حضرت شیخ الاسلام مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کی سلسلہ وار خودنوشت سوانح
”یادیں“
جامعہ دارالعلوم کراچی

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وعلی کل من تبعھم باحسان إلی یوم الدین

تمہید

میرے بہت سے دوستوں اور کرم فرماؤں نے میرے سفرنامے پڑھنے کے بعد مجھ سے فرمائش کی کہ میں اپنی آپ بیتی لکھوں۔ لیکن میں نے ہمیشہ اسے ان حضرات کی محبت کا ایک شاخسانہ سمجھ کر اس پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا، کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ سوانح حیات بڑے آدمیوں کی لکھی جاتی ہے جن کی زندگی میں دوسروں کے لئے کوئی سبق ہو۔ مجھ جیسا شخص جو اپنی سابق زندگی پر نظر ڈالے، تو اسے اپنے اعمال پر ندامت اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو، اس کی سوانح سے کسی کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

اب سے تین سال پہلے مجھ سے میرے انتہائی قابل احترام بزرگ اور دارالعلوم ڈابھیل کے صدر مفتی حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم نے (جن کی خدمات ہندوستان بھر میں بلکہ عالم اسلام کے مختلف خطوں میں پھیلی ہوئی ہیں) حرم شریف میں یہ فرمائش کی، تو اُس وقت بھی میں نے یہی عذر کیا، لیکن اس کے بعد حضرت مفتی صاحب مدظلہم نے ڈابھیل پہنچ کر ایک مفصل خط تحریر فرمایا جس میں نہ صرف اپنی طرف سے، بلکہ متعدد دوسرے اہل علم کی طرف سے پوری سنجیدگی اور اہتمام کے ساتھ یہ فرمائش دہرائی گئی تھی۔ یہ مکتوب گرامی درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۲۷ جون ۲۰۱۱ء

مخدومنا المکرم والمعظم حضرت اقدس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

خدا کرے حضرت والا بعافیت اور سلامت ہوں، احقر عرصۂ دراز سے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب نور اللہ مرقدہ اور حضرت والا کی تصانیف کا گرویدہ رہا ہے، وجہ اس کی صرف اور صرف یہی ہے کہ یہ تصانیف علمائے ربانیین کے مذاق ومزاج کی رعایت سے پُر ہیں، اور ہمارے علماء کی سلامتیٔ فکر اور پاکیزہ خیالات کی ترجمان ہیں، بالخصوص حضرت والا کی دورِ اخیر کی تصانیف کا تو کیا کہنا؟ دینی مزاج کے حاملین ذوق وشوق اور بڑی رغبت سے پڑھتے ہیں، کئی اشاعتیں ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہیں، جب تصانیف کی مقبولیت کا یہ حال ہے تو صاحب تصانیف کی محبوبیت کا کیا عالم ہوگا؟ اس کو لکھنے کی ضرورت نہیں، سال گزشتہ اسی ماہ جولائی میں ہندوستان کا سفر ہوا تھا، جس میں یہاں کے باشندوں کی وارفتگی کا مشاہدہ حضرت والا خود فرما چکے ہیں۔

اس مختصر تمہید کے بعد حضرت والا کی خدمت میں مؤدبانہ درخواست عرض کرنا چاہتا ہوں جو صرف احقر ہی کی نہیں؛ بلکہ دین سے وابستہ بہت بڑے طبقہ کی دلی دھڑکن ہے، اگر درخواست کو عملی جامہ پہنایا جائے تو بڑی تشنگی دور ہوگی، اہل علم کا بہت بڑا طبقہ دلی دعائیں دے گا، اور ان کو چراغ راہ ہاتھ لگے گا، اس مشعلِ راہ سے اہل علم اپنی زندگی کے عقدۂ لاینحل حل کیا کریں گے۔

درخواست یہ ہے کہ حضرت والا اپنی آپ بیتی تحریر فرمادیں، اپنی آپ بیتی لکھنے کے متعلق ہمارے اکابر کا طریقہ بطور دلیل آپ کے سامنے پیش کرنا سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہے، اس لئے ان کی خودنوشتہ سوانح حیات اور آپ بیتی کے

نام لکھنے کی جسارت کرنے سے قاصر ہوں؛ البتہ ایک بات جو احقر کے ناقص خیال میں آئی، وہ یہ ہے کہ زندوں کی سوانح نسلِ حاضر کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین میں زیادہ مفید ہے۔ اکابرین کی زندگی ہی میں ان کے کمال اور ہنر کی صحیح معرفت کے بعد (یعنی منظر عام پر تحریری شکل میں آنے کے بعد) ان سے بلا واسطہ اور بروقت فائدہ اٹھا کر ان کے کارناموں اور ان کی روشن کی ہوئی شمعوں سے زیادہ کام لیا جاسکتا ہے، اور دین و دنیا کی ترقی کی منزلیں زیادہ آسانی اور تیزی سے طے کی جاسکتی ہیں، کیونکہ وفات یافتہ حضرات کے حوالہ سے دیکھا جائے، تو سچ یہ ہے کہ ان کی سیرت و کردار کے دفاتر صرف "نظریہ" ہوتے ہیں؛ متشکل اور "متحرک نمونۂ عمل" نہیں ہوتے؛ اس لئے ان کی سیرت اور کردار کا مطالعہ کرنے والے کے لئے (بالخصوص ان کے لئے جو ان کے عہد کو نہ پاسکیں) ایک بہت بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ ہمیں کون بتائے گا کہ اس سیرت و کردار کو کس طرح عملی جامہ پہنایا جائے؟ جبکہ زندوں کے حوالہ سے کہا جاسکتا ہے کہ "نظریہ" اور "نمونۂ عمل" دونوں موجود ہیں۔

"کتاب مبین" کے ساتھ "نور عظیم" خود رب العالمین جل جلالہ وعم نوالہ کا وضع کردہ قانون ہے، اور اللہ جل شانہ نے خود ہی اس کی راہ دکھائی اور مخلوق کو اس پر چلایا ہے، نیز اس کے بندوں نے اس کو طبعی طور پر قبول کر کے اس پر عمل کیا ہے، امید ہے کہ اس قانون فطرت کی لاج رکھ کر احقر کی درخواست کی طرف توجہ منعطف فرمائیں گے۔

احقر کی درخواست کسی معمولی شخصیت کی آپ بیتی لکھنے کی نہیں؛ بلکہ ایسی عظیم شخصیت کے حوالہ سے ہے جس کی علمی اور دینی خدمات اور تصنیفی کارنامے دنیا کے سامنے ہیں، اور پورا عالمِ اسلام ان کے احسانات کے زیر بار ہے، جس نے تنہا صرف ایک آدمی کا نہیں بلکہ ایک مکمل انجمن کا کام کیا ہے، جس کی نظیر اس عہد میں

ماضی قریب میں حضرت والا کو واسطہ نہیں ملتی۔

ممکن ہے کہ بعض خردہ گیر طبیعتیں (جن سے ماضی قریب میں حضرت والا کو واسطہ پڑا) اس آپ بیتی پر خودنمائی اور کارناموں کی بے جا تشہیر کا عنوان لگائیں، اور ان کو اس میں تفاخر اور مبالغہ آرائی کی بو آئے؛ لیکن چند گنے چنے معترضین کی الزام دہی کی وجہ سے جن سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہا اور جن کی ملامت سے کوئی بچ نہیں سکا ان اہل ذوق اور فدائیوں کو اس سرمایہ سے محروم کرنا صحیح نہ ہوگا جن کی تعداد لا تعد ولا تحصی ہے، اور جو اس جیسی آپ بیتی کو سرمایۂ بصیرت بنانے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ علوم دینیہ اور مدارس عربیہ کے طلباء سے لے کر حکومتی ایوانوں اور کچہریوں کے خادموں اور ملک و بیرون ملک کے ہر فرد بشر کے لئے اس میں عبرت وبصیرت اور ذکر وموعظت کا بڑا سامان ہے۔

جب حضرت اقدس تھانوی نے اپنی تصنیف "اشرف السوانح" میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا، حضرت اقدس مدنی ؒ نے "نقش حیات" میں اپنے حالات قلم بند کئے، حضرت شیخ الحدیث ؒ نے آپ بیتی تصنیف فرمائی، تو ان کے معاصرین نے کیسے کیسے تبصرے کئے! کیسی کیسی سرگوشیاں کیں! لیکن یہ سب اکابر ہم اصاغر اور آنے والی نسلوں کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ناقدین وحاسدین کی خردہ گیری کی سزا آئندہ نسلوں کو نہیں دی، اور تواضع وانکساری اور فنائیت کے پیکر مجسم ہونے کے باوجود اپنے حالات وواقعات، علمی وروحانی کمالات سے اہل ذوق کو محروم نہیں کیا۔

احقر امید کرتا ہے کہ حضرت والا بھی اپنے اکابر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہمیں محروم نہیں کریں گے۔

سطور بالا میں احقر نے اپنی دیرینہ دلی آرزو بے ہنگم طور پر صاف صاف لکھنے کی جرأت کی، اس کی وجہ بھی بالکل حضرت والا کی عنایات وشفقتیں ہیں، جب جب

بھی ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی، احقر نے دیکھا کہ حضرت والا کی خرد پروری اور ذرہ نوازی روز افزوں ہے، ممکن ہے اس تحریر میں ادب ملحوظ نہ رہ پایا ہو اور کوئی نامناسب جملہ نکل گیا ہو، اگر حضرت والا ایسا محسوس فرمائیں، تو میں حضرت والا کی خدمت میں بصد ادب و نیاز معافی کا خواست گار ہوں، اور دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالی حضرت والا کی شخصیت کو عالم اسلام کی خدمت کیلئے دیر تا دیر بعافیت زندہ و سلامت رکھے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

أملاہ: العبد احمد عفی عنہ خانپوری

خادم دار الافتاء، جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین، ڈابھیل، گجرات، الہند۔

اس مکتوب گرامی کے ساتھ ایک مزید تحریر بھی تھی جس میں جامعہ ڈابھیل کے ایک صالح استاذ کے قلم سے ان کا ایک خواب بیان کیا گیا تھا جو بندے کے لئے ایک بشارت پر مشتمل تھا۔ اسکو محض تحصیل سعادت کے لئے نقل کر رہا ہوں، جس کے بارے میں حضرت امام محمد بن سیرین رحمۃ اللہ تعالی علیہ کا یہ مقولہ پوری طرح پیش نظر ہے جو میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحریر میں دیکھا تھا۔ حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ تعالی علیہ کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ وہ تعبیر خواب کے امام ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ " :الرؤیا تسر ولا تغر" یعنی خواب خوش کرنے کے لئے تو ٹھیک ہے، لیکن اس سے دھوکے میں نہیں پڑنا چاہئے، کیونکہ کسی شخص کی مقبولیت عند اللہ کا اصل مدار کسی خواب پر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے بیداری کے اعمال پر ہوتا ہے۔ البتہ اُسے فال نیک سمجھ کر اس سے خوش ہو جانے کی حد تک ٹھیک ہے، بشرطیکہ اُسے اعمال صالحہ اور اتباع سنت میں اضافے کا ذریعہ بنایا جائے۔

اس وضاحت کے ساتھ حضرت مدظلہم کی یہ تحریر بھی جو ان کے خط کے ساتھ منسلک تھی، ذیل میں نقل کرتا ہوں :

۲۴ر رجب المرجب ۱۴۳۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

آج سے پانچ سال پہلے ہمارے جامعہ کے درجہ حفظ کے ایک مدرس (جو صالح اور

معمولات کے پابند ہیں) نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا، وہ خواب انہیں کے الفاظ میں (بتغییر یسیر) نقل کیا جاتا ہے:

"بندہ شبیر احمد نزولی نے ایام حج (ذی الحجہ) میں ایک خواب دیکھا تھا، اس کے متعلق تعبیر مطلوب ہے۔ خواب کی تفصیل اس طرح ہے کہ بندہ نے بوقت تہجد یہ محسوس کیا کہ جامعہ ڈابھیل میں خانقاہ کا سلسلہ جاری ہے، اور بندہ بھی گاؤں میں پڑھا کر وقتاً فوقتاً شریک ہوتا ہے، تو میں مسجد جامعہ آیا تو پتہ چلا کہ مسجد کے حی علی الفلاح والی جانب داخل ہوتے ہی پہلے دروازے کے قریب پہلی کھڑکی کے پاس پنکھے کے نیچے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں، اس درمیان بعض نے ملاقات کا شرف حاصل کیا، بندہ نے بھی ملاقات کی، پھر تھوڑی دیر تک اور آنے والے حضرات نے ملاقات کی، بندہ کو مزید شوق ہوا ملاقات کا تو دوبارہ آگے بڑھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مجھے دیکھ کر کچھ جلدی سے اٹھ بیٹھے اور ملاقات کا شرف بخشا اور ارشاد فرمایا: خیریت سے ہو؟ بندہ نے بحمد اللہ سے جواب دیا، پھر کچھ ہی دیر بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے چائے لائی گئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نوش فرمائی، بندہ کے دل میں خیال آیا میں بھی کچھ گھر سے منگواؤں، میں نے ایک طالب علم کو اشارہ سے بتلایا: جلدی سے جا کر گھر سے کھانا لے آؤ، تو وہ فوراً گھر سے مرغی کا گوشت اور روٹی لایا، میں نے ادباً پیش کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تناول فرمایا، میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکم سیر ہو کر تناول فرمایا، تو مجھے ہجرت والا قصہ یاد آیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام معبد رضی اللہ عنہا کے گھر دودھ تناول فرمایا تھا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ نوش فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا نوش فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیر ہو گئے اور میں خوش ہو گیا، وہی جذبہ میرا تھا، پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بائیں طرف پہلی کھڑکی کی طرف توجہ فرمائی،

اس پر ایک کتاب انوار نبوت (مصنفہ مفتی شبیر صاحب) تھی، مجھ سے فرمایا: کتاب لاؤ! میں نے پیش کی، اور ساتھ ہی کھول کر بتلانے لگا، اور ادبا عرض کیا: یا رسول اللہ! ان کی ہر کتاب مدلل ہوتی ہے، مفتی صاحب ہر حدیث کا حوالہ جلد نمبر، صفحہ نمبر، سطر نمبر سب لکھتے ہیں، اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہاں! ہندوستان میں مفتی شبیر اور پاکستان میں مفتی محمد تقی عثانی بہت اچھا کام کر رہے ہیں، اس کے کچھ دیر بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد کے حی علی الصلاۃ والی جانب تشریف لائے، پہلی کھڑکی کے پاس کچھ حضرات کھانا کھا رہے تھے، چاول اور دودھ ملا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عصائے مبارک الگ رکھا اور شریک ہوگئے، اتنے میں مولانا عبد اللہ کاپودروی صاحب تشریف لائے، ملاقات کی، فرمایا: یا رسول اللہ! آپ نے خلاف معمول عصا رکھ دیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں بھائی! کسی کی خاطر صدمہ برداشت کرنا چاہیے۔ اس درمیان بہت سے علماء حضرات موجود تھے، حضرت والا مفتی احمد صاحب مدظلہ بھی شریک تھے، بات چل رہی تھی، فجر کی اذان کی آواز آئی اور بندہ کی آنکھ کھل گئی"۔

اس خط کے ملنے کے بعد میں نے حضرت مفتی صاحب مدظلہم کو یہ جواب دیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی قدر مکرم حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ بذریعہ ای میل ایسے وقت ملا جب سفر برطانیہ کیلئے پابرکاب ہوں، اس سے پہلے متعدد احباب کی طرف سے جب بھی اپنی آپ بیتی لکھنے کی تجویز آئی، بندہ نے اُسے سختی کے ساتھ اس لئے رد کیا کہ حقیقۃً بندہ اپنے آپ کو اس لائق نہیں سمجھتا کہ اپنے حالاتِ زندگی لکھے جائیں، اور دوسرے اہم کام ہر وقت سامنے رہتے ہیں، لیکن آنجناب نے جس انداز مشفقانہ میں یہ خط تحریر فرمایا

ہے، اسے پڑھنے کے بعد پہلی بار اس تجویز پر سنجیدگی سے غور کرنے کا خیال پیدا
ہوا۔ حقیقت تو اب بھی وہی ہے کہ ایک مکھی مچھر کی آپ بیتی کسی کو کیا نفع پہنچائے
گی؟ لیکن آنجناب نے جن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے، اُن میں بعض ایسے
ہیں کہ ان پر سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں، ایک خیال اب بھی بڑی رکاوٹ ہے، اور
وہ یہ کہ باقی ماندہ عمر میں کچھ دوسرے کام تالیف کے سلسلے میں پیش نظر ہیں، سوال
یہ ہے کہ اوقات کو اُن کاموں میں صرف کرنا زیادہ بہتر ہے یا اس کام میں؟ کسی
وقت موقع ہوا تو ان شاء اللہ اس پر آنجناب سے زبانی رہنمائی لوں گا۔

جو خواب آنجناب نے نقل فرمایا ہے، اسے پڑھ کر عجیب کیفیت ہوئی جو الفاظ
سے بالاتر ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ بندہ کو اُس کا اہل بننے کی توفیق عطا فرمائیں۔
آمین۔ مفتی شبیر صاحب مدظلہم اور ان کی تصانیف دیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا۔ بندہ
اُن سے ناواقف ہے۔ ہوسکے تو ان کے بارے میں چند سطور تحریر فرمادیں۔

والسلام

محمد تقی عثمانی

۱۴۳۲/۸/۶ھ

اسکے بعد ایک اور مرتبہ حضرت مفتی صاحب مدظلہم کا یہ خط موصول ہوا:

باسمہ تعالیٰ

بخدمت حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

عافیت خواہ بعافیت ہے، خدا کرے حضرت والا بخیر وعافیت ہوں۔

احقر نے ماہ شعبان المعظم میں حضرت والا سے آپ بیتی مرتب کرنے کی بذریعہ
عریضہ درخواست کی تھی جسے حضرت والا نے بالمشافہہ اور تحریراً شرف قبولیت سے
مشرف فرمایا۔ فجزاکم اللہ أحسن الجزاء۔

ماہِ مبارک میں مکۂ معظمہ میں باریابی کا شرف حاصل ہوا، اس وقت حضرت والا نے فرمایا تھا "آپ بیتی شروع کر دی ہے"۔

اپنے مقام (انڈیا) پہنچنے کے بعد حضرت والا کا نوازش نامہ احقر کے نام آیا اس میں بھی اس سلسلہ میں سنجیدگی سے سوچنا تحریر فرمایا ہے۔

احقر کی درخواست کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر اس کو عملی جامہ پہنانے سے بڑی مسرت ہوئی اور حضرت والا کی خوردنوازی کا احساس بھی۔

یہاں جس کسی کو یہ بات معلوم ہوئی بڑا خوش ہوا اور دعا گو ہے کہ اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ آگے بڑھا کر جلد از جلد تکمیل فرمائے۔ (آمین)

حضرت والا نے اپنے مکتوب گرامی میں جو یہ تحریر فرمایا ہے:

"ایک خیال یہ بھی بڑی رکاوٹ ہے اور وہ یہ کہ باقی ماندہ عمر میں کچھ دوسرے کام تالیف کے سلسلہ میں پیش نظر ہیں، سوال یہ ہے کہ اوقات کو ان کاموں میں صرف کرنا زیادہ بہتر ہے یا اس کام میں"؟

اس کا اصل جواب تو حضرت والا ہی جانتے ہیں احقر کے ناقص خیال میں یہ ہے:

(1) تالیف کے کام حضرت والا اپنی زیرِ نگرانی کروالیں، اور آپ بیتی کا کام بذات خود انجام دیں؛ اس لئے کہ اوّل الذکر کام کی انجام دہی اور اس میں نقص کی صورت میں تلافی اہلِ علم کے بس میں ہے۔ جب کہ ثانی الذکر کام میں یہ نہیں ہوسکتا، احوال کی صحیح تصویر کشی دوسرا کر ہی نہیں سکتا اگر کوشش کرے گا بھی تو افراط وتفریط کا امکان ہے، جیسا کہ بعض سوانح نگار اس کا شکار ہوئے ہیں۔

(2) حضرت والا کے بیان سے ایسے امر کا حل ہزاروں انسانوں نے سیکھا، عمل کیا ور مفید پایا۔ حضرت والا ہی کے الفاظ "اصلاحی خطبات" سے نقل کرتا ہوں۔

"کام کرنے کا بہترین گُر"

ہمارے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جو

کام فرصت کے انتظار میں ٹال دیا وہ ٹل گیا، وہ پھر نہیں ہوگا: اس واسطے کہ تم نے اس کو ٹال دیا۔ کام کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو دھکا دو، یعنی وہ دو کام جو تم پہلے سے کر رہے ہو اب تیسرا کام کرنے کا خیال آیا، تو ان دو کاموں کے درمیان تیسرے کام کو زبردستی گھسا دو، وہ تیسرا کام بھی ہوجائے گا۔ اور اگر یہ سوچا کہ ان دو کاموں سے فارغ ہو کر پھر تیسرا کام کریں گے تو پھر وہ کام نہیں ہوگا۔ یہ منصوبے اور پلان بنانا کہ جب یہ کام ہوجائے گا تو پھر یہ کام کریں گے یہ ٹالنے والی باتیں ہیں۔ (اصلاحی خطبات: ۱/۵۳)

مذکور بالا دو حل پیش کرنے کی جرأت اور ہمت مکتوب گرامی کے الفاظ "کسی وقت موقع ہوا تو ان شاء اللہ اس پر آنجناب سے زبانی رہنمائی لوں گا" سے ہوئی، ورنہ ایسے امور میں کسی چھوٹے کا اپنے بڑے کو مشورہ دینا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

مکتوب گرامی میں ازراہ تواضع تحریر فرمایا ہے:

"حقیقت تو اب بھی وہی ہے کہ ایک مکھی مچھر کی آپ بیتی کسی کو کیا نفع پہنچائے گی"

احقر کے خیال میں مذکورہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اس کے جواب میں بس اتنا کافی ہے کہ اگر مکھی میں نفع نہ ہوتا تو قرآن کریم کی ایک سورت "النحل" کو اس کے نام سے موسوم نہ کیا جاتا۔

ایک اور نکتہ ذہن میں آرہا ہے، وہ یہ کہ مکھی مچھر دونوں اڑنے والے جانور ہیں۔ حضرت والا کی آپ بیتی درحقیقت جگ بیتی ہے۔ اہل علم میں سے شاید ہی کسی نے اتنا طیران الارض کیا ہو جتنا حضرت نے فرمایا ہے۔ کتاب "جہانِ دیدہ" اور "دنیا مرے آگے" اس کا بین ثبوت ہے۔ حضرت کے سفرناموں کا جب یہ حال ہے کہ ؎ لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

تو آپ بیتی کا کیا حال ہوگا؟ اس کو الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

بہر حال مکرر درخواست ہے کہ آپ بیتی تحریر فرمانے کا جو سلسلہ جاری فرمایا ہے اس کی تکمیل ضرور فرماویں۔

اللہ تعالیٰ حضرت والا کے سایہ عاطفت کو دیر تا دیر بعافیت وسلامت باقی رکھیں اور اوقات میں برکت نصیب فرماویں۔

املاہ العبد احمد عفی عنہ خانپوری

خادم دار الافتاء والتدریس

جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل

بتاریخ ۱۰ ذی قعدہ ۱۴۳۲ھ

اس مکتوب میں حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم نے اس بندۂ عاجز کے بارے میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، وہ تو یقیناً ان کے حسن ظن اور محبت کا اثر ہے، ورنہ من آنم کہ من دانم۔ لیکن اس مکتوب گرامی کے ساتھ دل میں ایک اور خیال نے مجھے اس فرمائش پر عمل کا داعیہ پیدا کیا۔ اور وہ یہ کہ میرے کچھ محبت کرنے والوں نے اپنی محبت کے تقاضے سے میری سوانح اردو اور عربی میں مرتب فرمائی ہیں، اور انہیں دیکھ کر مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ان کی محبت نے بہت سے معاملات میں انہیں مبالغے پر آمادہ کر دیا ہے، نیز بعض موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے ان معاملات کا پورا پس منظر اور تفصیلات ان کے سامنے نہیں آسکیں، اور ان کی صحیح حقیقت میرے علاوہ شاید کوئی اور بیان نہ کر سکے۔ اس لئے ریکارڈ درست رکھنے کی خاطر یہی مناسب ہے کہ میں خود اپنے قلم سے ان کی حقیقت واضح کروں۔

دوسری طرف جو چیز میرے لئے بہت بڑے مانع کی حیثیت رکھتی تھی، وہ یہ کہ متعدد تالیفی خدمات میرے پیش نظر تھیں جنہیں چھوڑ کر اپنی ذاتی داستان چھیڑ دینا طبیعت پر بار تھا۔ ان دونوں جہتوں میں تطبیق کے لئے ہی میں نے حضرت مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم سے یہ وعدہ کر لیا تھا کہ میں اپنے سفروں کے دوران ان کی فرمائش کو پورا کرتے ہوئے عمر رفتہ کی یادیں قلمبند کرنے کی کوشش کروں گا۔

چنانچہ میں نے جواب میں مندرجۂ ذیل خط لکھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی قدر معظم حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم العالی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حضرت والا کا گرامی نامہ بذریعہ ای میل موصول ہوا، اور تعمیلِ ارشاد کی خاطر اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام پر ارادہ کرلیا ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کام فی الحال سفروں کے دوران شروع کردوں گا۔ آنجناب حج کے سفر پر روانہ ہورہے ہیں، بندہ دست بستہ دعاؤں کا ملتجی ہے، اور اگرچہ معلوم ہے کہ آنجناب اس ناکارہ کیلئے دعا فرماتے ہی ہیں، لیکن پھر بھی درخواست کرنے کو دل چاہتا ہے، اور یہ دعا بھی فرمائیں کہ اگر اس کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا ہو تو اسے بعافیت مکمل اس طرح کرنے کی توفیق عطا فرمائیں کہ دوسرے کاموں کا بھی حرج نہ ہو۔ نیز روضۂ اقدس پر اس ناکارہ کا سلام عرض کرنے کی بھی درخواست ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو حج مبرور کی سعادتوں سے مالامال کرکے بعافیت واپس لائیں، اور بایں فیوض تادیر آپ کا سایۂ عاطفت ہم پر قائم رکھیں۔ آمین۔ والسلام

بندہ محمد تقی عثمانی

۲۸/ذوالقعدۃ ۱۴۳۲ھ

چنانچہ اس صورت پر عمل کرتے ہوے میں نے جہازوں اور سفر کی قیام گاہوں پر یہ کام شروع کیا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت مفتی صاحب مدظلہم سے پھر ملاقات ہوئی، تو اس کا ایک معتد بہ حصہ مکمل ہوچکا تھا۔ حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم کو اس کی اطلاع دی، تو انہوں نے فرمایا کہ میں اس سلسلے کو اپنے ماہنامے "البلاغ" میں قسط وار شائع کرنا شروع کردوں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نام پر اگلے مہینے سے یہ سلسلہ البلاغ میں شروع کررہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اسے پڑھنے والوں کے لئے نافع اور مفید بنائیں۔ آمین۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(پہلی قسط)

اپنے آپ کو مسلک کے اعتبار سے دیوبندی کہتے اور لکھتے ہوئے تو مجھے اس لئے تأمل ہوتا ہے کہ اس سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے، اور بعض لوگ دیوبندی مسلک کے لفظ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتے ہیں کہ دیوبندی کوئی مذہبی فرقہ ہے، جس نے امت کی اکثریت سے ہٹ کر کوئی الگ راستہ نکالا ہے حالانکہ دارالعلوم دیوبند کے مکتبِ فکر سے وابستہ علماء اپنے اعتقاد اور عمل میں قرآن کریم اور سنت نبوی علی صاحبہا السلام کی ٹھیک اُسی معتدل تعبیر کے قائل ہیں جو چودہ سو سال سے امت میں متوارث چلی آتی ہے، انہوں نے کسی نئے فرقے کی بنیاد نہیں ڈالی بلکہ جمہور امت جن عقائد کے قائل اور جن اعمال پر کاربند چلے آتے تھے علماء دیوبند ٹھیک انہی عقائد واعمال کے پابند ہیں، البتہ اگر کبھی اُن پر کوئی گرد وغبار آتا دیکھا، تو اُسے حکمت اور استقامت سے ہٹانے کی کوشش انہوں نے ضرور کی ہے، جس کے نتیجے میں بعض ان سے عناد رکھنے والوں نے یہ تأثر دیا ہے کہ وہ ایک الگ فرقہ ہیں۔ اس موضوع پر حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج" بہترین کتاب ہے، اور اس کے مقدمے میں میں نے اس پہلو کو مزید واضح کیا ہے لیکن اس وقت کہنا یہ تھا کہ حضرات علماء دیوبند کو دینی معاملات میں اپنا آئیڈیل سمجھنے کے باوجود مجھے یہ کہنے میں تو تأمل ہوتا ہے کہ میں مسلک کے اعتبار سے "دیوبندی" ہوں کیونکہ اس سے فرقہ واریت کی بو آتی ہے، لیکن میں پیدائشی طور پر دیوبندی ضرور ہوں اور مجھے اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ سعادت ضرور حاصل ہے کہ میری پیدائش اُس قصبے میں ہوئی جہاں دارالعلوم دیوبند نے علم وفضل، عزیمت واستقامت اور عظمتِ کردار کے وہ پہاڑ پیدا کئے جن کی نظیریں اس آخری دور میں ملنی مشکل ہیں۔

دیوبند میں ہمارے آباء واجداد ''میاں جی ''کے لقب سے مشہور تھے۔ ''میاں جی ''اس دور

میں ایک لقب تھا جس کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا ہے کہ:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قصبات و دیہات میں پھیلے ہوئے عام مکاتب جن میں قرآن کریم کی تعلیم کے بعد اردو، فارسی، حساب ریاضی کی تعلیم کا عام رواج تھا جو آجکل مڈل اسکول کی تعلیم سے زیادہ معیاری تعلیم تھی، اس کے اساتذہ "میاں جی" کے لقب سے مشہور ہوتے تھے جو دینی تعلیم کے ساتھ عملی تقدس کے حامل ہوں، جیسے حضرت حاجی امداداللہ صاحب مہاجر مکیؒ کے شیخ میاں جی نور محمد صاحب (رحمۃ اللہ تعالی علیہما) بھی لوہاری میں معروف ہوئے، اور میاں جی منے شاہ صاحبؒ دیوبند میں صاحب کشف و کرامات بزرگ ہوئے ہیں"۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"مجھے اپنے خاندان کا کوئی موثق اور باسند نسب نامہ ہاتھ نہیں آیا، مگر شریعت نے ان معاملات میں سند متصل ہونے کی شرط نہیں رکھی، بلکہ بڑے بوڑھوں کی زبان پر عام شہرت کو کافی سمجھا ہے۔ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے بتواتر یہ بات سنی ہے کہ ہمارا خاندان حضرت عثمان رضی اللہ تعالی عنہ کی اولاد میں سے ہے"(۱)۔

میری پیدائش ۵ر شوال ۱۳۶۲ھ کو ہوئی۔ اپنی پیدائش کی یہی تاریخ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی بیاض میں لکھی ہوئی دیکھی تھی۔ چونکہ اُس ماحول میں تاریخوں کو محفوظ رکھنے کیلئے ہجری سالوں اور مہینوں ہی کا حساب رکھا جاتا تھا اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے ساتھ شمسی تاریخ نہیں لکھی تھی لیکن بعد میں مختلف تقویموں کے ذریعے حساب لگانے سے معلوم ہوا کہ وہ اکتوبر ۱۹۴۳ء کی تیسری تاریخ تھی۔ اور یہ واقعہ بھی میں نے اپنی والدہ ماجدہ اور اپنے بہن بھائیوں سے سنا کہ جس دن میں پیدا ہوا، اُسی دن جس بستر پر مجھے لٹایا گیا تھا، اُس پر چھت سے ایک سانپ آ کر گر گیا تھا، اور اگر اُسے کسی طرح بستر سے ہٹا کر مار نہ دیا گیا ہوتا، تو شاید یہ دنیا میری برائیوں سے محفوظ ہو جاتی۔

بہرحال! مجھے اپنی عمر کے صرف چار سال سات مہینے (اکتوبر ۱۹۴۳ء سے مئی ۱۹۴۸ء تک) دیوبند کے قصبے میں گذارنے کا موقع ملا اور وہاں بچپن کا صرف وہ وقت میں نے گذارا جس میں بچے

۱۔ ہمارے نسب کی یہ تفصیلات حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ کی کتاب "میرے والد ماجد" میں درج ہیں۔

کو اپنے کھیل کود کی دنیا سے باہر کسی چیز کا شعور نہیں ہوتا اور بعد میں جب بڑا ہو جاتا ہے، تو اس دور کی باتیں بھول بیٹھتا ہے۔ لیکن مجھے اس بچپن کے دیوبند کی بہت سی باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے میں آج انہیں دیکھ رہا ہوں۔

یہ وہ وقت تھا جب دیوبند کے گھروں میں نہ بجلی تھی، نہ پنکھا، نہ بہتے ہوئے پانی کے نل، نہ تیل نہ گیس کے چولھے۔ بجلی کے قمقموں کی جگہ یا تو موم بتی کے چراغ تھے، یا لالٹینیں۔ نلوں کی جگہ پانی کا ذخیرہ مٹی کے مٹکوں یا پیتل کے گھڑوں میں رکھا جاتا تھا، جنہیں بھرنے کے لئے اکثر کسی ماشکی کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں جو چمڑے کی بڑی سی مشک کمر پر لاد کر گھر گھر پانی پہنچایا کرتا تھا۔ کوئی فیشن ایبل اور خوشحال علاقہ ہوتا، تو اس میں بورنگ کرکے ایک مشترک لوہے کا نلکا لگا دیا جاتا تھا جس کے ہینڈل کو زور زور سے اوپر نیچے کرکے کسی بالٹی یا لوٹے میں پانی بھرا جا سکتا تھا۔ پانی مہیا کرنے کے علاوہ اس کا ایک فائدہ یہ تھا کہ ہاتھوں کی، بلکہ پورے جسم کی ورزش ہو جایا کرتی تھی۔ چونکہ میری عمر ایسی ورزش کی متحمل نہیں تھی، اس لئے دوسروں کو اس کے ہینڈل سے جھولتے ہوئے دیکھ کر ہی خوش ہو لیتا تھا۔ گھروں میں پینے کے لئے صراحیاں ہوتی تھیں، جو لُو کے تھپیڑے کھا کر خوب ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھیں۔ بجلی کے پنکھوں کی جگہ ہاتھ کے پنکھے ہوتے تھے، جو آج بھی جب بجلی چلی جاتی ہے، تو بے طرح یاد آتے ہیں۔

مئی جون کے موسم میں جب گرمی کی تپش درودیوار سے پھوٹتی، تو لکھوری اینٹوں سے بنے ہوئے صحن میں کوئی سقاء (جسے بہشتی اور ماشکی بھی کہا جاتا تھا) اپنی مشک سے فرش پر پانی کا چھڑکاؤ کر جاتا تھا اور جب فضا میں رُکی ہوئی ہوا کو ہاتھ کے پنکھوں سے منہ کی طرف درآمد کیا جاتا، تو گیلے فرش سے سوندھی سوندھی خوشبو اٹھا کرتی تھی اور اُس سے ممکنہ ٹھنڈک حاصل کرنے کا کام بھی نکل جاتا تھا۔ اسی موسم میں جب میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ ایک بانوں سے بنی ہوئی چارپائی پر صحن میں لیٹتا تو میرے اور تاروں بھرے آسمان کے درمیان گیس، پٹرول اور ڈیزل کا کوئی پردہ حائل نہیں ہوتا تھا اور نہ فضا میں پھیلی ہوئی کسی روشنی سے کوئی چھوٹے سے چھوٹا ستارا ماند پڑتا تھا۔ جگمگ کرتے ستاروں کے درمیان کہکشاں کے جال اور اُس سے پھوٹتی ہوئی سفیدی کو میں دیر تک تکتا رہتا اور ہم بچے یہ سمجھتے تھے کہ یہ آسمانی سڑک ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کیلئے بنائی ہے۔ اسی آسمانی سڑک پر فرشتوں کی آمد و رفت کا تصور کرتے کرتے

مجھے نیند آجاتی تھی۔

دل چاہ رہا ہے کہ اپنی ان یادوں کو بچپن کے اُس دور کے کچھ متفرق واقعات سے شروع کروں، لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ میں اُس وقت کے اپنے گھر کے افراد کا مختصر تذکرہ کردوں:

مجھے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں، کیونکہ میری پہچان اُن کے واسطے سے ہوتی ہے نہ کہ اُن کی پہچان میرے واسطے سے[1]۔ میں جو کچھ بھی ہوں، انہی کی نسبت سے ہوں۔ اگر کوئی اچھائی اللہ کی توفیق سے ملی ہے، تو انہی کے واسطے اور فیض سے، اور اگر کوئی برائی آئی ہے، تو وہ ان کی صحبت سے فائدہ نہ اٹھانے کی وجہ سے ہے، غرض جو کچھ ہوں، انہی کا ہوں:

اگر سیاہ دلم، داغ لالہ زارِ توام
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ توام

لہٰذا میری اس سرگزشت میں ان کا تذکرہ ان شاء اللہ تعالیٰ بار بار آئے گا۔

میں نے جب سے آنکھ کھولی حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو دو کاموں میں مشغول دیکھا۔ وہ اُس وقت اگرچہ دارالعلوم دیوبند کے مفتیٔ اعظم کے عہدے اور تدریس سے مستعفی ہوچکے تھے لیکن ایک تو بہت سے طالب علم جو خاص طور پر انہی سے شاگردی کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے اُن سے خصوصی درخواست کرکے اُن سے ہمارے گھر پر آکر پڑھا کرتے تھے۔ یہ وہ چیز تھی جسے آج کوچنگ یا ٹیوشن کہا جاتا ہے، لیکن بڑا فرق یہ ہے کہ آج کوچنگ اور ٹیوشن، پڑھانے والوں کے لئے آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ہوتے ہیں، لیکن دینی مدارس میں استاذ شاگرد کا رشتہ ایسا بے لوث ہوتا ہے کہ جس طالب علم کے لئے باقاعدہ درس گاہ میں پڑھنا کافی نہ ہوتا ہو، اسے استاذ الگ سے پڑھانے میں نہ صرف یہ کہ بخل سے کام نہیں لیتے، بلکہ پوری ذمہ داری کے ساتھ شاگرد کا حق ادا کرتے ہیں، اور اس پر طالب علم سے کوئی معاوضہ وصول کرنا

(۱) اور الحمدللہ! ان کا قدرے مفصل تذکرہ میں اپنی کتاب "میرے والد میرے شیخ" میں کرچکا ہوں اور ماہنامہ البلاغ کا مفتیٔ اعظم نمبر بھی میری ادارت میں شائع ہوچکا ہے جس میں بہت سے مضامین کے علاوہ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کے قلم سے اُن کی مفصل سوانح بھی ہے جو بعد میں الگ کتابی صورت میں بھی شائع ہوچکی ہے۔ اسی میں ہمارے خاندان اور آباء واجداد کا تذکرہ بھی ہے۔

مدارس کے ماحول میں نہایت معیوب سمجھا جاتا ہے، چاہے استاذ کی معاشی حالت کیسی ہی کمزور ہو۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی جذبے کے ساتھ ان طلبہ کو ہمارے گھر یا مسجد میں پڑھایا کرتے تھے۔

ہمارے محلے کی مسجد کا نام تو آدینی مسجد "تھا (۱) لیکن لوگ اُسے عام بول چال میں دینی مسجد کہتے تھے۔ شروع میں ہمارے دادا حضرت مولانا محمد لیٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس کے متولی تھے (۲)، بعد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس کے متولی بنے اور بعض اوقات اُس میں بھی درس دیا کرتے تھے۔

دوسرے جب وہ گھر میں ہوتے، تو اکثر اوقات اُنہیں کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے ہی پایا۔ یہاں تک کہ رات کو بھی گرمیوں میں جب ہمارے گھر کے صحن میں روشنی کیلئے سہ دری کے ایک دروازے میں ایک لالٹین لٹکا دی جاتی تھی حضرت والد صاحبؒ اُسی لالٹین کی روشنی میں اکثر و بیشتر لکڑی کے قلم کو (جسے اُس وقت ِکلک کا قلم کہا جاتا تھا) دوات میں ڈبو ڈبو کر کچھ نہ کچھ لکھتے نظر آتے تھے، کیونکہ فاؤنٹین پین کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی بیٹھک کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمرہ بنایا ہوا تھا جسے ہم حجرہ کہتے تھے۔ وہ ان کی عبادت گاہ تھی، جہاں سے ان کی تلاوت اور ذکر کی آواز آیا کرتی تھی۔

مجھے بچپن کے اُس دور میں حضرت والد ماجدؒ کے علمی اور عملی کمالات کا اندازہ تو کیا ہوتا؟ (صحیح معنی میں تو وہ اب بھی نہیں ہے،) لیکن اتنا ضرور تھا کہ اپنی چھوٹی سی کائنات میں وہی محبت وعقیدت کا سب سے بڑا مرکز تھے۔ اور وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میرے تقریباً تمام بڑے بھائیوں نے ان کی محبت کے ساتھ اُن کی ڈانٹ ڈپٹ اور مار کا بھی مرہ چکھا تھا لیکن میرے حصے میں اُن کا صرف پیار ہی

---

(۱) آدینہ فارسی زبان میں جمعہ کو کہتے ہیں اور آدینی کا مطلب تھا وہ مسجد جس میں جمعہ ہوتا ہو۔

(۲) حضرت مولانا محمد یاسین صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ دارالعلوم دیوبند کے قیام سے ایک سال پہلے ۱۲۸۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، اور اس طرح دارالعلوم دیوبند کے تقریباً ہم عمر تھے، اور ان کا یہ مقولہ میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے بارہا سنا کہ ہم نے دارالعلوم دیوبند کا وہ زمانہ دیکھا ہے جب وہاں کے شیخ الحدیث سے لیکر چوکی دار تک ہر شخص صاحب نسبت ولی اللہ تھا۔ ہمارے یہ دادا قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کے خاص مرید تھے، اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ہم سبق۔ زندگی بھر دارالعلوم دیوبند میں فارسی اور ریاضی کے استاذ رہے، اور دیوبند کی کئی کئی نسلوں نے ان کی شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ ان کے حالات حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے رسالے "میرے والد ماجد" میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں۔

بیار آیا تھا۔ایک مرتبہ میں (تقریباً بارہ سال کی عمر میں) اپنی والدہ مرحومہ کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کے یہاں لاہور چلا گیا تھا۔اُس وقت انہوں نے بھائی جان کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

"محمد تقی سلمہ کے بغیر مجھے بھی دن کاٹنے مشکل ہو رہے ہیں۔"

دیوبند کے زمانے میں اُن کا صرف ایک مرتبہ مدراس کا سفر مجھے یاد ہے جس میں ان کی جدائی میرے لئے انتہائی صبر آزما تھی اور اُس پر طرّہ یہ ہوا کہ جب وہ سفر سے واپس تشریف لائے، تو میں نے ضد کر کے اپنے بھائیوں کو اس پر آمادہ کرلیا تھا کہ اُن کے استقبال کیلئے میں بھی اُن کے ساتھ ریلوے اسٹیشن جاؤں گا۔اس میں سب سے بڑا شوق تو حضرت والد صاحبؒ کے استقبال کا تھا لیکن اسٹیشن جانے میں دو مزے اور بھی تھے۔ایک یہ کہ اسٹیشن جانے کیلئے تانگے (گھوڑا گاڑی) کی سواری لازمی تھی محلے میں ایک ہندو تانگے والا پھگو کے نام سے مشہور تھا -ایسے مواقع پر اُس کی خدمات حاصل کرنے کیلئے تانگے کی پہلے سے بکنگ کرالی جاتی تھی، جو اُس موقع پر کرالی گئی تھی، اس تانگے کی سواری کا موقع ہمیں بہت کم ملتا تھا کیونکہ قریب کے فاصلے پیدل اور درمیانی قسم کے فاصلے اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ ڈولی (پالکی) میں طے ہوجایا کرتے تھے۔اتنی دور جانا شاذ و نادر ہوتا تھا جس کیلئے تانگے کی ضرورت ہو۔لہذا اسٹیشن جانے میں اس شاہانہ سواری کا مزہ بھی آنا تھا جس کا تصور بڑا دلفریب تھا۔دوسرے ریلوے اسٹیشن ہمارے لئے بذاتِ خود ایک اعلیٰ درجے کی تفریح گاہ سے کم نہ تھا جس سے لطف اندوز ہونے کے مواقع خال خال ہی میسر آتے تھے۔لہذا یہ ہمارے لئے کئی لحاظ سے ایک انتہائی پرلطف اور پرمسرت موقع تھا۔

لیکن عین وقت پر نہ جانے کس طرح میرا ہاتھ جل گیا اور اُس کی وجہ سے علاج معالجے کیلئے مجھے گھر ہی میں روک لیا گیا اور میں اسٹیشن جانے سے محروم رہا۔یہ محرومی میرے لئے کئی محرومیوں کا مجموعہ تھی اس لئے اُس کی حسرت آج بھی یاد ہے۔لیکن اُس کے بعد یہ پُرلطف منظر بھی بھلائے نہیں بھولتا کہ جونہی حضرت والد صاحبؒ گھر میں داخل ہوئے اُنہوں نے کسی اور طرف متوجہ ہونے کے بجائے سب سے پہلے مجھے پکارا اور آگے بڑھکر گود میں اُٹھالیا۔لالٹین کی روشنی میں اُن کی سیاہ گھنی داڑھی اور اُنکا خوشی اور محبت سے کِھلا ہوا چہرہ اِس وقت بھی میرے تصور کی نگاہوں میں اس طرح سامنے ہے جیسے میں ابھی ان کو دیکھ رہا ہوں۔

جاری ہے......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(دوسری قسط)

میری والدہ ماجدہ، (محترمہ نفیسہ خاتون صاحبہ) اللہ تعالیٰ اُن پر ہمیشہ اپنی رحمت کی بارشیں برسائے، ایک مثالی ماں اور ایک مثالی گھریلو خاتون تھیں۔ وہ دیو بند کے ایک مشہور انصاری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، اور انہوں نے جس طرح ہر قسم کے سرد و گرم حالات میں حضرت والد صاحبؒ کی رفاقت کا حق ادا کیا، وہ ایک مستقل موضوع ہے، اس کے بارے میں میں ان کی وفات پر لکھ بھی چکا ہوں، جو میری کتاب "نقوش رفتگاں" میں شامل ہے۔ وہ بھی بڑی عابدہ وزاہدہ خاتون تھیں، ان کے تلاوت، ذکر اور نوافل کے معمولات اس وقت تک قضا نہیں ہوئے جب تک وہ اپنے ہوش وحواس میں رہیں۔

لیکن ہمارے لئے تو وہ ایک سراپا محبت وشفقت وجود تھا جس کے رات دن کے تقریباً تمام اوقات ہماری راحت رسانی کے لئے وقف تھے، اور اس کی خاطر وہ خود اپنی راحت وآرام کو ہمیشہ قربان کئے رہتی تھیں۔ یوں تو اپنی ساری اولاد ہی سے ان کی محبت برابر تھی، لیکن سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے مجھے اُن کا لاڈ پیار شاید سب سے زیادہ ملا، جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ میں کافی بڑا ہونے تک کھانا اُنہی کے ہاتھ سے کھایا کرتا تھا، اور جب تک وہ لقمے بنا بنا کر میرے منہ تک نہ پہنچاتیں، میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اس کے علاوہ والدہ صاحبہؒ کو کسی قریب کے گھر میں بھی جانا ہوتا، تو ممکن نہیں تھا کہ میں اُن کے ساتھ نہ ہوں۔

اُس زمانے میں دیو بند جیسے قصبے میں خودکار سواریوں، مثلاً موٹر کاروں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جو لوگ دیو بند سے کبھی باہر نہ گئے ہوں، انہوں نے کبھی موٹر کار شاید دیکھی بھی نہ ہو۔ لے دے کر تانگا (گھوڑا گاڑی) ہی ایک سواری ایسی تھی جس میں بیٹھ کر قصبے کے اندرونی فاصلے طے کئے جاسکتے تھے، اور وہ بھی صرف مردوں کیلئے مخصوص سواری تھی۔ مسلمان خواتین کیلئے برقع پہن کر بھی تانگے میں بیٹھ کر

کہیں جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اگر کوئی بہت دور کا فاصلہ ہوتا، اور تانگے کے بغیر سفر کرنا مشکل ہوتا، تو تانگے کے چاروں طرف پردہ باندھ کر برقع پوش خواتین اُس پردے کے اندر بیٹھتی تھیں، ورنہ ایک محلے سے دوسرے محلے جانے کے لئے پالکی استعمال ہوتی تھی، جسے دیوبند کی زبان میں "ڈولی" کہا جاتا تھا۔ اس ڈولی کو دو انسان اپنے کندھوں پر اٹھاتے تھے جنہیں "کہار" کہتے تھے۔ جب کسی خاتون کو ڈولی میں سفر کرنا ہوتا، تو کہار اُس کو گھر کے اندر رکھ کر باہر چلے جاتے۔ خاتون اُس میں بیٹھ جاتیں، اور کبھی کبھی اپنے ساتھ ایک پتھر رکھ کر بیٹھتی تھیں، تاکہ جب کہار ڈولی کو اٹھائے، تو اُسے خاتون کے جسم کا صحیح وزن بھی معلوم نہ ہوسکے۔ بعض اوقات چھوٹے بچوں کو شوق ہوتا تھا کہ وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ اس سواری کا مزہ لیں۔ ایسی صورت میں پتھر رکھنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آتی تھی۔ چنانچہ جب میری والدہ صاحبہ میری ننھیال کے کسی گھر میں تشریف لے جاتیں، تو مجھے بھی ساتھ بٹھالیتیں، اور مجھے ڈولی کے چاروں طرف پڑے ہوئے پردوں کی وجہ سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں، لیکن ہم جھٹکے لیتی ہوئی اُس ڈولی کے ہچکولوں ہی سے مزہ لیتے رہتے تھے، جنہیں ہم دیوبند کی زبان میں یہ کہتے تھے کہ بڑی اچھی "باریاں" آرہی ہیں، (یعنی سواری کے مزے آرہے ہیں)۔

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد میں ہم نو بہن بھائی تھے۔ سب سے بڑی بہن محترمہ نعیمہ صاحبہ (مرحومہ) تھیں، جنہیں ہم "آپا جان" کہتے تھے۔ ان کی شادی میری پیدائش سے پہلے ہی ہوچکی تھی۔ ان کی دو صاحبزادیاں اور ایک صاحبزادے بھی میری پیدائش سے پہلے پیدا ہوچکے تھے۔ اگرچہ وہ بہت خوش مزاج خاتون تھیں، اور میرے تمام بہن بھائی اُن سے بہت بے تکلف تھے، لیکن بچپن ہی میں مجھ پر اُن کا ایسا رعب قائم ہوگیا تھا جو والدہ ماجدہ کے رعب سے بھی زیادہ تھا۔ اور اُس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اُن کا مکان ہمارے مکان سے کچھ فاصلے پر اُس محلے میں تھا جسے "ٹیلہ" کہا جاتا ہے، وہ ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا، مگر ہمیں وہ پہاڑ سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہماری یہ بہن اس ٹیلے پر اپنے شوہر حکیم سید شریف حسین صاحب مرحوم کے ساتھ رہتی تھیں، جو اپنی طبیعت کی نفاست اور نزاکت میں اودھ کے نواب معلوم ہوتے تھے، اور اُن کے گھر میں صفائی ستھرائی کا اہتمام حد سے زیادہ تھا۔ اُنہیں اپنے بستر پر

معمولی شکن بھی گوارا نہ تھی۔

میں اپنے کسی بڑے کے ساتھ اُن کے گھر جاتا، تو اپنے ہم عمر بھانجے بھانجیوں کے ساتھ کھیل میں لگ جاتا۔ ایک مرتبہ اسی طرح کھیلتے کھیلتے میں اپنے میلے کچیلے پاؤں سمیت اپنی بہن کے بستر پر چڑھ گیا، تو اُنہوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور فرمایا: "بس قدم رنجہ نہ فرماؤ"۔ "قدم رنجہ" کا لفظ پہلی بار اُسی وقت سُنا تھا، لیکن اس لفظ کے معنی اور اُس میں چھپے ہوئے طنز سے زیادہ وہ گھورتی ہوئی نظریں ایک دائمی رعب بن کر دل پر چھا گئیں، جو سالہا سال بعد جا کر کسی قدر بے تکلفی میں تبدیل ہوسکا۔ مجھے اُس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس طرح غصّے سے دیکھنے کو "گھورنا" کہتے ہیں۔ جب آپا جان نے میرے دوسرے بہن بھائیوں کو یہ واقعہ سنایا تو "گھورنے" کا لفظ میں نے پہلی بار سُنا تھا۔ میری یہ سب سے بڑی بہن چونتیس سال کی عمر ہی میں انتقال فرما گئی تھیں جبکہ میں تیرہ سال کا تھا۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس کی نعمتوں اور راحتوں سے نوازیں، انہوں نے مشکل معاشی حالات میں جس خودداری اور وقار کے ساتھ زندگی گزاری، اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس موقع پر ان کا ایک واقعہ قلم کی زبان پر آنے کے لئے بے چین ہورہا ہے۔

جیسا میں نے عرض کیا، وہ شادی کے بعد اکثر مشکل معاشی حالات سے دوچار رہیں۔ اسی قسم کے حالات میں انہوں نے ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ سے عرض کیا کہ میرے لئے دعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے حج کی سعادت عطا فرمادیں۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: "کیا تمہیں حج کا شوق ہے؟" انہوں نے اثبات میں جواب دیا، تو حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا "نہیں، تمہیں شوق نہیں ہے" انہوں نے حیرانی سے عرض کیا: "میں سچ کہتی ہوں کہ مجھے حج کا بڑا شوق ہے" اس پر حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: "کیا تم نے اس کام کے لئے کچھ پیسے جمع کئے ہیں؟" انہوں نے اس کا جواب نفی میں دیا، تو حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا: "اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شوق زبانی ہی زبانی ہے، حقیقت میں شوق ہوتا، تو اس کے لئے کچھ جمع کرتیں" انہوں نے یہ عذر پیش کیا کہ "کچھ بچتا ہو، تو جمع کروں" حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ کیا تم ایک آنہ بھی اس کام کے لئے بچا نہیں سکتیں؟ انہوں نے کہا کہ

"اتنا تو بچا سکتی ہوں، لیکن حج کا خرچ اس سے کیسے پورا ہوگا؟" حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ بندہ اپنی استطاعت کے مطابق جب کسی نیک کام کے لئے قدم اٹھالیتا ہے، تو اول تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اور اگر وہ نیک کام پورا نہ بھی ہوسکے، تو اُس کا ثواب ان شاء اللہ مل کر رہتا ہے۔ لیکن کوئی قدم اٹھائے بغیر صرف آرزو سے کام نہیں بنتا۔

بات آئی گئی ہوگئی۔ اس کے کافی عرصے کے بعد ۱۹۵۶ء میں جب ان کا انتقال ہوا، اور ان کے ورثاء نے ان کے سامان کا جائزہ لیا، تو اُس میں ایک کپڑے کا چھوٹا سا تھیلا ملا جس پر لکھا ہوا تھا "حج کے لئے پیسے" اسے کھول کر دیکھا گیا، تو اس میں غالباً پینسٹھ (۶۵) روپے نکلے۔ حضرت والد صاحبؒ نے وہ تھیلا دیکھا، تو ان کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو آگئے، اور اُس وقت انہوں نے سارا واقعہ سُنایا۔ اس کے بعد حضرت والد صاحبؒ نے ان پیسوں کو ان کے حج بدل کی ادائیگی میں خرچ کیا، اور اس طرح ان کا حج بدل ادا کروایا۔

پھر ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ حج کے دوران میدان عرفات میں تھے، چند لمحوں کے لئے اُن پر غنودگی طاری ہوئی، تو انہوں نے عالم رؤیا میں دیکھا کہ آپا جان عرفات کے پہاڑ جبل الرحمہ پر چڑھ رہی ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی اس بندی کا حج ادا فرمادیا۔ رحمها الله تعالیٰ رحمةً واسعة.

ان سے چھوٹی بہن محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ مدظلہا ہیں جو ماشاء اللہ بہت عبادت گذار اور منظم زندگی رکھنے والی خاتون ہیں۔ انہیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، اور آج (۲۳؍فروری ۲۰۱۷ء مطابق ۲۵؍ جمادی الاولی ۱۴۳۸ھ کو) میرے علم کی حد تک اب دنیا میں ان کے سوا کوئی اور ایسا شخص موجود نہیں ہے جسے براہ راست حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا شرف حاصل ہو۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کا معمول تھا کہ وہ ہمیشہ رمضان المبارک اہل وعیال کے ساتھ تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامۃؒ کی صحبت میں گذارتے تھے۔ اس غرض کے لئے بکثرت خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مکان کے بالائی کمرے میں ٹھہرنا ہوتا تھا۔ یہ بالائی کمرہ اس طرح تھا کہ حضرتؒ کے

رہائشی کمرے کے سامنے صحن تھا، اور صحن کے آخری سرے پر سیڑھیاں اس بالائی کمرے تک پہنچاتی تھیں۔ بیت الخلاء چونکہ ایک ہی تھا، اس لئے حضرتؒ نے یہ انتظام فرمایا ہوا تھا کہ صحن میں ایک خاص جگہ پر ایک لالٹین رکھوا دیتے تھے۔ اس لالٹین کا وہاں رکھا ہوا ہونا اس بات کی علامت تھی کہ نیچے کا بیت الخلاء اوپر کے کمرے والوں کے لئے خالی ہے، اور پردے کا انتظام بھی موجود ہے۔ اگر لالٹین وہاں نہ ہوتی، تو یہ اس بات کی علامت تھی کہ بیت الخلاء مشغول ہے۔

میری یہی بہن بتاتی ہیں کہ اوپر کی منزل میں رہتے ہوئے حضرت والد صاحبؒ انتہائی ادب کی حالت میں رہتے تھے، اور ہم بچوں کو تلقین فرماتے رہتے تھے کہ ذرا بھی شور نہ ہو، کہیں ہم حضرتؒ کی تکلیف کا باعث نہ بن جائیں۔ میں اس وقت چھوٹی بچی تھی، اور ابھی پردے کے قابل نہیں تھی۔ اسی دوران ایک دن حضرت والد صاحبؒ نے مجھ سے فرمایا کہ حضرتؒ سے جا کر کہنا کہ آپ مجھے بیعت کرلیں۔ شروع میں میں نے اسے ایک مذاق سمجھا کہ ایک بچی کو کیسے بیعت کیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ جب والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا، تو میں نے پوچھا: " کیا بچے بھی بیعت ہوتے ہیں؟ "والد صاحبؒ نے فرمایا: "جی ہاں، بیعت ہوسکتے ہیں۔" اس کے بعد میں نے پیرانی صاحبہ سے عرض کیا کہ مجھے حضرتؒ سے بیعت ہونا ہے۔ چنانچہ پیرانی صاحبہ نے حضرتؒ سے فرمایا کہ یہ بچی بیعت ہونا چاہتی ہے۔ حضرتؒ نے مجھے بلا کر فرمایا: " بیعت کو گڈے گڑیا کا کھیل تو نہیں سمجھوگی؟ "جب میں نے نفی میں جواب دیا، تو حضرتؒ نے ایک کپڑے کا سرا میرے ہاتھ میں دیکر دوسرا سرا اپنے دست مبارک میں رکھا، اور مجھے بیعت کرلیا۔ اس طرح انہیں بچپن ہی میں یہ شرف حاصل ہوگیا[1]۔

میری اِن ہمشیرہ کی شادی بھی میری پیدائش سے پہلے ہوچکی تھی، بلکہ ان کی ایک صاحبزادی مجھ سے پہلے پیدا ہوچکی تھیں اور ایک صاحبزادی میرے تقریباً ساتھ ساتھ پیدا ہوئی تھیں۔ وہ اپنے شوہر اور بچیوں کے ساتھ ہمارے گھر سے مغربی سمت میں سامنے ہی ایک الگ گھر میں رہتی تھیں۔ محترمہ نعیمہ خاتون صاحبہ مرحومہ کی دو صاحبزادیوں اور ایک صاحبزادے اور محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ مدظلہا کی ایک

(۱) یہاں یہ واضح رہے کہ بیعت کا اصل مقصد تو بلوغ کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے، لیکن سلسلے میں داخل ہونے کی برکت بچپن میں بھی حاصل ہوسکتی ہے۔

صاحبزادی کا میں کہنے کو ماموں تھا، لیکن میرے یہ بھانجے بھانجیاں عمر میں مجھ سے بڑے تھے، اور پھوپی امۃ الحنان صاحبہ کے مکتب میں (جس کا ذکر ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آنے والا ہے) یہ چاروں مجھ سے آگے تھے۔ لیکن چونکہ عمر کا فرق زیادہ نہیں تھا، اس لئے یہ میرے بھانجے کم اور دوست زیادہ تھے، اور میری دوستی انہی کی حد تک محدود تھی۔ ان میں بھی بھانجے ایک ہی تھے، جو بعد میں مولانا حکیم مشرف حسین صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کہلائے۔ چنانچہ زیادہ تر دوستی انہی سے تھی۔ وہ ہر کھیل میں طاق تھے، اور میں اُن کا تابع مہمل۔

بہرکیف! ان دونوں بہنوں کے ساتھ عمر میں اتنے زیادہ تفاوت کی وجہ سے کہ ان کی اولاد بھی مجھ سے بڑی تھی، ان کے ساتھ بہنوں جیسی بے تکلفی کے بجائے ایک مربی جیسے رعب کا تعلق تھا۔

ان دو بہنوں کے بعد تیسرا نمبر ہمارے سب سے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا تھا جنہیں ہم "بھائی جان" کہتے تھے۔ انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں درس نظامی کی تعلیم متوسط کتابوں تک حاصل کی تھی، لیکن پھر کچھ حالات ایسے ہوئے کہ وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے، اور انہوں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قائم کئے ہوئے کتب خانے دارالاشاعت کو سنبھالا ہوا تھا لیکن ان کا مطالعہ، خاص طور پر تاریخ وسیرت، تصوف اور اکابر علماء دیوبند کے حالات وسوانح اور ان کے ملفوظات و افادات کے معاملے میں، اتنا وسیع تھا کہ اچھے اچھے علماء بھی اس میں ان کی ہمسری نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ سے بیعت تھے۔ اور تمام بزرگوں کے منظورِ نظر۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا داود غزنویؒ، حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ سب ان سے محبت فرماتے تھے، اور جب کبھی انارکلی میں ان کی کتابوں کی دوکان کے قریب سے گزرتے، تو وہاں تشریف لاکر کچھ دیر بیٹھتے، اور اپنے فیوض سے انہیں سرفراز فرماتے تھے۔ بھائی جان کو قرآن کریم کی تلاوت کا خاص ذوق تھا، اور رمضان المبارک میں دس سے پندرہ تک قرآن کریم ختم کرلیتے تھے۔ بہترین شاعر تھے اور ان کا کلام "کیفیات" کے نام سے قبول عام حاصل کرچکا ہے جس پر میں نے پیش لفظ بھی لکھا ہے۔ ان کی شادی

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور دیوبند کی عیدگاہ کے خاندانی خطیب حضرت مولانا محمد مبین خطیب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے ۱۹۴۶ء میں اُس وقت ہوئی جب میری عمر تین سال تھی، اور مجھے ان کی شادی کے علاوہ یہ بھی یاد ہے کہ ان کی شادی سے پہلے میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ہمارے مکان کے شمالی حصے میں ان کے لئے دو کمروں کا اضافہ کروایا تھا۔ وہ اُس وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تجارتی کتب خانے دارالاشاعت کے ناظم بن چکے تھے۔ وہ بھی عمر میں مجھ سے کم از کم چودہ سال بڑے تھے، اس لئے بڑی دو بہنوں کے بعد دل پر اُن کا بھی اچھا خاصا رعب رہتا تھا۔

اُنہیں خوشنویسی کا بھی بڑا شوق تھا اور وہ کبھی کبھی کسی بڑے کاغذ یا گتے پر بڑے خوبصورت انداز میں کوئی شعر یا کوئی حکیمانہ مقولہ لکھ کر اپنا یہ شوق پورا کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے اسی مشغلے میں مصروف تھے کہ بیچ میں کسی کام سے اُٹھ کر چلے گئے، اور میں نے بھی وہاں پہنچ کر ان کی نقل اُتارنے کی کوشش میں روشنائی کی دوات کو اس بری طرح ہاتھ لگایا کہ وہ الٹی ہوگئی اور ساری روشنائی بہ کر نیچے پھیل گئی۔ بھائی جان کا رعب تو دل میں بیٹھا ہوا تھا لیکن یہ یک طرفہ قسم کا رعب تھا ان کی طرف سے مجھے مارنے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ اس حرکت کے نتیجے میں مجھے یہ تو یقین ہوگیا کہ جس چیز کا رعب دل پر طاری رہا ہے، آج اُس کا عملی مظاہرہ ضرور ہو کر رہے گا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ مظاہرہ کتنی شدت کا ہوسکتا ہے، تا کہ ذہن کو اُس کے لئے تیار رکھوں۔ چنانچہ روشنائی وغیرہ کو وہیں چھوڑ کر میں اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے پاس روانہ ہوگیا، اور اُن میں سے ہر ایک سے پوچھتا پھرا کہ: "بھائی جان کا ہاتھ کیسا پڑتا ہے؟" (یعنی جب وہ تھپڑ مارتے ہیں تو وہ کتنی زور کا ہوتا ہے؟) میرے بہن بھائی جنہیں میری اس حرکت کا علم نہیں تھا، حیران تھے کہ مجھے بھائی جان کے تھپڑ کی تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے؟ پھر جب میں نے اُنہیں واقعہ بتایا، تو سب خوب ہنسے، یہاں تک کہ بھائی جان کو بھی جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے بھی میری اس تحقیق کا عملی جواب دینے کے بجائے اُس کا لطف لیا، اور پھر میرا یہ جملہ ایک لطیفہ بن گیا جسے میری ذہانتوں کی فہرست میں ایک اضافے کے طور پر مجلسوں میں بیان کیا جاتا تھا۔

بعد میں تو بھائی جان نے اپنے آپ سے اتنا بے تکلف کرلیا تھا کہ وہ بے تکلفی دوستی کی حد تک پہنچ

گئی تھی، اور کبھی کبھی تو ان سے مذاق کی کوئی بات کرنے کے بعد مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی کہ کہیں حدود سے تجاوز نہ ہوگیا ہو۔ اس بے تکلفی کی وجہ سے ان کے ساتھ جو وقت بھی ملتا، وہ ہمیں ایک نعمت معلوم ہوتا تھا۔ وہ دارالعلوم میں ہماری مصروفیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، اور قیمتی مشوروں سے سرفراز فرماتے تھے۔ جب سے میں نے لکھنا شروع کیا، وہ میری ہر تحریر کو اہتمام سے پڑھتے، اور اس پر تبصرے بھی فرماتے، اور مشورے بھی دیتے۔ میں نے اپنی کتاب "حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق" انہی کی فرمائش پر لکھی تھی، جس کا تذکرہ ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا(۱)۔

جاری ہے....

---

(۱) ان کی وفات پر میں نے البلاغ میں ان کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو میری کتاب "نقوش رفتگاں" میں شائع ہو چکا ہے۔

اعتذار

البلاغ صفر المظفر ۱۴۳۹ھ (نومبر ۲۰۱۷ء) کے گذشتہ شمارے میں نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کے سوانحی سلسلے "یادیں" میں ص: ۱۶ پر حضرت والا مدظلہم کا سن پیدائش ۱۳۴۲ھ غلط درج ہوگیا ہے، صحیح سن پیدائش ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) ہے، قارئین سے تصحیح فرمانے کی درخواست ہے ------------------------(ادارہ)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیسری قسط)

بھائی جان (حضرت محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ) کے بارے میں چند مزید خصوصیات کا تذکرہ کئے بغیر بات مکمل نہیں ہوگی۔ خصوصاً یہ بات کہ ہم بھائیوں میں یہ سعادت صرف بھائی جان ہی کے حصے میں آئی کہ انہوں نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، قدس سرہ، کی خدمت وصحبت بلکہ بیعت کا شرف بھی حاصل کیا، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، انہیں ہر سال تھانہ بھون ساتھ لے جاتے تھے، اور حضرت تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، ان سے بہت محبت فرماتے تھے، بارہا حضرت نے انہیں سر کی مالش کرنے کا موقع دیا۔ حضرتؒ پان کھانے کے عادی نہیں تھے، لیکن کھانے کے بعد بغیر کتھے چونے کا سادہ پتہ کبھی کبھی تناول فرمالیا کرتے تھے۔ بھائی جان اکثر ان کو بروقت پان پیش کردیتے تھے، اس لئے حضرت نے ازراہِ مزاح ان کا نام "پانی" رکھا ہوا تھا۔ جب پان کی ضرورت ہوتی اور بھائی جان پاس نہ ہوتے تو فرماتے، "وہ ہمارا پانی کہاں گیا"؟ ایک بہت بڑی سعادت انہیں یہ حاصل ہوئی کہ ایک روز انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ "مجھے پند نامہ عطار پڑھا دیجئے"۔ حضرت، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس اتنا وقت کہاں تھا کہ وہ کسی بچے کو پند نامہ پڑھائیں لیکن بھائی جان پر غیر معمولی شفقت ومحبت کے پیش نظر آپ نے اس معصومانہ درخواست کو ٹھکرانا پسند نہیں فرمایا اور جواب دیا کہ "اور تو میرے پاس کوئی وقت نہیں ہے لیکن عصر کے بعد میں ہوا خوری کے لئے جاتا ہوں، اس وقت کتاب لے کر میرے ساتھ چلا کرو میں اس فرصت میں تمہیں پند نامہ پڑھادوں گا"۔

چنانچہ عصر کے بعد بھائی جان کتاب لے کر پہنچ گئے اور درس شروع ہوگیا۔ اس وقت حضرت کے اکابر خلفاء بھی موجود تھے، انہیں اطلاع ہوئی تو انہیں بڑا رشک آیا۔ اور انہوں نے بھی اس درس میں شامل ہونے کی اجازت چاہی۔ حضرتؒ نے اجازت دیدی اس کے بعد اس پر کیف درس میں حضرت

والد صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحبؒ بھی شامل ہوگئے اور یہ درس رمضان بھر میں جاری رہا۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھائی جان سے اکثر اس واقعہ کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ "تم تو ہمارے ہم سبق ہو اور تمہارے طفیل ہمیں حضرتؒ سے پند نامہ پڑھنے کی سعادت ملی ہے"۔

بھائی جان نے جب بچپن میں لکھنا سیکھا تو حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے ان سے سب سے پہلا خط حضرت حکیم الامت، رحمۃ اللہ علیہ، کے نام لکھوایا۔ اس خط کا جو جواب حضرتؒ نے مرحمت فرمایا وہ ایک مستقل سبق بھی ہے اور بھائی جان کے لئے ایک عظیم سرمایۂ سعادت بھی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ: "برخوردار سلمہ السلام علیکم مع الدعا، تمہارے حروف دیکھ کر دل خوش ہوا۔ تمہاری علمی وعملی ترقی کی دعا کرتا ہوں۔ خط ذرا اور صاف کرلو، اس سے مکتوب الیہ کو بھی سہولت وراحت ہوتی ہے اس نیت سے ثواب بھی ملتا ہے۔ دیکھو! میں تم کو بچپن سے صوفی بنا رہا ہوں، دردسر کا یہ تعویذ سر میں باندھ لو، سب گھر والوں کو سلام ودعا۔ اشرف علی"۔

عام لوگ سوچیں گے کہ خط صاف کرنے کا تصوّف سے کیا واسطہ؟ لیکن یہ حکیم الامت حضرت تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کی خصوصیت تھی کہ انہوں نے شریعت وطریقت کے اہم ترین تقاضوں یعنی آداب معاشرت، اخلاق اور صفائی معاملات کی طرف اپنے متعلقین کو اس وقت بطور خاص متوجہ فرمایا جب دین کے ان شعبوں کو دین سے خارج سمجھ لیا گیا تھا، اور اوراد و وظائف یا نوافل میں سستی پر حضرتؒ نے کبھی عتاب نہیں فرمایا، لیکن اگر کوئی شخص آداب معاشرت یا معاملات وغیرہ میں کوتاہی یا ایسا کام کرتا جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچے تو اس پر سخت گرفت فرماتے تھے۔

حضرتؒ کی اسی تعلیم وتربیت کا اثر تھا کہ بھائی جان ہمیشہ اپنی نقل وحرکت میں اس بات کا خاص اہتمام کرتے تھے کہ اس سے کسی دوسرے کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

حضرت حکیم الامتؒ سے بھائی جان کے بیعت ہونے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ بھائی جان اس وقت تک نابالغ تھے، حضرتؒ کی شفقتوں اور عنایتوں کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایک دن خود ہی حضرتؒ سے بیعت کی درخواست کی۔ حضرت عموماً بلوغ سے پہلے بیعت نہیں فرماتے تھے، اس لئے ازراہ خوش طبعی فرمایا

کہ بیعت خالی ہاتھ تھوڑے ہی ہوتے ہیں، امرود لے کر آؤ تو بیعت کریں۔ وہ موسم ایسا تھا کہ بازار میں امرود نہیں آرہے تھے، اس لئے حضرتؒ نے یہ بات انہیں ٹالنے کے لئے فرمائی تھی اور خیال یہ تھا کہ اس موسم میں وہ امرود نہیں لاسکیں گے۔ لیکن بھائی جان نہ جانے کہاں سے تلاش کرکے امرود لے آئے؟ حضرتؒ نے دیکھا تو بڑا تعجب ہوا اور چونکہ وعدہ فرما چکے تھے اس لئے بیعت کے لئے راضی ہوگئے۔ لیکن حضرتؒ کے برابر شرعی احکام کی رعایت کون کرے گا؟ بھائی جان اس وقت نابالغ تھے اور نابالغ سے ہدیہ قبول کرنا والدین کی اجازت کے بغیر شرعاً جائز نہیں تھا، اس لئے بھائی جان کو واپس بھیجا کہ جاکر اپنے والدین سے پوچھ کر آؤ، بھائی جان اجازت لے آئے، تو اس کے بعد بیعت فرمایا۔

اس واقعہ کے بعد ۷ر ربیع الثانی ۱۳۵۶ھ کو حضرت والد صاحب مدظلہم نے حضرت حکیم الامت کے نام ایک خط تحریر فرمایا جس میں لکھا کہ:

"محمد زکی سلمہ کے لئے الحمدللہ مرید ہونے کی کھلی ہوئی برکت ظاہر ہوئی کہ نماز کا بہت ہی شوق ہوگیا، عشاء کی نماز کے وقت پہلے سو جاتا تھا اب بیٹھا ہوا انتظار کرتا رہتا ہے"۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"ماشاءاللہ! دعا کیجئے مجھ کو بھی اس بے گناہ بچے کی برکت نصیب ہو اور ہمت عمل اور استقامت واخلاص عطا ہو"۔

بھائی جان کے بچپن کے بہت سے معاملات حضرت حکیم الامتؒ ہی کے مشوروں سے انجام پائے۔ ۱۰ر رجب ۱۳۵۵ھ کے مکتوب میں حضرت والد صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ کو لکھا:

"محمد زکی سلمہ سال بھر سے زائد ہوا کہ اس کو حفظ قرآن مجید شروع کرادیا تھا مگر کچھ عرصہ چھ ماہ سے وہ بیمار چلا جاتا ہے۔۔۔۔ اب بعض اقرباء کا مشورہ یہ ہے کہ حفظ قرآن کی محنت یہ برداشت نہیں کرسکتا۔۔۔ سخت تردد میں ہوں، کیا کروں"۔

حضرتؒ نے جواب دیا:

"اگر زکی میرا بچہ ہوتا تو حفظ چھڑا دیتا، پھر جب کسی موقع پر قوت ہوتی (گو بعد فراغ درسیات سہی) پھر تکمیل کرادیتا۔ اس وقت بہت سہولت ہوجاتی ہے"۔

اس طرح بھائی جان اٹھارہ سال کی عمر تک حضرت حکیم الامت ،رحمۃ اللہ علیہ، کی ہدایات اور عنایات سے فیضیاب ہوتے رہے۔ اسی دوران حضرت والد صاحبؒ کو ایک مرتبہ ایک خط حضرت تھانویؒ کے پاس تھانہ بھون بھیجنا تھا۔ والد صاحب چاہتے تھے کہ یہ خط آج ہی حضرتؒ کو پہنچ جائے۔ ادھر سہارنپور سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی میں سفر کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ بھائی جان نے یہ خدمت اپنے ذمہ لی، دیوبند سے مظفر نگر اور مظفر نگر سے شاملی پہنچے، خیال تھا کہ شاملی سے تھانہ بھون جانے والی گاڑی مل جائے گی، مگر شاملی پہنچے تو گاڑی نکل چکی تھی۔ بھائی جان نے وہاں سے ایک سائیکل کرائے پر لی اور شاملی سے تھانہ بھون تک کا طویل راستہ اسی سائیکل پر طے کر کے مکتوب بروقت حضرتؒ کو پہنچادیا۔

حضرت تھانویؒ کے علاوہ دیوبند میں حضرت میاں صاحبؒ (حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحبؒ) بھی بھائی جان سے نہایت شفقت فرماتے تھے، اور بھائی جان کو ان کی خدمت وصحبت کا بھی خوب خوب موقع ملا۔ انہیں بچپن ہی سے بزرگوں سے فیضیاب ہونے اور ان کی خدمت وصحبت سے فائدہ اٹھانے کا خاص ذوق تھا اور اس لحاظ سے انہیں یہ شعر کہنے کا واقعی حق پہنچتا تھا کہ ؎

اس وقت سے میں تیرا پرستار حسن ہوں
دل کو مرے شعور محبت بھی جب نہ تھا

اور بزرگوں کی اسی صحبت کا اثر تھا کہ ان پر دین اور فہم دین کا ایک ایسا پختہ رنگ چڑھا ہوا محسوس ہوتا تھا جو کسی ماحول میں کبھی مغلوب یا مرعوب نہیں ہوا، وہ جس ماحول میں رہے ہمیشہ اچھا رنگ دوسروں پر چھوڑ کر آئے ؎

رنگیں ہے ہم سے قصہ مہر و وفا کہ ہم
اپنی وفا کا رنگ ترے رخ پر مل گئے

چوتھے نمبر پر ہماری بہن حسیبہ خاتون [1] (رحمہا اللہ تعالی) تھیں جنہیں ہم "بی جان" کہتے

---

(۱) ان کی وفات پر میں نے البلاغ میں ان کا تذکرہ قدرے تفصیل کے ساتھ کیا ہے جو میری کتاب "نقوش رفتگاں" میں شائع ہو چکا ہے۔

Scanned by CamScanner

تھے۔اور پانچویں نمبر پر محترمہ رقیہ خاتون صاحبہ مدظلہا جنکو ہم چھوٹی آپا کہتے ہیں۔عمر میں یہ دونوں بھی مجھ سے کافی بڑی تھیں لیکن اُس وقت غیر شادی شدہ تھیں اور انہوں نے شروع ہی سے ہمیں اپنے ساتھ اتنا بے تکلف کیا ہوا تھا کہ عمر کے بڑے تفاوت کے باوجود ان سے ہمیشہ دوستی کا سا رشتہ قائم رہا۔ان بہنوں کی بھی تعلیم کی کل کائنات پھوپی امۃ الحنان صاحبہ کے مکتب (جس کا ذکر میں ان شاء اللہ آگے کروں گا) اور گھریلو طور پر "بہشتی زیور" کی حد تک محدود تھی، لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے حسن تربیت کے نتیجے میں ان کا علمی اور ادبی ذوق یقیناً یونیورسٹیوں کی پڑھی ہوئی خواتین سے بھی زیادہ تھا۔ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور نہ صرف یہ کہ سخن فہمی کی صلاحیت غیر معمولی تھی بلکہ وہ خود اعلیٰ درجے کے شعر کہتی تھیں۔محض نمونے کیلئے ان میں سے بڑی بہن محترمہ حسیبہ خاتون مرحومہ کے یہ شعر ملاحظہ فرمایئے:

ہمیں تو آتا ہے رونا مآلِ گلشن پر
بھلا یہ ہنستے ہیں کیوں گلستاں،نہیں معلوم

گذر رہی ہیں نشیمن سے بے سلام و پیام
خفا خفا سی ہیں کیوں بجلیاں نہیں معلوم

اور محترمہ رقیہ خاتون صاحبہ مدظلہا کے یہ شعر:

ضبطِ غم پر بھی ڈبڈبا ہی گئی
آنکھ دل سے شکست کھا ہی گئی

سنتے سنتے مرا فسانۂ غم
چاندتاروں کو نیند آ ہی گئی

اس چھوٹی سی عمر میں میرے گھر کے زیادہ تر اوقات انہی دو بہنوں کے ساتھ گذرتے تھے، کیونکہ کپڑے بدلنے سے لیکر میرے ناز نخرے اٹھانے تک یہی میری دیکھ بھال پر مامور تھیں، اس لئے ان کی صحبت نے بچپن کے اسی ابتدائی زمانے میں مجھ میں ادبی ذوق کا بیج ڈال دیا تھا جس کا کچھ مزید حال میں ان شاء اللہ تعالیٰ آگے ذکر کروں گا۔

ان کے بعد جناب محمد رضی عثمانی صاحب (رحمہ اللہ تعالی) تھے جو اُس وقت دارالعلوم دیوبند کے درجۂ فارسی میں پڑھتے تھے۔ وہ طبعی طور پر بچوں سے نہ صرف بہت محبت کرتے تھے بلکہ ان کی نفسیات کی باریکیوں سے بھی خوب واقف تھے۔ انہوں نے مجھے بہت سر چڑھا رکھا تھا، اور میری ہر خواہش کو پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ہم تین چھوٹے بھائی اُنہیں "بھائی رضی" کہتے تھے، اور اُس وقت میں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں "بھائی لجی"! لیکن اگر کسی وقت وہ میرا کوئی مطالبہ پورا نہ کرسکتے، تو میں اُن سے ناراضی کا برملا اس طرح اظہار بھی کردیتا تھا کہ اُنہیں خطاب کرتے ہوئے بھائی کا لفظ حذف کر کے براہ راست اُن کا نام لے لیتا، اور غصے کے لہجے میں کہتا: "لجی" !۔

اُنہیں ایک مرتبہ یہ معلوم ہوگیا کہ میں کبوتر دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں۔ اُن کے ایک دوست نے جو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، کے بھتیجے تھے، کبوتر پال رکھے تھے، بھائی صاحب نے شاید اُن سے فرمائش کی ہوگی کہ وہ میرے لئے بھی ایک کبوتر لے آئیں۔ چنانچہ ایک دن وہ اپنے ہاتھ میں کبوتر لے کر دروازے پر آئے۔ بھائی صاحب مجھے لے کر خوشی خوشی دروازے پر گئے، اور میں نے جب کبوتر دیکھا، اور یہ معلوم ہوا کہ یہ میرے لئے آیا ہے تو میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا، اور مجھے بچپن کی وہ خوشی اب تک یاد ہے۔

اللہ تعالی بھائی صاحب کو اپنی مکمل مغفرت کا مورد بنائے۔ وہ خود بھی اُس وقت کم عمر تھے۔ کبھی کبھی مجھے خوش کرنے کیلئے وہ کاغذ پر مختلف تصویریں بناتے تھے۔ ایک مرتبہ اُنہوں نے کاغذ پر ایک امرود، ایک لیموں، ایک چڑیا، ایک گدھے اور ایک کوے کی تصویر بنادی۔ شاید مجھے کسی طرح یہ معلوم ہوگیا تھا کہ جانوروں کی تصویر بنانے سے والد صاحبؒ ناراض ہوں گے۔ لہٰذا جب کبھی میں اُن سے ناراض ہوتا، تو ان کا نام لے کر خطاب کرتے ہوئے اُنہیں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں کہتا: "املود، نیموں، چلیا، ددھا، توا (امرود، لیموں، چڑیا، گدھا، کوا) شاید اس میں یہ دھمکی پنہاں ہوتی تھی کہ اگر آپ نے مجھے راضی نہ کیا، تو میں والد صاحبؒ سے شکایت کردوں گا کہ انہوں نے چڑیا، گدھے اور کوے کی تصویر بنائی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ میری گالی بن گئی اور صرف اُنہی سے نہیں بلکہ جس کسی سے مجھے کوئی ناراضگی ہوتی تو میں اُسے غصے کے لہجے میں یہی کہتا: "املود، نیموں، چلیا، ددھا، توا" یہ میری بدترین گالی تھی جو میں کسی

بچے سے لڑائی کے دوران اُس کو دیا کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ بھائی رضی صاحب پر اپنی مغفرت ورضوان کی بارش برسائے، مجھ سے ان کے عشق کا عالم یہ تھا کہ جب حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی، قدس سرہ، کی جگہ بخاری شریف پڑھانے کے لئے دارالعلوم ڈابھیل بلایا گیا، تو حضرت والد صاحبؒ اُنہیں بھی اپنے ساتھ ڈابھیل لے گئے۔ ڈابھیل میں کئی مہینے قیام رہا۔ اس دوران وہ میری یاد میں بہت افسردہ رہتے اور انہوں نے "البلاغ" میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر جو مضمون لکھا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں:

> احقر ان دنوں قرآن کریم ناظرہ پڑھتا تھا، اور وہیں درجۂ قرآن میں داخلہ لے لیا تھا۔ مدرسے سے چھٹی کے بعد اکثر خاموش خاموش رہتا تھا۔ نہ کھانے میں دل تھا، اور نہ کسی اور کام میں۔ اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ آج کے مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ اُس وقت دو یا اڑھائی سال کے تھے، اور احقر کو ان سے اس قدر محبت اور تعلق خاطر تھا کہ دیوبند میں ایک گھنٹہ بھی اُس سے علیحدہ رہنا شاق گذرتا تھا، چنانچہ ڈابھیل میں بھی ہر وقت بس وہی یاد آتے رہتے اور جب کوئی اور بس نہ چلتا تو مدرسے کے درودیوار پر اُن کا نام لکھتا رہتا تھا۔ (مفتیٔ اعظم نمبر ۲: ۱۰۴۴)

بھائی صاحب کی ایک بڑی قربانی یہ تھی کہ پاکستان ہجرت کے بعد ہم سب بھائی تو چھوٹے تھے، اور حضرت والد صاحبؒ کا ہاتھ نہیں بٹا سکتے تھے، وہی تنہا ایسی عمر میں تھے کہ کسی معاشی سرگرمی میں ان کے کام آسکیں، چنانچہ وہ ابتدائی تعلیم کے بعد والد صاحبؒ کے تجارتی کتب خانے دارالاشاعت کے ناظم بن کر اسی کے لئے وقف ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تعلیم آگے جاری نہ رکھ سکے، لیکن اپنے مطالعے کے ذوق سے بفضلہ تعالیٰ انہوں نے اپنی معلومات میں اضافے کا سلسلہ آخر وقت تک جاری رکھا، اور عملی زندگی میں وہ دینی معلومات کے اعتبار سے بھی بہت سوں کے لئے قابل رشک تھے۔ حرمین شریفین کی حاضری کا بڑا ذوق تھا، اور تقریباً ہر سال نہایت والہیت کے ساتھ حج یا عمرے کے لئے جانے کا معمول تھا۔

پھر ساتویں نمبر پر جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم ہیں وہ دارالعلوم دیوبند میں قرآن کریم حفظ کر رہے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت وفطانت، حاضر جوابی اور ظرافت طبع کے خداداد اوصاف عطا

فرمائے ہیں وہ جب شعر وشاعری کے کوچے میں داخل ہوئے، تو اس میں بھی امتیاز حاصل کیا، تدریس کے شعبے میں گئے، تو کراچی گرامر اسکول اور کراچی یونی ورسٹی میں اسلامیات پڑھانے کے دوران انہوں نے بہت سے لوگوں کی زندگیاں بدلیں۔ انگریزی میں ایم اے کیا، تو اس صلاحیت سے متعدد دینی کتابوں کے انگریزی ترجمے کی خدمت انجام دی۔ "بائبل سے قرآن تک "اور مرزائیوں کے بارے میں "امت مسلمہ کا موقف " کا انگریزی ترجمہ انہی کے قلم سے ہوا ہے۔البلاغ انگریزی اب بھی انہی کی ادارت میں نکلتا ہے۔ان کی ذہانت وفطانت کا شاہکار ان کی تالیف "ہادئ عالم صلی اللہ علیہ وسلم" اب شہرۂ آفاق ہوچکی ہے۔اس کتاب میں انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری سیرت اس اہتمام سے لکھی ہے کہ اس میں کوئی لفظ نقطوں والا استعمال نہیں ہوا، تقریباً چار سو صفحات کی یہ سیرت نقطوں سے خالی ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اسے عالمی ریکارڈ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔نقطوں کے بغیر اردو میں کوئی لمبی تحریر، خاص طور پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ لکھنا کتنا مشکل کام ہے، اس کی کچھ تفصیل میں نے اس کتاب کے مقدمے میں بیان کی ہے۔لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق سے یہ کارنامہ چند مہینوں میں انجام دیا، اور ایک ریکارڈ قائم کردیا۔ ان کی اور بھی بہت سی کتابیں اور مضامین ان کی وسعت مطالعہ اور علمی، دینی اور ادبی ذوق کی آئینہ دار ہیں۔اللہ تعالیٰ نے انہیں انتہائی متواضع اور سادگی کا پیکر بنایا ہے۔نام ونمود سے کوسوں دور رہ کر وہ اب بھی اپنے مضامین کے ذریعے علم ودین کی خدمت انجام دیتے رہتے ہیں۔

آٹھویں نمبر پر میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم مجھ سے سات سال بڑے ہیں، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں بچپن سے آج تک اس طرح ساتھ رکھا ہے کہ نہ صرف گھر کے ماحول میں، بلکہ دینی اور ملکی حلقوں میں بھی ہم دونوں کے نام ایک ساتھ لازم وملزوم کی طرح لئے جاتے رہے ہیں۔ہم سب بہن بھائیوں میں مجھے سب سے طویل رفاقت کا اعزاز انہی کے ساتھ حاصل ہوا جس سے میں نے بہت کچھ سیکھا، مگر طبیعت کے بے ڈھنگ انداز نے اس پر عمل کرنے میں بکثرت رکاوٹ پیدا کی، وہ نہایت منظم اور بااصول زندگی کے حامل، اور میں بدحواس اور بے ڈھنگ، وہ ہرکام اطمینان اور وقار سے کرنے کے عادی، اور میں جلد باز، ان کے گھر سے لیکر دفتر تک ہر چیز باقرینہ،

اور میں بدسلیقہ، غرض میری ان بے وقوفیوں کو انہوں نے جس صبر وضبط کے ساتھ برداشت کیا، یہ انہی کا حوصلہ ہے، یہ اختلاف طبائع جس کا قابل اعتراض حصہ یقیناً میرے بے ہنگم اندازِ زندگی ہی کی وجہ سے تھا، اسے ان کے تحمل اور بڑائی نے کبھی قابل ذکر ناگواری میں تبدیل ہونے نہیں دیا، اور اس میں انہی کی بڑائی کا سب سے زیادہ دخل ہے کہ تعلیم کے زمانے سے لے کر تدریس، افتاء اور پھر ملکی معاملات تک مجھے الحمدللہ تعالیٰ ان کے ساتھ تقریباً پوری ہم آہنگی کے ساتھ ان سے استفادے کا موقع ملا، اور ہمیشہ ان کی شفقت میسر آئی۔۔ علماء کرام نے انہیں حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بعد "مفتیٔ اعظم پاکستان" کا لقب دیا، اور ان کی اردو عربی تصانیف، فتاویٰ اور ان کے دروس کی منضبط، واضح اور نپی تلی تقریریں اور ان کے مواعظ اس لقب کی صحت پر شاہد عدل ہیں۔ آج پاکستان میں جب سنجیدہ، صاحب رائے، معتدل اور مخلص علماء کی کوئی فہرست بنتی ہے، تو الحمدللہ ان کا نام نامی سرفہرست ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی تعمیر وترقی کے لئے انہوں نے اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی جس طرح وقف کی، آج دارالعلوم کے در و دیوار اور اس کا ایک ایک نشیب وفراز اس کی گواہی دے رہا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ دارالعلوم کی تمام عمارتیں، ایک دو کو چھوڑ کر سب براہ راست ان کی نگرانی میں بنیں، اور ان کی ایک ایک اینٹ پر انہوں نے بذات خود محنت فرمائی ہے، تو غالباً اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کا سایۂ رحمت بعافیت تمام ہم پر سلامت رکھے، وہ صرف میرے لئے نہیں، پورے خاندان اور پورے دارالعلوم کے لئے ایک شفیق باپ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ملک وملت کے مقاصد میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چوتھی قسط)

یہ تھا میرے آٹھ بہن بھائیوں کا مختصر تذکرہ، میں ان سب سے چھوٹا ہوں، اور جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، میری پیدائش ۵رشوال ۱۳۶۲ھ کو ہوئی تھی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کی وفات تقریباً تین مہینے پہلے ہوچکی تھی۔ اس لئے میرے تمام بہن بھائیوں کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہوں نے یا تو حضرت، رحمۃ اللہ علیہ، کی بذات خود زیارت کی تھی، یا کم از کم حضرتؒ کی مبارک نگاہیں ان پر پڑی تھیں۔ میں ان دونوں سعادتوں سے محروم رہا، نیز ہمارے تمام بہن بھائیوں کے نام بھی حضرت قدس سرہ نے رکھے تھے۔ میرا نام اگرچہ براہ راست حضرتؒ کی طرف سے رکھنے کا سوال نہیں تھا، لیکن جب حضرت والد صاحبؒ کی درخواست پر میرے کسی بڑے بھائی کا نام حضرتؒ تجویز فرماتے، تو کئی ہم قافیہ نام تجویز فرمادیتے تھے کہ ان میں سے کوئی نام رکھ لیا جائے۔ ان کئی ناموں میں ایک نام "محمد تقی" بھی تھا جو مجھ سے پہلے کسی اور بھائی کا نہیں رکھا گیا تھا۔ بظاہر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے میرا نام اسی فہرست میں سے رکھا جو حضرتؒ کی تجویز کی ہوئی تھی، اور چونکہ حضرت والد صاحبؒ حضرت حکیم الامتؒ کی وفات کے بعد عموماً اپنے محبوب استاذ و مربی حضرت میاں صاحب (یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی، رحمۃ اللہ علیہ) سے مشورے کیا کرتے تھے، اور وہ صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، اس لئے غالب گمان یہ ہے کہ میرا نام رکھنے میں ان کا مشورہ بھی شامل ہوگا۔

میرے تینوں بڑے بھائی دارالعلوم دیوبند میں پڑھتے تھے۔ میرا تو اس وقت قاعدۂ بغدادی بھی باضابطہ شروع نہیں ہوا تھا، اس لئے دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کا سوال ہی کیا تھا؟ لیکن کبھی کبھی اپنے ان تین بڑے بھائیوں کے ساتھ میں بھی دارالعلوم چلا جاتا۔ اس لئے اُس وقت کے دارالعلوم کا ایک دھندلا سا نقش

ذہن پر ضرور بیٹھ گیا تھا۔

طفلی و آغوش مادر خوش بہارے بودہ است

ہمارے گھر کی پچھلی طرف (یعنی مغربی سمت میں) ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا گھر تھا جس میں ہماری دادی صاحبہ، رحمۃ اللہ علیہا (جو حضرت گنگوہی قدس سرہ سے بیعت تھیں) رہا کرتی تھیں، ہمارے اور اُن کے گھر کے درمیان ایک سرنگ نما راستہ تھا، جسے ہم "نیم دری" کہا کرتے تھے۔ اس جدّی مکان کے بعد ہمارے ہی خاندان کے مختلف گھر تھے، جن کے درمیان ایک پتلی سی گلی ایک نسبۃً کشادہ علاقے تک پہنچتی تھی جسے ہم "چوک" کہتے تھے، اور وہ ہم بچوں میں کھیل کے میدان کے طور پر مشہور تھا، اور ہمارے اُس وقت کے تصور کے لحاظ سے وہ ایک وسیع اسٹیڈیم سے کم نہ تھا جس میں محلے بھر کے بچے وہ کھیل کھیلا کرتے تھے جنہیں کھیلنے کیلئے نہ کوئی پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت تھی، اور نہ کسی کوچ سے تربیت لینی پڑتی تھی۔ ہمارے بڑے بھائی بھی عموماً عصر کے بعد اسی چوک میں دیسی قسم کے کھیل کھیلتے تھے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، تین چار سال کے ایک نادان بچے کی کُل کائنات گھر سے شروع ہو کر اس چوک پر ختم ہو جاتی تھی، جہاں میں خود کھیلنے سے زیادہ دوسروں کو کھیلتے دیکھ کر ہی دل خوش کر لیا کرتا تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میری تین بھانجیاں اور ایک بھانجے مجھ سے عمر میں ایک سے لے کر تین سال تک بڑے تھے، اس لئے خاندان سے باہر کوئی دوست تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی، انہی بھانجے بھانجیوں سے دوستی کا سا تعلق تھا، اور بچپن کے کھیلوں کا رشتہ انہی کے ساتھ قائم ہو گیا تھا، اس زمانے کے کھیلوں میں آنکھ مچولی وغیرہ ہی ایسے کھیل تھے جو ہم اپنی عمر کے لحاظ سے کھیل سکتے تھے، اور اُس کے لئے گھر ہی کافی تھا، اُس کے لئے "چوک" کا اسٹیڈیم استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ گلی ڈنڈا وغیرہ ہماری بساط سے آگے کی بات تھی۔ ویسے بھی میں کسی کھیل میں کوئی قابل ذکر مہارت کبھی حاصل نہ کر سکا۔

میں اپنے نو بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا، اور شاید اس وجہ سے سب کا لاڈلا بھی۔ اب معلوم نہیں کہ یہ اس لاڈ پیار کا کرشمہ تھا، یا واقعی اس بات میں کوئی حقیقت بھی تھی کہ میرے والدین سے لے کر بہن بھائیوں تک سب کے سب اتنی چھوٹی سی عمر میں میری ذہانت کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے۔ اور دلیل میں میرے

جو واقعات پیش کئے جاتے تھے، وہ مجھے اب تک اس طرح یاد ہیں جیسے وہ آج کی بات ہو۔ ان میں سے چند واقعات جن سے شاید آپ بھی لطف اندوز ہوں، اس وقت قلم پر آنے کے لئے بیتاب معلوم ہورہے ہیں:

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت و رضوان کی بارشیں برسائے ،وہ اگرچہ دارالعلوم دیوبند جیسے ادارے کے سب سے بڑے مفتی تھے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں علم و فضل کے جس مقام سے نوازا تھا، اُس کا شہرہ پورے ملک میں تھا، اور ان کے جاں نثار شاگردان کی ہر خدمت کو اپنے لئے بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے، لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے مزاج میں اس قدر تواضع اور سادگی تھی کہ گھر کا سودا سلف لینے کیلئے خود بازار جایا کرتے تھے، اور کبھی کبھی گھر کے استعمال کی کوئی چیز خریدتے، تو اُسے اپنے دامن ہی میں رکھ کرلے آتے تھے۔ اُس وقت میں اس قابل ہو چکا تھا کہ والد صاحبؒ کی انگلی پکڑ کر ان کے ساتھ بازار جاسکوں۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو واپسی میں وہ مجھے بھی میرے مطلب کی کوئی چیز دلا دیتے۔ چاکلیٹوں اور ٹافیوں کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا، اس لئے ہماری پسندیدہ چیزیں کیا تھیں؟ بھنے ہوئے چنے، مکئی کی کھیلیں، چاول کے مرمرے، ملائی کا برف (جو آئس کریم کی ایک دیسی شکل تھی) اور دیسی ہی قسم کی مٹھائیاں! ذرا ترقی ہوئی تو ایک پیسے میں ایک چاکلیٹ نما چھوٹی سی مٹھائی ملنے لگی تھی، جس کی شکل سنگترے کی ایک قاش جیسی ہوتی تھی، اور اُسے ہم سنگترے کی مٹھائی کہا کرتے تھے۔ اب خیال آتا ہے کہ اُس دور میں بچوں کی خواہشات تمام تر ایسی چیزوں سے متعلق ہوتی تھیں، جو صحت کیلئے فائدہ مند اور قدرتی خصوصیات کی حامل ہوتی تھیں اور ہر جگہ سستے داموں مل جایا کرتی تھیں۔ بچوں کو خوش کرنے کیلئے جو مضر صحت اور مہنگی چیزیں آج ایجاد ہوگئی ہیں، ان کا کوئی تصور نہیں تھا۔

بہر کیف! حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جب ہمیں اپنے ساتھ کہیں لے جاتے، تو مذکورہ بالا چیزوں میں سے کوئی چیز ہمیں بھی دلا دیتے، اور اس کے نتیجے میں جانے آنے کی محنت بھی وصول ہوجاتی، اور بازار کی سیر اُس کے علاوہ تھی۔ لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا ہمیں کوئی چیز دلا دینا خود اُنہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس بات کا کوئی رواج نہیں تھا کہ اولاد اپنی طرف سے کوئی چیز دلوانے کی فرمائش یا اس کا مطالبہ کرے۔

چنانچہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بازار سے گھر کے لئے آلو لے کر جارہے تھے ۔ میں بھی ان کی انگلی پکڑے ان کے ساتھ تھا۔ اتفاق سے اُس دن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ ،مجھے بازار سے کچھ دلانا بھول گئے ۔ ذہن تو اس طرف لگا ہوا ہی تھا کہ ہمیں بھی کوئی چیز ملنی چاہئے، لیکن جب نہ ملی، اور بازار ختم ہوکر والد صاحب اُس گلی میں مڑنے لگے جس میں ہمارے مطلب کی کوئی دوکان نہ تھی، تو اندازہ ہوگیا کہ اب کچھ ملنے والا نہیں ہے ۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا، اپنی زبان سے فرمائش کرنا تو معمول اور رواج کے خلاف تھا، دوسری طرف حضرت والد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کو متوجہ کرنے کو بھی دل چاہ رہا تھا کہ آپ کچھ بھولے جارہے ہیں ۔ ان دو متضاد باتوں کا حل میرے اس بچپن کے ذہن نے یہ نکالا کہ میں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے کہا: "اباجی! میری گود میں آلو ہی ڈال دو"۔ حضرت والد صاحبؒ میری زبان سے یہ جملہ سن کر بیساختہ ہنس پڑے، اور پھر آلو کے بجائے میرے مطلب کی کوئی چیز مجھے دلا کر گھر واپس پہنچے، اور سب گھر والوں کو میری یہ بات سنائی جو بعد میں ایک لطیفہ بن گئی۔

اسی طرح دیوبند میں بدھ کے دن ایک بازار لگا کرتا تھا، جس میں آس پاس کے گاؤں والے اپنا اپنا سامان لاکر بیچا کرتے تھے، اور اس بازار میں عام طور پر گھریلو استعمال کی چیزیں سستے داموں مل جایا کرتی تھیں ۔ اسے "بدھ بازار" کہا جاتا تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ایک مرتبہ اُس بازار میں جاتے ہوئے مجھے بھی ساتھ لے گئے ۔ اب یاد نہیں کہ انہوں نے وہاں سے کیا چیزیں خریدیں، وہ بازار بھی زیادہ تر گھریلو استعمال کی اجناس کا بازار تھا، اور اس میں بچوں کے مطلب کی کوئی خاص چیز تھی بھی نہیں۔ چنانچہ اُس روز بھی انہوں نے مجھے کچھ نہ دلایا، یہاں تک کہ واپسی شروع ہوگئی ۔ ایک آخری دوکان میں چینی کے بنے ہوئے بتاشوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ جب ہم وہاں سے گذرے تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے کہا : "اباجی! بتاشوں کا بھاؤ ہی پوچھ لو"۔ اور اس طرح والد صاحبؒ کو ان کا بھولا ہوا فریضہ یاد دلادیا۔

ہمارا گھر دیوبند کے جس محلے میں تھا، اُسے بڑے بھائیوں کا محلّہ کہا جاتا ہے۔ دراصل ہمارے جدامجد کی اولاد "بڑے بھائی" کہلاتی تھی ، اور انہی کے نام پر محلے کا نام بھی مشہور ہوگیا تھا۔ ہمارے گھر کے صدر

دروازے کی طرف (جو مشرق میں تھا) وہ چھوٹی سی سڑک تھی جو مسلمانوں کی آبادی کو ہندوؤں کی آبادی سے ممتاز کرتی تھی۔ اس سڑک پر ہمارے گھر کے دوسری طرف تمام تر ہندو آباد تھے، لیکن اُن سے پڑوس کے اچھے تعلقات قائم تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے اُسی سڑک پر ایک آٹے کا کارخانہ تھا جسے ہم "انجن" کہا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس میں ایک مرتبہ آگ لگ گئی، تو سب سے پہلے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ان کی مدد کو پہنچے اور دیر تک آگ بجھانے کیلئے پانی اور زمین سے کھودی ہوئی مٹی ڈالنے کے کام میں مصروف رہے۔ غیر مسلم پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک ہمارے سارے اکابر کا خاص وصف تھا۔ میرے لئے یہ ایک دلچسپ منظر تھا، اور میں گھر سے یہ تماشا دیکھنے کے بعد اپنے بڑے بہن بھائیوں کے سامنے یہ منظر اپنی تتلائی ہوئی زبان میں بیان کرتا، اور اپنے ہاتھ پاؤں کی حرکات سے وہ نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتا، اور اس منظر کشی میں اپنے کسی بہن بھائی کے اوپر اُس طرح چڑھ جاتا جیسے میں نے آگ بجھانے والوں کو انجن پر چڑھتے دیکھا تھا۔ میرے بہن بھائی مجھ سے فرمائش کرکے اس منظر کشی کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔

میں تقریباً چھ سال کی عمر تک تتلائی ہوئی زبان بولتا رہا، اور اُس کے بھی طرح طرح کے لطیفے خاندان میں مشہور ہوئے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری، رحمۃ اللہ علیہ، کے بڑے صاحبزادے حضرت مولانا ازہر شاہ قیصر (رحمۃ اللہ علیہ) جو عرصے تک ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کے ایڈیٹر رہے، میرے سب سے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ، کے دوست تھے، اور اس حوالے سے ان کا ہمارے گھر میں بکثرت آنا جانا تھا، وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے، گھر والے مجھے پیار سے "تقی" کے بجائے "تقو" کہا کرتے تھے اور مولانا ازہر صاحب بھی مجھے اسی نام سے پکارتے، اور اکثر مجھے گود میں اٹھا کر "تقوّ تقوّ" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ دوسری طرف ان کا نام "ازہر" تھا جسے بگاڑ کر میں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں "اجہل" کہتا تھا، چنانچہ جب وہ دروازے پر دستک دیتے، اور میں باہر نکل کر انہیں دیکھتا، تو بھائی جان کو آکر بتاتا کہ: "بھائی اجہل آئے ہیں"۔ مولانا ازہر صاحبؒ میری اس زبان کے بڑے مزے لیا کرتے تھے۔ چنانچہ پاکستان آنے کے بعد جب میری ادارت میں ماہنامہ البلاغ جاری ہوا، اور اُس کا پہلا شمارہ مولاناؒ کے پاس پہنچا تو انہوں نے مجھے خط میں لکھا (جو سالہا سال کے بعد میرے نام ان کا پہلا خط تھا) کہ: "اب تو آپ مولانا محمد تقی عثمانی ہیں

لیکن میرے نزدیک آپ وہی تقوؔ میاں ہیں جو مجھے اجہل کہا کرتے تھے"۔ اور خط کے آخر میں اپنے نام کی جگہ لکھا "وہی آپ کا اجہل بھائی"۔

ہمارے گھر میں شعروادب کا بڑا چرچا تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا شعری مجموعہ تو ان کے "کشکول" میں چھپ چکا ہے۔ بڑے بھائی جان (مولانا محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ) باقاعدہ شاعر تھے، اور ان کی وجہ سے کئی شاعروں کا گھر میں آنا جانا رہتا تھا۔ میری دو بڑی بہنیں ایسی تھیں کہ اگرچہ انہوں نے کسی مدرسے یا اسکول میں کبھی نہیں پڑھا، بلکہ صرف گھریلو تعلیم پر اکتفا کیا، لیکن ان کا شعری اور ادبی ذوق بڑا پاکیزہ تھا، اور کبھی کبھی وہ خود شعر کہتی تھیں۔ اس سارے ماحول کے نتیجے میں بچپن کے اُس بالکل ابتدائی دور میں بہت سے اشعار مجھے بھی یاد ہو گئے تھے جو میں اپنی تتلائی ہوئی زبان میں پڑھا کرتا تھا، اور گھر والے میری زبان سے یہ تتلائے ہوئے اشعار سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ ایک ایسا ہی فساد گڈھ مکتیشر میں ہوا، تو وہاں کے ایک شاعر نے اس فساد کا نقشہ ایک نظم میں بڑے دردناک انداز میں کھینچا تھا۔ اُس نظم کے یہ اشعار مجھے اُسی وقت سے یاد ہیں:

کیا کیا ہوا موجودہ حکومت کے سہارے!

گنگا کے کنارے!

گھر جلتے تھے، اڑتے تھے ہواؤں میں شرارے

گنگا کے کنارے!

بوسے جنہیں ماں باپ دیا کرتے تھے سو بار

کرتے تھے جنہیں پیار!

کفار نے نیزے اُنہی رخساروں پہ مارے!

گنگا کے کنارے!

میری وہ بہن جو بہنوں میں سب سے چھوٹی اور چار بھائیوں سے بڑی ہیں، اور ہم انہیں چھوٹی آپا کہتے ہیں، اور بفضلہٖ تعالیٰ حیات ہیں، انہوں نے مجھے یہ نظم کسی وقت اچھے سے ترنم سے سنادی تھی۔ وہ مجھے اتنی پسند

آ گئی کہ جب تک میں ان کے منہ سے وہ نظم نہ سن لیتا، سوتا نہیں تھا۔ چنانچہ وہ اس نظم سے میری لوری کا کام لیا کرتی تھیں۔اور بعد میں میں نے ان سے خطاب کرتے ہوئے انہی کے بارے میں ایک نظم کہی تھی جسکا مطلع یہ تھا:

چھوٹی آپا ! مری اس نظم کا عنواں تم ہو
تم ہو اس بزم کی تزیین کا ساماں تم ہو

اس کے آخری شعر میں اسی لوری کی طرف اشارہ ہے:

لوریوں میں بھی مجھے درس دیئے ہیں تم نے
ہاں مری بہن ، مری دوست، مری ماں تم ہو

اس کے علاوہ قصبے بھر میں پاکستان بنانے کی تحریک چلی، تو شاعروں نے اُس کی حمایت میں جوشیلی نظمیں کہیں، اور وہ میں نے کہیں سے سن لیں تو اپنی تتلائی ہوئی زبان میں انہیں نہ جانے کس طرح بگاڑ کر دہرانا شروع کردیا۔ مولانا عامر عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، کی یہ نظم اُس زمانے میں بڑی مقبول اور مشہور ہوئی تھی کہ:

یا رنج وبلا کا خوف نہ کر، یا نام نہ لے آزادی کا!
گر دار ورسن کی تاب نہیں ، الزام نہ لے آزادی کا

نیز ان کی ایک نظم یہ تھی :

اگر لینی ہے آزادی تو مسلم لیگ میں آؤ
اخوت کا علَم لیکر جہانِ کفر پر چھاؤ

میں اس جیسی نظموں کو سمجھے بوجھے بغیر بگاڑ بگاڑ کر تتلائی ہوئی زبان میں پڑھتا، اور گھر والے اُس سے مزے لیتے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پورے ہندوستان میں تحریک آزادی اپنے شباب پر تھی، اور مسلمانوں کی طرف سے قیام پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ رہا تھا۔ چنانچہ ہمارے گھر کی مشرقی سمت میں جو چھوٹی سی سڑک تھی، اُس پر سے بھی جلوس گذرا کرتے تھے۔ چونکہ ان جلوسوں میں اکثر کسی نہ کسی کے لئے "زندہ باد" کے نعرے لگتے تھے، اس لئے جب دور سے کسی جلوس کا شور سُنائی دیتا، تو میں گھر والوں سے اپنی توتلی زبان میں کہتا: "جندہ باد آلہے ہیں" (زندہ باد آرہے ہیں)۔ اس کے علاوہ ان جلوسوں کے مختلف نعرے سُن سُن کر مجھے یاد ہوگئے تھے، مثلاً "سینے پہ گولی کھائیں گے پاکستان بنائیں گے"۔ میں جب وہ نعرے اپنی تتلائی ہوئی زبان میں دہراتا، تو سارے گھر والے اُس کا مزہ لیتے تھے۔

پھوپی امۃ الحنانُ کا گھریلو مکتب

ہم جس محلے میں آباد تھے، اُس میں اُس چوک کے قریب جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے، ہمارے خاندان کی ایک بزرگ خاتون کا قیام تھا جن کا نام امۃ الحنان تھا، اور ہم انہیں پھوپی کہا کرتے تھے، کیونکہ وہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی رشتے کی بہن تھیں۔ اُن کا گھر کیا تھا؟ خاندان بھر کے، بلکہ دور دور کے بچوں کی ایسی تعلیم گاہ تھی جس میں کئی کئی پشتوں نے اُن سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ کہنے کو تو بچیوں اور بہت چھوٹے بچوں کو قرآن شریف ناظرہ پڑھاتی تھیں، لیکن درحقیقت وہ بچیوں کو قرآن شریف کے علاوہ بہشتی زیور کے ذریعے وہ سب کچھ پڑھا دیتی تھیں جس کی انہیں شادی کے بعد تک ضرورت ہوتی، اور نہ صرف نظریاتی طور پر پڑھا دیتی تھیں، بلکہ اُس کی عملی تربیت بھی دیتی تھیں۔ یہی ان کا مشغلہ تھا، اور یہی ان کا شوق، جس کے ذریعے انہوں نے سینکڑوں بچوں اور بچیوں کو انسانیت سکھادی تھی۔ ہماری سب سے بڑی بہن سے لے کر مجھ تک، سب نے اُن سے پڑھا تھا۔

میں ابھی اس قابل تو نہ ہوا تھا کہ اس تعلیم گاہ کا باقاعدہ شاگرد بنوں، لیکن میرے والدین مجھے غیر رسمی طور پر قاعدۂ بغدادی دے کر اُن کے گھر بھیج دیتے تھے، اور اس طرح قاعدۂ بغدادی کا آغاز میں نے اس گھریلو

مکتب میں کیا تھا جہاں محترمہ امۃ الحنان صاحبہ، رحمۃ اللہ علیہا، اپنی کڑک دار آواز میں تعلیم وتربیت کے فرائض بڑی تندہی سے انجام دیتی تھیں۔

یہ ساری باتیں مجھے یاد ہیں، اور اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں جو شاید قارئین کے لئے کسی دلچسپی یا فائدے کی حامل نہ ہوں۔ اُس وقت میری عمر کیا تھی؟ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا، لیکن ساڑھے چار سال سے یقیناً کم تھی، کیونکہ پانچ سال کی عمر پوری ہونے سے پہلے ہی ہم دیوبند سے پاکستان روانہ ہوگئے تھے۔ البتہ مجھے اپنے سب سے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ، کا نکاح یاد ہے جو ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا۔ اُس وقت میری عمر یقیناً تین سال تھی۔ لہٰذا جو باتیں مجھے یاد ہیں وہ تین سے ساڑھے چار سال تک کی عمر کی باتیں ہیں۔ اور آج مجھے حیرت ہوتی ہے کہ مجھے کل کی بات بھی بعض اوقات یاد نہیں رہتی، لیکن اتنی کمسنی کی یہ باتیں اس طرح یاد ہیں جیسے میں اب انہیں دیکھ رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن کے زمانے میں جو باتیں ذہن پر نقش ہوجاتی ہیں، وہ کتنی دیرپا اور انمٹ ہوتی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ بچوں کے سامنے اچھی باتیں کرو اور یہ نہ سمجھو کہ ان نادانوں پر ہماری اُن باتوں کا کیا اثر پڑے گا جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

البتہ یہ میری محرومی ہے، اور اس کی دل میں حسرت بھی ہمیشہ رہی کہ دیوبند اُس وقت بھی بڑے درجے کے علماء اور اولیاء کرام کا مرکز تھا، لیکن میری عمر اُس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ اُن میں کسی کی زیارت مجھے یاد نہیں۔ البتہ مجھے ایک مرتبہ اپنے والدین کے ساتھ تھانہ بھون جانا یاد ہے، اور یہ میری یاد میں ریل کا پہلا سفر تھا، لیکن اُس وقت کچھ شعور نہ تھا کہ تھانہ بھون کیا ہے؟ اور وہاں جانے کا کیا مقصد ہے؟ البتہ ان کے بعد حضرت والد ماجد، رحمۃ اللہ علیہ، کے دوسرے محبوب ترین استاد اور مربی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ (جو حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور ہیں) بقید حیات تھے، اور غالب گمان یہ ہے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے بظاہر میری تحنیک بھی اُن سے کرائی ہوگی، لیکن افسوس ہے کہ مجھے حضرتؒ کی زیارت یاد نہیں ہے۔ البتہ بعد میں میں نے ایک خواب میں اُن کی زیارت کی تھی، اور اُن کا جو حلیہ دیکھا تھا، جب میں نے وہ اپنے بڑے بہن بھائیوں سے بیان کیا، تو اُنہوں نے بتایا کہ یہ حضرتؒ ہی کا حلیہ تھا۔ اسی طرح اُس وقت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب، رحمہما اللہ تعالیٰ، جیسے اکابر بھی دیوبند میں تشریف فرما تھے، لیکن مجھے کم عمری کی وجہ سے ان کی زیارت کا

شرف حاصل نہیں ہو سکا۔

اسی دوران ۲۷ رمضان المبارک ۱۳۶۶ھ مطابق ۱۴؍اگست ۱۹۴۷ء کو جمعۃ الوداع کی مبارک رات میں پاکستان کا قیام عمل میں آ گیا۔ اُس وقت میری عمر چار سال سے آٹھ دن کم تھی۔ مجھے وہ خاص دن تو یاد نہیں ہے جس دن پاکستان بنا، لیکن یہ یاد ہے کہ گھر میں چونکہ بار بار پاکستان بن جانے کا ذکر ہوتا رہتا تھا، اس لئے میرے اُس بچپن کے ذہن میں کچھ ایسا تصور بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی بڑی سی عمارت بنی ہے جس میں ایک بڑا سا ہال ہے، اور اُس کی دیوار پر چاند تارے کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

پاکستان بنتے ہی ملک کے مختلف حصوں میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے، اور مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر سکھوں کی طرف سے لرزہ خیز مظالم کی ایک قیامت برپا ہوگئی۔ یوپی کا ضلع سہارن پور جس کا ایک قصبہ دیوبند بھی تھا، چونکہ مشرقی پنجاب سے بالکل ملا ہوا تھا، اس لئے اس علاقے میں بھی سکھوں کی اچھی خاصی آبادی تھی، اور سکھوں کے مظالم کا دائرہ ہمارے ضلع تک پہنچ چکا تھا، اور ہندوؤں کی طرف سے بھی اُن کی پشت پناہی جاری تھی۔ اُن کے بھی جارحانہ نعروں پر مشتمل جلوس نکلا کرتے تھے۔ ہمارے محلے کی مشرقی جانب میں چونکہ ہندوؤں کی آبادی دور تک پھیلی ہوئی تھی جس کو "ہندواڑہ" کہا جاتا تھا۔ اس لئے ہر رات یہ افواہیں گرم رہتی تھیں کہ آج کی رات سکھوں یا ہندوؤں کی طرف سے حملہ ہوگا۔ اس خطرے کے پیش نظر محلے کے نوجوان باریاں مقرر کر کے محلے کے مختلف ناکوں پر ساری رات پہرہ دیا کرتے تھے۔ حالات کے اس پس منظر میں میرے بچپن کے ذہن پر خاص طور سے سکھوں کی ایک خونخوار تصویر مسلط ہوگئی تھی، اور چار سالہ دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ سکھ کوئی خطرناک مخلوق ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میں گھر والوں کی نہ جانے کس بات پر ناراض ہو کر گھر والوں کا بائیکاٹ کرتے ہوئے رات کو گھر کے مشرقی دروازے کے قریب ایک کونے میں جا لیٹا۔ یہ کونا میری نظر میں دو وجہ سے خطرناک تھا۔ ایک تو اس میں ایندھن کے طور پر استعمال ہونے والی لکڑیاں پڑی رہتی تھیں جن میں بعض اوقات بچھو بھی نکل آتے تھے، اور دوسری طرف یہیں ہمارے گھر کا وہ دروازہ تھا جو ہندواڑے کی اُس سڑک پر کھلتا تھا جہاں سے سکھوں کے جلوس گذرا کرتے تھے، اور وہیں سے ان کے حملے کا خطرہ سب سے زیادہ تھا۔ لیکن میں اپنی دانست میں یہ دو عظیم خطرے مول لے کر گھر والوں کو یہ جتانا چاہتا تھا کہ ان کا کوئی طرزِ عمل اتنا ناقابل برداشت ہے کہ اُس نے مجھے اس انتہائی سنگین اور مہلک احتجاج پر آمادہ

کردیا ہے۔ چنانچہ میرے بہن بھائی جب باری باری مجھے منا کر واپس گھر لے جانے کے لئے آتے تو اپنی تتلائی ہوئی زبان میں میرا ایک ہی جواب ہوتا، اور وہ یہ کہ: "چاہے چھتھ آ ؤ، چاہے بچھو تاتو، ہم تو یہیں پلے لہیں دے"۔ یعنی "چاہے کوئی سکھ آجائے، یا کوئی بچھو کاٹ لے، ہم تو یہیں پڑے رہیں گے"۔ آخر جب میرا یہ سنگین احتجاج کوئی بہن بھائی ختم نہ کرسکا، تو حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو مداخلت کرنی پڑی، وہ تشریف لائے، مجھے گود میں لے کر پیار کیا، اور مجھے اٹھا کر گھر میں لائے، اور بظاہر اس کے بعد ہمارے مطالبات تسلیم کرلئے گئے۔

جاری ہے.......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس الجامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(پانچویں قسط)

پاکستان کی طرف ہجرت

اسی دوران گھر میں یہ چرچا بار بار سننے میں آتا تھا کہ ہمیں پاکستان جانا چاہئے یا نہیں۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے شیخ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ اور اپنے استاذ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہما، کے ایماء پر تحریک قیام پاکستان میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، پاکستان تشریف لے جاچکے تھے، اور پاکستان کے قائداعظم محمد علی جناح صاحب نے پاکستان کا جھنڈا سب سے پہلے لہرانے کی انہی سے درخواست کی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد حضرت شیخ الاسلام، رحمۃ اللہ علیہ، کی پہلی جدوجہد یہ تھی کہ ملک کے لئے ایک اسلامی دستور تیار کیا جائے چنانچہ اس غرض کے لئے انہوں نے جناح صاحب مرحوم اور اُس وقت کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب مرحوم کو آمادہ کیا کہ وہ دستور کی اسلامی بنیادیں طے کرنے کیلئے اُس وقت کے بڑے علماء سے مدد لیں، اور ابتدائی طور پر اس کے لئے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اور جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب، رحمۃ اللہ علیہم، کا انتخاب کیا گیا، اور ان حضرات کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی کہ وہ تین مہینے میں دستور کی اسلامی بنیادیں ایک رپورٹ کی شکل میں مرتب فرمائیں۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے لئے مستقل طور پر دیوبند چھوڑ کر پاکستان جانا بہت سے مسائل کی وجہ سے نہایت مشکل تھا۔ اول تو دیوبند میں اُن کے مشاغل مختلف نوعیتوں کے تھے جنہیں چھوڑنا آسان نہیں تھا، دوسرے ہماری دادی صاحبہ، رحمۃ اللہ علیہا، انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُنہیں دیوبند میں تنہا چھوڑنا بھی

مشکل تھا، اور ساتھ لے جانا بھی مشکل، کیونکہ وہ بہت عمر رسیدہ تھیں، اور امن وامان کے لحاظ سے یہ وقت بڑا مخدوش تھا، نیز دو شادی شدہ بیٹیاں ایسی تھیں کہ اُنہیں ساتھ لے جانا اس وقت ممکن نہیں تھا، اور اُس دور میں اولاد کے کسی دوسرے ملک میں رہنے کا تصور بڑا تکلیف دہ ہوتا تھا۔ تیسرے دارالعلوم سے مستعفی ہونے کے بعد گھریلو اخراجات کیلئے آمدنی کا واحد ذریعہ تجارتی کتب خانہ دارالاشاعت تھا، اور اُسے اُن فساد زدہ حالات میں پاکستان منتقل کرنا کارے دارد۔ چوتھے اُس وقت ملک کے مختلف حصوں میں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، اور پاکستان جانے والے مہاجرین کو قدم قدم پر آگ اور خون کی ندیاں عبور کرنی پڑتی تھیں۔ پانچویں پاکستان میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں تھا۔ اس لئے کافی دن خاندان میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ پاکستان جانا مناسب ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، جو پاکستان بننے سے پہلے دہلی سیکریٹریٹ کی مسجد میں خطیب تھے، حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے تقریباً ساتھ ساتھ پاکستان چلے گئے تھے۔ علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، نے اُن کو، حضرت والد صاحبؒ کو دعوت دینے کیلئے دیوبند بھیجا۔ خاندان کے بہت سے رشتہ داروں کی رائے مذکورہ بالا حالات کی وجہ سے اس کے خلاف تھی، لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے آخر یہی فیصلہ کیا کہ جس پاکستان کے بنانے میں اپنی جدوجہد ابتک صرف کی ہے، اُس کی صحیح بنیادوں پر تعمیر وترقی کے اہم کام میں بھی اپنا حصہ ڈالنا ضروری ہے۔

یہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا ایک مشکل فیصلہ تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اُنہیں غیر معمولی حوصلہ عطا فرمایا تھا، اس لئے انہوں نے تمام مسائل کو نظر انداز فرما کر اپنے گھر والوں سے فرمادیا کہ وہ ہجرت کی تیاری کریں۔ مجھے اپنے بچپن کی وجہ سے مسائل کا تو کچھ علم نہیں تھا، لیکن میں گھر کی مجموعی فضا پر خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات کا اندازہ کر سکتا تھا، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے ابتک اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنے جدّی مکان کے ایک چھوٹے سے کمرے میں گذارا تھا، اور اب چند سال پہلے ہی اُنہوں نے وہ مکان بڑے شوق وذوق سے تعمیر کروایا تھا جس میں وہ اب مقیم تھے۔ دوسری طرف اُنہیں باغبانی کا بھی شوق تھا، جس کے لئے انہوں نے جی ٹی روڈ کے قریب ایک باغ لگایا تھا، اور جب کبھی اُنہیں اپنی علمی مشغولیات سے کچھ فرصت ملتی، وہ عموماً عصر کے بعد اس باغ میں تشریف لے جاتے۔ کئی مرتبہ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس باغ

میں انہوں نے خاص طور پر آم کے پودے لگائے ہوئے تھے، اور اُس سال اُن پر پہلا پھل آ رہا تھا۔ وہاں اُنہوں نے ایک کمرہ بھی بنوادیا تھا جہاں کبھی کبھی تمام گھر والے جمع ہوکر باغ کی شاداب فضا سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ ان تمام چیزوں کو ایک دم سے چھوڑ کر چلے جانا یقیناً بہت صبر آزما تھا، کیونکہ یہ یقین تھا کہ چھوڑ کر جانے کا مطلب یہ تھا کہ وہ ساری جائیدادیں حکومت کی تحویل میں چلی جائیں۔ لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے جب چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا، تو فرمایا کرتے تھے کہ "جس دن میں نے گھر اور باغ سے قدم نکالا، یہ ساری جائیدادیں میرے دل سے نکل گئیں"۔ حقیقت یہ ہے کہ زہد کی یہ تفسیر جو بعد میں کتابوں میں پڑھی، اور بزرگوں سے سُنی کہ انسان دنیا کے مال ودولت سے دل نہ لگائے، اور مال ہو، مگر اُس کی محبت دل میں بسی ہوئی نہ ہو، اُس کا جیتا جاگتا نمونہ ہم نے اپنے والد ماجد کی زندگی میں ہر مرحلے پر دیکھا۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃً واسعۃً۔

والد صاحبؒ نے اُس وقت یہ طے فرمایا تھا کہ اُن کی صرف غیر شادی شدہ اولاد اُن کے ساتھ جائے گی اور شادی شدہ اولاد فی الحال دیوبند ہی میں رہے گی۔ ہماری دو بڑی شادی شدہ بہنوں اور بھائی جان یعنی جناب محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ، کو اس قرارداد کے مطابق دیوبند ہی میں رہنا تھا۔ چنانچہ اسی قرارداد کے مطابق تیاری شروع کردی گئی، اور آخر کار یکم مئی ۱۹۴۸ء کا وہ دن آگیا جس کی رات کو دیوبند سے روانہ ہونا تھا۔ مجھے یہ یاد ہے کہ اُس دن دوپہر کے وقت خاندان کی بہت سی خواتین ہمارے گھر کی بیٹھک میں جمع تھیں، اور ہماری دو بہنیں جو ساتھ جانے والی تھیں، اور جن کے بارے میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ وہ شعر بھی کہا کرتی تھیں، انہوں نے اس موقع پر وطن سے خطاب کرتے ہوئے ایک نظم کہی تھی۔ اس نظم کے یہ دو مصرعے مجھے اُسی وقت سے یاد ہیں:

سلام تجھ پہ کہ اب دور جارہے ہیں ہم
لے آج آخری آنسو بہا رہے ہیں ہم

میری وہ بہنیں سب خواتین کو وہ اپنی نظم سُنا رہی تھیں، اور سب کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔
اُسی رات کو ہم دیوبند کے اسٹیشن سے ریل میں سوار ہوئے، اور پہلی منزل دہلی تھی جہاں پروگرام کے

مطابق ہمیں ایک دن قیام کرنا تھا۔ دہلی سیکریٹریٹ میں ایک افسر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے استقبال کیلئے دہلی اسٹیشن آئے ہوئے تھے، اور اُنہی کے گھر پر قیام ہونا تھا۔ وہ ایک سیاہ رنگ کی آسٹن کار لے کر آئے تھے۔ جہاں تک یاد ہے، میرے لئے کسی کار کو دیکھنے اور اُس میں سوار ہونے کا یہ پہلا موقع تھا اور مجھے اس اعزاز کی خوشی ابتک اس طرح یاد ہے کہ کار میں پھیلی ہوئی خوشبو ابتک میری یاد میں بسی ہوئی ہے۔

ایک دن دہلی میں کس طرح گذرا؟ مجھے اب یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ اگلے دن ہم دہلی کے ریلوے اسٹیشن کے اُس پلیٹ فارم سے ریل میں دوبارہ سوار ہوئے جو مرکزی پلیٹ فارم سے الگ تھا (کیونکہ یہ اُس چھوٹی لائن پر چلنے والی گاڑیوں کا پلیٹ فارم تھا جو راجستھان کی طرف جاتی تھیں) ہمارے بڑے بھائی جان کے بارے میں اگر چہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ ابھی پاکستان نہیں جائیں گے، لیکن وہ ہمیں پہنچانے کے لئے دہلی تک ساتھ آئے تھے۔ اور مجھے وہ منظر یاد ہے کہ وہ پلیٹ فارم پر اکیلے کھڑے تھے، اور ہماری ریل دھیرے دھیرے پلیٹ فارم چھوڑ رہی تھی۔ پلیٹ فارم کے ساتھ ہی لال قلعے کے برج نظر آتے تھے، اس لئے پاکستان پہنچنے کے بعد بھی جب کبھی میں بھائی جان کا تصور کرتا، تو وہ اُسی طرح پلیٹ فارم پر کھڑے نظر آتے اور ان کے پس منظر میں لال قلعہ!

جو بچہ عمر کے پانچویں سال میں ہو، ظاہر ہے کہ اُسے وطن چھوڑنے، نیا ملک بننے اور اس کی طرف مستقل ہجرت کرنے کے مضمرات کا کیا اندازہ ہوسکتا تھا؟ اس لئے میں ان تمام مسائل سے بے نیاز صرف اتنا جانتا تھا کہ والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ریل کا لمبا سفر ہے، چنانچہ میں چُھک چُھک کرتی ریل کی کھڑکی سے چمٹا رہتا، اور ہر نئے اسٹیشن کی چہل پہل سے مزہ لیتا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی اسٹیشن سے روانہ ہوتے وقت ریل کا دھواں چھوڑتا ہوا انجن تین مرتبہ سیٹیاں بجاتا ہے، اور تیسری سیٹی پر ریل روانہ ہوجاتی ہے۔ چنانچہ میرے دو بڑے بھائی جب سیٹی کی آواز سنتے، یا گارڈ کی سبز جھنڈی دیکھ لیتے، تو مجھ سے کہتے: "ریل کو چلوادیں؟" میں اثبات میں سر ہلاتا، تو وہ ریل کی ایک دیوار پر ہاتھ سے زور دیتے، اور ریل چلنے لگتی، اور میں حیران رہ جاتا کہ وہ اس ڈبے میں بیٹھ کر کس طرح ریل کو کنٹرول کررہے ہیں۔ اُسی سفر کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا ایک روٹی ہاتھ میں لئے ریل کے اسٹیشن چھوڑنے کا منظر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں ایک چیل آئی، اور میرے ہاتھ سے روٹی چھین کر لے گئی۔

دہلی سے ہم راجستھان کے شہر جودھپور پہنچے، اور ایک رات وہاں گذاری۔ وہاں کی صرف اتنی بات مجھے یاد ہے کہ جس گھر میں ہمارا قیام ہوا، وہ ریلوے لائن کے بالکل ساتھ تھا، اور اُس کے سامنے سے ایک بدبودار مال گاڑی گذرتی نظر آئی تھی، جو غالباً کوڑے کرکٹ اور غلاظت کو کہیں دور پھینکنے کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ وہاں سے روانہ ہوئے، تو ایک اسٹیشن باڑھ میل کا تھا، جہاں ہماری دو بہنوں کا ایک بکس جس میں ان کے کپڑے تھے، کسی طرح گم ہوگیا تھا جس کی تلاش میں کافی پریشانی رہی۔ اُس کے بعد وہ اسٹیشن آیا جس کے بعد پاکستان شروع ہونا تھا۔ یہاں کسٹم ہونا تھا، اور ہندوستان کے کسٹم آفیسر مہاجرین کے سامان کی بڑی سخت چیکنگ کررہے تھے اور خاص طور پر بغیر سلے کپڑوں کو لیجانے نہیں دے رہے تھے۔ شاید مقصد یہ تھا کہ انہوں نے پاکستان کی مخالفت میں "بھوکا ننگا پاکستان" کا جو نعرہ لگایا تھا، اُس کو حقیقت بناکر مہاجرین کو دکھاسکیں کہ جو ملک تم نے مانگا تھا، وہاں تمہیں پہننے کے کپڑے تک میسر نہیں آئیں گے۔ ہمارے سامان میں ایک سلائی کی مشین بھی تھی وہ بھی انڈین کسٹم نے ضبط کرلی، اور کسٹم کی انتہائی تکلیف دہ کارروائی کے بعد ریل روانہ ہوئی، اور کچھ ہی دیر کے بعد پاکستان کی سرحد میں داخل ہوگئی۔ ہماری اگلی منزل حیدرآباد سندھ تھی، اور وہاں بھی ہم نے ایک رات گذاری۔ وہاں اُس وقت کی صرف اتنی بات مجھے یاد ہے کہ وہاں تقریباً تمام مکانوں کی چھتوں پر ترچھے بنے ہوئے ہوادان نظر آتے تھے جو ہم یوپی کے رہنے والوں کے لئے ایک عجوبہ تھا۔

حیدرآباد میں قیام کے بعد ہم آخرکار ۶/مئی ۱۹۴۸ء کو کراچی کے سٹی ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ یہاں حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ اور حضرت والد ماجدؒ کے دوست خلیفہ محمد عاقل صاحب (رحمۃ اللہ علیہم) استقبال کے لئے موجود تھے۔ چونکہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، حکومت کی دعوت پر تشریف لائے تھے، اس لئے حکومت کی طرف سے صدر کے علاقے میں وکٹوریہ روڈ کی ایک بلڈنگ "کنگس کورٹ" کی تیسری منزل پر ایک فلیٹ میں قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچھ دن ہم سب یہاں فرش پر سوتے رہے، اور کچھ عرصے کے بعد چارپائیوں کا انتظام کیا گیا۔ یہ ایک خوبصورت فلیٹ تھا جس کی کھڑکیاں اُس وکٹوریہ روڈ پر کھلتی تھیں جسے اب عبداللہ ہارون روڈ کہا جاتا ہے، اور آج وہاں ٹریفک اور دورویہ دوکانوں کی جو گہما گہمی نظر آتی ہے، اس کی موجودگی میں ۱۹۴۸ء کے وکٹوریہ روڈ کا تصور مشکل ہی سے کیا جاسکتا ہے جس کی صفائی ستھرائی اور پُرسکون ماحول کی وجہ سے وہ شہر کی خوبصورت ترین سڑک تھی۔ اس کی دائیں جانب شہر کی مرکزی شاہراہ

بندر روڈ واقع تھی، جسے اب قائد اعظم روڈ کہا جاتا ہے، اور وہیں ٹراموں کا مرکزی اڈہ تھا جسے ٹرام گودی کہا جاتا تھا۔ بائیں طرف صدر کا بارونق بازار تھا۔ اُس زمانے میں کراچی کی اہم سڑکوں کی روزانہ باقاعدہ دھلائی ہوا کرتی تھی۔ ہم دیوبند کے دیہاتی ماحول سے اُٹھ کر آنے والوں کیلئے اس میں دلچسپیوں کے بہت سے سامان تھے۔ اسی سڑک سے گورنر جنرل، وزیر اعظم اور باہر کے مہمان سربراہان حکومت گذرا کرتے تھے۔

"کنگسں کورٹ" نامی یہ بلڈنگ جواب بھی اسی نام سے موجود ہے، ایک چار منزلہ رہائشی عمارت تھی، اور اپنے مکینوں کے لحاظ سے اس کو ایک "کثیر ثقافتی (multicultural)" عمارت کہا جا سکتا تھا۔ ہم تیسری منزل پر مقیم تھے، ہم سے اوپر چوتھی منزل پر سندھ کے ایک معروف صنعت کار جناب محمد لائق لاکھو صاحب مرحوم رہا کرتے تھے، جو ایک وضع دار سندھی ثقافت کے نمائندے تھے، "لاکھو" سندھ کی ایک معزز برادری کا نام ہے، لیکن اُس وقت اُنہیں آس پاس کے لوگ "لاکھا صاحب" کہا کرتے تھے، اور میرے بچپن کے ذہن نے اس کا مطلب یہ سمجھا تھا کہ یہ لکھ پتی آدمی ہیں، اس لئے انہیں لاکھا کہا جاتا ہے۔ ان کے ساتھ ہمارا بالکل خاندانی جیسا تعلق ہوگیا تھا۔ لاکھو صاحب کی اہلیہ ہم سب بھائیوں سے بہت محبت کرتی، اور ہمارے ساتھ بڑی بہن جیسا سلوک کرتی تھیں۔ ان کے بیٹے غلام بشیر صاحب مرحوم ہمارے بھائی جیسے تھے۔ میری عمر تقریباً پانچ سال کی تھی، اور میں ان کے گھر بے تکلف چلا جایا کرتا تھا۔ لاکھو صاحب کی اہلیہ سندھ کے روایتی طریقے سے سیدھے توے پر گھی والی روٹیاں پکایا کرتی تھیں جو مجھے بہت پسند تھیں، اور وہ بڑی محبت سے کھلایا کرتی تھیں۔ ان کے گھر میں سندھ کی روایتی جھولے والی مسہری بھی تھی جس پر ہم بچے جھولے کے مزے لیا کرتے تھے۔ گھر کے اوپر کھلی ہوئی چھت تھی جو عصر کے بعد ہمارے کھیل کا میدان ہوا کرتی تھی۔ غلام بشیر صاحب بھی اس وقت کمسن تھے، اور ہمارے گھر میں بیٹوں کی طرح بے تکلف آتے تھے، لاکھو صاحب کے گھر کی خواتین سے ہمارے گھر کی خواتین کا گہرا رابطہ تھا، غرض جتنے دن ہم وہاں رہے، ان کے ساتھ دُکھ سکھ میں اس طرح شریک رہتے کہ ایک ہی گھرانے کا گمان ہوتا تھا۔ بعد میں ہم وہاں سے چلے گئے، تب بھی رابطہ قائم رہا، لاکھو صاحب اور ان کے بیٹے غلام بشیر صاحب مرحوم اب وفات پا چکے ہیں، لیکن غلام بشیر صاحب کے بیٹے غلام ہادی صاحب آجکل اسٹیٹ ایجنسی کا کام کرتے ہیں، اور ان سے اب بھی رابطہ رہتا ہے۔

ہم سے نیچے (یعنی دوسری منزل) میں جناب وزیر گل صاحب رہتے تھے جو نیوی کے ایک لیفٹنٹ

کمانڈر تھے، اور انکا تعلق صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) سے تھا۔ اُن سے بھی ایسا گہرا تعلق ہوگیا تھا کہ ان کی اہلیہ ہماری والدہ صاحبہ کو اپنی ماں کہا کرتی تھیں۔ ان کے بچے شاہجہاں اور ان کی بہنوں کا ہر وقت ہمارے یہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، اور وزیر گل صاحب کی اہلیہ کو کوئی مسئلہ پیش آتا، تو وہ مشورے کے لئے ہماری والدہ صاحبہ کے پاس آتی تھیں۔

تیسری منزل ہی پر ہمارے فلیٹ کے سامنے ایک اور فلیٹ تھا جس میں ایک میمن پارسی فیملی رہتی تھی، ان کے گھر کے دروازے پر پاوڈر سے بنے ہوئے وہ نقش ونگار نظر آتے تھے جو اُس وقت پارسیوں کے گھروں کی علامت سمجھے جاتے تھے۔

پہلی منزل پر سہارن پور کے ایک مہاجر سرکاری افسر آباد تھے، اور زمینی منزل پر ادھیڑ عمر کا ایک انگریز جوڑا رہتا تھا۔ انگریز مرد ایک ہاتھ سے معذور (ٹنڈے) تھے، اور ان کے گھر کے آگے ایک کھلی چھت والی پرانی سی کار کھڑی رہتی تھی، جو اپنے مالک کی خدمت کرنے سے زیادہ اُن سے اپنی خدمت لیتی رہتی تھی، چنانچہ ہم بکثرت دیکھتے تھے کہ جب اُنہیں شام کو کہیں جانا ہوتا، تو وہ تقریباً دوپہر سے ہاتھ میں اوزار لئے کبھی اُس کے بونٹ کے سامنے کھڑے، اور کبھی گاڑی کے نیچے لیٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ پھر نہا دھو کر شام کو میاں بیوی گاڑی میں سوار ہوتے، اور اُس کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ رو دھو کر ان کی خدمت کے لئے تیار ہوگئی ہے۔

اس طرح اس چار منزلہ عمارت میں رنگارنگ ثقافتیں جمع تھیں، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ان تمام پڑوسیوں کے حقوق حسب مراتب ادا فرماتے تھے، اور ہمارا بچپن جسے کھیل کود سے آگے کسی اور چیز سے ابھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی تھی، ان سب سے لطف لیتا رہتا تھا۔ ان سب رنگارنگ خاندانوں کے درمیان ایسا برادرانہ تعلق تھا کہ اپنے ثقافتی فرق کے باوجود سب ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ ایک روئی کے گودام میں بڑی خوفناک آگ لگی تھی۔ وہ جگہ ہمارے مکان سے کم از کم تین چار میل دور تھی، لیکن اُس آگ کا خوفناک دھواں ہمیں اپنے گھر کے سامنے والی عمارت کے بالکل پیچھے محسوس ہو رہا تھا۔ اس دھویں کو دیکھتے ہی ہماری بلڈنگ سے سارے جوان لوگ آگ بجھانے کے لئے اُس دھویں کی

سمت روانہ ہوگئے، ہمارے بڑے بھائی جناب محمد رضی صاحب ؒ بھی ان میں شامل تھے، اور چند ہی لمحوں میں میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ ہر قریبی عمارت سے انسانوں کا ایک بڑا ہجوم اُس آگ کا رُخ کر رہا ہے۔ کئی گھنٹے بعد بھائی صاحب واپس آئے، تو انہوں نے بتایا کہ یہ آگ یہاں سے بہت دور سٹی اسٹیشن کے روئی کے گودام میں لگی تھی، اور سب لوگوں نے وہاں پہنچ کر آگ بجھانے میں مدد کی، اور اسی مدد کے دوران ایک روئی کی جلتی ہوئی گانٹھ بھائی صاحب ؒ کے پاؤں پر آ گری تھی جس کی وجہ سے ان کے پاؤں میں کئی دن تک زخم رہا۔

اس طرح اُس زمانے میں باہمی محبتوں کے بڑے دلنواز مناظر نظر آیا کرتے تھے۔ جنہیں آج آنکھیں دیکھنے کو ترستی ہیں۔

لیکن ہمارے والدین کے لئے یہ بڑے صبر آزما دن تھے۔ تین مہینے کے لئے تو حضرت والد صاحب ؒ، حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی ؒ اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ؒ دستوری سفارشات کی رپورٹ تیار کرنے میں مصروف رہے، جس پر کچھ اعزازیہ مل جاتا تھا۔ لیکن اس کے بعد اُن کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ جو چار بیٹے ساتھ تھے، وہ سب کے سب کمسن تھے، اور ان کا سب سے بڑا مسئلہ تعلیم تھا، اور انہیں کسی قابل ذکر کمائی کے کام میں لگانا مشکل تھا۔ دیوبند سے جو کچھ روپیہ ساتھ لانا ممکن تھا، اُس کے بارے میں اُس وقت یہ سوچا گیا تھا کہ نقد رقم کو سفر میں ساتھ رکھنا مناسب نہیں، اس لئے جو کچھ نقد رقم تھی، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے دیوبند ہی کے ایک سُنار سے اُس کے ذریعے ایک سونے کا گلوبند بنوا کر حضرت والدہ صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، کو پہنا دیا تھا کہ جب ضرورت پڑے، اُسے بیچ کر نقد رقم حاصل کی جاسکے۔ چنانچہ جب آمدنی کی کوئی اور صورت نہ رہی، تو اس گلوبند کو بیچنے کے لئے کراچی کے ایک سُنار کے پاس لے گئے۔ اُس نے سونے کو کسوٹی پر پرکھ کر بتایا کہ یہ سونا ہے ہی نہیں، اور جس سُنار سے یہ گلوبند بنوایا گیا تھا اُس نے دھوکہ کر کے شاید پیتل پر سنہری پالش کر دی تھی اور اُس کو سونے کا گلوبند کہکر بیچ دیا تھا۔ جو رہی سہی پونجی تھی، وہ اس طرح مٹی ہوگئی۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اس واقعے کا ہنس ہنس کر ذکر فرمایا کرتے تھے۔

حضرت والد صاحب ؒ کے تعلقات وزیر اعظم سے لے کر نیچے کے افسروں تک بہت سے لوگوں سے تھے اور ان میں سے بہت سے والد صاحب ؒ سے ملنے کے لئے ہمارے گھر بھی آیا کرتے تھے، لیکن کسی کو پتہ نہیں تھا

کہ گھر میں کیا گذر رہی ہے؟ خود ہم بچوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ والد صاحبؒ کن حالات سے دوچار ہیں، البتہ والدہ صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، کئی کئی دن تک دال پکاتی رہتیں۔ مجھے تو یاد نہیں، لیکن میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم جو اُس وقت دس سال کے تھے، وہ بتاتے ہیں کہ ایک دن اُنہوں نے والدہ صاحبہ سے یہ شکوہ کردیا کہ آپ ہر روز دال ہی پکاتی رہتی ہیں۔ اُس موقع پر والدہ صاحبہؒ نے پہلی بار اُن کے سامنے یہ فرمایا کہ "تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ تمہارے باپ کا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے"۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ایک دوست حضرت خلیفہ محمد عاقل صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یاسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے شاگرد تھے، اور دارالعلوم دیوبند میں فارسی اور ریاضی کے استاذ رہے تھے، لیکن تحریک پاکستان میں شمولیت کی وجہ سے اُنہوں نے بھی وہاں سے استعفاء دیدیا تھا، اور شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاکستان آنے کے بعد وہ بھی ہم سے پہلے پاکستان آگئے تھے، اور یہاں اُنہوں نے یک راشن کی دوکان کھول لی تھی جو صدر اور جیکب لائن کے درمیان واقع تھی۔ اُس ابتدائی زمانے میں جب حضرت والد صاحبؒ کا کوئی آمدنی کا ذریعہ نہیں تھا، وہ زبردستی اپنی دوکان سے کچھ راشن ہمارے گھر بھجوادیا کرتے تھے، ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ کچھ عرصے تک اُسی سے ہمارے گھر میں کھانا پکتا تھا۔

ایک طرف تو حضرت خلیفہ محمد عاقل صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا یہ خلوص تھا کہ وہ کوئی حساب رکھے بغیر راشن ہمارے گھر بھجوادیا کرتے تھے، اور دوسری طرف حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی یہ معاملات کی صفائی تھی کہ جتنی مرتبہ اُن کی دوکان سے مختلف اجناس آتیں وہ اُن کا پورا حساب رکھتے تھے، چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے وسعت عطا فرمائی، تو انہوں نے پورا حساب کر کے اُتنی ہی رقم کا ہدیہ حضرت خلیفہ صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو پیش کردیا۔ (بعد میں اتفاق سے خود اُن پر ایک سخت وقت آیا، اور اُس وقت حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس وسعت تھی، اس لئے انہوں نے اُس سخت وقت میں حضرت خلیفہ صاحبؒ کی مدد فرمائی۔)

جاری ہے.....

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چھٹی قسط)

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، دیوبند میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے دارالاشاعت کے نام سے ایک تجارتی کتب خانہ قائم فرمایا تھا جو وہ دیوبند ہی میں چھوڑ آئے تھے، اور بھائی جان (جناب محمد زکی کیفی، رحمۃ اللہ علیہ) اُس کی دیکھ بھال کرتے تھے، مگر اُس کی آمدنی بھی اول تو معمولی سی تھی، دوسرے اُس کو پاکستان منتقل کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے نہ جانے کس طرح کچھ چھوٹے چھوٹے رسالے پاکستان آنے کے بعد بھی اُس دور میں چھپوائے، لیکن یہ وہ دور تھا جب اردو جاننے والے مہاجرین لٹے پٹے پاکستان آرہے تھے، اور ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ خود اپنے کھانے پینے اور رہائش کا انتظام کرنا تھا، اس لئے اردو کتابوں کی مانگ اتنی نہ تھی کہ وہ طباعت واشاعت کا خرچ نکالنے کے بعد کچھ آمدنی بھی پیدا کرسکیں۔

اس معاشی صورت حال کے ساتھ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو ہر وقت یہ فکر بھی لاحق تھی کہ وہ اپنی ضعیف والدہ صاحبہؒ کو دیوبند چھوڑ کر آئے تھے، جو حضرت گنگوہی، قدس سرہ، سے بیعت تھیں، اور ہم نے اُنہیں زندگی بھر کبھی ذکر اللہ سے خالی نہیں پایا، یہاں تک کہ اُن کے ہر سانس کے ساتھ "اللہ اللہ" کے الفاظ ہم خود سُنا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، چاہتے تھے کہ اُنہیں جلد از جلد یہاں بلانے کا کوئی انتظام کیا جائے۔ وہ ریل کے سفر کی متحمل بھی نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ ہمارے بھائی جان ہمارے دیوبند کے گھر میں اکیلے رہ گئے تھے، ان کی عمر بھی اُس وقت بائیس چوبیس سال کی تھی، اور دارالاشاعت کا سارا انتظام بھی وہی کرتے تھے۔ والدین اور بہن بھائیوں سے دور رہ کر تنہائی میں اُن کے کیا جذبات تھے؟ اس کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسی دوران جب عید آئی تو اُنہوں نے ہم بہن بھائیوں کے نام ایک کارڈ پر ایک نظم میں اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا جس کے یہ شعر مجھے اب بھی یاد رہ گئے ہیں:

مانا کہ میں دل درد کا خوگر ہی بنالوں
لیکن جو خلش چھپ نہ سکے، کیسے چھپالوں

تم عید کی خوشیوں سے کرو گھر میں چراغاں
میں اپنا ہی دل اپنے ہی داغوں سے سجالوں

ماں باپ جدا، بھائی بہن پاس نہیں ہیں
ایسے میں بتاؤ کہ میں کیا عید منالوں؟

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو تیسری فکر یہ تھی کہ ہم چاروں بھائی جو ساتھ پاکستان آئے تھے، تعلیم کے محتاج تھے، اور اُس وقت کراچی میں صرف ایک مدرسہ تھا جو محلّہ کھڈہ میں مظہرالعلوم کے نام سے معروف تھا وہ ہمارے گھر سے اتنا دور تھا کہ اُس میں تعلیم حاصل کرنا ہمارے لئے قابل عمل نہیں تھا۔

اُدھر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو سب سے بڑی تکلیف یہ تھی کہ یہ علاقہ جس میں ہم آ کر آباد ہوئے تھے، زیادہ تر انگریزوں اور پارسیوں کا علاقہ تھا، اور جو تھوڑے بہت مسلمان یہاں آباد تھے، وہ بیچارے بھی الاّ ما شاء اللہ دین کی کوئی خاص فکر نہیں رکھتے تھے، اس لئے اس علاقے میں دور دور تک کوئی مسجد نہیں تھی۔ شروع میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جماعت میں شامل ہونے کی خاطر دور دور بھی تشریف لے جاتے، لیکن پھر انہوں نے ہمارے گھر کے تقریباً سامنے کچھ مسلمانوں کے تعاون سے ایک کیبن بنوادیا، جس میں پانچوں وقت کی نماز باجماعت شروع ہوگئی، اور پھر رفتہ رفتہ مسجد کے لئے اس کے برابر والی گلی میں ایک جگہ بھی مل گئی، جہاں الحمدللہ باقاعدہ مسجد بنی، اور وہ ابتک چلی آتی ہے۔

مزید مسئلہ یہ بھی تھا کہ مہاجرین کے قافلے روز بروز کراچی پہنچ رہے تھے، اُن میں سے کچھ اپنے رشتہ دار بھی تھے، اور ان کا حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے سوا کوئی سہارا نہیں تھا، اس لئے وہ بھی تقریباً مستقل مہمان کے طور پر ہمارے گھر ہی میں ٹھہرتے، اور ان کو روزگار دلانے کی کوشش بھی حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے فرائض میں شامل تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ لٹے پٹے مہاجرین کی ہر ممکن امداد کی کوشش فرماتے تھے۔

غرض حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو طرح طرح کے مسائل کا سامنا تھا اور اب ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل ہے کہ اُنہوں نے کس کس طرح ان حالات کا مقابلہ فرمایا، لیکن ہمارے لئے وہ ایک

انتہائی شفیق باپ تھے جو گھر والوں کے سامنے ہمیشہ مطمئن اور خوش وخرم نظر آتے، بلکہ ہم لوگوں کی دلداری کے لئے ہمیں سیر وتفریح کو بھی لے جاتے۔ اُس وقت کراچی میں سمندر کی تفریح کیلئے سب سے دلکش جگہ کلفٹن تھی جسے اُس وقت زیادہ تر "ہوا بندر" کہا جاتا تھا۔ چونکہ وہ شہر سے بہت دور جگہ سمجھی جاتی تھی جہاں بسیں بھی بہت کم جاتی تھیں، اس لئے دن کے وقت وہ اکثر سنسان اور پُرسکون ہوتی تھی، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہم سب گھر والوں کو اُسی وقت وہاں لے جاتے۔ آج جس جگہ بڑا سا پارک بنا ہوا ہے، اُس وقت سمندر وہاں تک آیا کرتا تھا، اور وہ قدیم پُل جو اب پارک کے مشرقی حصے سے مغربی حصے تک پھیلا ہوا ہے، سمندر کی موجیں اُس پُل کے اگلے حصے کے نیچے تک آیا کرتی تھیں۔ یہاں ہم لوگ سمندر کی موجوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق نہاتے، اور گھر سے لایا ہوا کھانا دوپہر کے وقت وہیں کھا کر واپس لوٹتے۔ اسی طرح حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کبھی ہمیں بادبانی کشتی میں سوار کر کے کیماڑی سے منوڑہ لے جاتے، اور دن بھر کی یہ تفریح ہم بچوں کیلئے بڑی پُرکیف ہوتی تھی۔

ایک طرف تو مذکورہ بالا مسائل کے باوجود وہ ہماری دلداری کیلئے اس قسم کی تفریحات کا بھی سامان فرماتے، (اور ان تفریحات کے دوران بزرگوں کے واقعات اور نصیحتوں کے ذریعے ذہن سازی بھی کرتے جاتے۔) دوسری طرف حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو علمی ذوق عطا فرمایا تھا، اُس کی بنا پر خالص علمی اور فقہی مشغلے کسی حال نہیں چھوٹے۔ اگرچہ دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے آپ مدت پہلے استعفاء دے چکے تھے، لیکن لوگ اطراف عالم سے اُن کے پاس فقہی سوالات بھیجتے رہتے تھے جن کے جواب وہ اس حالت میں بھی تحریر فرماتے، اور دیوبند سے اگرچہ وہ زیادہ سامان ساتھ نہ لاسکے تھے، لیکن اہم کتابیں، مخطوطات، قلمی مسودے اور بزرگوں کے خطوط اور تبرکات کو بڑے اہتمام سے ساتھ لائے تھے، اور فرمایا کرتے تھے کہ کسٹم کی تلاشی میں مجھے سب سے زیادہ فکر ان کتابوں اور کاغذات کی تھی، لیکن کسٹم والوں کو ان سے کوئی غرض نہیں تھی انہیں تو یہ فکر تھی کہ کوئی سونا چاندی یا بے سلا کپڑا نہ جانے پائے۔ اس طرح والد صاحبؒ کا یہ علمی اثاثہ بڑی حد تک ان کے ساتھ آگیا تھا، یہاں تک کہ شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، اپنے ساتھ اتنی کتابیں نہیں لاسکے تھے، اس لئے بعض اوقات کسی مسئلے کی تحقیق کی ضرورت پڑتی، تو وہ تین منزل کا زینہ چڑھ کر ہمارے گھر تشریف لاتے اور مطالعہ فرماتے۔

رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ مسائل اس طرح حل ہونے شروع ہوئے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے کچھ دوستوں نے کراچی ہی میں کتابوں کی نشرواشاعت کا ایک ادارہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ شرکت میں قائم کیا، اور دوسری طرف بھائی جان مرحوم جو دیوبند کا کتب خانہ چلا رہے تھے، کسی طرح ان کے لئے ممکن ہوگیا کہ وہ کتب خانے کو وہاں سے سمیٹ کر پاکستان چلے آئیں، اور ہماری دادی صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔ چونکہ ان کے لئے ریل کا سفر قابل برداشت نہ تھا، اس لئے وہ انہیں دہلی سے ہوائی جہاز میں لیکر آئے۔ وہ ہم سب گھر والوں کی خوشی کا ناقابل فراموش دن تھا جب ہم اُن کے استقبال کے لئے ڈرگ روڈ کے ہوائی اڈے روانہ ہوئے۔ ڈرگ روڈ کا ہوائی اڈہ اُس وقت شہر سے بہت دور سمجھا جاتا تھا، اور بیچ میں جنگل حائل تھے۔ اُس وقت اورینٹ ائیرویز کے نام سے ایک ہی ائیر لائن پاکستان اور ہندوستان کے درمیان چلا کرتی تھی۔ اُس کا ڈکوٹا طیارہ رن وے پر آکر رُکا، تو میرے لئے کسی جہاز کو اتنے قریب سے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہم سب کی نگاہیں اُس کے دروازے پر مرکوز تھیں، تھوڑی دیر بعد بھائی جان دروازے سے نمودار ہوئے، اور مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہاتھ ہلاکر دوبارہ اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں وہ باہر آئے تو اُنہوں نے ہماری دادی صاحبہ کو اپنے بازوؤں میں اُٹھایا ہوا تھا۔ اور اس طرح حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی ایک بڑی پریشانی رفع ہوئی۔

بھائی جان اپنے ساتھ جتنی کتابیں ہوائی جہاز میں لاسکتے تھے، وہ تو لے آئے تھے، لیکن سارا ذخیرہ پانی کے جہاز ہی سے آسکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ صورت پیدا فرمائی کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ایک خصوصی شاگرد حضرت مولانا نور احمد صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) جو برما کے ضلع اکیاب سے تعلق رکھتے تھے، تعلیم کی غرض سے دارالعلوم دیوبند تشریف لائے تھے، ان کا حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے خصوصی تعلق تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے چونکہ پاکستان کی تحریک میں شمولیت اختیار کرلی تھی، اور انہیں دارالعلوم میں رہتے ہوئے کسی سیاسی جدوجہد میں شریک ہونا منظور نہیں تھا، اس لئے وہ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت تھانوی، قدس سرہ، کے ایماء پر دارالعلوم دیوبند سے مستعفی ہو چکے تھے۔ حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کو چونکہ حضرت والد صاحبؒ سے خصوصی تعلق تھا، اس لئے وہ غالباً خارجی اوقات میں حضرت والد صاحبؒ سے کچھ کتابیں بھی پڑھتے تھے، اور بکثرت اُن کی خدمت اور صحبت میں رہا کرتے تھے۔ وہ

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاکستان چلے جانے سے بہت مغموم تھے، اور خود بھی پاکستان آنا چاہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مہم جوئی اور محنت ومشقت کے کام نہایت پھرتی سے کرنے کا بڑا ذوق عطا فرمایا تھا۔ اُنہوں نے یہ کام اپنے ذمے لیا کہ وہ یہ کتابیں پانی کے جہاز سے پاکستان لے کر آئیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اوران کے ذریعے یہ کتب خانہ کراچی منتقل ہوگیا، اُن کے ساتھ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اپنے بھانجے جناب فخر عالم صاحب (مرحوم) کو بھی جہاز سے بلوالیا جو والدین کی وفات کے بعد ہماری دادی صاحبہ مرحومہ کے زیر پرورش تھے، مگران کے پاکستان آنے کی وجہ سے دیوبند میں اپنی خالہ کے پاس رہ گئے تھے، اور ان کی جدائی کی وجہ سے ہماری دادی صاحبہ بہت بے چین تھیں۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مناسب سمجھا کہ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ انہیں بھی بلوالیں۔ چنانچہ وہ بھی بحری جہاز سے ان کے ساتھ آگئے۔

میری تعلیم کا آغاز

حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ، کا کراچی میں اپنا گھر تو کوئی نہیں تھا، لیکن جمشید روڈ کی عامل کالونی میں مسلم لیگ کے ایک لیڈر ایس ایم قریشی صاحب مرحوم کا ایک بنگلہ تھا جس کے بارے میں انہوں نے فرمائش کی تھی کہ حضرتؒ اس میں قیام فرمائیں۔ چنانچہ حضرتؒ اُسی میں مقیم تھے، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کراچی آنے کے بعد نوزائیدہ ملک کے مسائل پر مشوروں کیلئے بکثرت اُن کے گھر جایا کرتے تھے، اور حضرتؒ کی دعاؤں کیلئے اکثر مجھے بھی ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مجھے یاد ہے کہ میں قاعدۂ بغدادی ایک خوبصورت سے جُزدان میں رکھ کر حضرتؒ کے سامنے بیٹھا تھا، اور غالب گمان یہ ہے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُس وقت مجھے حضرتؒ سے بسم اللہ کرانے کیلئے لیگئے تھے۔

ادھر حضرت مولانا احتشام الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے جیکب لائن میں ایک مسجد بنائی تھی جس کی چھت اُس وقت ٹین کی چادروں کی تھی، اور اُسی کے ساتھ اُن کا مکان بھی تھا۔ اس مسجد میں اُنہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی قائم کرلیا تھا جس میں قرآن کریم حفظ وناظرہ کی تعلیم ہوتی تھی۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے میرے بڑے بھائیوں کو تو اُس مدرسے میں داخل کردیا تھا جہاں برادر محترم جناب محمد ولی رازی صاحب قاری محمد زکریا صاحبؒ کے پاس اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی جناب حافظ نذیر احمد صاحبؒ کے پاس حفظ کرتے تھے۔ میری کمسنی کی وجہ سے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مجھے اُس

وقت وہاں باقاعدہ داخل کرنے کے بجائے گھر پر ہی حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے قاعدہ بغدادی پڑھوانا شروع کردیا تھا۔

ابھی قاعدہ ختم نہیں ہوا تھا، بلکہ اُس کا خاصا حصہ باقی تھا کہ دیوبند سے ایک خط کے ذریعے یہ معلوم ہوا کہ میری ایک بھانجی نے (جو مجھ سے ایک سال عمر میں بڑی تھیں) الف لام میم کا پارہ شروع کردیا ہے، میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، مشکل سے مشکل کام کو تیز رفتاری سے انجام دینے کے عادی تھے۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میری تقریباً ہم عمر بھانجی نے دیوبند میں الف لام میم کا پارہ شروع کردیا ہے، تو اُنہوں نے فرمایا کہ تم قاعدہ کافی پڑھ چکے ہو، اب تمہیں عم کا پارہ شروع کروادیتے ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ قاعدہ ختم کرنے سے پہلے ہی میں نے عم کا پارہ شروع کردیا۔ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اس طرح مجھے ناظرہ قرآن کریم پڑھاتے رہے، یہاں تک کہ میرے سات پارے مکمل ہوگئے۔ اس موقع پر اُنہوں نے فرمایا کہ اب تمہیں لفظوں کی پہچان ہوگئی ہے، اس لئے باقی قرآن کریم تم خود روزانہ پڑھ لیا کرو، اور اُس کے بعد اُنہوں نے مجھے بہشتی زیور کے اردو قاعدے سے سرسری گذار کر "بہشتی گوہر" شروع کرادیا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے "بہشتی گوہر" شروع کیا تو اُس کا پہلا جملہ یہ تھا کہ "یہ عالم شروع میں ناپید تھا" اس میں "ناپید" کا مطلب سمجھنے میں مجھے کافی دشواری پیش آئی، اور میں اُس کا مطلب سمجھنے کے لئے اپنے استاذ سے کافی جرح کرتا رہا۔ بہر کیف! ابھی اس کے کچھ ہی سبق ہوئے تھے کہ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اپنے مدرسے میں کتابوں کی تعلیم بھی شروع کروادی، اور رفتہ رفتہ یہاں باقاعدہ درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوگیا، جہاں حضرت مولانا بدر عالم صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جیسے اکابر نے بھی درس دیا، اور شاید کچھ عرصہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے بھی، اور حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، وہاں تعلیم دینے میں مصروف ہوگئے، اس لئے میں نے "بہشتی گوہر" اور "سیرت خاتم الانبیاء" کے کچھ حصے اپنی والدہ ماجدہ، رحمۃ اللہ علیہا، سے پڑھنے شروع کردیئے اور اب یاد نہیں کہ کتنا حصہ کس سے پڑھا، اور یہی میری اردو زبان کی تعلیم کی کل کائنات تھی۔ ان دو کتابوں کے علاوہ میں نے اردو سیکھنے کیلئے کوئی اور کتاب نہیں پڑھی۔

دوسری طرف میں روزانہ قرآن شریف اپنے طور پر پڑھتا رہتا تھا۔ میں قرآن شریف کو تکیہ پر رکھ کر

چارپائی پر بیٹھتا، اور روزانہ اُس کا کچھ حصہ پڑھ لیتا تھا، اور کبھی کبھی اپنی والدہ صاحبہؒ یا گھر کے کسی اور فرد کو سنا بھی دیتا تھا، یہاں تک کہ اسی طرح خود پڑھ پڑھ کر ایک صبح الحمدللہ ناظرہ قرآن کریم کی تکمیل ہوگئی۔

میں دیکھتا تھا کہ جب بچوں کا قرآن کریم ناظرہ یا حفظ مکمل ہوتا، تو عموماً اُس کیلئے باقاعدہ تقریب منعقد ہوتی تھی، جسے "آمین" کی تقریب کہا جاتا تھا، اور بسا اوقات مٹھائی تقسیم کرکے خوشیاں منائی جاتی تھیں، لیکن میں نے قرآن کریم ناظرہ کی تعلیم اس طرح مکمل کی کہ جس دن میری یہ "خودکار" پڑھائی مکمل ہوئی، اُس دن کسی کو پتہ بھی نہیں تھا کہ آج میرا قرآن کریم ختم ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے دل کی یہ حسرت اب تک یاد ہے کہ میں نے اکیلے کمرے میں آخری آیات پڑھ کر قرآن شریف بند کردیا، نہ کوئی دیکھنے والا تھا، نہ سننے والا، نہ کوئی تقریب تھی، نہ کوئی اجتماع۔

آخرکار میں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو بتایا کہ آج میرا قرآن کریم پورا ہوگیا ہے، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور انہوں نے مجھے انعام دینے کے لئے میرے دو بڑے بھائیوں (مولانا محمد ولی رازی اور حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہما) کو بازار بھیجا۔ میں اپنے گھر کی بالکنی میں کھڑا اُن کی واپسی کا شدت سے انتظار کرتا رہا، یہاں تک کہ وہ دُور سے مجھے آتے نظر آئے، تو اُن کے ہاتھ میں ایک نیلے رنگ کی کھلونے والی گاڑی تھی جس سے وہ خود بھی راستے میں محظوظ ہوتے آرہے تھے۔ اُسے پاکر میری خوشی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ ایک معمولی سی مگر خوبصورت گاڑی تھی (اُس وقت تک شاید خودکار گاڑیاں نہیں چلی تھیں) لیکن وہ میرے لئے کائنات کی بڑی دولت تھی۔ اب احساس ہوتا ہے کہ انسان اپنی فانی زندگی کے ہر مرحلے میں جن چیزوں سے دل لگاتا آیا ہے، اگلے مرحلے میں اُس پر ہنسی آتی ہے، یہاں تک کہ ایک وقت وہ آنے والا ہے جب یہ ساری زمین، جائیداد اور روپے پیسے کے ڈھیر کھلونوں سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہونگے:

بدنامئی حیات دو روزے نہ بود بیش
آں ہم بتو کلیم چہ گویم چساں گذشت

یک روز وقفِ بستنِ دل شد بہ این و آں
روز دگر بہ کندنِ دل زین و آں گذشت

بہرحال! اس طرح میری تعلیم کا آغاز ہوا۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(ساتویں قسط)

پاکستان اس طرح بنا تھا کہ تقسیم ہند کے نتیجے میں جو اثاثے پاکستان کے حصے میں آئے تھے، اول تو وہ تناسب کے لحاظ سے پہلے ہی کم تھے، پھر بہت سے اثاثے بھارت میں رہ گئے تھے، اور ان کی وصولی کا تنازعہ مدت تک چلتا رہا۔ اس لئے پاکستان کی حکومت نے انتہائی محدود وسائل کے ساتھ کام شروع کیا تھا۔ اس وقت دارالحکومت کراچی تھا، اور وزارتوں کا سیکریٹریٹ ٹین کی چادروں والے کمروں میں کام کرتا تھا۔ پیپر ویٹ کی جگہ پتھر استعمال ہوتے تھے، اور کاغذوں کو جوڑنے کے لئے پن کے بجائے کانٹوں سے کام لیا جاتا تھا۔ اسی وقت پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے "بورڈ تعلیمات اسلامیہ" کے نام سے ایک بورڈ تشکیل دیا، اور اس کا دفتر بھی اسمبلی کے ساتھ کھپریل کی چھت والے ایک کمرے میں بنایا گیا۔ بورڈ کی صدارت کیلئے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی، رحمۃ اللہ علیہ، کو دعوت دی گئی، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو بھی اُس کا رُکن بنایا گیا جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ زیر ترتیب دستور میں اسلامی تعلیمات سمونے کیلئے تجاویز مرتب کرے۔ اس حیثیت میں حضرت والد صاحبؒ کو جیکب لائن میں ایک کوارٹر کرایہ پر دیا گیا۔ دوسری طرف اس دوران ہماری سب سے بڑی بہن محترمہ نعیمہ خاتون صاحبہ (مرحومہ) اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہندوستان سے کراچی آگئیں۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ تقریباً ایک سال "کنگس کورٹ" میں رہنے کے بعد وہ فلیٹ عارضی طور پر ہماری بہن کو دیکر جیکب لائن کے اُس کوارٹر میں منتقل ہوگئے۔

اب جیکب لائن کا وہ مدرسہ جو حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، نے قائم فرمایا تھا، اور جہاں میرے بڑے بھائی پہلے سے پڑھتے تھے، ہمارے نئے گھر سے قریب ہوگیا، اور مجھے اس قابل قرار دیدیا گیا کہ میں بھی جیکب لائن کے مدرسے میں پڑھ سکوں۔ لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے شاید میرے نحیف ونزار جثے اور بہت پتلے دبلے وجود کو دیکھتے ہوئے میرے چار بھائیوں کے برعکس مجھے حفظ میں

نہیں لگایا، اور براہ راست کچھ ملی جلی اردو فارسی شروع کرادی جس کا آغاز "حمد باری" سے ہوا۔ یہ مولانا عبدالسمیع بے دل مرحوم کی لکھی ہوئی کتاب ہے جس میں مختلف الفاظ کے معنی مثنوی اشعار میں بیان کئے گئے ہیں۔ اگرچہ مولانا عبدالسمیع صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اُن کی یہ کتاب چونکہ بچوں کو الفاظ کے معنی یاد کرانے کیلئے مفید سمجھی گئی تھی، اس لئے علماء دیوبند نے اُس سے استفادہ میں کسی مسلکی تعصب کو آڑے آنے نہیں دیا، اور وہ تمام مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ میں نے وہ اور فارسی کی گردانوں کی کتاب "رسالہ نادر" جو ہمارے دادا حضرت مولانا محمد یاسین، رحمۃ اللہ علیہ، کی تالیف تھی، حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے جیکب لائن کے مدرسے میں پڑھنی شروع کردی تھی، لیکن یہ پڑھائی میری کمسنی کی وجہ سے بے قاعدہ سی تھی کہ جب چاہا سبق پڑھ لیا، اور جب چاہا چھٹی کرلی، بلکہ کوئی سبق کسی استاذ سے پڑھ لیا، اور کوئی کسی اور اُستاذ سے۔ حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کے صاحبزادوں میں مولانا احترام الحق صاحب مجھ سے کچھ بڑے تھے، اور جناب اعتصام الحق صاحب (حفظہما اللہ تعالیٰ) تقریباً میرے ہم عمر۔ بے قاعدہ اسباق سے فارغ بیشتر وقت اُن کی رفاقت میں گذر جاتا، اور کبھی حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کے گھر پر ہونے والی مجلسوں میں بیٹھ کر۔ اس تعلیم کی بے قاعدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اس زمانے میں کئی بار ٹائیفائڈ ہوا جس کی وجہ سے مہینے مہینے بستر پر گذارنے پڑے۔

دوسری طرف اُس وقت ہمارے بھائی جان (جناب محمد زکی کیفی رحمۃ اللہ علیہ) لاہور منتقل ہوگئے تھے، اور انہوں نے وہاں ادارۂ اسلامیات کے نام سے کتب خانہ قائم کرلیا تھا۔ ان کے یہاں پہلے بچے کی ولادت متوقع تھی، (جس کا نام "محمد مسعود غواص" رکھا گیا تھا، اور وہ پیدائش کے کچھ ہی دن کے بعد اللہ کو پیارا ہوگیا تھا) جس کے لئے والدہ صاحبہ نے لاہور کا سفر کیا، اور میں چونکہ ان کا لاڈلا تھا، اس لئے وہ میرے بغیر سفر نہیں کرتی تھیں۔ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم، جنہیں میں گھر کی بے تکلفی میں "بھائی رفیع" کہا کرتا ہوں، اور اس سرگذشت میں بھی اختصار اور بے تکلفی کے اظہار کیلئے بعض اوقات یہی تعبیر اختیار کروں گا، وہ اس سفر میں بطور محرم والدہ صاحبہ کے ساتھ لاہور گئے تھے، اور تقریباً دو مہینے ہمیں والدہ صاحبہؒ کے ساتھ وہاں رہنا پڑا۔ بھائی صاحب چونکہ اُس وقت حفظ کررہے تھے، اس لئے انہوں نے جامعہ

اشرفیہ میں ایک استاذ کے ساتھ اپنے حفظ کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن میری تعلیم پہلے ہی بے قاعدہ چل رہی تھی، اس لئے اُس کا کوئی باقاعدہ متبادل تلاش کرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ البتہ جب والدہ صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، کو کچھ وقت ملتا، وہ مجھے بہشتی گوہر اور سیرت خاتم الانبیاء پڑھانے بیٹھ جاتی تھیں۔ باقی وقت سیر سپاٹوں ہی میں گذرتا تھا۔

اسی سیر سپاٹے کا یہ واقعہ کبھی نہیں بھولتا کہ وہ شدید سردی کا زمانہ تھا، اور بھائی رفیع صاحب مدظلہم حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ کے صاحبزادے محمد معین صاحب مرحوم کے ساتھ اکثر شام کو لارنس گارڈن کے "گلشن فاطمہ" میں تفریح کیلئے جایا کرتے تھے، جو اُس وقت انتہائی حسین باغ تھا۔ میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ چلا جاتا تھا۔ اسی باغ کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت تالاب تھا۔ ایک مرتبہ یہ دونوں باتوں میں مشغول تھے، اور میں نے اس تالاب کے کنارے بنی ہوئی پتلی سی منڈیر پر چلنے کی مشق شروع کردی، کچھ دیر تک تو یہ مشق کامیاب رہی، لیکن پھر اچانک گیلی منڈیر سے پاؤں پھسلا، اور میں دھڑام سے تالاب میں گر کر غوطے کھانے لگا۔ دسمبر کی شدید سردی اور تالاب کا پانی برف کی طرح ٹھنڈا، ایک ہی لمحے میں موت سامنے نظر آنے لگی۔ تالاب اگرچہ زیادہ گہرا نہیں تھا، لیکن مجھ جیسے بچے کو ڈبونے کیلئے کافی تھا۔

بھائی رفیع صاحب اور بھائی معین صاحب نے بڑی دقت سے مجھے نیم بے ہوشی کی حالت میں تالاب سے نکالا، لیکن گیلے کپڑوں میں پورا بدن سردی سے کپکپا رہا تھا، اور دانت سے دانت بج رہے تھے۔ وہاں کپڑے بدلنے کا بھی کوئی راستہ نہ تھا۔ بھائی رفیع صاحب مدظلہم اُس وقت سردی سے بچاؤ کے لئے شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ہمیشہ دنیا اور آخرت میں اپنی رحمتوں سے نوازے، انہوں نے اپنی شیروانی اتار کر مجھے اُس میں لپیٹا، اور نہ جانے کس طرح مجھے گھر لاکر انگیٹھی کے سامنے بٹھایا، تب جان میں جان آئی۔ اس طرح اُس ارشادِ نبوی کا سبق تو اُسی دن مل گیا تھا جس میں سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"من رعیٰ حول الحمیٰ اوشک ان یقع فیہ"

"جو شخص کسی ممنوعہ علاقے کے اردگرد اپنے جانور چرائے، وہ کسی بھی وقت اُس ممنوعہ علاقے میں جا پڑ سکتا ہے۔"

لیکن کاش! کہ اپنے اعمال واخلاق میں بھی اس سبق پر عمل کرنے کی توفیق ہوئی ہوتی!

بھائی جان اُس وقت نیلا گنبد میں جامعہ اشرفیہ کی پرانی عمارت کے ساتھ ایک تنگ وتاریک قسم کے

فلیٹ میں رہتے تھے۔ اسی فلیٹ کے اوپر کی منزل میں حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ اور سب سے اوپر کی منزل میں جامعہ اشرفیہ کے بانی حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہما، رہا کرتے تھے۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب، قدس سرہ، حضرت حکیم الامتؒ کے اجل خلفاء میں سے تھے، اور انہوں نے جامعہ اشرفیہ دراصل امرتسر میں قائم فرمایا تھا، لیکن جب قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا، تو وہ لاہور منتقل ہوگئے تھے، اور اس عمارت میں یہ جامعہ اشرفیہ قائم فرمایا جو قیام پاکستان کے بعد قائم ہونے والے مدرسوں میں اولیت کا شرف رکھتا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ کی ہم کو یہ تاکید تھی کہ جب کبھی لاہور جائیں، تو حضرتؒ کی خدمت میں اہتمام کے ساتھ حاضری دیا کریں۔ چنانچہ اُس وقت جبکہ میری عمر سات سال کی تھی بھائی جان مرحوم کے ساتھ اُن کی خدمت میں بار بار جانا، اور حضرتؒ کی شفقتوں اور دعاؤں سے سیراب ہونا خوب یاد ہے۔ اگرچہ حضرتؒ کے مقام بلند کا شعور تو اُس وقت کیا ہوتا؟ وہ تو اب بھی نہیں ہے، لیکن یہ تأثر اُسی وقت کا یاد ہے کہ حضرتؒ کی مجلس میں جا کر اُس تنگ وتاریک فلیٹ میں بھی ایک عجیب قسم کا نور اور سرور محسوس ہوتا تھا، اور ایسا لگتا تھا کہ ہم شفقت ورحمت کے ایک شامیانے میں آگئے ہیں۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة۔

اسی دوران ایک دن بھائی جان دوکان سے روتے ہوئے گھر آئے، اور بتایا کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ وفات پاگئے ہیں۔ وہ بہاولپور کی یونی ورسٹی کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے تھے کہ وہیں پر اُن کا انتقال ہوگیا۔ انا لله وانا الیه راجعون۔ اُن کے علمی مقام کا اندازہ اُس بچپن میں کیا ہوتا؟ لیکن اُن کی شفقتوں سے محرومی نے اُس بچپن میں بھی ہمیں مغموم کردیا، اور بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ ملک وملت کیلئے کتنا زبردست سانحہ تھا جس سے ملک کے دینی حلقے اُس مرکزیت سے محروم ہوگئے جس نے تمام مکاتب فکر کو وسیع تر ملکی مفادات کی ایک لڑی میں پرویا ہوا تھا۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة۔

ہماری دوسرے نمبر کی بہن محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ، مدظلہا، جو دیوبند ہی میں رہ گئی تھیں، اُن کے شوہر جناب منشی بشیر احمد صاحب مرحوم کا (جو دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ میں ملازمت کرتے تھے) وہاں انتقال ہوگیا، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اُنہیں عدت گذار کر پاکستان بلالیا، اور وہ بھی اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ لاہور آگئیں، اور پھر ہمارے ساتھ ہی کراچی پہنچیں۔ اور جیکب لائن کے کوارٹر ہی کے ایک حصے میں

مقیم رہیں۔جیکب لائن میں ہمارا قیام تقریباً دو سال رہا۔اسی دوران میری بڑی بہن محترمہ حسیبہ خاتون (رحمہا اللہ تعالیٰ) کا نکاح ہوگیا، اور وہ رخصت ہوکر سُسرال چلی گئیں۔

جیکب لائن کے یہ کوارٹر سرکاری ملازمین کے لئے بڑے معمولی معیار پر بنائے گئے تھے جن کی دیواریں بھی چھوٹی تھیں، اور چوروں کو رات کے وقت ان پر چڑھ کر گھر میں کود جانے میں کسی دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا۔ چنانچہ اس گھر میں چور بہت آیا کرتے تھے، لیکن اس وقت چور بھی غیر ترقی یافتہ ہوتے تھے، اس لئے چپکے سے گھر میں کودنے کے بعد کوئی چھوٹی موٹی چیز ہاتھ لگ جاتی، تو اسی کو غنیمت جانتے تھے، اور اگر انہیں شبہ ہوجاتا کہ کسی گھر والے کی آنکھ کھل گئی ہے، تو جس آسانی سے آتے ہوئے دیوار پھاندی تھی، اسی آسانی سے دیوار پھاند کر واپس چلے جاتے تھے۔اس طرح چھوٹی موٹی چوریاں ہوتی رہتی تھیں، لیکن ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے حج کا ارادہ فرمالیا، اور اس کی تمام کارروائیاں مکمل کرکے جہاز کا ٹکٹ، پاسپورٹ اور شاید غیر ملکی کرنسی بھی ایک بڑے سے بٹوے میں رکھ لی تھی۔رات کے وقت جب سب سوئے ہوئے تھے، ایک چور آیا، اور خدا جانے کس طرح وہ بٹوا اٹھا کر لے گیا جس میں حج کا سارا سامان موجود تھا۔ حضرت والد صاحبؒ صبح کو اٹھے، تو یہ سارا سامان غائب تھا۔نہ پیسے تھے، نہ ٹکٹ، نہ پاسپورٹ، اور جہاز کی روانگی اتنی قریب تھی کہ اگر کسی طرح پیسوں کا انتظام ہو بھی جاتا، تو سرکاری کارروائیوں کا وقت نہ تھا، اس لئے حضرت والد صاحبؒ اس سال ساری تیاریوں کے باوجود حج کو نہ جاسکے۔حضرت مولانا احتشام الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ، کو اللہ تعالیٰ نے ظرافت بھی خوب عطا فرمائی تھی، جب انہیں حضرت والد صاحبؒ نے یہ واقعہ بتایا تو انہوں نے کہا": حضرت !اب تو وہ چور ہی حج کرے گا۔ "اس قسم کے مواقع پر ہم نے حضرت والد صاحبؒ کے تقدیر پر راضی رہنے کے جس وصف کا ہمیشہ مشاہدہ کیا، وہ کم دیکھنے میں آتا ہے۔

ہماری وہ بہن جو اپنے شوہر کی وفات کے بعد اپنی تین بیٹیوں کے ساتھ پاکستان آئی تھیں، ان کی آمد کے بعد جیکب لائن کا مکان تنگ پڑگیا، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے برنس روڈ کے قریب کیمبل اسٹریٹ پر ایک بلڈنگ میں جو اقبال منزل کے نام سے مشہور تھی، ایک وسیع فلیٹ کرایہ پر لے لیا، اور ہم وہاں منتقل ہوگئے، اور پانچ سال (یعنی 1951ء سے 1956ء تک) وہاں مقیم رہے۔یہ پانچ سال کئی حیثیتوں سے بڑے مبارک ثابت ہوئے ، اور اسی دوران کراچی میں ہمارا قیام مستحکم ہوا۔

بچپن میں پہلا سفرِ حج

یہاں منتقل ہونے کے بعد ایک نعمت تو یہ حاصل ہوئی کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے حج کا ارادہ فرمایا۔اس سے پہلے سال جیکب لائن کے قیام کے دوران بھی انہوں نے حج کی تمام تیاریاں مکمل کرلی تھیں، لیکن پیچھے لکھ چکا ہوں کہ حج کے پاسپورٹ اور ٹکٹ وغیرہ کی چوری کی وجہ سے حضرت والد صاحب،رحمۃ اللہ علیہ، حج کو نہ جاسکے تھے۔ اس سال انہوں نے دوبارہ ارادہ فرمایا۔اُس وقت میری والدہ صاحبہ، رحمۃ اللہ علیہا ،اور ہمارے بھائی جان (جناب مولانا محمد زکی کیفی صاحب مرحوم) بھی سفر میں ساتھ ہوگئے۔میری عمر اُس وقت آٹھ سال تھی،اور والدہ صاحبہ کا کوئی سفر میرے بغیر ممکن نہیں تھا، اس لئے مجھے بھی اُس چھوٹی سی عمر میں سفرِ حج کی سعادت نصیب ہوگئی۔چنانچہ ۳۱ر جولائی ۱۹۵۱ء کو ہم اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کے ایک مجاز صحبت الحاج ظفر احمد صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، اُس وقت پان اسلامک اسٹیم شپ کمپنی میں انجینئر تھے۔اسی کمپنی کا ایک پانی کا جہاز سفینۂ عرب کہلاتا تھا جو حج کے موسم میں حاجیوں کو لے جایا کرتا تھا۔اسی جہاز کے اوپر والے عرشے پر اُنہوں نے ایک وسیع کیبن بک کرایا تھا جس کے ایک حصے میں وہ اپنی اہلیہ محترمہ اور اپنے ایک صاحبزادے مشرف علی صاحب اور ایک صاحب زادی کے ساتھ مقیم تھے، اور دوسرے حصے میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ ہم رہتے تھے۔اُس عمر میں سفرِ حج کے تقدس کا کچھ کچھ احساس تو مجھے بھی ہو چلا تھا، لیکن اُس کے ساتھ پانی کے جہاز میں سفر کی دلچسپی بھی شامل ہوگئی تھی۔ الحاج ظفر احمد صاحبؒ کے صاحب زادے اور صاحب زادی بھی میرے تقریباً ہم عمر تھے، اور جلد ہی اُن کے ساتھ ایسی بے تکلفی ہوگئی کہ جہاز ہمارے لئے بھاگ دوڑ کا ایک میدان بن گیا۔اس بھاگ دوڑ سے جو وقت بچتا، میں اس میں حج کی کتاب سے طواف کی دعائیں یاد کرتا تھا۔تقریباً ایک ہفتہ سمندر میں بڑا دلچسپ اور پُر کیف گذرا، یہاں تک کہ ایک موقع پر میں نے حضرت والد صاحب ،رحمۃ اللہ علیہ، وغیرہ کو کپتان سے یہ تحقیق کرتے ہوئے دیکھا کہ جہاز یلملم کے سامنے سے کب گذرے گا؟ (اُس وقت تک تحقیق یہی تھی کہ پانی کا جہاز جب یلملم کے سامنے سے گذرے، تو اُسی وقت احرام باندھنا ضروری ہے بعد میں یہ تحقیق بدل گئی جسکی تفصیل جواہر الفقہ میں ہے) چنانچہ جب معلوم ہوا کہ جہاز یلملم کے سامنے سے گذرنے والا ہے، توسب نے احرام باندھ لئے اور مجھ سے بھی احرام بندھوایا

گیا۔اُس وقت پورا جہاز لبیک کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔اگلے ہی دن ہم جدّہ پہنچ گئے۔

اُس وقت جدّہ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔یہاں حاجیوں کے مختصر قیام کیلئے ایک حجاج منزل قائم تھی، اُسی کے ایک لکڑی سے بنے ہوئے کمرے میں ہمارا قیام ہوا۔کمرے سے زمین کی طرف باہر قدم نکالتے، تو زمین میں اس قدر نمی تھی کہ جوتوں سمیت ہم اُس میں دھنس جایا کرتے تھے، اور چلنا بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔کھانے کی ایک دوکان تھی جس کی روٹیوں میں سرخ سرخ کیڑے (جنہیں سُرسری کہا جاتا ہے) صاف نظر آتے تھے، اور اُن کو صاف کر کے منہ میں رکھ بھی لیں، تو اُس کی بُو سے سابقہ پیش آتا تھا۔چنانچہ کھانے کے بجائے کسی اور چیز سے بھوک مٹانی پڑتی تھی۔سارے جدہ شہر میں پکی سڑکیں گنی چُنی تھیں باقی کچی۔جب مکہ مکرمہ جانے کا وقت آیا، تو معلوم ہوا کہ بس میں سوار ہونے کے لئے دور کسی اڈے پر جانا ہوگا۔وہاں پہنچے، تو کئی گھنٹے بعد بس آئی، اور مکہ مکرمہ روانہ ہوئی۔راستہ کچا پکا سا تھا، اور ایسا یاد پڑتا ہے کہ ہمیں مکہ مکرمہ پہنچنے میں چار سے پانچ گھنٹے لگے تھے۔آخر کار وہ منزل آ گئی جس کا ایک ہفتے سے انتظار تھا۔

وہ منظر بڑا ہی ایمان افروز تھا جب ہم عشاء کے وقت مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔وہاں ایک دروازہ سا تھا جہاں گاڑی رُکی، تو بہت سے لوگ صراحیوں میں آب زمزم لئے کھڑے تھے، اور داخل ہونے والوں کا استقبال سفید خوشبودار کٹوریوں میں زمزم پلا کر کر رہے تھے۔مکہ مکرمہ کی برکات شروع ہو چکی تھیں۔معلم کے پاس سامان وغیرہ اتار اگیا۔حج کا وقت بہت قریب تھا، اور ہم سب نے "قران" کا احرام باندھا ہوا تھا۔ چنانچہ اُسی رات حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہم سب کو لے کر حرم شریف روانہ ہوئے، حرم شریف میں داخل ہوتے ہی نیلے رنگ کے غلاف میں لپٹے ہوئے بیت اللہ شریف کا وہ منظر آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔اپنی کمسنی کے باوجود میں جلال و جمال کے اس پیکر مجسم کو دیکھ کر دم بخود ہو گیا تھا، لیکن مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ منظر میں پہلے بھی دیکھ چکا ہوں۔میرے بڑوں پر گریہ طاری تھا، اور اسی عالم میں طواف شروع ہو گیا۔راستے میں آتے ہوئے میں حج کی کتاب میں طواف کا طریقہ پڑھتا آیا تھا، تصور نے حجر اسود اور رکن یمانی کی نہ جانے کتنی تصویریں بنائی ہوئی تھیں، اور طواف کی جو دعائیں کتاب میں لکھی تھیں، وہ بھی کچھ نہ کچھ یاد کر رکھی تھیں، لیکن یہاں پہنچ کر سب کچھ بھول چکا تھا، چنانچہ بے سمجھے بوجھے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پیچھے پیچھے چل کر طواف پورا کیا۔

اب صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنی تھی۔ اُس وقت مسعیٰ یعنی سعی کی جگہ اس طرح الگ نہیں تھی جیسی آج ہے، بلکہ صفا اور مروہ کے درمیان ایک عام سی سڑک تھی جس کے دونوں طرف دوکانیں بھی تھیں، اور اس سڑک پر ہاکروں کے ٹھیلے بھی کھڑے ہوتے تھے، اور گاڑیاں بھی چلتی تھیں۔ انہی دوکانوں اور گاڑیوں کے درمیان سعی بھی کرنی ہوتی تھی۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے شروع میں تو ہم بچوں کو اپنے ساتھ رکھا ،لیکن جب دیکھا کہ ہنگامے میں بچوں کے کچل جانے یا گم ہوجانے کا اندیشہ ہے، تو انہوں نے ایک ہاتھ گاڑی کرائے پر لیکر ہم تینوں بچوں کو اُس پر بٹھا دیا ،اور گاڑی والے کو تاکید کی کہ وہ ساتھ رہے، ساتھ ہی اُس سے ایک جگہ متعین کرلی جہاں الگ ہوجانے کی صورت میں وہ سعی کے بعد اُن سے مل جائے۔ لیکن گاڑی میں بیٹھنے کے کچھ ہی دیر بعد کسی ریلے میں حضرت والد صاحبؒ، والدہ صاحبہؒ اور بھائی جان، رحمۃ اللہ علیہم، ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوگئے ،اور جب اپنے آپ کو ہم نے ایک ایسے اجنبی کے حوالے دیکھا جو نہ ہماری بات سمجھتا تھا، اور نہ ہم اُس کی، تو ہمارا صبر وضبط جواب دے گیا، اور ہم تینوں نے تقریباً رونا شروع کردیا، پھر یاد نہیں کہ کس طرح سعی پوری ہوئی، اور کس طرح ہم حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے ملے۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ایک دوست حاجی داود مائت صاحب مرحوم مکہ مکرمہ ہی میں مقیم تھے، اور انہوں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے فرمایا کہ قیام کسی معلم کے بجائے اُن کے گھر پر ہو۔ اُس وقت کے حرم شریف کا نقشہ دیکھنے والے اب خال خال ہی رہ گئے ہوں گے۔ حرم شریف اُس وقت صرف (قدیم) ترکی عمارت کی حد تک محدود تھا، اور اُس کے چاروں طرف حرم شریف سے بالکل متصل تین تین منزلہ فلیٹ بنے ہوئے تھے۔ آجکل جہاں باب الفتح کی اندرونی سیڑھیاں واقع ہیں، اُن کے قریب حرم کا ایک چھوٹا سا دروازہ باب الرباط کہلاتا تھا۔ اسی باب الرباط سے سیڑھیاں اُن رہائشی فلیٹوں پر چڑھتی تھیں، اور تیسری منزل پر حاجی داود مائت صاحب مرحوم کا گھر تھا۔ اسی گھر کے ایک ایسے کمرے میں قیام ہوا کہ اس کی کھڑکی حرم شریف میں کھلتی تھی، اور وہاں سے بیت اللہ شریف، میزاب رحمت اور حطیم کا منظر ہر وقت سامنے تھا۔

منیٰ میں اُس وقت تھوڑی سی آبادی بھی تھی ، اور حاجی داود مائت صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے منیٰ میں ایک مکان کرائے پر لیا تھا جس میں ہم سب کا قیام ہوا۔ اور اگلے دن عرفات کیلئے روانگی۔ اُس عمر میں مناسک حج کا شعور تو کیا ہوتا؟ اتنا یاد ہے کہ حد نظر تک پھیلے ہوئے خیموں اور تمام انسانوں کا ایک ہی جیسا لباس میرے

لئے ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ گرمی کی شدت کے باوجود لوگ انتہائی جوش وخروش کے ساتھ تلبیہ پڑھتے ہوئے جبل رحمت کی طرف رواں دواں تھے۔ اُس روز گرمی انتہائی شدید تھی، اس کے باوجود حضرت والد صاحبؒ شروع میں جبل الرحمۃ تک پہنچنے کی کوشش میں خیمے سے روانہ ہوگئے، لیکن پھر لوگوں نے بتایا کہ اگر وہاں تک پہنچ بھی گئے، تو واپسی میں خیمے اکھڑنے کی وجہ سے اپنے خیمے تک پہنچنا ناممکن ہوجائے گا، چنانچہ واپس خیمے میں آکر والدہ صاحبہ اور بھائی جان کے ساتھ نہایت خضوع وخشوع کے ساتھ وقوف میں مشغول رہے۔

غروب آفتاب کے بعد وہاں سے روانہ ہوکر مزدلفہ پہنچے۔ مزدلفہ اُس وقت ایک ریتیلا صحرا تھا جہاں چاند کی چاندنی کے سوا کوئی روشنی نہیں تھی، اور کھلے آسمان کے نیچے ٹھنڈی ریت دن بھر کی شدید گرمی کے بعد ایک عظیم نعمت تھی۔ سب تھکے ہوئے تھے، لیکن سونے سے پہلے سامان کی حفاظت اس لئے ضروری تھی کہ اُن دنوں وہاں چوری، ڈاکوں کی کافی کثرت ہوا کرتی تھی۔ یہ سعودی حکومت کے بانی سلطان عبدالعزیز، رحمہ اللہ تعالی، کی حکومت کا دور تھا، اور ابھی امن وامان کی صورت حال پوری طرح قابو میں نہیں آئی تھی۔ چنانچہ سب بڑوں نے یہ طے کیا کہ سامان کو بیچ میں رکھ کر اُس کے چاروں طرف بستر لگا لئے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حفاظت کا یہ سامان کرنے کے بعد سب لوگ لیٹتے ہی سو گئے۔ صبح جب آنکھ کھلی، تو دیکھا کہ سامان میں سے ایک بکس غائب ہے جس میں ہم گھر والوں کا سارا سامان تھا۔ اس میں احرام کھولنے کے بعد پہننے کے کپڑے بھی تھے اور کچھ نقدی بھی، اور پاسپورٹ وغیرہ بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت کی غرض سے چونکہ اس بکس کو درمیان میں رکھ کر سب سوئے ہوئے تھے، اس لئے چور سمجھ گیا کہ اصل مال اسی میں ہے جس کی اتنی حفاظت کی جارہی ہے۔ اور اس طرح یہ غیر معمولی حفاظت ہی چوری کا سبب بن گئی۔ متنبی نے ایسے ہی مواقع کے لئے کہا ہے کہ:

الأمر لله رُبَّ مجتهد
ما خاب إلاَّ لأنَّه جاهد
ومتّقٍ والسّهام مرسلة
يحيد من حابض إلى صارد

یعنی: معاملہ تو اللہ تعالی کے ہاتھ میں ہے، بہت سے کوشش کرنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی

کوشش ہی کی وجہ سے ناکام ہوتے ہیں۔ اگر تیر کسی شخص کے سامنے سے آرہے ہوں، تو وہ ان سے بچنے کے لئے ان کے سامنے سے ہٹ کر نشانے سے الگ جاکر کھڑا ہوتا ہے، لیکن تیر بھٹک کر اسی کے پاس پہنچ جاتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ ہمارے گھرانے کے تمام افراد اس حالت میں رہ گئے کہ احرام کی چادروں کے سوا اُن کے پاس کچھ بھی نہیں بچا۔ چنانچہ جب اُس روز منیٰ واپس پہنچے، اور قربانی کے بعد احرام کھولنے کا وقت آیا، تو حضرت والد صاحبؒ بھائی جان مرحوم اور میرے پاس پہننے کے لئے کوئی سلا ہوا کپڑا نہیں تھا۔ آخر حاجی داود ثابت صاحبؒ اور ان کے صاحب زادوں نے اپنے کپڑے پہننے کے لئے دیئے، اور تین دن تک ہم اُنہی کپڑوں میں رہے۔ اب یاد نہیں کہ پاسپورٹ گم ہونے کے بعد حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے کیا انتظام فرمایا تھا۔

جاری ہے.....

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دار العلوم کراچی

یادیں

(آٹھویں قسط)

حج کے بعد بھی کچھ دن مکہ مکرمہ میں رہنا ہوا، اور ان دنوں میں، میں اپنی والدہ صاحبہ، رحمۃ اللہ علیہا، کو طواف کے لئے لے جاتا، اور طواف کی دعائیں مجھے تقریباً سب یاد ہوگئی تھیں، وہ میں زور زور سے پڑھتا رہتا، اور بہت سی خواتین بھی وہ دعائیں دہراتی جاتی تھیں۔

مکہ مکرمہ اُس وقت چھوٹا سا شہر تھا، اور ہماری پہنچ حرم شریف کے باہر اپنے قریب ایک مسقف بازار تک تھی، جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ "سوق المدعیٰ" "یا" سوق اللیل " کہلاتا تھا۔ (اب نئی توسیع میں یہ بازار بھی ختم ہوگیا ہے) حاجی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے صاحب زادے ہمارے دوست بن چکے تھے، (اور آجکل ان کے بیٹے یعنی حاجی صاحب مرحوم کے پوتے) عطریات کی مشہور دوکان "السرتی" کے مالک ہیں) وہ کبھی کبھی ہمیں اس بازار میں لے جایا کرتے تھے۔ اُس زمانے میں پاکستانی روپیہ سولہ آنے کا ہوتا تھا، اور ایک ریال کی قیمت بیس آنے تھی، اور اُس بازار میں ایک ریال میں ایک شربت ملا کرتا تھا، جو مجھے بہت پسند تھا۔ جو وقت طواف کرنے یا کرانے سے بچتا، اس میں باہر نکل کر وہ شربت پینے کے سوا کوئی اور مصروفیت نہیں تھی۔

مکہ مکرمہ کے بعد مدینہ منورہ جانے کا وقت آیا، تو معلوم ہوا کہ وہاں جانے کے لئے پکی سڑک موجود نہیں ہے، اور بس میں جانا خطرے سے خالی نہیں، کیونکہ کچی سڑک پر جب ڈرائیور گاڑی دوڑاتے ہیں، تو بسا اوقات مسافروں کے سروں کے چھت سے ٹکرانے کی وجہ سے لوگ زخمی ہوجاتے ہیں، اور وقت بھی بہت زیادہ لگتا ہے۔ اس لئے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے جہاز سے سفر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے دوبارہ جدہ پہنچے۔ معلوم ہوا کہ جہاز مغرب کے قریب کسی وقت روانہ ہوگا۔ چنانچہ ہم عصر کے قریب ہوائی اڈے پہنچے۔ ہوائی اڈہ کیا تھا؟ چھوٹی سی عمارت تھی، اور اُس میں اتنی جگہ نہیں تھی کہ مسافروں کو انتظار کیلئے بٹھایا

جاسکے۔ اس لئے تمام مسافروں کو عمارت کے باہر ریت پر بیٹھ کر انتظار کرنا تھا۔ ہم سب وہیں کپڑا بچھا کر بیٹھ گئے۔ میرے لئے یہ ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا پہلا موقع تھا، اس لئے مدینہ منورہ کی حاضری کے اشتیاق کے علاوہ یہ بچکانہ شوق بھی شامل تھا کہ اس نئی سواری میں سفر ہوگا۔ مغرب کے قریب کسی وقت جہاز کی روانگی کا اعلان تھا، لیکن مغرب کے بعد وہیں بیٹھے بیٹھے عشاء ہوگئی، مگر جہاز کی روانگی کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ عشاء کے بعد بھی انتظار کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ بہت رات بیت گئی، اور مسافر سونے لگے۔

رات بارہ بجے کے قریب جہاز کا ایک نمائندہ آیا، اُس کے پاس مسافروں کی فہرست تھی۔ اُس نے ایک ایک مسافر کا نام پکار کر حاضری لینی شروع کی، لیکن آخر میں کسی خاتون کے نام کے ساتھ "مسماۃ" لکھا ہوا تھا، وہ اُسے بھی کسی کا نام سمجھا، اور بار بار "مسماۃ" "مسماۃ" پکارتا رہا، اس نام پر کوئی جواب کیا آتا؟ چنانچہ وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک "یہ نام" پکارتا ہی چلا گیا۔ آخر میں شاید بھائی جان نے اُسے سمجھایا کہ یہ کوئی نام نہیں ہے، بلکہ خواتین کے ناموں کے ساتھ یہ لفظ لکھا جاتا ہے۔ بہرحال! اُس کے حاضری لینے سے کچھ امید بندھی کہ شاید اب جہاز میں سوار ہونے کے لئے بلایا جائے، لیکن اُس کے جانے کے بعد بھی کئی گھنٹے گذر گئے، اور کوئی بلانے نہ آیا، یہاں تک کہ پوری رات اسی طرح گذر گئی۔ جب صبح صادق کا وقت قریب آیا، تو معلوم ہوا کہ اب جہاز روانہ ہونے والا ہے، اور مسافروں کو جہاز میں بٹھایا جارہا ہے۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے فرمایا کہ اب جہاز میں بیٹھنے کا مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز قضا ہو، اس لئے قصداً اتنی دیر مزید رکے رہے کہ فجر کی نماز پڑھی جاسکے۔ نماز کے بعد جہاز میں سوار ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا سا ڈکوٹا طیارہ تھا، اور میرے لئے کسی فضائی سفر کا پہلا اتفاق تھا، اس لئے میں اس سے خوب خوب محظوظ ہوا۔

مدینہ منورہ کا رن وے اُس وقت پکا نہیں تھا، بلکہ بجری کا بنا ہوا تھا۔ جہاز کا پہیہ جب زمین سے لگا تو فضا میں بہت سی بجری اُڑی، اور پھر جہاز اترنے کے بجائے دوبارہ اوپر اُٹھ گیا، پھر کچھ بلندی پر جاکر اُس کا پہیہ دوبارہ زمین سے لگا، لیکن ایک بار پھر اُترنے کے بجائے پھر اوپر چلا گیا۔ ایسا شاید تین یا چار مرتبہ ہوا، اور اُس کے بعد وہ زمین پر اُتر سکا۔ میں نے یہ سمجھا کہ شاید جہاز اسی طرح ہمیشہ اُترا کرتا ہوگا، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ جہاز میں کوئی خرابی تھی جس کی وجہ سے ایمرجنسی بھی پیدا ہوسکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ تیسری یا چوتھی کوشش میں وہ اُترنے میں کامیاب ہوگیا۔ نیچے اترے تو دیکھا کہ مدینہ منورہ کے ہوائی اڈہ پر ایک چھوٹے سے کمرے

کے سوا کوئی عمارت نہیں تھی۔

میری عمر کا اُس وقت آٹھواں سال تھا، لیکن شروع ہی سے مدینہ منورہ کی محبت دل میں سمائی ہوئی تھی، اور اس مقدس شہر میں حاضری ایک سہانا خواب معلوم ہورہی تھی۔ اُس وقت مسجد نبوی (علی صاحبہ السلام) کا شمالی دروازہ جو باب المجیدی کہلاتا تھا، ترکی عمارت کے پہلے صحن کے کنارے ہوتا تھا، یعنی مسجد کی لمبائی موجودہ لمبائی کا بمشکل چھٹا حصہ ہوگی۔ دروازے کے سامنے تھوڑے سے کھلے حصے کے بعد ایک سرنگ نما راستہ تھا جس کے دونوں طرف دوکانیں بھی تھیں، اُس کے بعد ایک عمارت "اصطفا منزل" کہلاتی تھی جو حضرت والد صاحبؒ کے ایک دوست اور لکھنو کے ایک متدین تاجر حاجی اصطفا خان صاحب مرحوم نے حجاج اور زائرین کے مفت قیام کیلئے بنائی ہوئی تھی۔ ہمارا قیام اسی کے تہ خانے میں ہوا۔ اس تہ خانے کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک کنواں تھا، اور یہ وہی کنواں تھا جو حضرت ابوطلحہ انصاری، رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے باغ میں واقع تھا، اور اُسے بیر حاء یا بئر طلحہ کہا جاتا تھا۔ جب سورۂ آل عمران کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

لَنْ تَنَالُوْا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ

"تم ہرگز نیکی کا مقام حاصل نہیں کروگے جب تک اُن چیزوں میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جو تمہیں محبوب ہیں"۔

صحابۂ کرام، رضی اللہ تعالیٰ عنہم، اس بات کے بہت خواہش مند رہتے تھے کہ نیکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ چنانچہ ان میں سے تقریباً ہر ایک نے یہ جائزہ لینا شروع کیا کہ اسے اپنے مال میں سے کون سا مال زیادہ پسند اور محبوب ہے۔ پھر ہر صحابی نے اپنی سب سے زیادہ پسندیدہ چیزیں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے صدقہ کرنی شروع کردیں۔ اس کے بہت سے واقعات روایتوں میں آئے ہیں(۱)۔ انہی میں سے حضرت ابوطلحہ انصاری، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، بھی تھے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے اپنا باغ بیر حاء سب سے زیادہ محبوب ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ وہ صدقہ کردوں۔ آپ نے فرمایا کہ: "واہ! وہ تو بڑا نفع بخش مال ہے، اور میری رائے ہے کہ وہ تم اپنے رشتہ داروں کو صدقہ کردو" چنانچہ

۱۔ ان روایتوں کی تفصیل تفسیر معارف القرآن ج ۲ ص ۱۰۸ میں چوتھے پارے کی پہلی آیت کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

انہوں نے ایسا ہی کیا۔ صحیح بخاریؒ کی حدیث میں ہے کہ یہ باغ مسجد نبوی کے سامنے واقع تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کو اس کے کنویں کا پانی بہت پسند تھا، اور آپ وہ شوق سے پیا کرتے تھے۔ یہ سعادت ہمارے حصے میں آئی کہ اس بابرکت کنویں کے قریب ہمیں دو مرتبہ قیام کی توفیق ہوئی، اور اُس کنویں کی برکتوں سے ہم سیراب ہوئے۔ اب اصطفا منزل کی وہ عمارت اور وہ کنواں مسجد کے توسیع شدہ حصے میں شامل ہوگئے ہیں۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہمیں مسجد نبوی میں لے گئے، اُس کے ایک ایک حصے کا تعارف کرایا، اور پھر سرکار رسالت مآب، صلی اللہ علیہ وسلم، کے روضۂ اقدس پر حاضری اور سلام عرض کرنے کی توفیق ہوئی۔ مجھے پوری طرح یاد نہیں کہ ہم کتنے دن مدینہ منورہ میں رہے، لیکن غالباً آٹھ دن قیام رہا۔ اس دوران حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہمیں مختلف زیارتوں کے لئے لے گئے جن میں جنت البقیع کے بعد سب سے پہلے ہم احد پہاڑ کی زیارت کے لئے گئے تھے۔ وہاں شہداء احد کو سلام عرض کیا، اور میں نے دیکھا کہ حضرت والد صاحبؒ، بھائی جان اور دوسرے رفقاء اس بات کا اندازہ لگاتے رہے کہ مشرکین کی فوج کہاں تھی، اور مسلمانوں کا لشکر کس طرف تھا، نیز وہ ٹیلہ جس پر آنحضرت، صلی اللہ علیہ وسلم، نے تیراندازوں کو مقرر فرمایا تھا، وہ کونسا ٹیلہ تھا۔ اس ٹیلے کو "جبل الرماۃ" کہا جاتا ہے، اور اس بات کی تحقیق ہوتی رہی کہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے کس طرف سے آکر اس ٹیلے پر حملہ کیا ہوگا؟ لیکن کوئی یقینی بات سامنے نہ آسکی۔ انہی زیارتوں کے دوران ہم مسجد قبلتین بھی گئے، یعنی وہ مسجد جس میں پہلی بار بیت المقدس کے بجائے کعبہ شریف کو قبلہ بنانے کے احکام آئے، اور نماز کے دوران ہی آنحضرت، صلی اللہ علیہ وسلم، نے اپنا رخ کعبہ شریف کی طرف پھیرلیا۔ اس وقت یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اور اس میں دو چھوٹی چھوٹی محرابیں ایک دوسری کے مقابل بنی ہوئی تھیں۔ ایک محراب شمال کی طرف یہ بتانے کے لئے تھی کہ نماز بیت المقدس کی طرف رخ کرکے شروع کی گئی تھی، اور دوسری محراب جنوب میں تھی جس کا رخ کعبہ شریف کی طرف تھا، اور نماز کے دوران ہی رخ اس طرف پھیرلیا گیا تھا۔ اسی طرح غزوۂ احزاب کی جگہ بھی حاضری ہوئی، اور میں نے اپنے بڑوں کو یہ اندازے لگاتے ہوئے دیکھا کہ خندق کس جگہ اور کہاں سے کہاں تک کھودی گئی ہوگی۔ نیز مسجد قبا حاضری ہوئی۔ اس وقت یہ بھی ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اس کے اندر ایک خاص جگہ دیوار سے نکلا ہوا ایک سریا اس بات کی علامت تھی کہ اس جگہ حضور اقدس، صلی اللہ علیہ وسلم، امامت فرمایا کرتے تھے۔ نیز مسجد کے صحن میں بھی ایک چھوٹی سی محراب بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی آکر بیٹھی تھی۔

مسجد قبا کے مغربی دروازے کے سامنے ایک باغ تھا۔ اسی باغ میں وہ مشہور کنواں تھا جس کا ذکر احادیث میں "بئر اریس" کے نام سے آیا ہے۔ صحیح بخاری میں اس کے بارے میں یہ روایت آئی ہے :

صحیح البخاری (۸:۵)

عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيِّبِ، قَالَ :أَخْبَرَنِي أَبُو مُوسَى الْأَشْعَرِيُّ، أَنَّهُ تَوَضَّأَ فِي بَيْتِهِ، ثُمَّ خَرَجَ، فَقُلْتُ :لَأَلْزَمَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلَأَكُونَنَّ مَعَهُ يَوْمِي هَذَا، قَالَ :فَجَاءَ الْمَسْجِدَ فَسَأَلَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالُوا :خَرَجَ وَوَجَّهَ هَا هُنَا، فَخَرَجْتُ عَلَى إِثْرِهِ أَسْأَلُ عَنْهُ حَتَّى دَخَلَ بِئْرَ أَرِيسٍ، فَجَلَسْتُ عِنْدَ الْبَابِ، وَبَابُهَا مِنْ جَرِيدٍ حَتَّى قَضَى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَاجَتَهُ فَتَوَضَّأَ، فَقُمْتُ إِلَيْهِ فَإِذَا هُوَ جَالِسٌ عَلَى بِئْرِ أَرِيسٍ وَتَوَسَّطَ قُفَّهَا، وَكَشَفَ عَنْ سَاقَيْهِ وَدَلَّاهُمَا فِي الْبِئْرِ، فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ انْصَرَفْتُ فَجَلَسْتُ عِنْدَ الْبَابِ، فَقُلْتُ لَأَكُونَنَّ بَوَّابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْيَوْمَ، فَجَاءَ أَبُو بَكْرٍ فَدَفَعَ الْبَابَ، فَقُلْتُ :مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ :أَبُو بَكْرٍ، فَقُلْتُ :عَلَى رِسْلِكَ ثُمَّ ذَهَبْتُ، فَقُلْتُ :يَا رَسُولَ اللَّهِ، هَذَا أَبُو بَكْرٍ يَسْتَأْذِنُ؟ فَقَالَ :ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ .فَأَقْبَلْتُ حَتَّى قُلْتُ لِأَبِي بَكْرٍ :ادْخُلْ، وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُبَشِّرُكَ بِالْجَنَّةِ، فَدَخَلَ أَبُو بَكْرٍ فَجَلَسَ عَنْ يَمِينِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَعَهُ فِي الْقُفِّ، وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي الْبِئْرِ كَمَا صَنَعَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَشَفَ عَنْ سَاقَيْهِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، وَقَدْ تَرَكْتُ أَخِي يَتَوَضَّأُ وَيَلْحَقُنِي، فَقُلْتُ :إِنْ يُرِدِ اللَّهُ بِفُلاَنٍ خَيْرًا -يُرِيدُ أَخَاهُ- يَأْتِ بِهِ، فَإِذَا إِنْسَانٌ يُحَرِّكُ الْبَابَ، فَقُلْتُ :مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ :عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَقُلْتُ عَلَى رِسْلِكَ، ثُمَّ جِئْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ، فَقُلْتُ :هَذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ يَسْتَأْذِنُ؟ فَقَالَ :ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ، فَجِئْتُ فَقُلْتُ :ادْخُلْ، وَبَشَّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجَنَّةِ، فَدَخَلَ فَجَلَسَ مَعَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْقُفِّ عَنْ يَسَارِهِ، وَدَلَّى رِجْلَيْهِ فِي الْبِئْرِ، ثُمَّ رَجَعْتُ فَجَلَسْتُ، فَقُلْتُ :إِنْ يُرِدِ اللَّهُ بِفُلاَنٍ خَيْرًا يَأْتِ بِهِ، فَجَاءَ إِنْسَانٌ يُحَرِّكُ الْبَابَ، فَقُلْتُ :مَنْ هَذَا؟ فَقَالَ :عُثْمَانُ بْنُ عَفَّانَ، فَقُلْتُ :عَلَى رِسْلِكَ، فَجِئْتُ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ :ائْذَنْ لَهُ وَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ، عَلَى بَلْوَى تُصِيبُهُ فَجِئْتُهُ فَقُلْتُ لَهُ :ادْخُلْ، وَبَشَّرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْجَنَّةِ عَلَى بَلْوَى تُصِيبُكَ، فَدَخَلَ فَوَجَدَ الْقُفَّ قَدْ

مُلِیءَ فَجَلَسَ وِجَاهَهُ مِنَ الشِّقِّ الْآخَرِ قَالَ شَرِیکُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، قَالَ سَعِیدُ بْنُ الْمُسَیِّبِ" فَأَوَّلْتُهَا قُبُورَهُمْ"

اس روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک دن یہ طے کیا کہ سارے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہوں گا۔ میں مسجد نبوی پہنچا، تو آپ کو نہیں پایا۔لوگوں نے ایک خاص سمت کی طرف اشارہ کر کے مجھے بتایا کہ آپ اس طرف تشریف لے گئے ہیں۔ میں آپ کو اس سمت میں تلاش کرتے ہوئے چلا، تو آپ کو دیکھا کہ آپ بئر اریس میں تشریف لے گئے، پھر آپ نے قضائے حاجت کے بعد وضو فرمایا، اور اپنی مبارک پنڈلیاں کھولیں، اور اس کنویں کے بیچ میں پاؤں لٹکا کر تشریف فرما ہو گئے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرماتے ہیں کہ میں باغ کے دروازے پر پہنچا، اور کہا کہ آج میں حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دربانی کا فریضہ انجام دوں گا۔ اتنے میں حضرت ابوبکر، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وہاں تشریف لائے، اور دروازے کو دھکا دیا، میں نے پوچھا کون ہے؟ انہوں نے جواب دیا: "ابوبکر "میں نے کہا" : ذرا ٹھہریے "پھر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گیا، اور عرض کیا کہ "ابوبکر آئے ہیں، اور آپ سے اندر آنے کی اجازت مانگ رہے ہیں، تو آپ نے فرمایا کہ :انہیں بلالو، اور انہیں جنت کی خوشخبری دیدو۔ "چنانچہ وہ تشریف لائے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں طرف کنویں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں کہ میں واپس آکر دروازے پر بیٹھ گیا، میں اس وقت اپنے بھائی کو وضو کرتے ہوئے چھوڑ کر آیا تھا، میرے دل میں آیا کہ اگر وہ بھی اس وقت آجائیں تو اچھا ہو، (تاکہ میں ان کے لئے بھی اجازت لوں، اور انہیں بھی جنت کی خوشخبری مل جائے) لیکن اس مرتبہ دروازے پر حرکت ہوئی، تو حضرت عمر، رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئے، میں نے ان کے لئے اجازت مانگی، تو ان کو بھی آپ نے اجازت دی، اور ساتھ ہی جنت کی خوشخبری بھی عطا فرمائی۔ وہ آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بائیں جانب کنویں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ پھر حضرت عثمان، رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے، آپ نے انہیں بھی اجازت دی، اور فرمایا کہ انہیں جنت کی بشارت دے دو، اور اس کے ساتھ ایک آزمائش کی بھی جو انہیں پیش آئے گی۔ اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنے کی جگہ نہیں رہی تھی، اس لئے وہ آپ کے سامنے کی طرف کنویں میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ حضرت سعید بن المسیب، رحمۃ اللہ علیہ، جو یہ حدیث حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کررہے ہیں، یہ واقعہ بیان کر کے فرماتے ہیں کہ مجھے اس میں یہ

اشارہ محسوس ہوا کہ وفات کے بعد حضرت ابوبکر اور حضرت عمر، رضی اللہ تعالیٰ عنہما، کی قبریں تو آپ کے ساتھ بنیں، اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کی قبر ان حضرات کے ساتھ نہیں، بلکہ انکے سامنے بقیع میں بنی۔ (صحیح بخاری، مناقب)

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جب اس کنویں کے پاس پہنچے، تو آپ بھی اس میں پاؤں لٹکا کر بیٹھے، بھائی جان بھی، اور ان کی تقلید میں میں نے بھی ایسا ہی کیا۔

اس کنویں کی دوسری خاص بات یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خطوط بھیجنے کے لئے ایک انگوٹھی بنوائی تھی جس پر "محمد رسول اللہ" کے مبارک الفاظ نقش تھے۔ آپ کی وفات کے بعد یہ انگوٹھی حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہی، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آئی، اس کے بعد حضرت عثمانؓ کے پاس رہی (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ یہ انگوٹھی پہنے ہوئے بئر اریس پر بیٹھے، اور ہاتھ سے انگوٹھی نکال کر اسے الٹنے پلٹنے لگے۔ اتنے میں وہ انگوٹھی کنویں میں گر گئی۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم تین دن تک اسے کنویں میں تلاش کرتے رہے، وہ نہ ملی، تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کنویں کا پورا پانی نکال کر دیکھا، تب بھی وہ نہ مل سکی۔ (صحیح بخاری، **باب هل يجعل نقش الخاتم ثلاثة أسطر**) اس لئے اس کنویں کو بئر الخاتم (انگوٹھی کا کنواں) بھی کہا جاتا ہے۔

اس کنویں پر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ آٹھ سال کی عمر میں پہلی بار حاضری ہوئی تھی، پھر ۱۹۶۳ء میں اور غالباً ۱۹۶۴ء میں بھی۔ اس کے بعد جب حاضری ہوئی تو حکومت نے اس باغ اور کنویں کو ختم کر کے سڑک میں شامل کر دیا۔

مدینہ منورہ کے قیام کے دوران جنت البقیع بھی کئی بار حاضری ہوئی، وہ اس وقت زائرین کے لئے کھلا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی یاد ہے کہ میرا ایک بچپن کا دانت وہاں ٹوٹا تھا تو میری والدہ صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ، نے فرمایا تھا کہ یہ دانت جنت البقیع میں دفن کر دو، تاکہ کم از کم تمہارے جسم کا ایک حصہ جنت البقیع میں دفن ہو جائے۔ چنانچہ میں نے بڑے شوق سے جنت البقیع کی ایک جگہ زمین کھود کر دانت وہاں دفن کیا۔

اُس سفر حج کی بس یہی کچھ باتیں ہیں جو دھندلی دھندلی یاد رہ گئی ہیں۔ اور اُس کے بعد واپسی میں سفینۂ عرب کا سفر، اور یہ بات بھی کہ جہاز کے سفر ہی کے دوران یہ خبر ملی کہ پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان صاحب مرحوم کو راولپنڈی کے کمپنی باغ میں شہید کر دیا گیا۔ ۱۶/اکتوبر ۱۹۵۱ء کی تاریخ تھی،

اور اس خبر کے ملتے ہی پورے جہاز میں صدمے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھوں میں بھی آنسو دیکھے۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے خلیفہ حضرت حاجی محمد افضل صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھی اس جہاز میں ہم سفر تھے، اور جب وہ خبر پہنچی تو وہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی آبدیدہ تھے، اور بار بار یہ جملہ ان کی زبان پر تھا کہ "اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے" حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھی یہ لفظ بار بار دہراتے تھے، اور مجھے یاد ہے کہ یہ لفظ میں نے سب سے پہلے اُسی وقت سنا تھا۔ جہاز کا جھنڈا کئی دن سرنگوں رہا، یہاں تک کہ جہاز کراچی کے ساحل تک پہنچ گیا۔

جاری ہے.....

☆☆☆
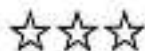
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(نویں قسط)

ابتدائی تعلیم

ہمارے گھر کی قریبی مسجد باب الاسلام تھی، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُسی میں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اُس میں امدادالعلوم کے نام سے ایک چھوٹا سا مدرسہ قائم تھا، لیکن وہ ایک مکتب کی شکل میں تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے وہاں کچھ عربی اور فارسی کی تعلیم کے لئے کچھ اساتذہ کو جمع کیا جن میں حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی، رحمۃ اللہ علیہ، سب سے بڑے استاذ تھے۔ (یہ وہی بزرگ ہیں جو پہلے دارالعلوم، پھر بنوری ٹاؤن میں اور اُس کے بعد سوات میں ایک اپنے قائم کئے ہوئے مدرسے میں فرائض تدریس انجام دیتے رہے، اوران کا قدرے مفصل تذکرہ میں نے نقوش رفتگاں میں کیا ہے) ان کے علاوہ حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ اور حضرت مولانا امیر الزماں کشمیری صاحب، رحمۃ اللہ علیہما، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مسجد کے مرکزی دروازے کی چھت پر ایک کمرہ بنوا کر اُس میں دارالافتاء قائم فرمادیا تھا، کیونکہ پاکستان منتقل ہونے کے بعد حضرت والد صاحبؒ کے پاس استفتاء تو مسلسل آتے تھے، لیکن نہ انہیں نقل کرنے کا کوئی انتظام تھا، نہ محفوظ رکھنے کا۔ حضرت والد صاحبؒ خود ہی ڈاک وصول کرنے اور روانہ کرنے کے کام انجام دیتے تھے۔ اب اس دارالافتاء میں فتویٰ نویسی، فتاویٰ کو نقل کرنے اور مستفتیوں سے رابطہ رکھنے کا ایک باقاعدہ نظم قائم ہوگیا، اور اُس میں ایک بزرگ جن کا اسم گرامی اب مجھے یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آرہا ہے، نقل فتاویٰ کیلئے مقرر فرمالئے گئے۔

اُس وقت حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے ساتھ ملحق ادارے "بورڈ تعلیمات اسلامیہ" کے رکن بھی تھے۔ میں "حمد باری" جیکب لائن میں پڑھ چکا تھا۔ حضرت والد صاحبؒ نے مجھے فارسی کی کتاب "گلزار دبستاں" شروع کروائی، اور مجھے اُس کتاب کا تھوڑا سا سبق دیکر اپنے ساتھ

اسبلی لے جاتے، اور میں وہاں بیٹھ کر سبق یاد کرتا رہتا، پھر حضرت والد صاحبؒ وہ سبق سنتے تھے۔ میرے ساتھ حضرت والد صاحبؒ کا معاملہ بڑی ہی شفقت کا رہا، لیکن صرف ایک دن انہوں نے مجھے ایک طمانچہ مارا۔ گلزار دبستاں میں ایک جگہ بندر کا فارسی لفظ "بوزینہ" آیا ہے۔ میں اُسے بار بار "بوزنہ" پڑھتا تھا۔ حضرت والد صاحبؒ نے کئی بار سمجھایا کہ یہ لفظ "بوزنہ" نہیں بلکہ "بوزینہ" ہے۔ مگر نہ جانے کیوں میری زبان پر "بوزنہ" ہی چڑھا ہوا تھا، اور بار بار کی تنبیہ کے باوجود جب وہ لفظ آتا تو میں "بوزنہ" ہی پڑھتا تھا۔ اس پر ایک دن انہوں نے مجھے ایک طمانچہ مارا، اور دماغ درست ہوگیا۔ پھر کبھی اس لفظ کے تلفظ میں یہ غلطی نہیں کی۔ اُس کے بعد انہوں نے مجھے ایک مرتبہ اور مارا تھا، اور وہ نماز فجر کے لئے بیدار نہ ہونے پر۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائیں۔ ان دو واقعات کے علاوہ انہوں نے مجھے کبھی نہیں مارا۔

جب مسجد باب الاسلام میں باقاعدہ تعلیم شروع ہوگئی، تو انہوں نے مجھے حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی، رحمۃ اللہ علیہ، کے سپرد فرمادیا۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحبؒ بڑے فاضل بزرگ تھے، اور ان کی شخصیت بڑی بارعب تھی۔ میں تو اپنی بے قاعدہ تعلیم کے دوران "گلزار دبستاں" ہی میں اٹکا ہوا تھا، لیکن کچھ طلبہ اوپر کی جماعت کے بھی آگئے تھے، جن میں مولانا اشرف علی صاحب لاہوری مدظلہم اور مولانا محمد اسماعیل بلخی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے ان کو گلستاں، بوستاں، احسن القواعد وغیرہ کا درس دینا شروع کردیا، اور مجھے بھی کبھی کبھی سبق دیدیتے تھے، اور ساتھ ہی انہوں نے خوشخطی سکھانے کے لئے مجھے اُن بزرگ کے حوالے کردیا جو دارالافتاء میں نقل فتاویٰ کی خدمت انجام دیتے تھے۔ شام کے وقت حضرت مولانا فضل محمد صاحب، قدس سرہ، یہ دیکھا کرتے تھے کہ واقعۃً میں نے کچھ پڑھا بھی ہے یا نہیں۔ ان کی بارعب شخصیت سے مجھے اُس وقت ویسے ہی ڈر لگتا تھا، شام کے وقت اُن کے محاسبے کی فکر سارے دن رہا کرتی تھی۔

اسی وقت کا ایک لطیفہ یاد آیا کہ میں تو ابتدائی فارسی پڑھا کرتا تھا، اور وہ بھی بے قاعدہ، لیکن دارالافتاء کے وہ بزرگ جو مجھے خوشخطی سکھاتے تھے، کسی کسی طالب علم کو عربی بھی پڑھا دیا کرتے تھے۔ میں عربی عبارتوں میں یہ دیکھا کرتا تھا کہ اُن میں "إنّ" کا لفظ بہت کثرت سے آتا ہے، ایک دن میں نے اپنے اُن خوشخطی کے

استاذ سے پوچھا کہ "إنَّ" کے کیا معنیٰ ہیں؟ انہوں نے فرمایا: "تحقیق"۔ میرے پلّے کچھ نہ پڑا، تو اُس وقت میرے دل پر یہ تأثر قائم ہوا کہ عربی اتنی مشکل زبان ہے کہ اُس کا ترجمہ بھی کردو تب بھی سمجھ میں نہیں آتی۔

میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مدظلہم، اسی مدرسے میں جناب قاری فخرالدین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس حفظ قرآن کریم کی تکمیل کررہے تھے۔ جب ان کے حفظ کی تکمیل ہوگئی، تو ان کو بھی فارسی پڑھنی تھی۔ کچھ دن بعد حضرت مولانا امیر الزماں کشمیری صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھی تشریف لے آئے اور انہیں بھی اس مدرسے میں استاذ مقرر کردیا گیا، اور ہم دونوں نے کچھ اور ساتھیوں کے ساتھ باقاعدہ رہبر فارسی، تیسیر المبتدی وغیرہ ان سے پڑھنی شروع کردی۔ کوئی باقاعدہ درسگاہ تو تھی نہیں، اور مسجد میں تنخواہ لے کر پڑھانا شرعی اعتبار سے مناسب نہیں تھا، اس لئے حضرت مولانا، رحمۃ اللہ علیہ، ہمیں مسجد کے وضو خانے میں پڑھایا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے باقاعدہ طالب علم کی حیثیت سے پڑھائی شروع کی تھی، اور اللہ تعالیٰ حضرت مولانا امیر الزماں کشمیری صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائیں، انہوں نے انتہائی محبت اور شفقت سے ہمیں پڑھایا۔ وہ ایک مجاہد آدمی تھے اور ۱۹۴۸ء کے جہاد کشمیر میں اور اس کے بعد حیدرآباد دکن کے پولیس ایکشن کے دوران انہوں نے بذات خود جہاد میں حصہ لیا تھا جس کے واقعات وہ بڑے ذوق وشوق سے سنایا کرتے تھے۔ جہاد کا جذبہ ان کی رگ وپے میں سرایت کئے ہوئے تھا، اور ان کی صحبت میں ہمارے دل میں بھی جہاد کا ذوق وشوق پیدا ہوا، اور یہ دعا میری روزمرہ کی دعاؤں میں شامل ہوگئی کہ: "یا اللہ! ایک مجاہد کی زندگی اور ایک شہید کی موت عطا فرما۔"

دارالعلوم کراچی کا قیام

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے دل ودماغ پر کراچی آنے کے بعد یہ فکر شب وروز مسلط تھی کہ دینی تعلیم کے بڑے بڑے مراکز ہندوستان میں رہ گئے ہیں، اور جو علاقے پاکستان کے حصے میں آئے ہیں، اُن میں دینی مدارس کی تعداد بھی کم ہے، اور ان کا معیار تعلیم بھی کمزور۔ خاص طور پر کراچی میں کوئی بڑا مدرسہ نہیں تھا۔ کراچی کے ایک اندرونی محلے کھڈہ میں مظہر العلوم کے نام سے ایک واحد مدرسہ تھا جس میں دورۂ حدیث تک تعلیم ہوتی تھی، لیکن وہ شہر کی ضروریات کیلئے ناکافی تھا، اس لئے حضرت والد صاحبؒ اس فکر میں تھے کہ یہاں کوئی معیاری مدرسہ قائم ہو۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ محلہ نانک واڑہ میں سکھوں کا ایک اسکول تھا

جو سکھوں کے رخصت ہوجانے کے بعد سے ویران پڑا ہوا تھا۔ وہ تعلیمی مقاصد کے لئے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو حکومت کی طرف سے مل گیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے ساتھ مل کر اس عمارت کی صفائی کی، اور اللہ تعالیٰ کے نام پر وہاں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کرکے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی۔ اور ۱۱ ر شوال ۱۳۷۱ھ مطابق ۳ ر جولائی ۱۹۵۲ء کو دارالعلوم نے ایک منظم ادارے کی شکل میں کام کرنا شروع کیا۔ دارالعلوم کے پہلے سال تعلیم صرف مشکوۃ شریف کی حد تک تھی، دورۂ حدیث اُس سال نہیں تھا، اور مشکوۃ کا درس خود حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، دیا کرتے تھے۔

رمضان المبارک ۱۳۷۱ھ میں برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب، مدظلہم، نے حفظ کی تکمیل کرکے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رمضان ۱۳۷۱ھ (مطابق جون ۱۹۵۲ء) میں پہلی محراب مسجد باب الاسلام ہی میں حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے قائم کردہ دارالافتاء میں سنائی، اور عید کے بعد دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔

دارالعلوم کراچی کو اللہ تعالیٰ نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ وہ پاکستان بننے کے بعد پورے سندھ میں پہلا معیاری دینی مدرسہ تھا، بلکہ پورے پاکستان میں بھی چند گنے چنے ادارے ہی اُس وقت موجود تھے۔ اس لئے وہ بہت سے اُن علماء کرام کی علمی خدمات کا نقطۂ آغاز بنا جو ملک کے عظیم دینی رہنما ثابت ہوئے۔ مثلاً حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ (جن کو علماء کرام نے حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہما، کے بعد مفتی اعظم پاکستان کا خطاب دیا) کسی دینی ادارے کی عدم موجودگی کی وجہ سے اُس وقت ایک برنس روڈ کے ایک ثانوی اسکول (میٹرو پولس اسکول) میں دینیات کے استاذ تھے۔ وہ دیوبند میں حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ (ناظم اول دارالعلوم کراچی) کے ہم سبق رہ چکے تھے۔ حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُن کو اسکول سے اُٹھا کر دارالعلوم لے کر آئے، اور یہاں سے انہوں نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی طرح حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ (جو بعد میں دارالعلوم کے شیخ الحدیث اور ناظم بنے) اُس وقت علوم شرقیہ کی ایک درسگاہ "دانش کدہ" میں اردو ادب پڑھایا کرتے تھے، جو برنس روڈ پر ہمارے مکان کے قریب ہی واقع تھی۔ میرے بھانجے اور دوست مولانا حکیم مشرف حسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُن دنوں "ادیب اردو" کے امتحان کی تیاری کررہے تھے، وہ

"دانش کدہ" میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن میں اُن کے ساتھ "دانش کدہ" گیا تو حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اس وقت شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال مرحوم کا "شکوہ جواب شکوہ" پڑھا رہے تھے، اور اُن کی زبان سے اُس وقت کا سنا ہوا یہ شعر ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے:

نالے بلبل کے سنوں، اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گُل ہوں کہ خاموش رہوں

دارالعلوم کے قیام کے بعد حضرت مولانا نور احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اُنہیں دارالعلوم لے کر آئے، اور یہیں سے اُن کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتیؒ اور حضرت مولانا امیر الزماں کشمیری، رحمۃ اللہ علیہما، کی تدریسی زندگی کا آغاز اگرچہ مسجد باب الاسلام ہی میں ہو چکا تھا، لیکن جیسا کہ پیچھے عرض کر چکا ہوں، وہ کوئی باقاعدہ مدرسہ نہیں تھا، اس لئے اُن کی باقاعدہ تدریسی خدمات دارالعلوم ہی سے شروع ہوئیں۔ حضرت مولانا مظہر بقا صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جو بعد میں مفتی بنے، اور آخر میں جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے اصول فقہ کے استاذ قرار پائے، وہ خود اپنے قول کے مطابق ایک آزاد منش بزرگ تھے، اور مدرسوں کی زندگی سے اُن کا کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے ملاقات کے بعد اُن کی زندگی سراسر بدل گئی جس کے واقعات وہ بڑے مزے لے لیکر سنایا کرتے تھے، اور اپنی سرگزشت میں انہوں نے لکھے بھی ہیں۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اُن میں ایک جوہر قابل دیکھا، تو انہیں دارالعلوم میں تدریسی خدمات سونپ دیں، اور شروع میں ناقل فتاویٰ کے طور پر اور بعد میں افتاء کی تربیت دے کر باقاعدہ نائب مفتی کی حیثیت میں اُن کا تقرر فرمایا۔ حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے بھی پاکستان میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز یہیں سے کیا۔ حضرت مولانا عبید الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، جو بعد میں بنگال کے علماء کے سرخیل قرار پائے، ان کو بھی حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے دارالعلوم میں دعوت دے کر ان کی تدریسی خدمات حاصل فرمائیں۔ اور یہیں سے ان کے علم وفضل کا چرچا شروع ہوا۔ حضرت مولانا منتخب الحق صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھی دارالعلوم میں تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، اور بعد میں کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات کے صدر بنے۔ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، بھی لاہور سے منتقل ہو کر دارالعلوم تشریف لائے، اور یہاں تفسیر جلالین کا درس شروع کیا، اور بعد میں

نائب ناظم کے فرائض بھی ان کے سپرد ہوئے۔اسی وجہ سے حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، دارالعلوم کراچی کو علماء کرام کی ماں کہا کرتے تھے۔

کچھ ہی عرصے میں دارالعلوم کی طرف طلبہ کا رجوع اتنا بڑھا کہ طلبہ کی رہائش گاہوں اور درسگاہوں کا الگ الگ کرنا ممکن نہیں تھا۔چنانچہ دن کے وقت کمروں میں اس طرح درس ہوتا تھا کہ طلبہ کے بستر دیوار کے چاروں طرف لپٹے رکھے رہتے تھے، اور رات کو وہی کمرہ بستروں سے اس طرح بھرا ہوا ہوتا کہ بیچ میں چلنے کی جگہ بھی نہیں ہوتی تھی۔

جب میں نے دارالعلوم میں پڑھنا شروع کیا، اُس وقت مجھے ابھی فارسی پڑھنی تھی، اور میری عمر اُس وقت نو سال تھی، برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے چونکہ حفظ کیا تھا، اور میں حفظ سے محروم رہا، اس لئے فارسی کے درجے سے ہم دونوں تعلیم میں ساتھ ہوگئے تھے۔اُس وقت حضرت مولانا بدیع الزمان صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، انّی کے مشہور مدرسے سے فارغ ہوکر تشریف لائے تھے، اور ہماری تمام کتابیں اُنہی کے سپرد تھیں۔رسالہ نادر، پندنامہ، انشاء فارغ، گلستاں، بوستاں، احسن القواعد یہ ساری کتابیں ہم نے حضرت مولاناؒ سے پڑھیں، اور بھائی صاحب مدظلہم کی ایک ڈائری میں ۱۰/ محرم ۱۳۷۲ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۵۲ء کی تاریخ میں یہ جملہ لکھا ہوا ہے کہ: "آج مدرسہ عربیہ دارالعلوم میں حضرت مولانا بدیع الزمان صاحب کے پاس گلستاں شروع ہوئی۔" اس کے ساتھ وہ ہمیں فارسی نثر نگاری کی تربیت بھی دیا کرتے تھے۔اللہ تعالیٰ اُن کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائیں کہ انہوں نے بڑی محبت اور شفقت سے ہمیں پڑھایا اور فارسی سے اتنی مناسبت پیدا فرمادی کہ اُس کی نظم ونثر سمجھنے کی استعداد الحمدللہ پیدا ہوگئی۔اُس سال میرے سالانہ امتحان کا نتیجہ دارالعلوم کی پہلی روداد میں چھپا ہوا موجود ہے، اور چونکہ میں آٹھ سال کی عمر میں والدین کے ساتھ حج کرنے کی سعادت حاصل کرچکا تھا، اس لئے میرے کئی اساتذہ مجھے پیار سے "حاجی جی" کہکر پکارتے تھے۔(بلکہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، میری شرارتوں کی وجہ سے مجھے اسی قافیے میں "پاجی" کہکر پکارتے تھے، اور اس بے تکلفی پر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔) چنانچہ روداد میں بھی میرا نام "حاجی محمد تقی" چھپا ہوا ہے۔اُن دنوں دارالعلوم دیوبند کے قدیم طریقے کے مطابق ایک کتاب کے کل نمبر پچاس ہوا کرتے تھے۔جو طالب علم ۴۸ تک نمبر حاصل کرتا، اُسے درجۂ اولیٰ میں کامیاب سمجھا جاتا تھا، ۴۷

سے ۴۵ تک درجۂ ثانیہ کے نمبر تھے، اور ۴۴ سے ۴۰ تک ادنیٰ درجے کے۔ اسکے بعد ۳۵ تک، اس حد تک کامیاب سمجھا جاتا تھا کہ عموماً اُسے اگلے درجے میں ترقی مل جاتی تھی۔ ۳۵ سے نیچے نمبر ہوں تو اُسے ناکام سمجھا جاتا تھا۔ یہ روایت بھی تھی کہ اگرچہ کل نمبر ۵۰ ہوتے تھے، لیکن جس طالب علم نے بہت امتیازی طور پر اچھا امتحان دیا ہو، اُسے پچاس کے اوپر بھی نمبر دیدیئے جاتے تھے۔ چنانچہ اچھے طلبہ کو ۵۱ یا ۵۲ نمبر بھی مل جاتے تھے۔ اس ترتیب کے مطابق میرا نتیجہ یہ تھا:

گلستان: ۵۱ بوستان: ۴۵ احسن القواعد: ۵۰ انشائے فارغ: ۵۱ حساب: ۵۰ خوشنویسی: ۴۰ ترجمتین: ۴۸ مالابدمنہ: ۴۹ جمال القرآن: ۵۱ قراءۃ: ۴۹

عربی تعلیم کا آغاز

اگلے سال یعنی شوال ۱۳۷۲ھ مطابق جولائی ۱۹۵۳ء میں ہماری عربی تعلیم کا آغاز ہوا جبکہ میری عمر دس سال ہوچکی تھی، اور "عربی کا معلم" کے سوا ہماری تمام کتابیں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس تھیں۔ چنانچہ صَرف میں ہم نے اُس سال یکے بعد دیگرے میزان ومنشعب، پنج گنج اور علم الصیغہ، نحو میں "نحومیر"، "شرح مائۃ عامل" اور "ہدایۃ النحو"، ادب میں حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی "دروس الادب" اور اُس کے بعد "مفید الطالبین" حضرتؒ ہی سے پڑھیں۔ البتہ "عربی کا معلم" حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، سے پڑھا۔ حضرت مفتی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو عربی ادب سے خصوصی مناسبت تھی، اس لئے انہوں نے ہمیں بڑے ذوق وشوق سے عربی لکھنے کی مشق کرائی۔ اپنی کم سنی کی وجہ سے نحو وصرف کے قدرے دقیق مسائل پر گرفت تو پوری نہ ہوسکی، لیکن لکھنے کا شوق شروع سے تھا، اس لئے لکھنے کی مشقوں میں اکثر میں کامیاب رہتا تھا، اگرچہ میرا خط بہت خراب تھا، جس میں کافی عرصے بعد بہتری آئی۔ اساتذۂ کرام میری عمر کے لحاظ سے میرے اس تھوڑے کو بھی زیادہ جان کر محبت اور ہمت افزائی کا معاملہ فرماتے تھے۔ تکرار کرانے میں بھی مجھے اس لئے دقت محسوس ہوتی تھی کہ میری زبان میں روانی نہیں تھی، اور میں بولتے وقت بکثرت اٹکا کرتا تھا۔ چنانچہ عموماً تکرار میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب کرایا کرتے تھے جن کے انداز گفتگو میں شروع ہی سے ماشاء اللہ بڑی فصاحت تھی۔

حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، ہر ہفتے جمعرات کو ہمارا ہفتہ وار امتحان لیا کرتے تھے، اس لئے تمام ہفتے چوکس ہوکر پڑھنا پڑتا تھا۔ اور یہ انہی کے حسن تدریس کا نتیجہ تھا کہ اُس سال ہم نے اتنی کتابیں پڑھیں کہ آجکل کے لحاظ سے درجۂ اولیٰ اور درجۂ ثانیہ دونوں کی کتابیں ایک ہی سال میں ہوگئیں ۔چنانچہ نحومیر کے ساتھ شرح مائۃ عامل اور ہدایۃ النحو، میزان کے ساتھ پنج گنج اور علم الصیغہ اور دروس الادب اور مفید الطالبین کے ساتھ فقہ کی نور الایضاح بھی ایک ہی سال میں پڑھ لی گئیں۔

حضرتؒ کے پاس ایک لمبی سی چھڑی محض طلبہ کو رعب میں رکھنے کیلئے رہا کرتی تھی جس کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی تھی، لیکن کبھی کبھی آ بھی جاتی تھی، اور ایک آدھ مرتبہ مجھے بھی اسکا مورد بننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

میری جماعت میں میرا ہم عمر کوئی نہیں تھا، سب مجھ سے بڑے تھے۔اس لئے درس کے بعد کھیل یا تفریح میں اُن کے ساتھ میرا جوڑ نہیں بیٹھتا تھا۔ چنانچہ غیر نصابی دوستیاں اپنے سے نیچی جماعت کے لوگوں سے رہتی تھیں۔ میرے ہم سبقوں میں میرے بڑے بھائی کے علاوہ مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہید، رحمۃ اللہ علیہ، (سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن) کے بڑے بھائی مولانا محمد احمد صاحب مدظلہم تھے (جو آجکل مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں)، اور مولانا حبیب اللہ مختار صاحبؒ ہم سے ایک سال پیچھے تھے، میرے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحبؒ بھی انہی کے ساتھ تھے، اور قاری محمد اسماعیل میرٹھی صاحبؒ بھی انہی کی جماعت میں تھے۔ پڑھائی سے فارغ ہوکر میں ان کے ساتھ قریبی پارک میں یا دارالعلوم کے احاطے کے باہر کچھ دیر کھیل لیا کرتا تھا۔ کبڈی اور گلی ڈنڈے سے لیکر کرکٹ تک ہر کھیل میں یہ دونوں طاق تھے، میں انکا تابع مہمل بنکر ان کے ساتھ لگا ضرور رہتا تھا، لیکن مہارت کسی کھیل میں حاصل نہ کرسکا۔ یوں بھی عصر کے بعد گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی، اس لئے کھیل کا وقت ہی بہت کم ملتا تھا۔ البتہ مدرسے کے سامنے جو پارک تھا، اس کے کنارے ایک بڑبوجھے کی دوکان تھی جس میں وہ چنے، مرمرے، مکئی کی کھیلیں وغیرہ بھونتا رہتا تھا، اور اس کی سوندھی سوندھی خوشبو دوپہر کو بھوک میں اور اضافہ کردیتی تھی۔ مجھے روزانہ گھر سے جیب خرچ کے طور پر والدہ ماجدہ ایک آنہ دیا کرتی تھیں، جو اُس وقت کے لحاظ سے ایک بچے کا شوق پورا کرنے کیلئے کافی ہوتا تھا۔ اس پونجی کا آدھا حصہ میں اُس بڑبوجھے سے سوندھی سوندھی مکئی کی کھیلیں یا بھنے ہوئے چنے لینے میں خرچ کرتا، اور باقی پونجی گھر سے

آئے ہوئے کھانے کے بعد کچے امرود، کچے آم، یا بادام کا کھٹا پھل خریدنے میں صرف کرتا تھا۔اور اسی دوپہر کے وقت میں کچھ کھیل کود بھی ہو جاتا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ برنس روڈ کے گھر کے قریب ایک میمن لڑکا یوسف نامی رہتا تھا، اُس نے جب مجھے بتایا کہ اُسے جیب خرچ کے لئے گھر سے چار آنے ملتے ہیں تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ اس کے پاس عیاشی کا اتنا بڑا سامان موجود ہے!

جی ہاں! آج اس بات پر مجھے بھی ہنسی آتی ہے، اور یقیناً آپ بھی کم از کم مسکرائے ضرور ہوں گے کہ چار آنے کی کیا حقیقت تھی جس پر کوئی رشک کرتا، لیکن آج جس مال و دولت یا زمین جائیداد کو ہم قابل رشک سمجھتے ہیں، اور جس پر لڑائیاں لڑتے اور مقدمہ بازیاں کرتے ہیں، ایک وقت آئے گا جب یہ سب چار آنے سے زیادہ بے حقیقت معلوم ہوں گی، اور اُس وقت ہنسی آئے گی کہ ہم کس چیز سے دل لگائے بیٹھے تھے۔اُس وقت پتہ چلے گا کہ قرآن کریم نے پہلے ہی جو بات فرمادی تھی وہ کتنی سچی تھی کہ:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

دنیوی زندگی کچھ بھی نہیں بس ایک دھوکے کا سامان ہے

بہرحال! اس طرح میرا یہ عربی کا پہلا سال مکمل ہوا، یہاں تک کہ امتحان سالانہ آگیا۔چنانچہ اُس سال میرا نتیجہ یہ رہا:

نور الایضاح:۴۹، میزان و منشعب:۵۱، عربی کا معلم:۴۹، نحو میر:۵۱، دروس الادب:۴۹، شرح مائۃ عامل:۴۸، ہدایۃ النحو:۴۵، مفید الطالبین:۵۰، پنج گنج:۴۸، علم الصیغہ:۵۰، جمال القرآن:۴۷، تجوید:۵۱، حساب:۴۸، خوش نویسی:۴۱۔

اگلے سال (یعنی ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹۵۴ء میں) بھی ہماری تمام کتابیں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس تھیں۔چنانچہ کافیہ، نفحۃ العرب، تیسیر المنطق، مرقات اور شرح تہذیب ہم نے حضرتؒ ہی سے پڑھیں، اور حضرتؒ کے دلنشین طرز تدریس سے ہم اس قدر مانوس ہوگئے تھے کہ کسی اور انداز تدریس سے مناسبت نہیں ہو پاتی تھی۔ چنانچہ پچھلے سال نور الایضاح حضرتؒ سے پڑھنے کے بعد جب اس سال قدوری پڑھنے کا نمبر آیا، تو مدرسے کی کسی ضرورت سے وہ حضرتؒ کے بجائے ایک اور نئے اُستاذ کے سپرد کردی

گئی، لیکن ہماری جماعت کے طلبہ کا جن میں ہم دو بھائیوں کے علاوہ مولانا محمد احمد صاحب مدظلہم (جو حضرت مولانا حبیب اللہ مختار صاحب شہید، رحمۃ اللہ علیہ، سابق مہتمم جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کے بڑے بھائی تھے) مولانا عبدالرزاق صاحب مراد آبادی مہاجر مدنی، رحمۃ اللہ علیہ، اور متعدد ذہین طلبہ شامل تھے، وہاں دل نہ لگا۔ استادوں کے خلاف درخواستیں دینے کا تو رواج نہیں تھا، لیکن انتظامیہ نے خود کچھ محسوس کر کے وہ کتاب حضرت مولانا امیر الزمان صاحب کشمیری، رحمۃ اللہ علیہ، کے سپرد فرمادی جن سے ہماری مناسبت قدیم تھی اس لئے وہاں سب مطمئن رہے۔

جاری ہے.....

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(دسویں قسط)

انجمن اصلاح صبیاں

ہمارے گھر کے قریب مسجد باب الاسلام تھی جس کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔اس مسجد کے قریب ایک مکان میں حضرت حاجی محمد ایوب صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، رہا کرتے تھے۔اُن کے کئی صاحبزادے تھے جن میں میرے تقریباً ہم عمر جناب محمد کلیم صاحب تھے (اللہ تعالیٰ انہیں بعافیت تادیر سلامت رکھے) اُن سے نمازوں میں ملاقات کے دوران دوستی ہوگئی جو بحمد اللہ آج تک قائم ہے۔ ماشاء اللہ اُن کا گھرانہ دیندار گھرانہ تھا۔اُن کے ساتھ کھیل کود کا تو زیادہ اتفاق نہیں ہوا، لیکن اُنہوں نے یہ تجویز پیش کی کہ بچوں میں دینی شعور پیدا کرنے کے لئے ایک بچوں کی جماعت بنانی چاہئے۔چنانچہ زیادہ تر اُنہی کی کوششوں سے مسجد میں غالباً ہفتہ وار بچوں کا ایک اجتماع شروع ہوگیا۔کلیم صاحب اگرچہ اسکول میں (شاید ساتویں یا آٹھویں جماعت میں) پڑھتے تھے، لیکن ماشاء اللہ گھر کی تربیت کے نتیجے میں اُس عمر کے لحاظ سے دینی معلومات بھی خوب تھیں، اور اُنہیں بات کرنے کا سلیقہ بھی مجھ سے زیادہ آتا تھا۔چنانچہ جہاں تک یاد ہے، پہلی مجلس میں اُنہوں نے حضرت عمر، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، کے اسلام لانے کا واقعہ بچوں کو بڑی کامیابی سے سُنایا جسے بچوں نے بہت پسند کیا۔میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں بولتے وقت بہت اٹکا کرتا تھا، اس لئے کلیم صاحب کی طرح روانی سے تقریر کرنا مجھے بھاری معلوم ہوتا تھا۔لیکن جب بار بار بچوں کا یہ اجتماع ہونے لگا، تو مجھے بھی کچھ نہ کچھ بولنا پڑتا تھا۔چنانچہ جہاں تک یاد ہے، میں "حکایاتِ صحابہ" سے کسی صحابی کے واقعات یاد کر کے سُنانے لگا تھا۔میرے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، اگرچہ بندر روڈ پر ہم سے دور رہتے تھے، لیکن بچوں کے اس اجتماع

میں وہ بھی پوری طرح شریک رہا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ہم نے سوچا کہ بچوں کی اس جماعت کا کوئی نام بھی رکھ دینا چاہئے۔ ہماری سمجھ میں اور کچھ نہ آیا تو اُسے "شعبۂ تبلیغ اسلام" کہنے لگے؛ اور اس اُس کی رُوداد وغیرہ بھی کسی کاپی میں لکھی جانے لگی۔ ایک مرتبہ یہ کاپی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نظر پڑگئی، تو اُنہوں نے مجھ سے پوچھا یہ کیا ہے؟ میں نے ساری تفصیل بتادی تو حضرتؒ نے فرمایا کہ یہ نام مناسب نہیں۔ اس کا نام "انجمن اصلاح صبیاں" رکھدو۔ چنانچہ پھر ہم نے اسی نام سے ایک مہر بھی بنوالی، اور یہ سلسلہ ہمارے برنس روڈ کا مکان تبدیل کرنے پر ختم ہوا۔

عربی تعلیم کے مراکز

اسی سال یہ واقعہ پیش آیا کہ پاکستان میں سوریا (شام) کے سفیر جناب جواد المرابط صاحب جو اگرچہ مغربی وضع قطع میں رہتے تھے، لیکن بڑے عبادت گذار اور صاحب دل آدمی تھے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، کے پاس بڑی محبت اور عقیدت کے ساتھ آیا کرتے تھے، انہوں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو یہ تجویز پیش کی کہ سوریا کا سفارت خانہ دارالعلوم کے ساتھ اشتراکِ عمل کرکے کراچی شہر کے مختلف علاقوں میں عربی زبان بالطریق المباشر (ڈائریکٹ میتھڈ سے) سکھانے کیلئے مراکز قائم کرسکتا ہے۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے اس تجویز کو پسند کرتے ہوئے اس کی منظوری دیدی، اور اس کیلئے دارالعلوم کو بنیاد قرار دیکر شہر کے مختلف اداروں میں یہ مراکز قائم کئے گئے۔ استاذ محمد امین المصری اُس وقت سوریا کے سفارت خانے میں "الملحق الثقافی" (کلچرل اٹیچی) کے عہدے پر فائز تھے۔ عربی کی تعلیم کے ان مراکز کی نہ صرف نگرانی اور نصاب کی تیاری انہوں نے اپنے ذمے لی، بلکہ بذات خود عربی پڑھانے کیلئے بھی تیار ہوگئے۔

انہوں نے اپنا درس دارالعلوم میں شروع کیا۔ وہ ہرروز اپنا درس لکھکر لاتے، اور عربی ہی میں پڑھاتے۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ جو لفظ سکھاتے، اس کے معنی عملاً سمجھاتے تھے، اور پھر ایک ایک طالب علم سے وہ لفظ کہلواتے تھے، اور تلفظ صحیح کرنے پر خصوصی زور دیتے تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے "کتاب" کا لفظ پڑھایا۔ اگرچہ انہیں معلوم تھا کہ "کتاب" کا لفظ اردو میں بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے، اور سب طلبہ اس کا مطلب بھی سمجھتے ہیں، لیکن مجھے یاد ہے کہ انہوں نے کتاب ہاتھ میں لیکر لفظ "کتاب"

کم از کم پچاس مرتبہ ضرور کہا ہوگا، اور پھر اتنی ہی مرتبہ طلبہ سے بھی کہلایا، تاکہ وہ اس کا تلفظ صحیح عربی لہجے میں کر سکیں۔ اس طرح وہ ہر درس لکھکر لاتے، اور اس کی پوری مشق کرواتے۔ پھر اُن کے یہی دروس کتابی شکل اختیار کر گئے، اور طريقة جديدة لتعليم العربية کے نام سے شائع ہوئے۔

شروع میں کچھ روز ہم نے استاذ امین مصری، رحمۃ اللہ علیہ، ہی کے ابتدائی درس میں شرکت کی۔ چونکہ وہ روزانہ کا سبق روزانہ تیار کرتے تھے، اس لئے بعض اوقات کسی عمل کا مظاہرہ کرنے کیلئے کچھ طلبہ کو اپنے پاس بلا کر کھڑا کر لیتے تھے، اور اس کام کیلئے بکثرت قرعۂ فال میرے نام پڑا کرتا تھا، کیونکہ میں شاید اُس جماعت میں سب سے کم عمر تھا، اس لئے " طريقة جديدة" کتاب میں میرا نام بھی آ گیا ہے۔

پھر کچھ دن کے بعد استاذ امین مصری، رحمۃ اللہ علیہ، کو یہ محسوس ہوا کہ جماعت میں مختلف معیار کے لوگ شامل ہیں، اور اُن سب کو " طريقه جديدة " کے معیار پر پڑھانا مناسب نہیں ہے، اس لئے بعد میں انہوں نے طلبہ کی استعداد کے مطابق تین جماعتیں بنا دیں، اور ہمیں دوسری جماعت میں شامل فرما دیا۔ اس غرض کے لئے تین مزید شامی اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ استاذ احمد الاحمد، استاذ عبد الحمید ہاشمی اور استاذ یاسین الحلو۔ استاذ یاسین الحلو سے تو ہمیں استفادے کی نوبت نہیں آئی، کیونکہ وہ ہم سے اوپر کی جماعت کو پڑھایا کرتے تھے۔ لیکن استاذ احمد الاحمد اور استاذ عبد الحمید الہاشمی کے دروس سے ہم نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

استاذ احمد الاحمد بڑے سنجیدہ رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دار العلوم میں کسی مہمان کی آمد کے موقع پر اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ تم اس جلسے میں عربی میں تقریر کرو۔ اس کیلئے انہوں نے ہی مجھے تقریر لکھنے کو کہا۔ میں نے الٹے سیدھے الفاظ میں چند جملے لکھکر انہیں دکھائے جن کے شروع میں اپنی کم علمی اور قلت بضاعت (کم مائیگی) کا ذکر بھی کیا تھا۔ انہوں نے دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ "قلتِ بضاعت" والی باتیں چھوڑ دو، یہ باتیں کسی خطیب کو احساس کمتری میں مبتلا کر کے تقریر کو پھیکا بنا دیتی ہیں۔ پھر انہوں نے خود تقریر لکھکر مجھے دی، اور فرمایا کہ اسے یاد کرلو۔ میں نے یاد کرلی تو اُنہوں نے فرمایا: " اب مجھے تقریر کر کے دکھاؤ کس طرح کرو گے؟"۔ میں نے اپنے دیسی انداز میں حفظ کی ہوئی تقریر پڑھنی شروع کر دی۔ انہوں نے مجھے ٹوکا، اور کہا کہ تقریر اس طرح نہیں کی جاتی۔ آؤ، میرے ساتھ کھڑے ہو۔ پھر اُنہوں نے اپنا دایاں پاؤں آگے اور بایاں پاؤں کچھ پیچھے رکھکر کہا کہ "اس طرح کھڑے ہو" اس سے اپنے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اُس کے بعد وہ ایک ایک جملہ مجھ

سے کہلواتے، اور پھر کہتے: "یوں نہیں اس طرح کہو" اور پھر وہ وہی جملہ قدرے گرج دار آواز میں کہتے، اور جب تک میری آواز اور لہجے میں مطلوبہ ٹھہراؤ یا گرج پیدا نہ ہوجاتی، وہ مجھ سے ایک ہی جملہ بار بار کہلواتے رہتے۔ اس طرح انہوں نے تقریر کرنے کی پوری مشق کرائی، اور میں نے ان کی ہدایات کے مطابق جلسے میں تقریر کی، تو انہوں نے مجھے خوب شاباش دی۔

دوسری طرف استاذ عبدالحمید ہاشمی بڑے خوبصورت، ہنس مکھ اور طرح دار نوجوان تھے۔ وہ اپنا کوئی سبق لکھکر نہیں لاتے تھے۔ بلکہ وہ طلبہ سے خوش طبعی کی باتیں اور ہنسی مذاق کرکر کے عربی سکھایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی تختۂ سیاہ پر چاک سے کوئی آیت قرآنی، کوئی حدیث یا کوئی ادبی عبارت لکھ دیتے، اور اُس کے ادبی اسرار ورموز ہمیں بتایا کرتے، کبھی کسی شعر کی تشریح فرماتے، اور عربی تلفظ کی بھی خوب مشق کراتے تھے۔ سبق کے دوران وہ کسی طالب علم کو اپنے ساتھ کھڑا کرلیا کرتے تھے۔ اور تختۂ سیاہ پر جو عبارت لکھی ہے، اُس سے اُس عبارت کے بارے میں سوالات کرتے، اور ساتھ ساتھ طرح طرح کے لطیفے سُناتے رہتے، یا اُسی طالب علم کے ساتھ مذاق کرتے رہتے۔

ایک مرتبہ وہ غالباً " تنافر حروف " کا مطلب سمجھا رہے تھے کہ جملے میں ایک جیسے حروف اس طرح جمع نہیں کرنے چاہییں جن کی ادائیگی دشوار ہوجائے۔ اس کی مثال میں انہوں نے ایک دیہاتی مچھلی پکڑنے والے کے بارے میں بتایا کہ اُس کی مقامی زبان میں چھوٹی کشتی کو "ککک " کہتے تھے، جو تین "کاف" کا مجموعہ ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنی کشتی میں سوار ہوکر مچھلی پکڑنے نکلا، تو دیکھا کہ ایک اور شخص اُسی جیسی کشتی میں سوار مچھلی پکڑنے کے لئے دریا میں جال ڈالے ہوئے ہے۔ اُس موقع پر اُس نے دوسرے شخص سے خطاب کرتے ہوئے دو شعر کہے:

یا راکباً فی کُکُکِک   وصائداً فی شَرَکِک

کُکُکُکَ کُکُکِکِی   وکُکُکِی کُکُکِکِک

(۱)۔۔۔(اے اپنی کشتی میں سوار ہونے والے، اور اپنے جال سے شکار کرنے والے!
تیری کشتی میری کشتی جیسی ہے، اور میری کشتی تیری کشتی جیسی ہے)

سولہ "کاف" پر مشتمل یہ شعر انہوں نے چاک سے تختۂ سیاہ پر لکھ کر طلبہ کو دعوت دی کہ اُسے پڑھیں۔ طالب علم اُسے پڑھنے میں بار بار اٹکتے، اور دوسرے ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے۔

غرض اُن کا درس بڑا رنگارنگ اور دلچسپ ہوتا تھا، اور ہمیں اُن کے درس کا انتظار لگا رہتا تھا۔ ایک دن اُنہوں نے اپنی مٹھی بند کر کے طلبہ کو چیلنج دیا کہ جو کوئی میری یہ مٹھی کھول دیگا، میں اُسے انعام دوں گا۔ جماعت میں بڑے بڑے قدآور اور مضبوط لوگ موجود تھے۔ سب نے باری باری زور لگا کر اُن کی مٹھی کھولنے کی کوشش کی، مگر کوئی کامیاب نہ ہوا۔ آخر میں ہمارے ایک ہم سبق ساتھی مولانا عبدالرزاق مرادآبادی (رحمۃ اللہ علیہ، جو بعد میں مدینہ منورہ ہجرت کر گئے تھے، اور وہیں ان کی وفات ہوئی) بڑے قوی ہیکل نوجوان تھے، اور انہوں نے کسی سے ہار ماننا سیکھا ہی نہیں تھا، وہ بڑے دعویدار انداز میں آگے بڑھے، اور اُنہوں نے زور لگانا شروع کیا۔ استاذ اور شاگرد دونوں کے چہرے کا رنگ زور لگانے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا، (اور اُس سرخ چہرے میں استاذ اور زیادہ خوبصورت نظر آرہے تھے) لیکن مٹھی اُن سے بھی نہ کھل سکی۔ آخر کار استاذ نے کہا: "چلو میں تمہاری تھوڑی سی مدد کرتا ہوں۔" اور یہ کہکر انہوں نے اپنی بھینچی ہوئی انگلیوں میں تھوڑا سا اتنا فاصلہ پیدا کر لیا کہ وہ قدرے ڈھیلی پڑ گئیں، اور بند انگلیوں کے درمیان اتنی جگہ بن گئی کہ کوئی اُن کے بیچ میں اپنی انگلی داخل کر سکتا تھا۔ انہوں نے عبدالرزاق صاحب سے کہا کہ "اگر آپ اس میں اپنی ایک انگلی داخل کر لیں تو شاید اُس کی مدد سے آپ کیلئے مٹھی کھولنا آسان ہو، چنانچہ عبدالرزاق صاحبؒ نے جھٹ اپنی انگلی اندر داخل کر لی۔ لیکن جونہی انگلی اندر گئی، استاذ نے اپنی انگلیوں کو زور سے مزید بھینچ دیا، اور اُن کی انگلی درمیان میں پھنس کر رہ گئی۔ اب عبدالرزاق صاحبؒ ان کی مٹھی تو کیا کھولتے؟ اُن کو خود اپنی پھنسی ہوئی انگلی کے لالے پڑ گئے۔ اب وہ ہیں کہ انگلی بیچ سے نکالنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، اور پوری جماعت ہنسی سے دوہری ہوئی جا رہی ہے۔ آخر مولانا عبدالرزاق صاحبؒ کو شکست کا اعتراف کرنا پڑا، اور پھر استاذ نے اُن کی انگلی کو رہائی بخشی۔ غرض وہ اس طرح طلبہ کو ہنسا ہنسا کر مختلف حالات سے متعلق عربی محاورے اور بول چال کا انداز سکھایا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان دونوں استادوں کو بہترین جزا عطا فرمائے۔ انہوں نے ہماری جماعت میں عربیت کا ذوق پیدا کرنے میں ناقابل فراموش حصہ لیا۔ آج جب مجھے عرب ممالک میں عربوں سے گفتگو یا تقریر و تحریر کی نوبت آتی ہے، تو عموماً لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا آپ نے مصر یا سعودی عرب میں پڑھا ہے؟ اور جب میں یہ جواب دیتا

ہوں کہ میری تمام تر عربی اور دینی تعلیم صرف اور صرف دارالعلوم کراچی میں ہوئی ہے، تو لوگ تعجب کرتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عربی تحریر و تقریر سے جو مناسبت بھی عطا فرمائی، اُس کا پہلا سبب تو ہمارے استاذ گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی تعلیم و تربیت تھی کہ انہوں نے ہمیں عربی کے صرف قواعد ہی کی تعلیم نہیں دی، بلکہ عربی لکھنے کی مشق پر بھی بہت زور دیا، اور دوسرا سبب یہ دو شامی استاذ تھے جو ہر روز کسی نہ کسی ادبی عبارت کے ادبی پہلوؤں پر بات کرتے، اور اُسی کی بنیاد پر عربی تقریر و تحریر کی مشق کراتے تھے۔

شروع میں ان حضرات کا درس دارالعلوم نانک واڑہ ہی کے ایک ہال میں ہوتا تھا، بعد میں سول ہسپتال کے سامنے ایک اسکول میں منتقل ہوگیا تھا، اور ہم عصر کے بعد وہاں جا کر تقریباً ایک گھنٹہ ان کے درس میں شریک ہوتے تھے۔

اس سال میرے سالانہ امتحان کا نتیجہ یہ رہا جو دارالعلوم کی روداد بابت رمضان ۱۳۷۳ء تا شعبان ۱۳۷۴ء مطابق مئی ۱۹۵۴ء تا اپریل ۱۹۵۵ء میں چھپا ہوا ہے :

قدوری: ۴۷، کافیہ: ۵۰، نفحۃ العرب: ۵۳، تیسیر المنطق: ۴۵، البلاغۃ الواضحۃ: ۵۰، النحو الواضح: ۵۰ مرقات: ۴۵، اوسط: ۴۸، درجۂ اولیٰ اور نفحۃ العرب میں اول۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(گیارہویں قسط)

شعروادب سے مناسبت کا آغاز

حضرت مولانا سحبان محمود صاحب، قدس سرہ، نے ان اسباق کی تعلیم کے ساتھ شعروادب کا ذوق بھی اُسی زمانے سے میری گھٹی میں ڈال دیا تھا۔ حضرتؒ بذات خود بہترین شعر کہتے تھے، اور درس کے دوران اپنے پسندیدہ اشعار نہ صرف سناتے، بلکہ ان کی ادبی لطافتوں پر اس طرح بات کرتے کہ شعر کا صحیح مطلب سمجھ میں آتا، اور اُس کا لطف محسوس ہوتا تھا۔ پھر ایک موقع پر انہوں نے یہ سلسلہ بھی شروع کیا کہ ایک مصرع طرح دیدیتے، اور ہم سے کہتے کہ اس پر شعر کہو۔ چنانچہ ہم اپنی بساط کے مطابق تک بندی کر کے حضرتؒ کو دکھاتے، اور وہ اُس کی اصلاح فرماتے۔

دوسری طرف میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہمارے گھر کا ماحول بھی شعروادب کا ماحول تھا۔ حضرت والد صاحب، قدس سرہ، صرف اردو ہی میں نہیں، عربی اور فارسی میں بھی شعر کہتے تھے، ہمارے سب سے بڑے بھائی حضرت زکی کیفی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، تو باقاعدہ شاعر تھے، اور اُن کی وجہ سے گھر میں بڑے بڑے شعراء کی آمدورفت بھی رہتی تھی۔ ہماری بہنوں کو بھی شعروشاعری کا خاص ذوق تھا، اور جناب محمد ولی رازی صاحب بھی شعر کہتے تھے۔ اس لئے گھر میں ہماری دلچسپی اور تفریح کا سامان یہ تھا کہ جب سارے بہن بھائی جمع ہوتے تو کبھی بیت بازی شروع ہو جاتی، کبھی کسی نے کوئی اچھی نظم یا غزل کہیں دیکھی یا سُنی ہوتی تو وہ دوسروں کو سُناتا، اور سب اُس سے لطف اندوز ہوتے۔ کبھی کوئی ادبی مضمون سب مل کر پڑھتے، اور کبھی چھوٹی آپا ہم سب کو حفیظ جالندھری کا شاہنامہ اسلام سُنایا کرتیں جسے ہم بڑے ذوق وشوق سے سنتے تھے۔

اس سارے پس منظر میں بچپن ہی سے مجھے شعروادب کا شوق ہوگیا تھا، اور میری عمر ابھی نو سال ہی کی

تھی کہ مجھے بہت سی نظمیں اور غزلیں زبانی یاد ہوگئی تھیں۔ اُس زمانے میں بچوں کا ایک رسالہ "ساتھی" کے نام سے نکلا کرتا تھا۔ میرے بڑے بھائی جناب محمد رضی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے وہ رسالہ میرے نام جاری کروادیا تھا، اور اُسے پاکر میں خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ ہر مہینے مجھے اُس کا انتظار رہتا، اور مہینے کے شروع میں ڈاکیہ کا انتظار اُسی کی وجہ سے رہا کرتا تھا۔ اور جب وہ آجاتا، تو جب تک میں اُسے اول سے آخر تک پڑھ نہ لیتا، چین نہیں آتا تھا۔ اُسی سے میرے دل میں یہ شوق پیدا ہوا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ میری وہ بہن جنہیں ہم چھوٹی آپا کہتے تھے، اس کام میں میری خاص ہمت افزائی کرتیں۔ اُس زمانے کے رسالوں میں قلمی دوستی کا ایک سلسلہ ہوا کرتا تھا۔ بچے اپنے نام اور پتے رسالوں میں شائع کراتے، اور دوسرے بچوں کو دعوت دیتے کہ اُن سے خط وکتابت کے ذریعے دوستی کریں۔ جب اُس رسالے میں قلمی دوستی کا سلسلہ شروع ہوا، تو میری بہن نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان میں سے کسی کو خط لکھنا شروع کروں۔ اس سے مجھے لکھنے کی مشق ہوگی۔ چنانچہ میں نے اُن ناموں پر نظر ڈالی جو قلمی دوستی چاہتے تھے۔ ان ناموں میں مجھے جو نام سب سے زیادہ پسند آیا، وہ "مجاہد" تھا۔ پتہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ افریقہ کے شہر نیروبی میں رہتے ہیں جو اُس وقت ٹانگانیکا کا دارالحکومت تھا۔ (بعد میں ٹانگانیکا کا نام کینیا ہوگیا)۔ میں نے صرف "مجاہد" کے لفظ سے محبت کی بنا پر قلمی دوستی کے لئے انہی کو منتخب کیا، اور ایک اُلٹا سیدھا خط لکھ کر چھوٹی آپا کو دکھایا۔ انہوں نے اُس میں اصلاح کرکے اُسے ایک قاعدے کا خط بنادیا، اور میں نے وہ ڈاک کے سپرد کردیا، اور اُس کا جواب بھی آگیا۔ کچھ دنوں تک یہ قلمی دوستی جاری رہی۔ اپنے اس اَن دیکھے دوست کو ابتدائی طور پر میں خط لکھتا، اور چھوٹی آپا اُس پر نظر ثانی کرکے اُس میں ادبی چاشنی پیدا کردیتیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ مجھے بھی لکھنے کا کچھ سلیقہ آنے لگا۔

اُسی زمانے میں روزنامہ "جنگ" میں مراسلات کے کالموں میں لوگ کسی نہ کسی موضوع پر کوئی نہ کوئی بحث چھیڑ دیا کرتے تھے، اور اُس موضوع پر دونوں طرف سے مراسلے شائع ہوتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ یہ فضول سی بحث چھڑ گئی کہ عورت شاعر ہوسکتی ہے یا نہیں؟ چھوٹی آپا نے مجھ سے کہا کہ تم بھی ایک مراسلہ لکھدو۔ میں نے حکم کی تعمیل میں ایک مراسلہ لکھا اور وہ "جنگ" میں "صنف نازک اور شاعری" کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہ میری پہلی تحریر تھی جو کہیں شائع ہوئی۔ اس کے بعد ایک مرتبہ یہ بحث چھڑی کہ پاکستان کے کرنسی نوٹوں پر قائد اعظم کی تصویر ہونی چاہئے یا نہیں؟ میں نے "نوٹوں پر تصویر" کے عنوان سے مراسلہ لکھا

جس میں یہ موقف اختیار کیا کہ تصویر جائز نہیں ہے، اور اس سے شخصیت پرستی کی بنیاد پڑتی ہے، اس لئے ہمارے نوٹوں پر کوئی تصویر نہیں ہونی چاہئے۔ نیز ایک مرتبہ یہ بحث چھڑی کہ ملک میں مخلوط تعلیم ہونی چاہئے یا نہیں۔ اس موقع پر بھی میں نے مخلوط تعلیم کے خلاف دلائل پر مشتمل ایک مراسلہ لکھا۔ یہ تمام مراسلے "جنگ" میں شائع ہوتے رہے، اور ان سب میں میری چھوٹی آپا کی نہ صرف پشت پناہی، بلکہ اصلاح وترمیم بھی شامل ہوتی تھی۔ اور اس طرح اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ میری قلمی کاوشوں کی بنیاد انہی کی تعلیم وتربیت اور ہمت افزائی کا نتیجہ تھی۔ میری عمر اُس وقت دس سال تھی۔ جب ان کی شادی ۲۷ رفروری ۱۹۵۳ء لاہور میں مقیم جناب شفقت علی صاحب مرحوم سے ہوئی۔ اتفاق سے جس دن ان کا نکاح تھا، اُس دن ملک بھر میں تحریک ختم نبوت اپنے شباب پر پہنچی ہوئی تھی، اور آرام باغ میں اُس روز ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہو رہا تھا جس سے حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، رحمۃ اللہ علیہ، خطاب کر رہے تھے، اور ملک کے اکابر علماء کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ حضرت والد ماجد، رحمۃ اللہ علیہ، کی گرفتاری کی بھی خبر گرم تھی، اور یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے نکاح میں شریک ہوسکیں گے یا نہیں، لیکن آخر کار اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ رکھا، اور نکاح بخیر وخوبی انجام پا گیا۔

اور مجھے یاد ہے کہ جب چھوٹی آپا گھر سے رخصت ہوئیں، تو میں ہفتوں اُنہیں یاد کر کے روتا رہا۔ وہ سال میں ایک مرتبہ کراچی آیا کرتیں تو وہ دن میرے لئے عید کے دن ہوتے تھے۔ چنانچہ میں نے کافی عرصے کے بعد ان کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار ایک نظم میں کیا جس میں کہا تھا:

چھوٹی آپا! مری اس نظم کا عنواں تم ہو
تم ہو اس بزم کی تزئین کا ساماں تم ہو

حضرتِ والدِ ماجد کی نگاہوں کا سرور
والدہ کے رُخِ پُر نور کی افشاں تم ہو

تم سے بہنوں کے دلوں میں ہے طرب نغمہ سرا
بھائیوں کے لئے ہر درد کا درماں تم ہو

مہر و الفت کے جہاں پھول مہکتے ہیں سدا
ہاں وہ گلشن، وہ گلستاں، وہ خیاباں تم ہو

جس جگہ شور ہے انسانوں کی افزونی کا

اُس جہاں میں بھی جو ملتا نہیں انساں، تم ہو

بے رخی اور لگاوٹ کے ان اندھیاروں میں

روشنی جس سے ہے، وہ شمعِ فروزاں، تم ہو

تم سے ہے میری نظر میں رخِ ہستی پہ نکھار

جس سے ہے بزمِ محبت میں چراغاں، تم ہو

تم سے چونک اٹھتی ہیں ارمانوں کی نورس کلیاں

عید کا چاند ہو تم، صبحِ بہاراں تم ہو!

لوریوں میں بھی مجھے درس دیے ہیں تم نے

ہاں مری بہن، مری دوست، مری ماں تم ہو!

جب میں نے یہ نظم ان کی کراچی آمد کے موقع پر انہیں سنائی تو لاہور واپس جا کر اُنہوں نے اس کے جواب میں اسی بحر اور قافیے میں مجھے یوں جواب دیا:

چھوٹے بھائی! مری اس نظم کا عنواں تم ہو

آنکھ کا نور ہو، تسکینِ دل وجاں تم ہو

تم سے میکے کی فضاؤں میں ہے اک کیفِ نشاط

کیا چمن زار ہے وہ جس کی بہاراں تم ہو!

آنکھ کا نور ہو، والد کے جگر کی راحت،

والدہ کے لئے تسکین کا ساماں تم ہو!

بھائی کے خونِ شجاعت میں حرارت تم سے

اور بہنوں کا مچلتا ہوا ارماں تم ہو

سب سے چھوٹے ہو، تمھیں پیار ہے سب کا حاصل

ہے دلوں پر بھی حکومت ، وہ سلیماں تم ہو

دیکھ کر تم کو مرے دور ہوں سب رنج و محن

بھول جاؤں جسے پا کر غمِ دوراں تم ہو!

ہیں مرے گلشنِ ہستی میں بہاریں تم سے

کشتِ دل جس سے ہے سیراب وہ باراں تم ہو

تم سے کھلتے ہیں یہ ارمانوں کے نورس غنچے

جس میں یہ پھول مہکتے ہیں ، وہ داماں تم ہو

دل ہے یا علم کے انوار کا آئینہ ہے!

درس دیتا ہو جو پیہم ، وہ دبستاں تم ہو

جہل والحاد کے بڑھتے ہوئے اندھیاروں میں

روشنی جس سے ہے وہ شمعِ فروزاں تم ہو

الغرض حمد اُسی ذات کی زیبا ہے مجھے

جس کا انعام ہو تم ، رحمتِ یزداں تم ہو

میری عمر جب بارہ سال پوری ہوئی ، تو شوال ۱۳۷۷ھ سے دارالعلوم میں ہمارا نیا تعلیمی سال شروع ہو رہا تھا۔ اس سال (یعنی ۱۳۷۷ھ و ۱۳۷۸ھ) میں بھی شرح جامی ، مقامات حریری ، کنز الدقائق ، اصول الشاشی ، شرح جامی ، قطبی ، شرح تہذیب اور البلاغۃ الواضحۃ ، تمام کتابیں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب ، رحمۃ اللہ علیہ ، ہی کے پاس رہیں ، اور ہم ان کے ناقابل فراموش اندازِ تدریس سے مستفید ہوتے رہے۔ حضرت ، رحمۃ اللہ علیہ ، کے بارے میں میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ان کو اس زمانے میں شعر و ادب سے بڑی دلچسپی تھی ، اور وہ خود اعلیٰ پائے کے شعر کہتے تھے۔ شرح جامی جیسی کتاب میں بھی وہ اپنے اس ذوق سے رنگ بھرتے رہتے تھے ۔ اس سال جب ہم نے " البلاغۃ الواضحۃ " ان سے پڑھی تو ان کے اس ذوق نے اُس کا لطف دوبالا

کردیا۔خود "البلاغة الواضحة "بہترین ادبی شہ پاروں سے بھری ہوئی ہے۔اُس پر حضرت "فصاحت وبلاغت کے مسائل کی مثالیں اردو شاعری کے حوالوں سے بھی دیتے ،جس کی وجہ سے پورا درس گل وگلزار ہوجاتا تھا۔مثلاً مجھے یاد ہے کہ "تعقید معنوی " کی مثال دیتے ہوئے انہوں نے مومن کا یہ شعر سنایا تھا:

خیال خواب راحت ہے علاج اس بدگمانی کا

وہ ظالم قبر میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

حضرت نے فرمایا کہ دراصل اس شعر کے پہلے مصرعے میں "علاج اس بدگمانی کا؟ "جملہ استفہامیہ ہے، اور جب تک اس پر علامت استفہام نہ لگائی جائے ، یا سوالیہ لہجے میں اُس کو نہ پڑھا جائے ، اُس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔غرض اس طرح ہم نے ان کے ادبی ذوق سے خوب خوب استفادہ کیا۔

شام کو ہم گھر آتے، تو مغرب تک برنس گارڈن یا پولو گراؤنڈ میں کچھ تفریح کرنے کے بعد اپنے اسباق کی تیاری اور مطالعہ میں مصروف رہتے ۔اور پھر ہمارے گھر میں بہن بھائیوں کا اجتماع ہوتا جس میں اکثر بیت بازی کا مقابلہ ہوا کرتا تھا، اور اس مقابلے کے شوق میں مجھے زیادہ سے زیادہ شعر یاد کرنے کا شوق ہوا۔اسی زمانے میں حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام گھر میں آیا تو ہم سب چھوٹی آپا کے اردگرد بیٹھ جاتے، اور وہ ہمیں ایک رواں دواں ترنم کے ساتھ شاہنامہ سنایا کرتیں جس کی آواز آج بھی کانوں میں گونجتی ہے۔ مجھے شاہنامے سے اتنا لگاؤ ہوگیا تھا کہ اُس کے صفحے کے صفحے زبانی یاد ہوگئے تھے، اور سچی بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر، غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب کے تفصیلی واقعات میں نے کتابوں میں بعد میں پڑھے،لیکن سب سے پہلے شاہنامے ہی کے ذریعے معلوم ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ کبھی کوئی اچھی دینی یا ادبی کتاب لے آتا،تو سب اجتماعی طور پر اُس کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔کبھی مولانا مناظر احسن گیلانی ،رحمۃ اللہ علیہ، کی "النبی الخاتم ﷺ "پڑھی جارہی ہے، کبھی مولانا ابوالکلام آزاد" کی "غبار خاطر"، کبھی حضرت مولانا اصغر حسین صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کی "خواب شیریں "اور کبھی پطرس بخاری مرحوم کے مزاحیہ مضامین۔غرض بہن بھائیوں کی یہ مجلس بڑی رنگارنگ ہوتی تھی ۔اور اگر کبھی حضرت والد صاحب ،رحمۃ اللہ علیہ،کو فرصت ملتی ،تو پھر ہمیں کسی اور مشغلے کی ضرورت نہیں تھی ۔ان کے ساتھ جو وقت بھی ملتا، وہ بڑا شگفتہ اور پُر بہار ہوتا۔حضرت والد صاحب ،رحمۃ اللہ علیہ، ہم میں

گھل مل جاتے، اور کبھی ہمیں اپنے بزرگوں کے واقعات سناتے، کبھی تاریخ اسلام کے واقعات، کبھی اپنی روزمرہ کی ان مصروفیات سے باخبر فرماتے جو ہماری سمجھ کے دائرے میں آسکتی ہوں۔

اُس وقت ریڈیو پاکستان سے بھی بعض اوقات بڑے مفید پروگرام ہوا کرتے تھے۔صبح کا آغاز قاری زاہر قاسمی صاحب مرحوم کی تلاوت اور اس کے بعد حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، رحمۃ اللہ علیہ، کے مسلسل درس قرآن سے ہوتا تھا، اور جمعہ کے دن اُس وقت کے ریڈیو پاکستان کے ڈائرکٹر ذوالفقار علی بخاری صاحب مرحوم کی درخواست پر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کا "معارف القرآن" کا درس ہوتا تھا۔اُس کے بعد کے پروگراموں میں بھی اُس طرح کی بے ہودگی کم ہوتی تھی جیسی آجکل ریڈیو ٹی وی میں دکھائی دیتی ہے۔پروگراموں میں ادبی عنصر اچھا خاصا ہوتا تھا، اور دلچسپ اور معلوماتی سلسلے جاری رہتے تھے۔ "چیستاں" کا کھیل جس میں معلومات عامہ کا مقابلہ ہوتا تھا، ہم نے ریڈیو ہی سے سیکھا تھا۔اسی ریڈیو پر ہر ہفتے طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا، جس میں ملک کے نامور شعراء حصہ لیتے تھے۔حفیظ جالندھری، ادیب سہارن پوری، حمایت علی شاعر، شاعر لکھنوی، ماہر القادری، رئیس امروہوی، قمر جلالوی، ارم لکھنوی، تقریباً ہر ہفتے اس طرحی مشاعرے میں اپنا تازہ کلام سُناتے، اور ہم سب بہن بھائی اُسے بڑے شوق سے سنتے تھے۔کبھی ہندوستان سے بھی شعراء آئے ہوئے ہوتے تو انہیں بھی مدعو کیا جاتا۔چنانچہ جناب جگر مرادآبادی، شکیل بدایونی، اور جگن ناتھ آزاد کو بھی ہم نے پہلی بار اسی مشاعرے میں سنا تھا۔

اب خیال آتا ہے کہ اُس وقت ہمارے تفریحی مشغلے بھی علمی اور ادبی نوعیت کے ہوتے تھے جن سے معلومات بھی بڑھتی تھیں، اور علمی اور ادبی ذوق بھی پروان چڑھتا تھا۔انہی مجلسوں کی بدولت مجھے کتابوں کا شوق پیدا ہوا۔
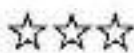
☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ———— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(بارہویں قسط)

علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پاس زمین

اس تعلیمی سال (۱۳۷۴ھ مطابق ۱۹۵۵ء) کے دوران ایک اہم واقعہ پیش آیا جس کا قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے:

اُس وقت تک کراچی میں دارالعلوم کے سوا کوئی اور بڑا مدرسہ نہیں تھا، اس لئے طلبہ کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہورہا تھا، اور نانک واڑہ کی عمارت بہت تنگ پڑگئی تھی۔ ہر شخص یہ ضرورت محسوس کرتا تھا کہ مدرسہ کسی کشادہ جگہ پر منتقل ہو۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ کس کو اس ضرورت کا احساس ہوسکتا تھا، اس لئے وہ کسی بڑی جگہ کی تلاش میں تھے۔ چنانچہ ایک طویل جدو جہد کے بعد اس کام کے لئے وہ کشادہ جگہ مل گئی جو شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب ایک کشادہ میدان کی سی شکل میں خالی پڑی ہوئی تھی۔

اس زمین کے حصول اور پھر اُس سے دست برداری کا واقعہ چونکہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا عجیب واقعہ ہے جس کے بارے میں میں نے اپنے شیخ عارف باللہ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی اور حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری، رحمۃ اللہ علیہما اور متعدد علماء کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کا تنہا یہ عمل اُن کی عظمت کردار اور صدق واخلاص کا اعلیٰ مقام ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ ابتک اس واقعے کی تفصیلات کہیں مطبوعہ ریکارڈ پر نہیں آئیں، حالانکہ وہ انتہائی سبق آموز ہیں، اس لئے میں یہ واقعہ قدرے تفصیل سے عرض کرتا ہوں۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، قدس سرہ کے شاگرد اور تحریک

پاکستان وغیرہ میں ان کے رفیق کار تو تھے ہی، اُس کے علاوہ اُن سے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کی دُور کی یہ رشتہ داری تھی کہ حضرت علامہؒ ہماری دادی صاحبہ، رحمہا اللہ تعالیٰ کو مُمانی کہا کرتے تھے۔ گویا حضرت والد صاحبؒ اُن کے کسی رشتے سے ماموں زاد بھائی تھے۔ حضرت علامہؒ کو ان کے خاندان والے محبت میں "پھول ابا" اور ان کی اہلیہ محترمہ، رحمہا اللہ تعالیٰ کو "پھول اماں" کہا کرتے تھے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی، ان کے بھائی جناب فضل حق صاحب فضلی مرحوم نے دینی علوم کے بجائے کچھ عصری تعلیم حاصل کی تھی جس کی بنا پر وہ دیوبند کے محکمۂ ڈاک میں افسر تھے۔ اُنہی کی صاحب زادی کو حضرت علامہؒ نے منہ بولی بیٹی بنایا ہوا تھا جو مولانا محمد یحیٰ صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے نکاح میں تھیں۔ مولانا محمد یحیٰ صاحب، رحمۃ اللہ علیہ ایک قوی الاستعداد عالم تھے۔

حضرت علامہؒ کی وفات کے موقع پر ان کے مزار کے لئے جگہ اُس وقت کے وزیر اعظم جناب لیاقت علی خان صاحب مرحوم نے متعین کی تھی۔ مزار کے قریب ایک وسیع جگہ خالی پڑی تھی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ایک طرف یہ خیال تھا کہ حضرت علامہؒ کے مزار سے متصل کوئی اُن کے شایانِ شان دارالعلوم قائم ہو، دوسرے حضرت علامہ، قدس سرہ کی پاکستان کے لئے جو خدمات ہیں، اُن کے پیش نظر اُن کا حق ہے کہ اُن کی اہلیہ محترمہ، ان کی منہ بولی اولاد اور ان کے بھائی کو جو اُنہی کی وجہ سے پاکستان منتقل ہوئے تھے، اور ہندوستان میں اپنی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے، رہائش کی کوئی جگہ فراہم کی جائے۔ چنانچہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہؒ کے مذکورہ بالا اعزہ اور بعض دوسرے معززین کی طرف سے ایک درخواست حکومت کو دی تھی کہ اس جگہ پر حضرت علامہ عثمانی، قدس سرہ کی یادگار میں ایک دارالعلوم قائم کیا جائے، اور علامہؒ کے رشتہ داروں کو بھی اُس میں رہائش کیلئے جگہ دی جائے۔ یہ درخواست چند اشخاص کی طرف سے تھی، اور جیسا کہ حکومتی اداروں کا معمول ہے، وہ سرد خانے میں پڑی رہی، اور اُس پر کئی سال کوئی کارروائی نہ ہوسکی، یہاں تک کہ دارالعلوم کیلئے نانک واڑہ میں جگہ مل گئی۔ جب یہ جگہ تنگ پڑی، اور نئی جگہ کی ضرورت محسوس ہوئی، تو حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ حضرت علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے مزار والی جگہ پر ابتک کوئی کارروائی اس لئے نہیں ہوئی کہ وہ چند اشخاص کی طرف سے انفرادی درخواست تھی۔ اب چونکہ دارالعلوم محض ایک تصور نہیں، بلکہ ایک باقاعدہ رجسٹرڈ ادارہ ہے، اس لئے اگر اُس کی طرف

سے اس جگہ کو دارالعلوم کے لئے لینے کی درخواست دی جائے، تو اُس کی کامیابی کی امید ہے۔ چنانچہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہؒ کے اعزہ کے علم میں لاکر کراچی کے چیف کمشنر کو دارالعلوم نانک واڑہ میں مدعو کیا، تاکہ وہ بذاتِ خود جگہ کی تنگی اور دارالعلوم کی ضرورت کا اندازہ کریں، اس موقع پر حضرت علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ اعزہ بذاتِ خود موجود تھے، اور انہی کی موجودگی میں زبانی طور پر یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کو وہ جگہ حضرت علامہؒ کی یادگار کے طور پر الاٹ کردی جائے، اور اس میں حضرت علامہؒ کی اہلیہ اور اعزہ کو بھی رہائشی پلاٹ دیئے جائیں۔ پھر ۳؍جولائی ۱۹۵۳ء کو چیف کمشنر کے پاس درخواست دی، جو حضرتؒ کے اعزہ کے علم میں تھی۔ مختلف حکام سے اس بارے میں بات چیت ہوتی رہی، اور چونکہ یہ معلوم ہوا کہ یہ کام میونسپل کارپوریشن کی قرارداد کے بغیر ممکن نہیں ہوگا، اس لئے ۵؍جنوری ۱۹۵۴ء کو اس مقصد کیلئے میونسپل کارپوریشن میں درخواست دی گئی، جس میں دارالعلوم کیلئے زمین الاٹ کرنے کے علاوہ یہ درخواست بھی شامل تھی کہ اسی کے ایک حصے میں حضرت علامہؒ کی اہلیہ محترمہ، منہ بولے داماد اور بھائی صاحب کو آٹھ آٹھ سو گز کے رہائشی پلاٹ دیئے جائیں۔ ان کے علاوہ حضرتؒ کے کچھ دور کے پانچ رشتہ داروں کے نام بھی اس فہرست میں شامل فرمادیئے گئے تھے جن کے لئے رہائشی پلاٹ کی درخواست دی گئی۔[1] چنانچہ ایک طویل جدوجہد کے بعد ۳؍مئی ۱۹۵۴ء کو کارپوریشن کی اسٹینڈنگ کمیٹی نے اس درخواست کی منظوری کی سفارش کی جس کے بعد کارپوریشن کے لینڈ منیجر آفس نے ۲۳؍جولائی ۱۹۵۴ء کو کچھ شرائط کے ساتھ درخواست منظور کی، اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ان شرائط کو منظور کرنے کے بعد ۱۶؍نومبر ۱۹۵۴ء کو میونسپل کارپوریشن نے اپنی ایک قرارداد نمبر ۴۸۶ میں دونوں باتوں کی باضابطہ منظوری دیدی جس کی رُو سے سولہ ہزار دو سو گز دارالعلوم کو، اور دو ہزار پانچ سو اڑتالیس گز حضرت علامہؒ کی اہلیہ محترمہ اور حضرت علامہؒ کے دوسرے رشتہ داروں کو الاٹ ہونا تھا۔ دارالعلوم کو جو زمین دی گئی وہ لیز پر تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ لیز کی شرائط پوری نہ کرنے پر وہ حکومت واپس لے سکتی ہے، لیکن جو رہائشی پلاٹ حضرت علامہؒ کی اہلیہ اور رشتہ داروں کو دیئے جانے تھے، وہ مالکانہ حقوق کے ساتھ تھے۔ اسی میں حضرت والد صاحبؒ کو بھی بحیثیت صدر دارالعلوم

۱۔ وجہ یہ تھی کہ علامہ عثمانیؒ اور ان کے رشتہ دار ہندوستان میں اپنی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے، اور متروکہ جائیدادوں کے تبادلے کے معاہدات جاری تھے، اس کے علاوہ علامہ عثمانیؒ کی پاکستان کے لئے خدمات اور قربانیوں کا بھی یہ تقاضہ تھا۔

اور حضرت مولانا نوراحمد صاحبؒ کو بحیثیت ناظم دارالعلوم بالترتیب آٹھ سو اور پانچ سو گز کے پلاٹ دیئے جانے کی بھی منظوری دی گئی، لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درخواست دی کہ وہ اور مولانا نوراحمد صاحبؒ اپنی ذاتی رہائش کے لئے کوئی زمین یہاں لینا نہیں چاہتے، لہٰذا جو زمین ان کو شخصی طور پر دینا طے ہوا ہے، وہ بھی دارالعلوم ہی کو دیدی جائے۔

قانونی اعتبار سے اس قرارداد پر عمل کیلئے اُسے چیف کمشنر کراچی کے پاس بھیج دیا گیا۔ چیف کمشنر نے اپنی منظوری میں لکھا کہ سولہ ہزار دو سو گز زمین دارالعلوم کو دی جاتی ہے، اور میونسپل کارپوریشن نے جو رہائشی پلاٹ حضرت علامہؒ کی اہلیہ محترمہ اور ان کے داماد اور بھائی کے لئے مخصوص کئے ہیں، ان کی بھی منظوری دی جاتی ہے، لیکن جو پلاٹ صدر دارالعلوم حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ (صدر دارالعلوم کراچی) اور مولانا نوراحمد صاحبؒ (ناظم دارالعلوم کراچی) کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں، چونکہ انہوں نے خود اس سے دستبرداری کی درخواست دی ہے، اس لئے وہ پلاٹ بھی دارالعلوم کو دیئے جاتے ہیں۔ البتہ ان کے علاوہ حضرت علامہؒ کے جو پانچ دُور کے رشتہ دار ہیں، ان کو رہائشی پلاٹ دینا منظور نہیں۔ (کراچی میونسپل کارپوریشن کے لینڈ مینیجر آفس سے کارپوریشن کی قرارداد کے ساتھ چیف کمشنر کا یہ حکم نامہ ۷؍دسمبر ۱۹۵۲ء کو L.c.g.L 1.54 کے نمبر پر جاری ہوا جو اپنے تمام متعلقہ کاغذات کے ساتھ دارالعلوم میں محفوظ ہے۔)

قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے اس جگہ پر مدرسہ بنانے کا اعلان فرمادیا۔ اس احاطے پر "دارالعلوم کراچی بیادگار شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی" کا بورڈ بھی لگ گیا۔ حضرت مولانا نوراحمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے انتھک محنت، مہم جوئی اور بڑے بڑے مشکل کام جلد از جلد کرنے اور کروانے کا خاص وصف عطا فرمایا تھا۔ انہوں نے ہی اس زمین کی منظوری حاصل کرنے کے لئے دن رات ایک کردیئے تھے، اور جب زمین مل گئی، تو انہوں نے ہی کچھ عارضی کمرے اس غرض کے لئے جلدی جلدی بنالئے کہ وہاں سے تعمیری کام کی نگرانی کی جاسکے، اور ہر وقت رابطے کی آسانی کے لئے وہاں ٹیلی فون بھی لگوالیا، اور بقدرِ ضرورت بجلی کا کنکشن بھی حاصل کرلیا۔

لیکن حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ مدرسے کی تعمیر کا باقاعدہ افتتاح ملک کے اہل اللہ علماء سے کرایا جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

اور حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری، رحمہم اللہ تعالیٰ کو لاہور سے، حضرت مولانا خیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کو ملتان سے، حضرت مولانا اطہر علی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کو مشرقی پاکستان سے دعوت دی گئی، اور اتوار ۲۶؍ اور پیر ۲۷؍ جمادی الثانیہ ۱۳۷۴ھ مطابق ۲۰؍ اور ۲۱؍ فروری ۱۹۵۵ء کو ایک دو روزہ سالانہ جلسے کا اعلان کر دیا گیا جس میں نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جائے۔

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب، رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کو بھی حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے ایک خط کے ذریعے اس جلسے میں شرکت کی دعوت دی جس کے جواب میں حضرتؒ نے تحریر فرمایا:

دفتر دارالعلوم دیوبند ضلع سہارنپور

مخدوم برادرم، زید مجدکم العالی

سلام مسنون نیاز مقرون۔ مکرمت نامہ نے سرفراز فرمایا، سب سے پہلے تو اس مژدۂ جانفزا (تاسیس دارالعلوم) پر اپنی انتہائی خوشی اور اس کے ساتھ ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اثناء قیام کراچی میں کئی دارالعلوموں کے نام کان میں پڑتے تھے۔ بعضے قائم ہوئے، بعضوں کے قائم کرنے کے لوگ خواب دیکھ رہے تھے، اور ان سب کو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے منصوبہ کی طرف منسوب کرنے کے ارادے ظاہر کرتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان منصوبوں کو اس نسبت کے ساتھ دل کبھی قبول نہیں کرتا تھا، دل میں یہ چیز جمی ہوئی تھی کہ اس منصوبہ کے تحت اگر دارالعلوم قائم ہوگا تو وہ صرف مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قائم کریں گے۔ جب آپ نے بھی دارالعلوم کے قیام کی اطلاع فرمائی، اور اس کے بارہ میں ایک مختصر سا ٹریکٹ بھی آیا، تو دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا کہ اُس منصوبہ نے صحیح معنی میں آج جنم لیا ہے، اور اب یہ آگے بڑھے گا۔ اور اس ناچیز کا تصور صحیح ہوگیا۔ ساتھ ہی اپنے دل میں خواہ مخواہ یہ منصوبہ بھی جمالیا تھا کہ یہ دارالعلوم اُسی جگہ قائم ہونا چاہیے جس جگہ کو مولانا مرحوم نے اپنی خوابگاہ بنایا ہے۔ اُس جگہ کو دیکھ دیکھ کر گویا لالچ آتا تھا کہ یہ جگہ گویا دارالعلوم ہی کو تک رہی ہے، حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج اُس نے یہ مژدہ بھی سنا دیا کہ منصوبہ صاحب منصوبہ کے قریب ہوگیا، اور دارالعلوم وہیں پہنچ گیا جہاں سے اُسے روحانی طور پر ہر وقت کمک ملے گی۔

دارالعلوم دیوبند بھی پہلے جاری ہوا تھا پھر عمارت کی تاسیس ہوئی تھی، وہی نقشہ اِس دارالعلوم کا بھی ہو رہا

ہے۔ یہ مشابہت فال نیک ہے۔ اُس دارالعلوم کو اگر اُس وقت کے ممتاز ارباب اخلاص نے قائم کیا تھا، تو اس دارالعلوم کو بھی اُن کے سچے جانشین قائم کر رہے ہیں جو علم وعمل میں اُن کے پیرو اور جانشین ہیں۔

میری انتہائی کوشش ہوگی کہ میں اس مبارک تقریب میں شامل ہوں، لیکن آپ جانتے ہیں کہ قبضہ کی بات نہیں ہے اور وہ بھی بقید وقت۔ دعاء فرمادیں کہ حق تعالیٰ کامیاب فرمائے۔ السعی منا و الا تمام من اللہ۔

میری طرف سے اس یادفرمائی کا شکریہ جناب اور حضرات ممبران دارالعلوم قبول فرمادیں۔ سب مل کر دعاء کا زور لگادیں تو تیسیر عسیر ہوجائے گی، سعی اپنے دل کے جذبہ سے ہوگی۔ خلیفہ جی (۱) کی خدمت بابرکت میں سلام مسنون۔ بچوں کو دُعاء۔ والدہ صاحبہ اور بھاوج صاحبہ کی خدمت میں سلام مسنون واستدعاء دُعاء۔

والسلام

محمد طیب

از دیوبند ۲۷/۵ ۱۳۷۲ھ

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:

مخدوم ومحترم دامت، فیوضکم وبرکاتکم

بعد تحیہ مسنونہ آنکہ گرامی نامہ صادر ہوا موجب صد مسرت ہوا، ان شاء اللہ تعالیٰ، دل وجان سے حاضر ہوں گا، مگر درخواست ایک تو یہ ہے کہ اگر کوئی مضمون متعین فرمادیں کہ اس موضوع پر وعظ کرنا ہوگا، تو اس کو سوچ لوں، جب فاروق اعظمؓ تقریر سے پہلے "زوّرتُ فی نفسی مقالۃً" فرمادیں، تو ہم جیسے نابکاروں کا کیا ذکر۔

دوم یہ کہ جلسہ اگر حضرت مولانا عثمانی مرحوم کے مزار کے سامنے ہو تو بہتر ہے۔

۱۔ حضرت خلیفہ محمد عاقل صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، مراد ہیں جو ہمارے دادا کے شاگرد اور دارالعلوم دیوبند میں ہمارے دادا کی جگہ فارسی اور ریاضی کے استاد رہے، اور جب تحریک پاکستان کی وجہ سے حضرت عثمانیؒ اور حضرت والد صاحبؒ نے دارالعلوم سے استعفا دیا تو انہوں نے بھی استعفا دیا، اور حضرت علامہ عثمانیؒ کے ساتھ جدوجہد میں شریک رہے۔ حضرت والد صاحبؒ اور حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی ان سے بچپن کی دوستی تھی۔

سوم یہ کہ اس ناچیز کو دو دن میں فارغ فرمادیں، تاکہ جناب والا سے فارغ ہو کر دوسرا کوئی کام کر سکوں۔
جواب باصواب کا منتظر ہوں۔

والسلام

محمد ادریس غفرلہ

حضرت مولانا خیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:

دفتر مدرسہ عربیہ خیر المدارس ملتان شہر (پاکستان)

مخدومی مکرمی حضرت مفتی صاحب، دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

طلب خیریت کے بعد عارض ہوں کہ:

گو فروری میں اسقدر طویل وعریض سفر بہت دشوار نظر آرہا ہے مگر بقول " الضرورات تبیح المحظورات "، تعمیلاً لملارشاد ۱۸ر فروری ۱۹۵۵ء بروز جمعہ پنجاب سے روانہ ہو کر ۱۹ر فروری بروز شنبہ کراچی شہران شاء اللہ تعالیٰ پہنچوں گا۔ اور مدرسۃ الاسلام سندھ میں مولوی آفتاب احمد صاحب کے پاس قیام کروں گا۔ آپ کی خدمت میں کسی وقت خود حاضر ہو جاؤں گا۔ آپ استقبال کا کوئی اہتمام نہ فرماویں۔ والسلام

طالب دعا احقر خیر محمد عفی عنہ از ملتان

۱۲ر فروری ۱۹۵۵ء

حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری، رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:

انجمن خدام الدین

شیرانوالہ دروازہ لاہور

مخدومی ومخدوم العلماء والفضلاء حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، دامت برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دارالعلوم کے قیام کے لئے زمین کا مل جانا ایک نعمت ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ مسلمانوں کے لئے یہ

سرزمین باعث ہدایت ہوگی، بارگاہ الٰہی سے بصد عجز و نیاز دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی مبارک زندگی میں اسے انتہائی تکمیل تک پہنچائے، اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہ چشمۂ آبِ حیات طلباء علوم دینیہ کو سیراب کرتا رہے، اور ہمیشہ اس سرزمین سے خدا پرست مقبول بارگاہ الٰہی علماء کرام پیدا ہوتے رہیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

اپنی مجبوریوں کی بناء پر حاضری سے معذور اور جناب والا سے معافی کا خواستگار ہوں۔

احقر الانام احمد علی عفی عنہ

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ حضرت مولانا رسول خان صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے تحریر فرمایا:

گرامی خدمت جناب مولانا صاحب، دامت فیوضکم و برکاتکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گرامی نامہ پہنچا۔ باعث صد افتخار و عزت ہوا، حق تعالیٰ جناب کے ترقیات دینی ودنیاوی کا سلسلہ غیر محدود فرمائے۔ آمین۔

میں بسر و چشم حاضری کیلئے تیار ہوں، اس بنیاد میں شرکت سعادت سمجھتا ہوں۔ مگر جناب کو لڑکی کا مقدمہ معلوم ہے۔ ۷؍فروری ۱۹۵۵ء میں تاریخ ہے۔ یہ تاریخ اگر حاضری سے مانع نہ ہوئی تو اس سعادت میں ضرور شریک ہوں گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

جناب سفر خرچ نہ ارسال فرمائیں۔ اگر مانع نہ ہوا، تو اس بنیاد کے شرف سے محروم نہ ہوں گا، جناب کی یاد فرمائی کا بیحد شکر گزار ہوں۔ والسلام مع الاکرام

مکرمی جناب حاجی وجیہ الدین صاحب سے اگر ملاقات ہو تو میری طرف سے السلام عرض کر دینا۔

محمد رسول خان عفا عنہ الرحمٰن

امام العصر حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری، رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے مولانا ازہر شاہ قیصر صاحبؒ نے تحریر فرمایا:

حضرت المحترم، دام فضلکم، سلام مسنون

دار العلوم کراچی کی روداد اور جلسہ کا دعوت نامہ ملا، دلی شکریہ عرض کرتا ہوں، عمارت سے متعلق اعلان

دلچسپی سے پڑھا۔ میری رائے کیا؟ لیکن اتنا ضرور عرض کروں گا کہ کسی وقت جماعت دیوبند کا ایک حصہ کٹ کر گجرات وکاٹھیا واڑ والوں تک گیا اور اس نے افریقہ تک دین کی اشاعت کی، تو دوسری دفعہ وہ افراد اس جماعت کے لئے اس پر مامور کیے گئے کہ وہ نومولود سلطنت میں اسلامی شعائر کو محفوظ کردیں۔ خوش قسمت ہے وہ زمین جس نے مولانا عثمانی کے لئے اپنی آغوش کھولدی، اور خوش نصیب ہے وہ خطہ جسے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کی کام کرنے والی شخصیت میسر آئی، اہل پاکستان اگر غور کریں تو ان کے یہاں دارالعلوم کی تعمیر وتاسیس کے سلسلہ میں ایک بڑا کام ہو رہا ہے جس میں امیر وغریب سب کو اپنی وسعت کے مطابق حصہ لینا چاہئے۔

امید ہے کہ آپ کے مزاج گرامی بعافیت ہوں گے، والدہ صاحبہ محترمہ سلام فرماتی ہیں۔ والسلام

سید محمد ازہر شاہ قیصر

چنانچہ جن حضرات نے وعدہ فرمایا تھا، وہ تشریف لائے۔ جلسے میں جہاں اکابر کے خطابات ہونے تھے وہاں دارالعلوم کے طلبہ کی بھی تقریریں اور مکالمے رکھے گئے تھے۔ میری عمر بارہ سال تھی، اور مجھے استاذ احمد الاحمد نے بڑی محبت سے ایک عربی تقریر کی تیاری کرائی تھی، اور شاید طلبہ کے ایک عربی مکالمے میں بھی مجھے شامل کیا تھا۔ اپنی کم عمری کے باعث میری تقریر کی بڑی ہمت افزائی کی گئی۔

اجلاس کی پہلی نشست ۲۰ر فروری کو سعودی عرب کے سفیر جناب عبدالحمید الخطیب، رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں رکھی گئی تھی جو بذات خود ایک اچھے عالم تھے۔ دوسری نشست حضرت مولانا خیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے زیر صدارت تھی، تیسری نشست ۲۱ر فروری کو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے زیر صدارت اور چوتھی نشست حضرت مولانا اطہر علی صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے زیر صدارت تھی۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوئٹہ سے خلیفہ عبدالحق صاحب اور صوبہ سرحد سے حضرت مولانا شیر محمد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے بھی جلسے سے خطاب فرمایا۔ ان کے علاوہ مرکزی وزراء میں سے جناب سردار عبدالرب نشتر صاحب، ابوحسین سرکار صاحب اور ڈاکٹر مالک صاحب نیز اسپیکر دستور ساز اسمبلی جناب مولوی تمیز الدین صاحب، شام کے سفیر جناب جواد المرابط صاحب، رحمہم اللہ تعالیٰ نے بھی شرکت فرمائی۔

۲۱؍ فروری ۱۹۵۵ء کے روزنامہ جنگ میں پہلے دن کے جلسے کی یہ خبر شائع ہوئی:

دارالعلوم کے لئے ۹۳ ہزار کے عطیات کا اعلان

" کراچی۔ ۲۰؍ فروری۔ آج دارالعلوم کراچی کا افتتاحی اجلاس عام زیرِ صدارت سفیر سعودی عرب السید عبدالحمید الخطیب منعقد ہوا جس میں کراچی کے شہریوں کی بیشتر تعداد کے علاوہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے مقتدر علماء جن میں مولانا مفتی محمد حسن (لاہور) مولانا خیر محمد (ملتان) خلیفہ عبدالحق (کوئٹہ) مولانا اطہر علی صدر نظام الاسلام پارٹی (مشرقی پاکستان) اور مقامی علمائے کرام شامل تھے۔ سفیر شام جناب جواد المرابط صاحب، مولوی تمیز الدین خاں صاحب اور سردار عبدالرب نشتر صاحب بھی شریک جلسہ ہوئے، نئے طریقہ تعلیم سے عربی سیکھے ہوئے طلباء نے عربی زبان میں تقریریں کیں۔ (۱) جسے سامعین نے بہت پسند کیا، صدر نے اپنی تقریر میں اسلامی علوم کی تحصیل وترقی کے لئے قیام دارالعلوم پر دلی مسرّت کا اظہار کیا، علم کی اہمیت وفضیلت واضح کی، اور دارالعلوم کی کامیابی کے لئے دعا کی۔ جلسۂ عام میں کراچی کے ایک تاجر جناب سیٹھ عبداللطیف باوانی نے دارالعلوم کی تعمیر کیلئے ۹۳؍ ہزار روپے عطیہ کا اعلان کیا۔ صدر کی تقریر سے پہلے مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث (جامعہ اشرفیہ لاہور) اور استاد احمد الاحمد شامی نے تقریریں کیں۔ اجلاس کی دوسری نشست بعد عشاء منعقد ہوئی۔ تیسری نشست آج ڈھائی بجے دن سے ۵ بجے تک ہوئی۔ اور چوتھی نشست آج بعد عشاء منعقد ہوئی جس میں مولانا مفتی محمد حسن اور دیگر علما نے تقاریر کیں"۔

(روزنامہ جنگ ۲۱؍ فروری ۱۹۵۵ء)

لیکن اچانک یہ حادثہ پیش آ گیا کہ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی، قدس سرہ کے رشتہ داروں کے درمیان کسی نے یہ غلط فہمی پھیلادی کہ یہ جگہ جو حضرت علامہؒ کے مزار کے قریب ہے، اس پر سب سے پہلا حق تو آپ حضرات کا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحبؒ آپ کا حق غصب کر رہے ہیں، لہٰذا انہیں اس سے روکا جائے۔ جن حضرات نے اس معاملے کو بڑھا چڑھا کر ہوا دی، اُن کی تحقیق میں پڑنا اس لئے مناسب نہیں ہے کہ اب وہ حضرات اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مکمل مغفرت فرمائیں۔ لیکن بات یہاں تک پہنچی کہ حضرت شیخ الاسلام، قدس سرہ، کی اہلیہ محترمہ جو خالص گھریلو خاتون تھیں، اور دنیا کے معاملات سے انہیں سروکار

---

(۱) ان میں سے ایک بندہ محمد تقی بھی تھا۔

نہیں تھا، ان کے بھی کان بھرے گئے، اور ان کی طرف سے لکھ کر جنگ اخبار میں ایک مراسلہ شائع کیا گیا، اور ایک پوسٹر بھی حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف شائع کیا گیا۔

جب حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، کو علم ہوا، تو وہ حضرت علامہؒ کی اہلیہ محترمہ کی خدمت میں گئے، اور صورت حال کی وضاحت کی کوشش کی، لیکن وہ ایک سادہ لوح اور گھریلو خاتون تھیں جن کے دل میں بے اعتمادی کی فضا پیدا کی جا چکی تھی، اس لئے انہوں نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا، اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ جس جگہ مدرسے کا افتتاحی جلسہ ہو رہا تھا اخبارات میں شائع ہوا کہ وہ وہاں خود پہنچ کر احتجاج کریں گی۔

یہ بات میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ جب چیف کمشنر کو دار العلوم میں بلایا گیا تھا، اُس وقت حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ اعزہ کی موجودگی میں زبانی طور پر یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ دار العلوم کو وہ جگہ حضرت علامہؒ کی یادگار کے طور پر الاٹ کردی جائے۔ اور پھر ۳ رجولائی ۱۹۵۳ء کو چیف کمشنر کے پاس درخواست دی، جو حضرتؒ کے اعزہ کے علم میں تھی، اور اُس وقت ان کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا تھا۔ اب جبکہ تمام مراحل ان کے سامنے طے کر لئے گئے، تو اچانک یہ اعتراض کھڑا کردیا گیا۔

جب حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سُنا تو انہوں نے ایک ایسا فیصلہ کرلیا جو آج کے ماحول میں تقریباً ناقابل تصور تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر مدرسہ کھول رہا ہوں، کوئی تجارتی دوکان نہیں۔ اور میں اپنے استاذ کی اہلیہ کو ناراض کر کے مدرسہ بنانا نہیں چاہتا، لہٰذا اس جلسے میں دار العلوم کا سنگ بنیاد نہیں رکھا جائے گا، البتہ چونکہ دور دراز سے بڑے مقتدر علماء کرام اور زعمائے ملت جلسے میں شریک ہونے کے لئے آچکے تھے، اس لئے یہ فرمایا کہ جلسہ بدستور جاری رہے گا، تاکہ لوگ ان بزرگوں کے خطابات سے مستفید ہوسکیں، لیکن یہ مدرسے کے سنگ بنیاد کا جلسہ نہیں، بلکہ ایک عام سالانہ جلسہ ہوگا، اور جب تک اس اٹھائے ہوئے تنازعے کا تصفیہ حضرتؒ کی اہلیہ محترمہ کی رضامندی سے نہیں ہوجاتا یہاں مدرسے کی تعمیر ملتوی رہے گی۔

چنانچہ روزنامہ نئی روشنی کے ۲۳ رفروری ۱۹۵۵ء کے شمارے میں جلسے کے بارے میں یہ خبر شائع ہوئی:

دین اور قوم کی خدمت نہ کرنے والا تاجر کفرانِ نعمت کا مُجرم ہے
دارالعلوم کے اجلاس میں عربی کے مسائل پر غور

کراچی ۲۲؍ فروری (نامہ نگار خصوصی) دارالحکومت پاکستان میں جامع ازہر کے طریقہ پر عظیم الشان اسلامی درسگاہ دارالعلوم کی جدید عمارت بیادگار شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے تعمیری کام کے افتتاح کا اعلان ہز ایکسلنسی سید عبدالحمید الخطیب سعودی سفیر متعینہ پاکستان نے ایک عظیم الشان تقریب میں کیا جس میں تمام پاکستان کے جید علماء اور فضلاء نے شرکت کی۔ ان میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب، صدر جمعیۃ علمائے اسلام ونظام اسلام پارٹی مشرقی پاکستان، مولانا خیر محمد صاحب ملتان، مفتی محمد حسن صاحب پنجاب، حضرت شیخ الحدیث علامہ محمد ادریس قاسمی لاہور، شیخ القراء قاری حامد حسین صاحب، حضرت خلیفہ عبدالحق صاحب بلوچستان، حضرت مولانا شیر محمد صاحب سرحد وغیرہ وغیرہ۔

اکابر علماء اور مولوی تمیز الدین خان صاحب، سردار عبدالرب نشتر، ابوالحسین سرکار وزیر مرکزیہ ڈاکٹر عبدالمطلب مالک وزیر مرکزیہ، سید امین المصری، ہز ایکسی لنسی سفیر شام، سیٹھ عبداللطیف باوانی، مسٹر اے ایم قریشی سابق صدر مسلم لیگ وصدر اخوان پاکستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مولانا مفتی محمد متین الخطیب نے نظام نامۂ عمل پیش کیا، اور مختصر روئیداد سالانہ پیش کی جس میں بتایا گیا کہ یہ دارالعلوم بیادگار حضرت شیخ الاسلام علامہ شبیر عثمانی ایک ٹرسٹ کے تحت قائم کیا جا رہا ہے، جس میں سیٹھ باوانی حکیم حافظ محمد سعید مالک ہمدرد دواخانہ، خان بہادر فضل کریم، خان بہادر حاجی وجیہ الدین، سیٹھ حاجی شریف، حاجی ابراہیم، مفتی محمد شفیع صاحب ٹرسٹی ہیں، اور یہ ٹرسٹ رجسٹرڈ ٹرسٹ ہے جسے حکومت پاکستان نے محاصل سے معاف کیا ہے۔ یہ اراضی میونسپل کارپوریشن نے بہ سفارش آنریبل چیف کمشنر اسی رجسٹرڈ ٹرسٹ کے نام الاٹ کی ہے۔ حکومت نے اسی دارالعلوم سے علیحدہ آٹھ سو گز اراضی شیخ الاسلام کی بیوہ بیگم صاحبہ اور ۸؍سو گز اراضی شیخ الاسلام کے بھائی کو مرحمت فرمائی ہے۔

کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا، اور دارالعلوم کی تحریک ترویج عربی کے سلسلہ میں مختلف حضرات نے عربی میں تقریریں کیں۔ جن کا مقصد ترویج علم دین اور عصر حاضر کے مطابق مسلمانوں کو علوم جدیدہ سے مستفیض ہونے کا مشورہ دینا تھا۔ سفیر سعودی عرب نے خطبہ افتتاحیہ میں مسئلہ توحید وایقان مسلم پر

ایک فاضلانہ خطبہ دیا، اور مسلمانوں کو وحدت ورسالت کے موضوعات پر متحد ومنظم ہونے کا مشورہ دیا۔دارالعلوم کے سلسلہ میں فرمایا مجھے اس کے افتتاح کرنے کی عزت حاصل ہونے کا فخر ہے۔

پہلے دن کی نشست کے اختتام پر اعلان تحریری پڑھ کر سنایا کہ سنگ بنیاد رکھنے کی رسم بدیں وجہ ملتوی کی جاتی ہے کہ ٹرسٹ کے روبرو بیگم علامہ عثمانیؒ کی چند تجاویز زیر غور ہیں۔سیٹھ حاجی عبداللطیف باوانی نے ۹۳ہزار روپیہ دارالعلوم کے تعمیری فنڈ میں دیا، تعمیر کا کام شروع ہو چکا ہے۔عمارت پر آٹھ لاکھ روپیہ صرف ہوں گے۔اور اس طرح ایک عظیم اسلامی درسگاہ اسلامی حکومت میں پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی۔سیٹھ باوانی نے کہا میں تاجر ہوں، اور ایک تاجر کا فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے جو اُسے ملتی ہیں قوم، ملک اور دین کی خدمت کرے، اور اگر کوئی تاجر یہ فرض ادا نہیں کرتا، تو وہ کفران نعمت کرتا ہے۔تمام علماء اور مقررین نے عربی زبان کی ترویج پر زور دیا، اور کہا عربی جاننا پاکستانی مسلمانوں کے لئے از بس ضروری ہے۔(روزنامہ نئی روشنی ۲۳ر فروری ۱۹۵۵ء)

جن لوگوں نے حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ بات سُنی کہ انہوں نے اس جگہ دارالعلوم کی تعمیر کو ملتوی کر دیا ہے وہ دنگ رہ گئے۔لوگوں نے کہا کہ یہ جگہ دارالعلوم کو الاٹ ہو چکی ہے، قانونی طور پر کسی کو اس میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے، اور سرکاری مشینری نے بھی یقین دلایا ہے کہ ہم آپ کے ساتھ پوری طرح تعاون کریں گے۔تعمیر کا نقشہ باضابطہ منظور ہو چکا ہے۔کچھ کمرے بھی بن گئے ہیں، حاجی عبداللطیف باوانی صاحب نے تعمیر کے لئے ۹۳ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان کر دیا ہے، ملک بھر کے مشہور علماء تشریف لائے ہوئے ہیں، ان کی موجودگی میں افتتاحی جلسہ ہو چکا ہے۔ایسی حالت میں جبکہ نانک واڑہ کی جگہ بہت تنگ ہوگئی ہے، اس جگہ سے دستبردار ہونا سخت بددلی اور بدنامی کا سبب ہوگا۔لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں دارالعلوم کی بنیاد اپنے استاد کی اہلیہ محترمہ کے ساتھ جھگڑے پر نہیں رکھ سکتا۔بلکہ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب کا بیان ہے کہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے مجلس منتظمہ سے کہا کہ چونکہ زمین مجلس منتظمہ کو الاٹ ہو چکی ہے، اس لئے آپ کو پورا حق ہے کہ آپ قانون کے مطابق تعمیر کی کارروائی جاری رکھیں، لیکن میں اس کا حصہ نہیں بنوں گا، اور اپنے مدرسے کا کام نانک واڑے میں اُس وقت تک جاری رکھوں گا، جبتک کوئی زمین کسی جھگڑے کے بغیر نہیں مل جاتی۔

اس کے بعد حکیم محمد سعید صاحب مرحوم اور خان بہادر فضل کریم صاحب کو حضرتؒ کے اعزہ سے بات چیت کرنے کیلئے بھیجا گیا۔ ان حضرات نے جو مطالبات پیش کئے، ان میں سے بیشتر حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ، نے مان لئے، مثلاً یہ کہ ان کی پہلی تجویز یہ تھی کہ مدرسہ حضرت علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے قائم ہو، اس پر پہلے ہی عمل ہو چکا تھا۔ جو بورڈ لگایا گیا تھا، اُس پر واضح لفظوں میں "بیادگار شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ" لکھا ہوا تھا، ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ جناب فضل حق صاحب کو حضرت علامہؒ کے مزار اور اس کی قریبی مسجد کا متولی بنایا جائے، حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو بھی منظور کرلیا لیکن ان کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ مدرسے کا ٹرسٹ تبدیل کر کے اُسے علامہ عثمانی ٹرسٹ بنایا جائے جو حضرت علامہ عثمانی، رحمۃ اللہ علیہ کے ورثاء پر مشتمل ہو۔ یہ بات اصولی طور پر اول تو اس لئے غلط تھی کہ ایک وقف تعلیمی ادارے کو ہمیشہ کے لئے وراثت کی بنیاد پر قائم نہیں کیا جاسکتا، دوسرے زمین کا الاٹمنٹ دارالعلوم کی مجلس منتظمہ کے نام ہو چکا تھا، اُسے توڑے بغیر اس مطالبے پر عمل ممکن نہیں تھا، جو موجودہ حالات میں عملاً تقریباً ناممکن تھا، اور سرکاری حلقے بھی اُس پر راضی نہیں تھے۔ تیسرے حضرت علامہؒ کے ورثاء میں ایک حضرت مولانا محمد یحیٰ صاحب، رحمۃ اللہ علیہ ہی ایسے تھے جو عالم تھے، اور جنہیں مدرسے کے معاملات سے دلچسپی ہوسکتی تھی۔ چنانچہ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے یہ پیشکش کی کہ انہیں دارالعلوم کی مجلس منتظمہ میں شامل کرلیا جائے گا۔ لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ جو لوگ ان حضرات کو اُبھار رہے تھے، ان کے پیش نظر نہ مدرسہ قائم کرنا تھا اور نہ حضرتؒ کے اعزہ کی کوئی خیر خواہی۔ اس لئے ان مطالبات کو تسلیم کرنے کے باوجود مخالفت جاری رہی۔ اور حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ اپنے اس موقف پر قائم رہے کہ میں مدرسے کی بنیاد جھگڑے پر رکھنا نہیں چاہتا اور بالخصوص اپنے استاذ کی اہلیہ محترمہ کو ناراض کر کے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ بکثرت سُنایا کرتے تھے کہ:

"أنا زعیم ببیت فی وسط الجنّة لمن ترک المراء وھو محقّ"

یعنی": میں اُس شخص کو جنت کے بیچوں بیچ گھر دلوانے کا ذمہ دار ہوں جو حق پر ہونے کے باوجود جھگڑا چھوڑ دے"۔

حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ کو ہم نے ہمیشہ اسی حدیث پر عمل کرتے ہوئے پایا، لیکن یہ ایسا موقع تھا کہ اس وقت اپنے حق سے دست برداری کے اس معمول کو نبھانا بڑے دل گردے کا کام تھا، اور ہم سب کے دل اس پر مسوس رہے تھے، اور یہ بات بھی تقریباً واضح نظر آرہی تھی کہ اس کے نتیجے میں یہاں حضرت علامہؒ کے شایانِ شان کوئی دارالعلوم نہیں بن سکے گا، اور یہ جگہ نہ جانے کس کام میں استعمال ہوگی، چنانچہ واقعہ یہی ہوا کہ اُس جگہ نہ کوئی دینی مدرسہ قائم ہوسکا، نہ حضرت علامہؒ کے اعزہ کو رہائش کی کوئی جگہ مل سکی، نہ حضرتؒ کے بھائی مزار اور مسجد کے متولی بن سکے۔ بلکہ جب یہ حضرات اعزہ کسی طرح دارالعلوم کی تعمیر پر راضی نہ ہوئے اور بالآخر حضرت والد صاحبؒ نے اس زمین سے مکمل دست برداری اختیار فرمالی، تو بعد میں جناب اے ایم قریشی صاحب نے (جن کے گھر میں حضرت شیخ الاسلامؒ اور ان کی اہلیہ محترمہ مقیم رہے تھے) اسلامیہ کالج کے نام سے وہاں اپنا پرائیویٹ ادارہ بنایا جس میں فیس لے کر عصری تعلیم دی جاتی ہے۔ اس میں حضرت علامہ عثمانیؒ کا کسی بھی حیثیت سے کوئی حوالہ تک نہیں تھا۔ حضرت علامہؒ کا مزار اسی کالج کے احاطے میں سالہا سال ایسی کس مپرسی کی حالت میں رہا کہ وہاں تک پہنچنا بھی دشوار تھا۔ کالج کی انتظامیہ کو اُسے صاف رکھنے کا بھی کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ پھر سالوں بعد میری فرمائش پر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے اُس کا راستہ الگ کرکے اُسے قابلِ رسائی بنایا۔

لہٰذا اُس وقت ہم جیسا کوئی ہوتا، تو وہ یہ دلیل بڑی آسانی سے پیش کرسکتا تھا کہ اگر ہم نے یہ جگہ چھوڑ دی تو اس جگہ پر کوئی بھی ایسا کام ہوسکتا ہے جو حضرت علامہؒ کی حرمت کے خلاف ہو، لیکن جس دل میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے سوا کوئی اور مصلحت نہ تھی، اُس کا فیصلہ یہی تھا کہ دارالعلوم کی بنیاد جھگڑے پر رکھنی درست نہیں۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بزرگوں سے یہی سیکھا تھا۔

قطب الارشاد حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، قدس سرہ نے بھی حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی ویران پڑی ہوئی خانقاہ کو آباد کرکے وہاں قرآن وحدیث کی تعلیم کا مبارک سلسلہ جاری فرمایا تھا لیکن جب شیخؒ کے سجادہ نشینوں نے اعتراض کیا، تو سالہا سال جاری رہنے والے تعلیمی سلسلے کو ایک لمحہ تأمل کے بغیر وہاں سے بے سروسامانی کے ساتھ مسجد میں منتقل کردیا تھا۔ حضرت والد صاحب، رحمۃ اللہ علیہ انہی کے روحانی وارث تھے اس لئے ان کا فیصلہ ہم سب کے لئے کتنا حیرت انگیز اور کتنا تکلیف دہ رہا ہو، اُن کے لئے

معمول کے مطابق تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو وہ دارالعلوم کے لئے کوئی اور بہتر جگہ عطا فرمادیں گے۔ اسی لئے میں نے بڑے بڑے علماء کو یہ فرماتے ہوئے سُنا کہ حضرت مفتی صاحب، قدس سرہ، کا تنہا یہ عمل اُن کی عظمت کردار اور صدق واخلاص کا اعلیٰ مقام ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے قریب والی زمین کا یہ واقعہ جمادی الثانیہ ۱۳۷۲ھ ہجری کا ہے۔ اُس کے بعد ہمارا تعلیمی سال شعبان میں ختم ہوگیا۔ اور شوال ۱۳۷۲ھ سے نیا سال شروع ہوا، لیکن یہ حضرت والد ماجد، رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص اور توکل کی برکت تھی کہ اس واقعے کو چند مہینے ہی گذرے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہیں زیادہ بڑی زمین شرافی گوٹھ میں عطا فرمادی جس کی تفصیل میں، ان شاء اللہ آگے ذکر کروں گا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیرہویں قسط)

لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں

رمضان ۱۳۷۴ھ (تقریباً مئی ۱۹۵۵) تک ہماری رہائش برنس روڈ کے قریب کیمبل اسٹریٹ کے ایک فلیٹ میں تھی۔ اس فلیٹ میں ہم پانچ سال مقیم رہے۔ یہ زمانہ بڑا بابرکت ثابت ہوا۔ اسی قیام کے دوران اُس حج کی توفیق ہوئی جس کا ذکر میں پہلے کرچکا ہوں۔ یہیں پر بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم نے حفظ قرآن کی تکمیل کرکے پہلی محراب سُنائی، یہیں رہتے ہوئے نانک واڑہ میں دارالعلوم قائم ہوا، اور ہماری باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ یہیں پر ہماری بڑی بہن محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ جو دیوبند سے بیوہ ہوکر آئی تھیں، ان کا نکاح حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ یہیں پر ہماری دوسری بہن جنہیں ہم چھوٹی آپا کہتے ہیں، ان کا نکاح لاہور کے جناب حافظ شفقت علی صاحب مرحوم سے ہوا، اور یہیں ہمارے دوسرے بڑے بھائی جناب محمد رضی صاحب مرحوم کا نکاح ہوا جو حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا۔ اور یہیں رہتے ہوئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دوسرے رفقاء نے بورڈ تعلیمات اسلامیہ میں پاکستان کے دستور کی اسلامی بنیادیں طے کیں جن کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء کا دستوری مسودہ مؤثر اسلامی دفعات کے ساتھ تیار ہوا (اگرچہ بعد میں گورنر جنرل غلام محمد نے دستور یہ توڑ کر ملک کو پٹڑی سے اتار دیا، اور یہ مسودہ طاق نسیان میں چلا گیا)

لیکن یہ مکان بھی کرایہ کا تھا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ کراچی میں مکان اپنا ہو۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ ہندوستان سے ہجرت کے وقت اچھی خاصی جائیداد کے مالک تھے، جس میں وسیع گھر کے علاوہ کچھ آبائی زرعی زمینیں تھیں، اور ایک باغ بھی تھا، جو انہوں نے بڑے شوق سے

لگایا تھا، اور جس سال آپ نے وہاں سے ہجرت فرمائی، اس سال اس پر آم کا پہلا پھل آرہا تھا، لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جس دن میں نے اس گھر اور باغ سے قدم باہر نکالا، وہ گھر اور باغ میرے دل سے نکل گئے۔ چنانچہ پاکستان ہجرت کے بعد یہ تمام جائیدادیں ہندوستان کی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیں۔

بالآخر پاکستان اور ہندوستان کے ایک معاہدے کے نتیجے میں یہ طے پایا کہ آبادی کے تبادلے کے نتیجے میں جو لوگ اپنی جائیدادیں ایک ملک میں چھوڑ کر دوسرے ملک گئے ہیں، انہیں ایک خاص ضابطے کے تحت نئے ملک کی متروکہ جائیدادوں میں سے حصہ دیا جائیگا۔ اس طرح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی متروکہ جائیدادوں کے بدلے کراچی کے محلے لسبیلہ ہاؤس میں ایک پلاٹ ملا تھا جس پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چار کمروں کا مکان تعمیر فرمالیا تھا۔ (مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان چار کمروں کی تعمیر پر آٹھ ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔)

چنانچہ رمضان ۱۳۷۴ھ میں اُس کی تعمیر مکمل ہوگئی تھی، اور اُس میں منتقل ہونے کیلئے عید کا انتظار تھا۔ ہم بھائیوں نے یہ طے کیا کہ رمضان المبارک کی ستائیسویں شب اُسی مکان کی چھت پر شبینہ کر کے گذاری جائے۔ برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم ماشاء اللہ حافظ ہیں۔ انہوں نے اپنے کئی ہم سبق حفاظ کو جمع کر کے تراویح ہی میں وہاں شبینہ کیا، اور غالباً دس یا بارہ پاروں کی تراویح میں تلاوت کی۔ اور عید کے بعد ۴ر شوال ۱۳۷۴ھ (مطابق تقریباً ۲۵ر مئی ۱۹۵۵ء) کو ہم اُس گھر میں منتقل ہوگئے۔

برنس روڈ کے مکان سے تو ہم پیدل ہی مدرسے چلے جایا کرتے تھے۔ لیکن لسبیلہ ہاؤس کا مکان مدرسے سے تین ساڑھے تین میل کے فاصلے پر تھا، اس لئے وہاں ہم دونوں بھائی سائیکل پر جایا کرتے تھے۔ سائیکل حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم چلاتے، اور میں اُن کے پیچھے کیریر پر یا اگلے ڈنڈے پر بیٹھ کر جایا کرتا تھا۔ کبھی کسی وجہ سے سائیکل میسر نہ ہوتی، تو بس میں بھی جانا پڑتا، اور اُس کے لئے دو بسیں بدلنی پڑتی تھیں۔

لاہور اور دیوبند کا سفر

اسی تعلیمی سال کے دوران جب میری عمر بارہ سال تھی، میری والدہ صاحبہ کو دو سفر درپیش تھے، ایک سفر لاہور کا۔ اور دوسرے والدہ صاحبہ اپنے بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں سے ملنے کیلئے دیوبند بھی جانا چاہتی تھیں۔

اگرچہ یہ میری پڑھائی کا زمانہ تھا، اور اس سفر میں ایک مہینے سے بھی شاید کچھ زیادہ مدت لگنی تھی، اور اتنے دن کا ناغہ میری تعلیم کے لئے نقصان دہ تھا، لیکن میری عمر بارہ سال تھی، اور میری والدہ نہ میرے بغیر سفر کرتی تھیں، اور نہ میں ان کے بغیر رہ سکتا تھا۔ اس لئے میں بھی یکم نومبر ۱۹۵۵ء کو انہی کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تاکید فرمائی تھی کہ جب تک لاہور میں رہوں، جامعہ اشرفیہ میں اسباق میں شریک ہوجاؤں، اور جب تک دیوبند رہنا ہو، دارالعلوم دیوبند میں۔ چنانچہ لاہور پہنچ کر حسب معمول جب حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُن سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کا ذکر کیا، تو حضرتؒ نے بڑی شفقت سے متعلقہ اسباق میں بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ میں وہاں اپنے تمام اسباق میں شریک ہوتا رہا۔ حسن اتفاق سے حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دو صاحب زادے یعنی حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جو بعد میں جوانی ہی میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے تھے) اور حضرت مولانا فضل الرحیم صاحب مدظلہم (موجودہ مہتمم جامعہ اشرفیہ) بھی اُس سال وہی کتابیں پڑھ رہے تھے جو میں پڑھ رہا تھا، اس طرح ان کے ہم سبق ہونے کا شرف حاصل ہوگیا، اور ہم تمام اسباق میں اکٹھے شریک ہوتے رہے۔

اگرچہ دارالعلوم میں اپنے اسباق کو میں جس مقام پر چھوڑ کر آیا تھا، ضروری نہیں تھا کہ یہاں بھی پڑھائی اُسی مقام پر ہوتی، دوسرے کسی نئے استاذ سے مناسبت پیدا کرنے میں بھی کچھ وقت لگتا ہے، اس لئے اس طرح سفر کے نتیجے میں جو تعلیمی نقصان ہوتا تھا، اُس کی پوری تلافی تو نہیں ہوسکتی تھی، لیکن کچھ نہ ہونے سے کچھ ہوجانا بہتر تھا، اس لئے میں نے اسی کو غنیمت سمجھا تھا۔ اور بعد میں یہ غنیمت غنیمتِ کبریٰ اس طرح بن گئی کہ ہمارے شرح جامی اور شرح تہذیب کے استاد چھٹی پر چلے گئے۔ میں نے یہ سوچ کر کہ یہ مفلسی میں آٹا گیلا ہوگیا، حضرت مفتی صاحب قدس سرہ کے دونوں صاحبزادوں سے جو میرے ہم سبق تھے، یہ تجویز پیش کی کہ ہم حضرت مفتی صاحبؒ کی خدمت میں چل کر اُن سے درخواست کرتے ہیں کہ ان دو کتابوں کے پڑھانے کے لئے کسی دوسرے استاد کا انتظام فرمادیں۔ چنانچہ ہم تینوں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور یہ درخواست پیش کی۔ حضرتؒ ہماری یہ درخواست سُن کر کھل اُٹھے، اور جواب میں ایسی بات ارشاد فرمائی جو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ تھی۔ فرمایا: "کچھ فکر نہ کرو، ہم تمہیں یہ کتابیں پڑھائیں گے، اور ان کتابوں

کے گھنٹے میں یہاں میرے پاس آجایا کرو" ۔ یہ سُن کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ حضرتؒ نے عرصۂ دراز سے تدریس کا سلسلہ چھوڑا ہوا تھا۔ اپنی ٹانگ کٹنے کے بعد وہ ٹانگ سے معذور تھے، اور اس حالت میں اُن کا وجود سراپا رشد وہدایت تھا، اور ان کی مجلس ہمہ وقت اپنے شیخ حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکروں اور اُن کے افادات سے آباد تھی، اور اُس چھوٹی سی عمر میں وہ مجھے دنیا کے مقدس ترین انسان لگتے تھے، اور جب کبھی کسی بزرگ سے بیعت ہونے کا خیال آتا، تو ان کے سوا کسی اور کی طرف ذہن نہیں جاتا تھا۔ ان کی موجودہ کیفیت دیکھنے والا کوئی شخص یہ تصور بھی نہ کرسکتا تھا کہ وہ شرح جامی اور شرح تہذیب جیسی کتابیں پڑھائیں گے۔ لیکن حضرتؒ نے اپنی شفقتوں سے نہال فرمادیا۔ ان کا مکان نیلا گنبد کے مدرسے کے ایک فلیٹ میں تیسری منزل پر واقع تھا۔ ہم روزانہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، اور حضرتؒ کے درس کے دوران اندازہ ہوتا کہ تقدس اور ولایت کا یہ سراپا نحو اور منطق کی دقیق باتوں کو بھی کتنی آسانی سے سمجھا دیتا ہے۔ شرح جامی میں حاصل ومحصول کی بحث اچھی خاصی مشکل سمجھی جاتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ حضرتؒ نے ہمیں وہ بحث چٹکیوں میں سمجھا دی تھی۔ اسی طرح شرح تہذیب کا اُس وقت کا نصاب ضابطے کی بحث تک ہوتا تھا، اور ضابطہ مشکل ہونے کی وجہ سے نصاب سے خارج تھا، لیکن حضرتؒ نے فرمایا کہ ہم تمہیں وہ بھی پڑھائیں گے، اور واقعۃً پڑھایا اور خوب پڑھایا۔ رحمہ اللہ تعالی رحمۃً واسعۃ.

تقریباً چھبیس دن لاہور کا قیام مکمل کرنے کے بعد ۲۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو والدہ صاحبہ کو دیوبند جانا تھا۔ اس سفر میں ہمارے بھائی جان (جناب محمد زکی کیفی صاحب مرحوم) والدہ صاحبہ کو دیوبند لے جانے کیلئے تیار ہوگئے، اور ان کی رفاقت میں ہم ریل کے ذریعے روانہ ہوئے۔ اُس زمانے میں ہندوستان کا سفر نت نئی مشکلات کا حامل تھا۔ کسٹم سے گذرنا، اور اُس کے بعد ریل میں سوار ہونا دنیا کے میدان حشر سے کم نہ تھا۔ اس ریل نے امرتسر پہنچایا، اور وہاں سے دوسری ٹرین ملی جس نے پورا مشرقی پنجاب عبور کرکے رات گئے دیوبند کے اسٹیشن پر اُتارا۔ میرے بچپن کے ذہن میں دیوبند کی جگہوں کا جو تصور تھا، اب چھ سال میں کراچی اور لاہور کی شہری زندگی کا عادی ہوجانے کے بعد وہ ساری جگہیں بہت چھوٹی نظر آرہی تھیں۔ میرے ذہن میں دیوبند کے اسٹیشن اور پلیٹ فارم وغیرہ کی جو تصویر بیٹھی ہوئی تھی، ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اُس تصویر کو یکا یک چھوٹا کردیا ہے۔ پلیٹ فارم پر رشتہ داروں کا بڑا مجمع تھا، اور والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ کے اُن سے ملنے اور سب کے

چہروں سے پھوٹتی ہوئی خوشی کا منظر قابل دید تھا۔

ہمارا قیام اپنے ماموں جناب انوار کریم صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہوا۔ اگلے دن میں نے اپنی بچپن کی گلیوں اور اپنے مکان کا چکر لگایا، ہمارا مکان اب شرنارتھیوں کے قبضے میں تھا، مگر انہوں نے اندر آنے کی اجازت دیدی، اور اُس میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا لگایا ہوا یہ کتبہ درسِ عبرت دے رہا تھا:

دنیا کا کچھ قیام نہ سمجھو، کرو خیال
اس گھر میں تم سے پہلے بھی کوئی مقیم تھا

یہ شعر تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گھر کی تعمیر کے وقت کندہ کرایا تھا جب اس گھر کو چھوڑنے کا کوئی تصور بھی نہیں تھا، لیکن آج یہ شعر اُس کے نئے مکینوں کو عبرت دلا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اس گھر کو چھوڑتے وقت اُس کی بالائی منزل کے ایک چھجے کے نیچے کوئلے سے ایک شعر لکھ آئے تھے۔ یہ کوئلے سے لکھا ہوا شعر بھی اُس وقت پڑھا جاتا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اُڑ جائیں گے

بہر حال! اپنے گھر میں دوسروں کی اجازت سے داخل ہونے اور ان کا ممنون ہونے کے بعد ہم اپنے محلے میں نکلے، اُس کی ایک ایک چیز اپنی جگہ موجود تھی، لیکن چھوٹی نظر آ رہی تھی، یہاں تک کہ وہ چوک جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں کہ وہ ہمارے لئے ایک بڑے میدان یا اسٹیڈیم کی حیثیت رکھتا تھا، اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سمٹ کر ایک چھوٹا سا صحن بن گیا ہے۔

زندگی کے مختلف مراحل میں انسان مختلف چیزوں کو بڑا سمجھتا ہے، لیکن بعد میں جب ان کی حقیقت واضح ہوتی ہے تو انسان اس بات پر ہنستا ہے کہ میں نے کس چیز کو بڑا سمجھا تھا۔ یہ دنیا بھی آج ہمیں بہت بڑی نظر آتی ہے، لیکن آخرت میں پہنچ کر جب اس کی حقیقت کھلے گی تو یقیناً اپنی اس کوتاہ نظری پر ہنسی آئے گی۔

بہر کیف! دیوبند کے قیام کے دوران حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہدایت کے مطابق میں نے دارالعلوم دیوبند میں اپنے اسباق شروع کر دیئے۔ شرح جامی اُس وقت حضرت مولانا نصیر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ پڑھاتے تھے (جو بعد میں شیخ الحدیث بنے) الحمدللہ ان سے استفادے کی نوبت آئی۔ کنز الدقائق

اورشرح تہذیب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب کے پاس تھی ، اور مقامات حریری حضرت مولانا جلیل الرحمٰن صاحب کے پاس ۔ میرے پھوپی زاد بھائی حضرت مولانا سید حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دار العلوم کے بڑے قابل اور مقبول استاد تھے، وہ بھی مقامات حریری پڑھاتے تھے، اور میری اوران کی خواہش تھی کہ میں اُن کے پاس مقامات پڑھوں، لیکن اُن کے گھنٹے کا کنز الدقائق سے تعارض تھا، اس لئے میں اُن سے استفادہ کرنے سے محروم رہا، لیکن دیوبند کے اس سفر کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے دار العلوم دیوبند کا، غیر رسمی ہی سہی، طالب علم بننے کی سعادت حاصل ہوگئی، اور اُسی زمانے میں مجھے وہاں کے اکابر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ میری عمر اتنی چھوٹی تھی کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دینے کا حوصلہ نہ ہوا، لیکن دور دور سے الحمد للہ زیارت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

میری ایک خالہ دیوبند سے کچھ فاصلے پر تحصیل کھتولی کے ایک گاؤں سرائے رسول پور میں مقیم تھیں۔ والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ اُن سے ملنے دو دن کے لئے وہاں بھی گئیں، اور میں ان کے ساتھ تھا۔ کھتولی وہ قصبہ ہے جو ہمارے روحانی جد امجد حضرت میاں جی منے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مسکن تھا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک نہر کے کنارے کنارے سرائے رسول پور جاتی تھی۔ اس سڑک پر رکشہ کے ذریعے ہم سرائے رسول پور پہنچے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت اور سرسبز وشاداب گاؤں تھا جس کی واحد مسجد کی امامت ہمارے خالو کرتے تھے ، اور اسی وجہ سے ہماری خالہ وہاں مقیم تھیں۔ یہ دو دن اس گاؤں میں بڑے پرلطف گذرے۔ خالص دیہاتی ماحول کا پہلی بار مشاہدہ ہوا، اور اسی میں یہ دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا کہ ہماری خالہ کی ایک پڑوسن کو جب پتہ چلا کہ ہم لوگ کراچی سے آئے ہیں، تو انہوں نے مجھے اپنے گھر بلا بھیجا۔ یہ ایک عمر رسیدہ خاتون تھیں، اور میں چونکہ بارہ سال کا بچہ تھا، اس لئے انہوں نے مجھ سے پردہ بھی نہیں کیا۔ گھر میں بٹھا کر انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کراچی سے آئے ہو؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، تو اُنہوں نے کہا: " تم میرے بیٹے حسین کو تو جانتے ہوگے ، اُس کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا: "میں تو ان کو نہیں جانتا" اس پر خاتون کی حیرانی قابل دید تھی ، انتہائی تعجب کے لہجے میں وہ بولیں : "ہائے ! تم کراچی میں رہتے ہو، اور حسین کو نہیں جانتے ؟" میں نے کہا : "وہ کہاں رہتے ہیں؟" کہنے لگیں ": ارے وہ اُسی کراچی میں رہتا ہے جس میں تم رہتے ہو"۔ اب میں سمجھا کہ یہ خاتون کراچی کو بھی سرائے رسول پور پر قیاس فرما رہی ہیں کہ

جیسے یہاں رہنے والا ہر شخص ایک دوسرے کو جانتا ہے، اسی طرح کراچی کا ہر باشندہ بھی ایک دوسرے کو جانتا ہوگا۔ اس پر میں نے اُن کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کراچی اتنا بڑا شہر ہے کہ اُس کا ایک سرا اگر یہاں سمجھا جائے تو دوسرا سرا میرٹھ میں ہوگا۔ یہ سن کر وہ اس قدر حیران ہوئیں جیسے میں انہیں الف لیلہ کی کوئی کہانی سُنا رہا ہوں۔

اب خیال آتا ہے کہ جب قرآن کریم جنت کے بارے میں یہ فرماتا ہے کہ اُس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے، یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک ادنیٰ جنتی کو اتنا بڑا رقبہ دیا جائیگا جو پوری دنیا سے دوگنا زیادہ ہوگا، تو اُس پر ہماری حیرت اُس دیہاتی خاتون کی سی ہوتی ہے جو کراچی شہر کے بارے میں یہ تصور کرنے کو تیار نہیں تھی کہ وہ سرائے رسول پور سے اتنا زیادہ بڑا ہوگا کہ اُس میں ایک باشندہ دوسرے کو پہچانتا نہیں ہوگا، اور جس کی سادگی پر ہمیں ہنسی آجاتی ہے۔ لیکن وہ انبیاء کرام جو یا تو اپنی آنکھوں سے عالم بالا کی سیر کر آئے ہیں یا عالم بالا کے پیدا کرنے والے نے براہ راست ان کو وہاں کی خبر پہنچادی ہے، وہ ہم دنیا کے دیہاتیوں کو حیرت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، پھر بھی انکو ہم پر ہنسی نہیں، ترس آتا ہے۔

بہر کیف! اپنی والدۂ محترمہ کے ساتھ لاہور اور دیوبند کا یہ سفر بڑا پر کیف بھی تھا، اور میرے لئے بہت سی سعادتوں کا بھی سبب بنا۔

وہاں سے واپس آکر میں لاہور ہی میں تھا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ جمعیت علماء اسلام کی طرف سے مغربی پاکستان کا دورہ کرتے ہوئے لاہور تشریف لائے، اور آگے پنجاب اور صوبہ سرحد کے دورے پر روانہ ہونے کا پروگرام تھا۔ اس سفر میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت نصیب ہوئی جس کی کچھ تفصیل ذکر کرنے سے پہلے حضرت والد صاحبؒ کی اُس وقت کی مصروفیات کا کچھ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے:

جاری ہے..........

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چودھویں قسط)

۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے کچھ واقعات

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی جہد مسلسل سے عبارت تھی۔ وہ پاکستان آنے کے بعد ہمہ تن اس فکر میں تھے کہ پاکستان اپنے اصل مقصد وجود یعنی نفاذ اسلام کا ایک دلکش نمونہ بنے۔ چنانچہ ملک میں ایسا دستور نافذ ہو جو اسلامی تعلیمات کا آئینہ دار ہو۔ چنانچہ اس سلسلے میں ملک کے سیکولر حلقوں سے ان کا پیہم مقابلہ رہتا تھا۔ دوسری طرف دارالعلوم کی تدریسی اور انتظامی ذمہ داریاں مستقل وقت چاہتی تھیں۔ فتویٰ نویسی کا سلسلہ الگ تھا جو کسی حال بند نہیں ہوا۔ مسجد باب الاسلام میں فجر کے بعد درس قرآن کا معمول کبھی قضا نہیں ہوا، اور بعد میں معارف القرآن کے نام سے ریڈیو پاکستان پر ہر جمعہ کو آپ کا درس الگ ہوتا تھا۔ ملکی ضروریات کے مطابق تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ تصوف وسلوک میں حضرت حکیم الامۃ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی جو امانت آپ کے پاس تھی، اُسے دوسروں تک پہنچانے کیلئے ہر اتوار کو اصلاحی مجلس منعقد فرماتے تھے، اور طالبانِ سلوک کی ڈاک الگ ایک مستقل کام تھا۔ خاندانی مسائل اس کے علاوہ تھے۔ اور ان تمام امور کیلئے سفروں کی مصروفیت بھی بکثرت رہتی تھی۔

لیکن ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء خاص طور پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیلئے طرح طرح کے مسائل لیکر آئے تھے اور اس میں بڑے بڑے اہم واقعات پیش آئے جن کا الگ الگ ذکر کرنا مناسب ہے۔

دستور پاکستان کی جدوجہد

ایک طرف جس دستور کی تیاری میں شب وروز کھپائے ہوئے تھے، وہ آخری مراحل میں تھا، اور اسے بہتر سے بہتر بنانے کیلئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے متعلقہ ذمہ داروں سے ملاقاتوں اور گفتگو کا

مستقل سلسلہ جاری کر رکھا تھا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پاکستان آنے کے بعد پہلے تین ماہ میں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے ساتھ مل کر ایک دستوری خاکہ مرتب کیا تھا۔ پھر پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے بورڈ تعلیمات اسلامیہ کے نام سے ایک ادارہ اسمبلی سے ملحق کیا جو حضرت مولانا سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں کام کر رہا تھا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُسکے رکن رکین تھے۔ چونکہ ملک میں شروع سے ایک طبقہ ایسا تھا جو ملک کو اسلامی شناخت دینے پر کسی طرح راضی نہیں تھا، اور ملک میں لادینی دستور لانا چاہتا تھا، اس لئے اسی طرح ایک پروپیگنڈا یہ تھا کہ مسلمانوں کے بہت سے فرقے ہیں، اور وہ کبھی ایک نظام دستور پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس کے جواب میں علماء کرام نے یہ طے کیا کہ تمام مکاتب فکر کے علماء مل کر اسلامی دستور کی بنیادیں متفقہ طور پر طے کریں۔ اس کیلئے حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دوسرے علماء کے تعاون سے ۳۳ رعلماء کا ایک اجتماع منعقد کیا جس میں دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور شیعہ علماء جمع ہوئے، اور انہوں نے دستور پاکستان کیلئے متفق ہو کر ۲۲ ر نکات منظور کئے، جو ملک کی دینی سیاسی جدوجہد میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر جب دستور کے بارے میں حکومت کی طرف سے ناظم الدین رپورٹ کی سفارشات پیش ہوئیں، تو ان پر غور کے لئے دوبارہ ۳۳ رعلماء کا اجتماع منعقد ہوا جس میں اس رپورٹ پر تمام مکاتب فکر کے علماء کی طرف سے متفقہ ترمیمات مرتب کر کے شائع کی گئیں۔ آخر کار ۱۹۵۴ء کے دستوری مسودے میں بورڈ تعلیمات اسلامیہ کی بیشتر سفارشات منظور کر لی گئی تھیں، لیکن گورنر جنرل غلام محمد نے دستور ساز اسمبلی کو توڑ کر معاملہ پھر صفر تک پہنچا دیا، اور نئے دستور کی تیاری کے دوران سیکولر حلقوں کے ساتھ مقابلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

ان کی طرف سے ایک پروپیگنڈا یہ کیا جا رہا تھا کہ اسلام پر عمل کرنا یا نہ کرنا انسان کا انفرادی معاملہ ہے۔ اس میں ریاست کو بحیثیت ریاست کوئی دخل نہیں دینا چاہئے، اور اس کی تائید میں یہاں تک کہا گیا کہ قرآن کریم میں ملکی دستور کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے جواب میں ایک مفصل رسالہ "دستور قرآنی" کے نام سے تحریر فرمایا جس میں قرآن کریم کی وہ آیات مفصل تشریح کے ساتھ جمع فرمائیں جن میں ملکی نظام کے بارے میں واضح ہدایات عطا فرمائی گئی ہیں۔ پھر ایک

پروپیگنڈا یہ تھا کہ اگر ریاست کو اسلامی بنایا گیا، تو اس میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ سکیں گے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اس کے جواب میں ایک رسالہ "اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق" کے نام سے تحریر فرمایا۔ ان رسالوں کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا، اور پھر یہ رسالے ہزاروں کی تعداد میں شائع کر کے انہیں اسمبلی کے ارکان اور عمائد حکومت کو بھیجا گیا اور ان سے ارکان اسمبلی کی ذہن سازی میں بڑی مدد ملی۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تقسیم ہند سے پہلے پاکستان کی تحریک میں علماء کی جدوجہد کو منظم کرنے کے لئے جمعیت علماء اسلام قائم فرمائی تھی، جس نے تحریک میں جان ڈال کر حصول پاکستان میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں اسلامی دستور وقانون نافذ کرنے کے لئے یہ جمعیت حضرتؒ ہی کی سربراہی میں قائم رہی۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اُس کے صدر قرار پائے، اور اُن کی وفات کے بعد حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہم۔ حضرت والد صاحبؒ بیشتر اوقات جمعیت کے نائب صدر کے طور پر کام کرتے رہے، پھر حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ضعف اور معذوری کی وجہ سے حضرت والد صاحبؒ کو جمعیت کا قائم مقام صدر بنا دیا گیا۔ اُس وقت چونکہ ملک مغربی اور مشرقی حصوں پر مشتمل تھا، اس لئے مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں جمعیت کی صوبائی تنظیم حضرت مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سربراہی میں کام کرتی رہی۔ جمعیت کے تحت دستوری جدوجہد کی ایک لمبی تاریخ ہے جس کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن خلاصہ یہ ہے کہ جمعیت نے اپنے محدود وسائل کے تحت تحریر وتقریر، ارباب اقتدار اور دستور ساز اسمبلی سے مذاکرات اور عوامی جلسوں کے ذریعے دستور پاکستان کو اسلامی بنانے، اور ملک میں دینی شعائر کو فروغ دینے کے لئے اپنی جدوجہد مسلسل جاری رکھی، البتہ جمعیت کی ضلعی بنیادوں پر تنظیم کمزور تھی، اور بعض جگہوں پر تنظیمی اختلاف بھی تھا۔ حضرت والد صاحبؒ کو جمعیت کی قیادت سنبھالنے کے بعد اندرونی تنظیم کو منضبط اور فعال بنانے کی بھی فکر تھی۔ ۱۹۵۵ء کے آخر میں آپ نے مغربی اور مشرقی پاکستان کا ایک دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ جس میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ساتھ تھے۔ دورے کے دو بنیادی مقصد تھے۔ ایک یہ کہ دستور پاکستان کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ اُس کو اسلامی بنانے کے لئے رائے عامہ کو ہموار کیا جائے، اور اس سلسلے میں لادینی طاقتوں کا علمی اور عوامی سطح پر مقابلہ کیا جائے۔ دوسرا مقصد یہ تھا

کہ مختلف شہروں میں جمعیت کی شاخیں قائم کرکے انہیں متحد اور منظم کیا جائے۔

حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ پنجاب اور سرحد کا دستوری دورہ

میں اس موقع پر اپنی والدہ صاحبہ (رحمہا اللہ تعالیٰ) کے ساتھ ہندوستان سے واپس آکر لاہور ہی میں تھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ اور برادر مکرم حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کے ساتھ سندھ اور پنجاب کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے لاہور تشریف لائے۔ یہاں سے جہلم، راولپنڈی، اکوڑہ خٹک، پشاور، مردان اور پھر واپسی میں سرگودھا، فیصل آباد (جو اُس وقت لائلپور کہلاتا تھا) اور شیخوپورہ جانے کا پروگرام تھا۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اس سفر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ چلوں۔ چنانچہ حضرتؒ کی اجازت سے ۲۳ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو میں بھی ساتھ ہولیا۔ لاہور سے آگے کسی شہر جانے کا یہ پہلا موقع تھا، اور اپنے ملک کے اس حصے کو دیکھنے کا بڑا شوق۔ دسمبر ۱۹۵۵ء کا آخر تھا، اس لئے سردی بڑی شدید تھی۔ لاہور سے ریل کے ذریعے جہلم پہنچے جہاں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد حضرت مولانا عبداللطیف صاحبؒ نے عظیم الشان جلسے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ جمعہ کے بعد عظیم الشان جلسہ ہوا جس سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب فرمایا، اور شام کو جمعیت کی ایک میٹنگ ہوئی۔ میں عمر کے تیرھویں سال میں داخل ہوا تھا، اور جلسے اور میٹنگ سے زیادہ سیر سپاٹے سے دلچسپی تھی، چنانچہ رات گذار کر فجر کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس قرآن تھا، لیکن ہم حضرت خطیب صاحبؒ کے ساتھ دریائے جہلم کی سیر کیلئے گئے۔ اُس وقت دریا میں لکڑی کے بڑے بڑے شہتیر پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے میزبانوں نے بتایا کہ یہ شہتیر کشمیر کے جنگلوں سے درخت کاٹ کر حاصل کئے گئے ہیں۔ شہتیروں کے تاجر وہاں سے درخت کاٹ کر یہ شہتیر دریا میں ڈال دیتے ہیں، اور وہ بہ بہ کر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ان پر نام اور نمبر لکھا ہوا ہوتا ہے، اور یہاں وہ جس کے پاس بھیجے جاتے ہیں، وہ اُسے اٹھالیتا ہے۔ کسی دریا سے افق پر طلوع آفتاب کا منظر جو پہلی بار وہاں دیکھا تھا آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔

جہلم سے ۲۴ر دسمبر کو بس کے ذریعے راولپنڈی روانہ ہوئے۔ اُس روز محلّہ ورکشاپی کی مسجد میں حضرت مولانا عبدالحنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دن کے وقت جلسے کا اہتمام کیا ہوا تھا، اور رات کو حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جن کی اُس وقت پہلی بار زیارت ہوئی۔ رات کا جلسہ بڑا عظیم الشان تھا، اور

سخت سردی کے باوجود لوگ جم کر تقریریں سنتے رہے۔ آخر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب فرمایا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کڑاکے کی سردی میں حد نظر تک پھیلے ہوئے انسان بیک وقت اسلامی دستور کیلئے انتہائی جوش وخروش کا مظاہرہ کررہے ہیں۔

اگلی منزل اکوڑہ خٹک تھی۔ راولپنڈی سے ۲۵؍ دسمبر کو ہم نے کار کے ذریعے سفر کیا۔ جب کار دریائے اٹک پر پہنچی، تو وہاں شاید کسی ریل کے گذرنے کی وجہ سے راستہ بند تھا، اس لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ یہاں انتہائی دلفریب منظر سامنے تھا۔ ایک طرف دریائے اٹک اور دریائے کابل کا سنگھم نظر آرہا تھا، اور اس کے دونوں طرف سرسبز پہاڑ۔ ایسا منظر میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس موقع پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ پاکستان بننے سے پہلے جب ہم نے حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) کا دورہ کیا تھا، تو اُس وقت بھی ہماری گاڑی یہاں آکر رک گئی تھی اور سامنے جو حسین منظر تھا، اُسے دیکھ کر حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عجیب نکتہ بیان فرمایا تھا۔ انہوں نے اس منظر کو دیکھ کر فرمایا کہ کیا تمہیں اس منظر میں کوئی ترتیب نظر آتی ہے؟ دیکھو نہ دریا ایک سیدھ میں بہہ رہا ہے نہ ان پہاڑوں کے نشیب وفراز میں کوئی ترتیب نظر آتی ہے، دریا بل کھاتا ہوا بہہ رہا ہے۔ کوئی پہاڑ اونچا اور کوئی نیچا ہے۔ اس پر اُگنے والے درخت بھی ایک لائن میں نہیں ہیں، بلکہ کوئی درخت سیدھا ہے، کوئی خم کھائے ہوئے ہے۔ لیکن اس منظر کا مجموعی حسن ایسا ہے کہ بار بار دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حسن ہی بے ترتیبی میں ہے اگر اس میں ربط اور ترتیب پیدا کرنے کی کوشش کی جائیگی تو اس منظر کی بے ساختگی اور اس کا فطری حسن مصنوعی بن کر اپنی دلکشی کھو بیٹھے گا۔

پھر فرمایا کہ لوگ قرآن کریم کی آیات میں زبردستی ربط تلاش کرنے کی کوشش میں بعض اوقات بیجا تکلف سے کام لیتے ہیں، حالانکہ اس کے بے ساختہ حسن کو محسوس کرنے کیلئے کسی ربط وترتیب کو بہ تکلف تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دن کے بارہ بجے ہم اکوڑہ خٹک پہنچے، اور اُس روز کی ڈائری میں میرے یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

"۱۲ بجے اکوڑہ پہنچے۔ بہت بڑا جلوس لینے آیا تھا۔ "قانون قرآن زندہ باد"، "مفتی محمد شفیع زندہ باد"، "مفتیٔ اعظم زندہ باد" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی، اور دو لڑکے بڑی شیریں آواز میں عربی ترانہ پڑھ رہے تھے۔"

یہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم حقانیہ کے ذریعے اپنا فیض جاری فرمایا ہوا تھا۔ حضرتؒ ہی کے مدرسے میں قیام ہوا۔ اُس وقت حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہم [۱] بھی مدرسے میں زیر تعلیم تھے، ان سے پہلی ملاقات اسی موقع پر ان کے ایک ناقابل فراموش احسان کے ذریعے ہوئی۔ وہ اس طرح کہ اکوڑہ خٹک اُس وقت "حسن بداوت" (دیہاتی حسن) کا ایک نمونہ تھا، حضرتؒ کے جس مکان میں ہمارا قیام ہوا، وہ گارے کا بنا ہوا کچا مکان تھا۔ اُس وقت یہاں قدیم عرب کی وہی روایت چلی آتی تھی کہ گھروں میں بیت الخلا بنانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ہمیں اُس وقت تک "بداوت" کے اس "حسن غیر مجلوب" (۲) کا کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ زبردست سردی کی ٹھٹھری ہوئی رات میں مجھے بیت الخلا کی ضرورت پیش آئی، تو اپنی عمر سے قریب جو نوجوان نظر آئے، وہ مولانا سمیع الحق صاحب ہی تھے۔ کم عمری کی وجہ سے اپنی اس ضرورت کا اظہار کرتے ہوئے شرم بھی آرہی تھی، لیکن طبیعت ان تکلفات کی متحمل نہیں تھی، میں نے ان سے بیساختہ اپنی ضرورت کا اظہار کردیا۔ ان کے چہرے پر کچھ دیر کے لئے تأمل کے کچھ آثار نظر آئے، لیکن فوراً ہی انہوں نے مجھ سے اپنے پیچھے آنے کو فرمایا، اور پھر وہ مجھے اندھیری رات میں ہاتھ پکڑ کر گلی سے گذرتے ہوئے ایک مکان کی چھت پر لے گئے اور ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف اشارہ کرکے میری مشکل آسان کی۔ اگرچہ کچھ اندازہ یہ ہورہا تھا کہ یہاں میرا یہ عمل **وضع الشيء في غير محله** (۳) کی قباحت سے خالی نہیں ہے، لیکن ان باریکیوں میں جانے کا موقع نہیں تھا، اس لئے میں نے بھی تکلف نہیں کیا۔

یہاں آتے ہوئے تو بات کرنے کا موقع نہیں تھا، لیکن ان کا احسان مند ہونے کے بعد واپسی میں اُن سے تعارف ہوا اور پھر ایسا تعارف ہوا کہ وہ دوستی میں تبدیل ہوگیا جس کا ذکر ان شاء اللہ آگے کہیں آئے گا۔

اکوڑہ خٹک ہی میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ (جنہیں حضرت حکیم الامتؒ "کامل پورے" فرمایا کرتے تھے،) شیخ الحدیث تھے۔ ہمارے محبوب استاذ حضرت مولانا سحبان محمود

---

(۱) افسوس کہ آج جب یہ روداد چھپ رہی ہے تو انہیں مدظلہم کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے۔

(۲) بداوت کے معنی ہیں "دیہاتی انداز" اور "حسن غیر مجلوب" سے متنبی کے اس شعر کی طرف اشارہ ہے جس میں اس نے کہا ہے کہ: حسن الحضارة مجلوب بتطرية وفي البداوة حسن غير مجلوب

(۳) اس کے معنی ہیں "کسی چیز کا بیجا استعمال"، اور عام طور پر یہ اصطلاح "ظلم" کی تعریف کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُن کے شاگرد تھے، اور ان کی زبان سے حضرتؒ کا محبوبانہ تذکرہ نہ جانے کتنی بار سن کر ان کی زیارت کا اشتیاق تھا۔ الحمد للہ یہ اشتیاق وہیں پورا ہوا۔ حضرتؒ کے نورانی پیکر کی یہ پہلی اور آخری زیارت تھی۔ میں نے حضرتؒ سے ذکر کیا کہ ہمارے محبوب استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب ہیں، جو آپ کے شاگرد ہیں، اور اس طرح میں آپ کا بالواسطہ شاگرد ہوں۔ حضرتؒ مسکرائے اور بڑی شفقت کا معاملہ فرمایا۔

اگلے دن صبح نو بجے اکوڑہ خٹک سے ہم نوشہرہ پہنچے جہاں ایک بڑا مجمع استقبال کے لئے جمع تھا، اور "مفتیٔ اعظم زندہ باد" اور "ناظم اعلیٰ زندہ باد" کے نعروں سے ماحول گونج رہا تھا۔ صرف تین گھنٹے کے قیام کے دوران جامع مسجد نوشہرہ میں بڑا جلسہ ہوا، اور ظہر کے بعد مردان کیلئے روانہ ہوئے، اور مسجد پیراں کے قریب قیام ہوا۔ عصر کے بعد مولانا مدرار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گنج بازار میں جمعیت کی میٹنگ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ اور رات کو مسجد پیراں میں جلسہ ہوا۔ اور ۲۷ر دسمبر کی صبح حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی مسجد میں درس قرآن دیا۔ اور اسی شام چار بجے چارسدہ سے ہوتے ہوئے پشاور پہنچے۔ رات کو قصہ خوانی بازار کی ایک مسجد میں جلسہ تھا جو دوسرے جلسوں کی طرح بھرپور تھا۔

یہ میرا صوبۂ سرحد (موجودہ خیبر پختونخوا) دیکھنے کا پہلا موقع تھا، اور اُس کی اتنی بات یاد ہے کہ ہر کھانے کے بعد سرخ سرخ مالٹوں کا دور چلا کرتا تھا، اور اس کے بعد یہاں کا مشہور "کاوا" یعنی سبز چائے بھاری سے بھاری کھانے کو ایسا ہضم کردیتی تھی کہ تھوڑی دیر میں پھر بھوک لگنے لگتی تھی۔

پشاور سے ۲۸ر دسمبر کو بس کے ذریعے ہٹیاں روانہ ہوئے۔ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وطن "دریا خان" لیجانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔ چنانچہ ہٹیاں سے تانگے کے ذریعے "دریا خان" پہنچے جہاں نماز ظہر ادا کی اور حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ضیافت سے لطف اندوز ہوئے۔ اُس کے بعد تانگے ہی کے ذریعے حضرو پہنچے جہاں حضرت مولانا نصیرالدین صاحب غور غشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی، اور ایک کامیاب جلسے کے بعد وہیں سے بس کے ذریعے کیمبل پور (موجودہ اٹک) روانہ ہوئے جہاں عشاء کے بعد جلسے سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خطاب فرمایا، اور اُس کے بعد ریلوے اسٹیشن پہنچ کر سرگودھا جانے کیلئے ریل میں سوار ہوئے، حضرت مولانا عبدالحنان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو پورے سفر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھے، راستے میں راولپنڈی پہنچ کر اتر گئے، اور حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ریل میں ہماری رات گذری۔ صبح اندھیرے ریل حسن وال

کے اسٹیشن پر پہنچی، تو وہاں ایک مجمع حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صرف زیارت کے لئے نہ جانے کب سے منتظر کھڑا تھا، ریل صرف چند منٹ ٹھہری، اور اسی میں محبت کرنے والوں نے اپنا حق محبت ادا کردیا۔ طلوع آفتاب کے وقت ریل سرگودھا پہنچی جہاں حضرت مولانا محمد شفیع صاحب سرگودھوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑے مجمع کے ساتھ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کیا، اور وہاں بھی بڑا زبردست جلسہ ہوا۔

اگلی صبح ۳۰/ دسمبر کو اسی ریل سے لائل پور (موجودہ فیصل آباد) روانہ ہوئے، جہاں بہت بڑا مجمع استقبال کے لئے موجود تھا، اور جمعہ گھنٹہ گھر کے قریب ایک مسجد میں پڑھا، جہاں جمعہ کے بعد ایک پُر ہجوم جلسہ تھا، وہاں کا زرعی کالج پہلی بار دیکھا۔ ۳۱ دسمبر کو بس کے ذریعے شیخوپورہ پہنچے، اور ظہر کے بعد جلسہ ہوا، اور اُسی دن شام ۴/ بجے کے قریب واپس لاہور پہنچے۔ اور یکم جنوری ۱۹۵۶ء کو بس کے ذریعے سیالکوٹ پہنچے جہاں ہمارے پھوپی زاد بھائی مولانا حامد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے گھر پر قیام ہوا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں علماء کرام کے ایک اجتماع سے خطاب فرمایا۔ ۲/ جنوری کو واپس لاہور پہنچے۔ حضرت والد صاحب اور حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ فوراً ہی مشرقی پاکستان کے دورے پر روانہ ہوگئے، اور وہاں بھی اسی طرح کا طوفانی دورہ کیا، لیکن ہمارے اسباق سے کافی غیر حاضری ہو چکی تھی، اس لئے وہاں سے واپس کراچی آکر ہم دوبارہ پڑھنے میں مشغول ہوگئے، یہاں تک کہ تعلیمی سال ختم ہوگیا۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ان طوفانی دوروں کی خبریں اخبارات میں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، اور اس دورے سے دو بڑے فائدے ہوئے۔ ایک تو ملک کا جو دستور تکمیل کے مراحل میں تھا، اور سیکولر حلقے اُسے ایک لادینی دستور بنانے کی فکر میں تھے، ان دوروں کے ذریعے ملک بھر میں ان کے خلاف ایک فضا بنی جس کے نتیجے میں اُن حلقوں کی یہ کوشش پیچھے چلی گئی۔ دوسری طرف ان دوروں کے نتیجے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جمعیت علماء اسلام کو ضلعی سطح پر فعال بنانے کے لئے جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم فرمائیں، اور باہمی اختلافات کو رفع کرکے یکجہتی کا ماحول پیدا کرنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی۔ (۱)

چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جمعیت علماء اسلام اور ملک کے دوسرے دینی حلقوں نے دستور پاکستان کے سلسلے میں جو انتھک جدوجہد کی تھی، آخر کار اس میں اس حد تک کامیابی حاصل ہوئی کہ ۱۹۵۶ء

(۱) اس سفر کی یہ تفصیلات میری ڈائری سے ماخوذ ہیں۔

کے دستور میں متعدد اسلامی دفعات شامل ہوئیں جن کی وجہ سے اس لابی کو شکست فاش ہوئی جو ملک کا دستور لادینی بنیاد پر بنانا چاہتی تھی، اور ملک سیکولر بننے کے خطرے سے بچ گیا۔ چنانچہ اس دستور کے نفاذ کے لئے ۲۳؍ مارچ ۱۹۵۶ء کی تاریخ مقرر کی گئی۔ یہ وہی تاریخ تھی جس میں ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی۔ اس تاریخ کو ملک بھر میں "یوم جمہوریہ" منایا گیا، اور ملک کے ریاستی سربراہ کو گورنر جنرل کے بجائے پہلی بار صدر مملکت کہا گیا، اور اگر یہ کہا جائے، تو بیجا نہیں ہوگا کہ ملک کو مکمل آزادی اُس روز حاصل ہوئی۔ اس لئے اس دن پورے ملک میں ایک جشن کا سا سماں تھا۔ دارالعلوم کے طلبہ تقریر کی مشق کے لئے جو ہفتہ وار اجتماع منعقد کیا کرتے تھے، اس روز اس کا موضوع یہی تھا۔ اور اس موقع پر میں نے بھی ایک ٹوٹی پھوٹی نظم کہی تھی جو اس اجتماع میں پڑھی گئی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(پندرہویں قسط)

جس جمعیت علماء اسلام کے دورے کا ذکر میں نے پیچھے کیا ہے، یہاں بظاہر یہ ضروری تھا کہ اس کا مختصر تعارف بھی کراؤں، اور اس سوال کا بھی جواب دوں جو اکثر ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ جمعیت علماء اسلام آیا وہی ہے یا کوئی اور؟ لیکن اس وقت میں اپنے بچپن اور لڑکپن کی یادیں لکھ رہا ہوں، اس لئے یہاں اس داستان کو چھیڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا تذکرہ اپنے موقع پر آئے گا۔

تعلیمی سال کا اختتام

لاہور، دیوبند اور صوبۂ سرحد و پنجاب کے سفر کی بنا پر میں دو مہینے سے زائد دارالعلوم سے غیر حاضر رہا۔ اس لئے میری تعلیم کا کافی نقصان ہو چکا تھا۔ اگرچہ جامعہ اشرفیہ لاہور اور دارالعلوم دیوبند میں کچھ عرصہ تعلیم جاری رہی، لیکن ظاہر ہے کہ وہ مرتب تعلیم کا بدل نہیں ہو سکتی تھی۔ اور واپسی کے بعد بمشکل تین مہینے امتحان سالانہ میں باقی تھے۔ اس لئے نقصان کی تلافی کے لئے کافی محنت کرنی پڑی۔ اس سال میرے سالانہ امتحان کا حسب ذیل نتیجہ دارالعلوم کی رُوداد بابت رمضان ۱۳۷۴ھ تا شعبان ۱۳۷۶ھ مطابق مئی ۱۹۵۵ء تا اپریل ۱۹۵۷ء میں درج ہے:

کنز الدقائق: ۵۱، البلاغۃ الواضحۃ: ۵۰، ترجمۂ قرآن کریم: ۵۰، شرح جامی: ۴۹، مقامات حریری: ۴۶، قطبی: ۴۱، اصول الشاشی: ۴۵، شرح تہذیب: ۴۴، خوشنویسی: ۴۵

میری ڈائری میں درج ہے کہ کنز الدقائق کا امتحان مفتی صابر علی صاحبؒ نے، البلاغۃ الواضحۃ اور خوشنویسی کا امتحان حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ نے، ترجمۂ قرآن کریم کا مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ

نے، شرح جامی کا مولانا زیارت گل صاحبؒ نے، (جنھوں نے اپنا نام بعد میں حضرت والد صاحبؒ کی تجویز پر بدل کر عبدالحق رکھ لیا تھا) مقامات حریری کا امتحان تحریری تھا، شرح تہذیب کا مولانا بدیع الزمان صاحبؒ نے، قطبی کا مفتی ولی حسن صاحبؒ نے، اور اصول الشاشی کا مولانا فضل محمد صاحبؒ نے لیا تھا۔ رحمهم الله تعالیٰ اجمعین.

تجوید کی مشق

مجھے یہ احساس کمتری پریشان کرتا رہتا تھا کہ میں نے پورا قرآن کریم باقاعدہ کسی استاذ سے نہیں پڑھا، بلکہ سات پاروں کے بعد خود ہی پڑھ پڑھ کر پورا کرلیا تھا۔ اس وجہ سے میرے تلفظ میں کافی کوتاہیاں تھیں۔ دارالعلوم میں پڑھنے کے دوران میں نے ان کوتاہیوں کو دور کرنے کیلئے کئی قاری صاحبان سے قرآن کریم کی تجوید کی مشق کی۔ ان میں سب سے پہلے تو جناب قاری محمد الیاس صاحب مرحوم تھے جو ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق، حضرت قاری محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے، اور ہمارے بھائی جناب محمد رضی صاحبؒ کے نسبتی بھائی بھی تھے۔ وہ دارالعلوم میں مشق قرائت کرایا کرتے تھے۔ میں نے اُن سے جمال القرآن پڑھا، اور سورۂ یوسف کی قرائت کی ابتدائی مشق کی۔ پھر حضرت قاری عبدالوہاب مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم میں اس خدمت پر مامور ہوئے، تو میں نے اُن سے بھی مشق کر کے استفادہ کیا۔ اور ان کی بتائی ہوئی یہ بات اب تک یاد ہے کہ قراءت حفص کی ایک روایت میں سارے قرآن کریم میں اشمام صرف ایک جگہ موجود ہے، اور وہ سورۂ یوسف کی آیت کریمہ مَالَكَ لَا تَأْمَنَّا کے نون میں ہے کہ اسے ادا کرتے ہوئے ہونٹوں کو اس طرح موڑا جاتا ہے جیسے ضمہ کی ادائیگی کے وقت ہونٹ مڑتے ہیں لیکن ضمہ پڑھا نہیں جاتا۔

اُن کے بعد حضرت قاری حامد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس زمانے میں اپنی خوش الحانی میں شہرۂ آفاق تھے۔ وہ بڑے نازک مزاج اور نفیس طبع بزرگ تھے۔ ان کے بستر پر ایک معمولی شکن بھی پڑ جائے تو وہ سو نہیں سکتے تھے۔ ان کا کمرہ اَوَدھ کے کسی نواب کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ساری عمر شادی نہیں کی، مگر ایک بلی پالی ہوئی تھی، وہی ان کی گھریلو دلچسپی کا سامان تھی، اور اُس کے ساتھ وہ بچوں کی طرح کھیلا کرتے تھے۔ وہ مرگئی، تو ان کو باقاعدہ آنسوؤں سے روتے ہوئے دیکھا گیا۔ قرآن کریم کی تلاوت میں وہ بہت سے لہجوں کے ماہر تھے،

اوران کی تلاوت سننے والوں کے لئے سماں باندھ دیتی تھی۔ میں نے اُن سے بھی استفادہ کرنا چاہا، لیکن وہ جتنے نازک مزاج تھے، اُتنے ہی زودرنج اور جلالی بھی تھے۔ میں نے ایک دودن اُن سے مشق کی، تو انہیں میری کسی بے ہودگی پر جلال آ گیا، اور انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ اُس کے بعد اُن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی، اس لئے ان سے استفادہ کرنے سے محروم رہا۔ اس کے علاوہ لاہور کے قیام کے دوران میں کبھی کبھی حضرت قاری عبدالمالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بھی چلا جاتا تھا۔ انہوں نے مجھے سورۂ حشر کے آخری رکوع کی مشق کرائی، اور مجھے یاد ہے کہ سورت کے آخری جملے "وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" کی تلاوت کے وقت میں جب "العزیز" کے حرف لام پر پہنچا تو اس کی ادائیگی کے وقت اُس میں قلقلہ پیدا ہوجاتا تھا۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس پر کئی بار ٹوکا، مگر میری وہ عادت ختم نہ ہوئی، اس پر حضرت نے مجھے یہ گُر سکھایا کہ جب تم حرف "لام" ادا کر رہے ہو، تو اُسی وقت "عین" بھی ساتھ ساتھ پڑھ لیا کرو، اس طرح "لام" کی ادائیگی میں قلقلہ پیدا نہیں ہوگا۔ غرض انہوں نے اس ایک رکوع میں وہ کچھ سکھا دیا جو مہینوں میں بھی سیکھنا مشکل تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ.

دارالعلوم نانک واڑہ کا آخری سال

۱۳۷۵ھ کے شوال میں ہمارا دارالعلوم نانک واڑہ میں آخری سال تھا۔ اور اُس میں ہمیں ہدایہ اولین، نورالانوار، مختصر المعانی وغیرہ پڑھنی تھیں، اور یہ پہلا موقع تھا کہ ہمارے اسباق حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس نہیں تھے۔ ہدایہ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحبؒ کے پاس تھی۔ نورالانوار حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس شروع ہوئی جو انتہائی مقبول استاذ تھے، اور اپنے شگفتہ اندازِ گفتگو سے درس کو کشتِ زعفران بنائے رکھتے تھے۔ لیکن بعد میں اُنہیں مدرسے کی طرف سے اوپر کی کوئی کتاب پڑھانے کیلئے مل گئی، اس لئے نورالانوار حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس منتقل ہوگئی، اور اپنے محبوب استاد کے پاس دوبارہ کم از کم ایک گھنٹے حاضر رہنے کی مسرت میسر آ گئی۔

مختصر المعانی، سلم العلوم اور دیوان متنبی حضرت مولانا فضل محمد صاحب سواتی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئیں جو بڑے منجھے ہوئے تجربہ کار استاذ تھے۔ حضرتؒ سے ہمیں مسجد باب الاسلام میں گلستاں کا کچھ حصہ پڑھنے کا موقع ملا تھا، اوراُن کی شخصیت کا بڑا بھاری رعب دل پر چھایا ہوا تھا، لیکن ان اسباق کی تدریس میں اُنہوں نے

جس شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا، وہ غیر معمولی تھا، اور ان کے احسانات کا حق ادا کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ان کا انداز تدریس بھی بڑا دلنشین تھا۔اتفاق سے مجھے اپنی ٹیڑھی طبیعت کی وجہ سے مختصر المعانی سے کبھی مناسبت نہ ہوسکی، کیونکہ بلاغت میں منطقی چون وچرا ذوق پر بہت بار گذرتی تھی، اور یوں بھی پچھلے سال حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے البلاغة الواضحة جس اہتمام سے جھوم جھوم کر پڑھی تھی کہ ساتھ ساتھ ادبی عبارتوں اور اشعار میں علم بلاغت کے قواعد کا اجراء اور اُن کی مشق بھی ساتھ ساتھ ہوتی جاتی تھی، اُس کے بعد مختصر المعانی کی چون وچرا میں دل نہیں لگتا تھا۔ اسی طرح منطق کی ضروری اصطلاحات کا علم حاصل کرنے کے بعد اُس کی تفصیلی بحثوں کا بھی کوئی خصوصی ذوق نہیں تھا، اس لئے سلّم العلوم میں بھی زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔البتہ دیوان متنبی ہم نے ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی، اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وہ بڑے اہتمام سے پڑھائی۔اُس کے بہت سے اشعار بھی مجھے یاد ہوگئے۔اور سب سے زیادہ لطف ہدایہ اور نور الانوار میں آتا تھا۔ہدایہ میں حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فقہ اور اصول کے نادر نکات تو بیان فرمایا ہی کرتے تھے۔اُس کے ساتھ وہ عمومی تربیت اور ذہن سازی کیلئے بھی بڑی مؤثر باتیں ارشاد فرماتے، اور عمومی مطالعہ بڑھانے کیلئے بھی ہدایات دیتے رہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے میرا عربی لکھنے کا شوق دیکھا تو ایک دن فرمایا کہ کتب خانے میں ایک کتاب " فقه اللغة " رکھی ہے، اُس کا مطالعہ کیا کرو۔یہ ابومنصور ثعالبیؒ کی " فقه اللغة " تھی جسے دیکھ کر وہ مجھے بہت دلچسپ معلوم ہوئی، اور اُسے میں نے پڑھانے کے زمانے تک مطالعے میں رکھا، اور اُس سے زبان وبیان کے تنوع میں بڑی مدد ملی۔

دینی مدارس میں یہ روایت شروع سے چلی آتی ہے کہ طلبہ استاذ سے سبق پڑھنے کے بعد اس کو دہرانے کیلئے ایک جماعت بنالیتے ہیں، پھر اپنے ہی میں سے کسی اچھی استعداد والے ساتھی کو منتخب کرلیتے ہیں کہ وہ سبق دہرا کر انہیں سنائے۔اس عمل کو ہمارے مدارس کے ماحول میں " تکرار " کہا جاتا ہے۔اور جو ساتھی تکرار کراتا ہے، اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ استاذ کی تقریر کا چربہ اتار کر طلبہ کے سامنے پیش کردے۔اس کے لئے ایک طرف تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ خود سبق کو اچھی طرح سمجھا ہوا ہو، اور دوسری طرف چونکہ وہ بھی ایک طرح کی تدریس ہوتی ہے، اس لئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ تکرار کرانے والے میں بات سمجھانے کی اچھی صلاحیت ہو۔جب جماعت میں اس صلاحیت کے حامل ایک سے زیادہ طلبہ ہوں تو وہ تکرار کرانے کیلئے

باریاں بھی مقرر کر لیتے ہیں۔ اور تجربہ یہ ہے کہ تکرار کا یہ طریقہ تمام طلبہ کیلئے نہایت مفید ہوتا ہے، اور خاص طور پر جو طلبہ تکرار کراتے ہیں، انہیں ساتھ ساتھ تدریس کی بھی اچھی مشق ہو جاتی ہے۔

میری جماعت میں کوئی میرا ہم عمر نہیں تھا۔ سب مجھ سے بڑے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تکرار کی جماعت بنتی، تو تکرار کرانے کی ذمہ داری مجھ سے بڑی عمر کے ساتھیوں ہی کے حصے میں آتی، اور میں عموماً تکرار میں سامع ہی کی حیثیت سے شریک ہوتا۔ اکثر تکرار میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کرایا کرتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالی نے انہیں مضبوط علمی استعداد کے ساتھ فصاحت بیان بھی خوب عطا فرمائی ہے، اس لئے اُسی وقت سے ان کا تکرار طلبہ میں مقبول تھا۔ میری زبان میں روانی نہیں تھی، اور میں اٹک اٹک کر بولا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں ساتھیوں کو الجھن ہوتی تھی۔ اس لئے مجھے تکرار کرانے کا موقع کم دیا جاتا تھا، اور اس طرح مجھے اپنی اس کمزوری کو دور کرنے کا موقع بھی نہیں ملتا تھا۔

مجھے اپنی اس کمزوری کا احساس تھا، اور اُسے دور کرنے کی فکر بھی۔ اس کا خداداد انتظام کچھ اس طرح ہوا کہ کوئٹہ کے ایک طالب علم جو عمر میں مجھ سے بہت زیادہ تھے، اور بلوچستانی پگڑی پہن کر اپنی قد وقامت میں مجھ سے دگنے لگتے تھے، سال کے درمیان عربی کے پہلے سال میں داخل ہوئے۔ ان کے جو اسباق رہ گئے تھے، وہ انہوں نے مختلف ساتھیوں سے پڑھنے شروع کئے۔ میں نے انہیں پیشکش کی کہ "عربی کا معلم" میں آپ کو پڑھاؤں گا۔ وہ اپنے سے آدھی عمر کے ایک پتلے دبلے کھلنڈرے قسم کے طالب علم سے شاید پڑھنے کو راضی نہ ہوتے، لیکن میں دارالعلوم کے مختلف اجتماعات میں عربی کی جو رٹی رٹائی تقریریں کرلیا کرتا تھا، ان کی وجہ سے طلبہ میں میری کمسنی کے باوجود میری عربی دانی کا کچھ تأثر بیٹھا ہوا تھا، اس لئے انہوں نے مجھ سے پڑھنا منظور کرلیا، اور میں نے دوپہر کو چوتھے گھنٹے کے بعد انہیں عربی کا معلم پڑھانا شروع کردیا۔

انہیں پڑھانے کے لئے جو وقت طے ہوا تھا، اس کا انتظار اور اشتیاق داڑھی والے "شاگرد" کے بجائے بارہ سالہ "استاد" کو زیادہ رہتا تھا۔ جونہی چوتھا گھنٹہ بجتا، میں بلا تاخیر مقررہ جگہ پہنچ کر ان کا انتظار کرتا۔ وہ کچھ بے نیاز سے واقع ہوئے تھے۔ اطمینان سے تشریف لاتے، اور مجھے ان کے انتظار میں ایک ایک منٹ بھاری معلوم ہوتا۔ کبھی کبھی بغیر اطلاع کے ناغہ بھی فرمادیتے، اور میں اس کشمکش میں پڑ جاتا کہ اگر انہیں تلاش کرنے جاؤں، تو بظاہر یہ "استادی" کے وقار کے خلاف بات تھی، اور اگر تلاش نہ کروں، تو پڑھانے کی

لذت سے کیسے محروم رہوں؟ آخر کار پڑھانے کا شوق "استادی" کے وقار کو شکست دیدیتا، اور میں انہیں تلاش کرنے کیلئے مختلف درسگاہوں کی خاک چھانتا رہتا، اور وقت گذرنے کے بعد اگلے دن کا انتظار شروع کر دیتا۔ اگلے دن وہ بڑی بے نیازی سے آتے، تو میرا یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ اُن سے غیر حاضری کی وجہ پوچھتا، اور وہ اس طرح کتاب کھول لیتے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ میں انہیں اردو سے عربی بنانے کا تحریری کام دیتا، تو کبھی کراتے، کبھی نہیں، میں اس کی باز پرس کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا، کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کل سے پڑھنا ہی بند نہ کردیں، اور میں دیکھتا رہ جاؤں۔ مجھے تو اُن سے یہ فائدہ حاصل کرنا تھا کہ اُن کے سامنے سبق کی تقریر کرکے اپنی زبان میں روانی کی عادت ڈالوں، چنانچہ الحمدللہ رفتہ رفتہ اپنا ما فی الضمیر دوسرے تک پہنچانے کی کچھ نہ کچھ عادت پڑتی گئی۔ وہ مجھے صبر وسکون سے برداشت کرتے رہے، اور میں ان کی شان بے نیازی کو برداشت کرتا رہا۔ یہاں تک کہ جب "عربی کا معلم" کا پہلا حصہ ختم ہوا، تو میرے اندازِ گفتگو میں کسی قدر اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ اس طرح درحقیقت وہی تدریس اور تقریر سکھانے میں میرے استاد تھے کہ انہی کے ذریعے مجھے اندازِ تکلم کی تربیت ملی۔ اب نہ جانے وہ کہاں ہیں؟ مجھے اب ان کا نام بھی یقین کے ساتھ یاد نہیں آرہا (ایسا یاد پڑتا ہے کہ ان کا نام شاید اختر محمد تھا) لیکن وہ جہاں بھی ہوں، اللہ تبارک وتعالی ان کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازیں کہ ان کا مجھ پر بڑا احسان ہے۔

بہر حال! اس تربیتی کورس سے گذرنے کے بعد میری جماعت کے ساتھی بھی مجھ سے تکرار کرانے پر راضی ہوگئے۔ بھائی صاحب کی تکرار کی جو جماعت تھی، ان کی فصاحت بیان کی وجہ سے اُس کے لئے مجھے برداشت کرنا مشکل تھا، اس لئے میں نے کچھ ایسے ساتھی ڈھونڈ لئے جو میری کچی پکی زبان پر راضی رہ سکیں، اور اس طرح رفتہ رفتہ مجھے بھی تکرار کرانے کا موقع فراوانی سے مل گیا، اور اس سے گفتگو میں کچھ مزید بہتری پیدا ہوگئی۔

ایک مرتبہ ناظم آباد کراچی کے کسی ادارے نے سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر مدارس اور اسکولوں کے طلبہ کا ایک تقریری مقابلہ منعقد کیا جس میں تقریروں کا عنوان تھا : " رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے شارع قانون تھے"۔ حضرت مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہم سے فرمایا کہ تم بھی اس میں حصہ لو۔ اس سے پہلے دار العلوم کے اندرونی اجتماعات میں چند منٹ کی رٹی رٹائی عربی تقریر کے سوا باہر کے کسی جلسے میں کبھی تقریر کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لئے کچھ ڈر بھی لگ رہا تھا، لیکن حضرتؒ نے ہمت

بندھائی، اور موضوع کے بارے میں کچھ اہم نکات نہ صرف بتائے، بلکہ کچھ املا بھی کرائے، اور میں نے اُنہی کی بنیاد پر وہاں تقریر کی۔ میری عمر اُس وقت تیرہ سال تھی۔ تقریری مقابلے میں مجھ سے کہیں زیادہ عمر کے حضرات بھی شریک تھے۔ اب یا تو یہ حضرت مفتی ولی حسن صاحب قدس سرہ کے بتائے ہوئے نکات کی کرامت تھی، یا پھر میری کمسنی پر فیصلہ کرنے والوں کو رحم آ گیا تھا کہ مجھے مقابلے میں پہلی پوزیشن ملی، اور انعام میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی "المرشد الامین" کا اردو ترجمہ مجھے دیا گیا۔ یہ کسی بھی عام جلسے میں میری پہلی تقریر تھی۔

دارالعلوم کراچی میں اُس وقت بڑے اصحاب علم وفضل اساتذہ کا گلدستہ جمع تھا۔ جن اساتذہ کا میں نے اوپر ذکر کیا، ان کے علاوہ حضرت مولانا منتخب الحق صاحب، حضرت مولانا مظہر بقا صاحب، سلہٹ کے حضرت مولانا عبید الحق صاحب، حضرت مولانا طاسین صاحب، حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحب، حضرت مولانا مفتی محمد صابر صاحب رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سب وہاں اپنی تدریس کا فیض پھیلا رہے تھے۔ مجھے یہ بھی شوق تھا کہ جن اساتذہ کے پاس میرا کوئی سبق نہیں ہے، ان کی خدمت میں بھی کچھ وقت گذاروں۔ اس لئے ان حضرات کے پاس بھی کبھی کبھی چلا جاتا، اور یہ سب میرے بچپن کی وجہ سے مجھ پر بڑی شفقت فرماتے، اور اپنے تدریسی تجربات سے کچھ نہ کچھ رہنمائی فرماتے رہتے تھے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کی شخصیت ایسی تھی کہ ملک بھر کے علماء کرام اور مشاہیر کا جب کراچی آنا ہوتا، تو وہ اُن سے ملاقات کیلئے ضرور تشریف لاتے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُنہیں دارالعلوم میں دعوت دیکر یہ فرمائش بھی کرتے کہ وہ طلبہ کو نصیحت فرمائیں۔ چنانچہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ، حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ، حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہم کی اسی زمانے میں زیارت ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ گیروے رنگ کے لباس میں ملبوس تھے، اور جب اُن سے کسی نے میرا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا چھوٹا بیٹا ہوں تو اُنہوں نے مجھے گود میں اُٹھالیا۔

نہر سویز پر امریکی اور برطانوی حملہ

اسی سال عالم اسلام کے لئے یہ خبر سب سے زیادہ وحشت ناک تھی کہ ۲۹؍ اکتوبر ۱۹۵۶ء کو اسرائیل نے

جزیرہ نمائے سینا پر حملہ کیا، اور اُس کے دو دن بعد برطانیہ اور فرانس نے مل کر نہر سویز پر حملہ کردیا تھا۔ حضرت والد ماجد قدس سرہ پر اس واقعے کا بہت اثر تھا، اور اُس وقت ان کی خواہش یہ تھی کہ پورا عالم اسلام مصر کی مدافعت میں کھڑا ہو جائے، چنانچہ ایک طرف انہوں نے مختلف حکمرانوں اور عالم اسلام کی ممتاز شخصیات کو خطوط لکھے، اور خود بھی مسلمانوں کو مدد پہنچانے کیلئے ایک طبی وفد تیار کرنے کی کوشش کی، تاکہ کسی بھی طرح اس حملے کے خلاف مسلمانوں سے یکجہتی کا مظاہرہ کیا جاسکے۔

اسی سلسلے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ چاہا کہ دارالعلوم میں بھی فوجی تربیت کا انتظام کیا جائے، تاکہ اگر کچھ رضا کار وہاں بھیجنے کی نوبت آئے تو کچھ تربیت یافتہ افراد بھیجے جاسکیں۔ لیکن فوری طور پر یہ ممکن نہ ہوا، تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شہری دفاع کے محکمے سے رابطہ قائم فرما کر اُن کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے کچھ انسٹرکٹر دارالعلوم میں بھیج کر طلبہ کو شہری دفاع کی تربیت دیں۔ چنانچہ روزانہ عصر کے بعد شہری دفاع کا تربیتی پروگرام شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے کورس میں جناب بدرالحسن فاروقی صاحب نے ۷/نومبر ۱۹۵۶ء مطابق ۳/ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ کو تربیت کے لئے آنا شروع کیا، اور شہری دفاع اور ابتدائی طبی امداد کی تربیت دینی شروع کی۔ ہم طلبہ نے اس کورس میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا، میں اُس وقت اپنی عمر کے تیرہویں سال میں تھا، اور مجھے یاد ہے کہ ہم اُس وقت اس خوش فہمی میں تھے کہ یہ کورس آخر کار جہاد کی تربیت میں تبدیل ہو جائے گا۔ چنانچہ تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو مصر کے میدان جنگ میں دیکھتے، اور اپنے طفلانہ ذہن کے مطابق اسرائیلیوں اور برطانویوں سے دو بدو لڑنے کے نقشے دل میں جمایا کرتے۔ جنگ تو آخر کار روس کی مداخلت سے ختم ہوگئی، اور جن علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کیا تھا، وہ آخر کار واپس کردیئے گئے، لیکن ہم اس خوش فہمی پر کورس میں اُسی جوش وخروش سے حصہ لیتے رہے کہ شاید اور کچھ نہیں، تو جنگ کے زخمیوں کی امداد کیلئے کسی وقت ہمیں بھیج دیا جائے۔

میں فاروقی صاحب کے تمام لیکچروں کو قلم بند بھی کرتا تھا، اور وہ جو عملی مشقیں کراتے تھے، اپنی بساط کے مطابق ان میں بھی شامل رہتا تھا۔ ان لیکچروں کو جس کاپی میں لکھا، میں نے بعد میں اُسے فاروقی صاحب کو اسلئے دیا کہ وہ اُس پر نظر ثانی کرلیں۔ نظر ثانی تو انہوں نے نہ جانے کی یا نہیں لیکن چند دن بعد وہ کاپی اپنے اس نوٹ کے ساتھ مجھے واپس کردی:

"Though youngest of all the trainees yet paced with others throughout the training. Intelligent and keen student. Proved himself to be a willing worker. Remained anxious to learn more and more from his elders.

Recommended for higher training.

BH Farooqi.

Gen Instructor."

جب انہوں نے یہ عبارت لکھی، اُس وقت مجھے اتنی انگریزی نہیں آتی تھی کہ میں اس کا مطلب سمجھ سکوں۔ چنانچہ میں نے اپنے بڑے بھائی جناب مولانا محمد ولی رازی صاحب سے اُس کا ترجمہ کرا کر اُس کے نیچے لکھوایا جو یہ تھا:

"اگرچہ طلباء میں سب سے زیادہ کمسن ہیں، لیکن تمام طلبہ کے ساتھ پوری ٹریننگ کے درمیان ساتھ ساتھ رہے، ذہین اور شوقین طالبعلم ہیں، خود میں مہارت پیدا کرنے کا شوق ہے، اپنے بڑوں سے سیکھنے کے ہمیشہ مشتاق۔ اعلیٰ ٹریننگ کیلئے بھیجا جائے"۔

جنگ تو ختم ہو چکی تھی، لیکن اس تربیت نے کم از کم نیت کی حد تک جہاد کا ایسا شوق پیدا کر دیا کہ ہم نے بعد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ دارالعلوم میں باقاعدہ عسکری تربیت کا بھی انتظام کیا جائے، اور حضرتؒ نے جتنا قانونی حدود میں اُس وقت ممکن تھا، اُس کا انتظام دارالعلوم کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد کیا جس کا کچھ تذکرہ شاید آگے آجائے۔

اس سال میرے امتحان سالانہ کا نتیجہ یہ تھا:

ہدایہ اولین: ۵۱، نورالانوار: ۵۰، مختصر المعانی: ۴۵، تلخیص المفتاح: ۴۷، سلم العلوم: ۴۰، دیوان متنبی: ۴۹، خوشنویسی: ۴۵۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ـــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(سولہویں قسط)

شرافی گوٹھ میں دارالعلوم کی تعمیر

میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ علامہ عثمانیؒ کے مزار والی جگہ چھوڑنے کے بعد یہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے اخلاص اور توکل کی برکت تھی کہ اس واقعے کو چند مہینے ہی گذرے تھے کہ ایک تاجر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے، اور انہوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست حاجی ابراہیم دادا بھائی جنوبی افریقہ میں مقیم ہیں۔ کراچی شہر سے کچھ دور ملیر کے عقب میں شرافی گوٹھ کے نام سے ایک گاؤں میں ان کی کچھ زمین ہے جس میں ایک بنگلہ اور سرونٹ کوارٹرز طرز کے کچھ مکانات بھی بنے ہوئے ہیں، اور ایک کنواں بھی ہے۔ وہ یہ زمین دارالعلوم کو بطور عطیہ دینے کیلئے تیار ہیں، بشرطیکہ وہاں تعمیر پانچ سال کے اندر اندر کرنے کا وعدہ کیا جائے۔ حضرت والد صاحبؒ اور حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما نے وہ جگہ جاکر دیکھی، تو وہ شہر سے کہیں دور تمام تر ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں سے بھری ہوئی زمین تھی، اور اُس تک پہنچنے کا راستہ بھی انتہائی دشوار گذار تھا۔ وہاں جانے کیلئے کوئی پکی سڑک موجود نہیں تھی، کورنگی کریک جانے والی سڑک پر موجودہ ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کا کوئی تصور نہیں تھا، چنانچہ کورنگی کریک روڈ پر کئی میل ویرانے میں چلنے کے بعد ایک جگہ پہنچ کر (تقریباً اس جگہ جہاں آج انڈسٹریل ایریا کی سڑک شروع ہوتی ہے) کچے میں نیچے اترنا پڑتا تھا، اور وہاں سے پانچ میل سے بھی زائد فاصلہ کچے میں اس طرح طے کرنا پڑتا تھا کہ ہچکولے کھاتی ہوئی گاڑی بیس میل سے زیادہ رفتار سے نہیں چل سکتی تھی۔ دوسری طرف بس سے آنے کا راستہ بھی بڑا دشوار گذار تھا، کیونکہ کورنگی ٹاؤن شپ کا اس وقت تصور تک نہیں تھا، اور لانڈھی کالونی اس وقت نئی نئی آباد ہونی شروع ہوئی تھی جس کے آخری

اسٹاپ سے اس جگہ کا فاصلہ تقریباً ڈیڑھ میل کا تھا جو تمام تر جھاڑیوں اور ٹیلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور چلنے کے لئے کوئی مستقل کچی سڑک بھی نہیں تھی۔

سچی بات یہ ہے کہ اُس وقت اس زمین پر دار العلوم تعمیر کرنے کا تصور بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اور یہ ان حضرات ہی کا حوصلہ تھا کہ اس ویرانے میں اس عظیم کام کا بیڑا اٹھالیا، اور حاجی ابراہیم دادا بھائی مرحوم نے مؤرخہ ۱۹؍ جولائی ۱۹۵۵ء (تقریباً ۲۸؍ ذوالقعدہ ۱۳۷۴ھ) کو اُس زمین میں سے پچیس ایکڑ زمین دار العلوم کو دیدی۔ بعد میں چھ ایکڑ زمین کا اُس میں اضافہ کر کے ان کی طرف سے کل ۳۱ ایکڑ زمین بطور عطیہ دی گئی۔ (بعد میں جب اس علاقے کو ٹاؤن پلاننگ میں شامل کیا گیا، تو نقشہ درست کرنے کیلئے حکومت کو ان اکتیس ایکڑ میں سے کچھ زمین کی ضرورت پڑی، اور اس کے بدلے دار العلوم کو غیر آباد زمین میں سے ۲۵ ایکڑ مزید زمین حکومت سے مل گئی جس کے نتیجے میں دار العلوم کا کل رقبہ چھپن ایکڑ ہو گیا۔ لیکن ابتدا میں کام پچیس ایکڑ زمین کی بنیاد پر ہی شروع ہوا۔)

چنانچہ حضرت والد صاحب قدس سرہ، حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور مجلس منتظمہ کے دوسرے ارکان نے توکلاً علی اللہ مؤرخہ ۳۰؍ ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ بروز جمعہ مطابق ۱۶؍ دسمبر ۱۹۵۵ء اس نئی جگہ پر تعمیر کا آغاز کر دیا۔(۱)

حاجی عبد اللطیف صاحب باوانی رحمۃ اللہ علیہ دار العلوم کی مجلس منتظمہ کے رکن تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیوی دولت کے ساتھ بڑی دین داری سے نوازا تھا۔ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے پاس دار العلوم کو جو جگہ ملی تھی، اور جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں، اس زمین پر بھی اس وقت انہوں نے ۹۳ ہزار روپے تعمیر کے لئے دینے کا اعلان کیا تھا، لیکن وہاں مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر تعمیر نہ ہو سکی تھی۔ اب یہ نئی جگہ ملی، تو انہوں نے یہ ذمہ داری لے لی کہ وہ دار العلوم کی دو عمارتوں کی تعمیر اپنے اور اپنے متعلقین کے ذریعے کرائیں گے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی یہ ذمہ داری ایسی نبھائی کہ ہم لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔ وہ بکثرت دشوار گذار راستہ طے کر کے خود وہاں پہنچتے، اور خود کھڑے ہو کر تعمیری کام کی نگرانی کرتے تھے۔ حضرت مولانا

(۱) یہ تاریخ دار العلوم کراچی کی روداد بابت رمضان ۱۳۷۳ھ تا شعبان ۱۳۷۴ھ مطابق مئی ۱۹۵۴ء تا اپریل ۱۹۵۵ء میں صفحہ ۸۷ پر درج ہے۔

نوراحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوتو اللہ تعالیٰ نے مہم جوئی کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ جو کام جتنا زیادہ مشکل ہو، اُسے وہ اتنے ہی جوش وخروش سے انجام دیتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے عمارت جلد از جلد تعمیر کرنے کیلئے دن رات ایک کردیا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دس مہینے کی مختصر مدت میں عمارتوں کے دو بلاک آمنے سامنے تیار ہوگئے جن میں سے ایک بلاک طلبہ کی رہائش گاہ کا تھا، اور دوسرا درس گاہوں کا۔

دوسری طرف دور دراز کے صحرا میں دارالعلوم کی تعمیر کم از کم اس معیار تک پہنچانی تھی کہ اگلے تعلیمی سال سے وہاں تعلیم شروع کی جاسکے۔ لیکن وہاں تعلیم شروع کرنے میں یہ زبردست دشواری پیش آگئی کہ دارالعلوم کے وہ اساتذۂ کرام جن پر نانک واڑہ میں تعلیم کا بڑی حد تک دارومدار تھا، وہ اگلے سال سے رخصت ہورہے تھے، کیونکہ اُسی سال حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ نیوٹاؤن کی جامع مسجد میں ایک نئے مدرسے کی بنیاد ڈال رہے تھے جو اب ماشاء اللہ ملک کے ممتاز ترین مدارس میں شمار ہوتا ہے۔ حضرت مولانا فضل محمد صاحب، حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب اور حضرت مولانا بدیع الزماں صاحب رحمۃ اللہ علیہم اُس مدرسے میں تدریسی خدمات انجام دینے کا وعدہ کرچکے تھے، حضرت مولانا منتخب الحق صاحبؒ اور حضرت مولانا مظہر بقا صاحبؒ کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ ہوگئے تھے۔ حضرت مولانا عبید الحق صاحبؒ ڈھاکہ جاچکے تھے۔ ان حضرات کی جگہ پُر کرنا آسان نہیں تھا۔ ادھر ابتک صحیح بخاری کا بڑا حصہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود پڑھاتے تھے، اور اپنی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے جو شہر سے متعلق تھیں، اُن کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ دارالعلوم کی نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد یہ درس جاری رکھ سکیں۔ اس لئے دارالعلوم کی نئی عمارت میں تعلیم شروع کرنے کے لئے نئے اساتذہ کی اچھی بڑی تعداد درکار تھی۔

دوسری طرف حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہمیشہ یہ اصول رہا کہ کسی مدرسے میں مصروف کسی استاذ کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دینا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے، اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک مدرسے کو اجاڑ کر دوسرے مدرسے کو آباد کرنا درست نہیں، الا یہ کہ خود کوئی استاذ وہ مدرسہ چھوڑنا چاہتا ہو۔

لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے اس مشکل کا یہ حل نکلا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ اطلاع ملی کہ بعض اساتذہ اپنے طور پر اپنے اپنے مدرسے چھوڑنا چاہتے ہیں، اس لئے انہیں دعوت دینے میں کچھ حرج نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحبؒ نے بہاول پور سے، حضرت مولانا مفتی رشید احمد

صاحبؒ نے ٹھیڑی سے، حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ نے مظاہر علوم سہارنپور سے اور حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم نے ٹنڈو الہ یار سے تشریف لانے کا وعدہ کرلیا۔ اس کے علاوہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ جو ابتک ادارۂ شرقیہ کے نام سے جیکب لائن میں السنۂ شرقیہ کے امتحانات کی تیاری کرایا کرتے تھے، انہوں نے بھی اعزازی طور پر کچھ اسباق پڑھانے کا وعدہ فرمالیا۔ نیز حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت نوجوان تھے، اور تازہ تازہ جامعہ اشرفیہ لاہور سے فارغ ہوئے تھے، انہوں نے بھی دارالعلوم میں خدمات انجام دینے کا ارادہ فرمایا، اور اسی طرح ہمارے چچازاد بھائی حضرت مولانا خورشید عالم صاحبؒ بھی اُنہی دنوں دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو بھی دیوبند سے بلالیا، اور اس طرح اساتذہ کی کمی بڑی حد تک پوری ہوگئی۔

شرافی گوٹھ میں منتقلی

ہم ابتک اپنے گھر میں رہکر ہی تعلیم حاصل کررہے تھے، اور روزانہ صبح کو مدرسے جاتے، اور شام کو گھر واپس آتے تھے۔ لیکن مدرسے کے نئی عمارت میں منتقل ہونے کے بعد اب یہ نظم ممکن نہیں تھا، کیونکہ نئی عمارت گھر سے بہت دور تھی، اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کئی گھنٹے صرف کرنے پڑتے تھے۔ لہٰذا وہاں اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لئے ہمیں ہفتے بھر وہیں دارالاقامہ میں رہنا تھا۔ ابتک کبھی گھر سے دور رہنے کا موقع پیش نہیں آیا تھا، اور اپنا گھر بھی نیا نیا بنا تھا جس کی راحتوں سے صرف ایک سال ہی استفادہ کرپائے تھے۔ میری عمر کا چودھواں سال تھا، اور والدین سے دوری مستقل سوہانِ روح تھی۔ لیکن تعلیم جاری رکھنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنی رہائش دارالعلوم کے دارالطلبہ میں منتقل کرلی۔ اُس وقت دارالطلبہ کے دو بلاک تھے۔ ان میں سے مشرقی بلاک کے کنارے پر کمرہ نمبر ۱۶ میں ہمارا قیام ہوا۔ (یہ بلاک اب مدرسۃ البنات کا حصہ بن گیا ہے) اس کمرے کے بعد ایک کمرہ چھوڑ کر گنبد کے نیچے ایک بڑا کمرہ تھا۔ گنبد والے کمرے مجرد اساتذہ کو دیئے جاتے تھے۔ اور اس کمرے میں حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے جو اُس وقت نوجوان تھے، اور تازہ تازہ فارغ التحصیل ہوکر انہوں نے تدریس کا آغاز کیا تھا۔ چند دن ہمارا حسامی کا سبق بھی ان کے پاس ہوا تھا، اس لئے وہ ہمارے استاذ تھے، لیکن بڑے خوش مزاج اور خوش ذوق تھے، اور انہوں نے ہمیں اپنے آپ سے اتنا بے تکلف بنالیا تھا کہ وہ استاذ کم، اور دوست زیادہ بن گئے تھے۔

ہم پہلی بار گھر سے الگ ہوکر شرافی گوٹھ کی اس نئی عمارت میں منتقل ہوئے تھے۔ اُس وقت عمارت کے دو بلاک تو رنگ وروغن کے ساتھ مکمل ہو چکے تھے۔ اُن میں سے ایک جنوب میں واقع تھا، جو پندرہ کمروں پر مشتمل طلبہ کا دارالاقامہ تھا، اور دوسرا اُس کے مدمقابل شمال میں واقع تھا (جہاں اب نئی مسجد کا باب فاطمہ واقع ہے) اور وہ شروع میں بارہ درسگاہوں پر مشتمل تھا، بعد میں دو گول کمرے بن جانے کے بعد کل چودہ درسگاہیں ہوگئی تھیں۔

دونوں بلاکوں کے درمیان تقریباً سو گز کا فاصلہ تھا، جو تمام تر ریت کے ٹیلوں اور جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا، اور یہ ریت کے ٹیلے اور جھاڑیاں سانپ بچھو کے علاوہ گرگٹ، گوہ، سانڈے، سیہی اور نہ جانے کتنی مزید قسموں کے حشرات الارض کا مسکن تھے، جو دن کے وقت ہم سے ڈرتے تھے، اور رات کے وقت ہم اُن سے ڈرا کرتے تھے، کیونکہ یہی ان کی سیر وتفریح کا وقت ہوتا تھا، اور خاص طور پر بچھو عشاء کی نماز کے وقت آزادی سے گھومتے، اور شاید دن بھر کا بدلہ لینے کا بہترین موقع جان کر کسی نہ کسی کے پاؤں پر ڈس لیا کرتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد بکثرت کسی نہ کسی طالب علم کے چیخنے کی آواز آتی، اور معلوم ہوتا کہ اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہے۔ آس پاس نہ کوئی ڈاکٹر تھا، نہ ہسپتال۔ لہٰذا علاج کے مختلف دیسی طریقے آزمائے جاتے تھے۔ کسی نے بتایا کہ اگر کوئی بچھو مار کر اسے تیل میں ڈال دیا جائے، تو اُس تیل سے بچھو کے ڈسنے کا علاج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ یہ علاج کئی طلبہ پر آزمایا گیا، اور کچھ مفید بھی ثابت ہوا۔ آخر میں جو علاج سب سے زیادہ مقبول ہوا، وہ یہ تھا کہ جس جگہ بچھو نے کاٹا ہو، اُس جگہ کسی بچے سے دھار کے ساتھ پیشاب کروایا جائے۔ چنانچہ جب کسی کو بچھو کاٹتا، تو کسی بچے کو پکڑ کر اُسے پیشاب کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔

جنوبی بلاک کے مشرقی کنارے کے بعد تھوڑی سی جگہ راستے کیلئے چھوڑ کر ایک تیسرا بلاک اُس وقت زیر تعمیر تھا جس پر ابھی رنگ وروغن نہیں ہوا تھا۔ اس بلاک کے مغربی کنارے پر کمرہ نمبر ۱۶ تھا جو ہمیں ٹھہرنے کیلئے دیا گیا۔ اس میں ہم دونوں بھائی اور ہمارے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے، اور اُس میں تین چھوٹی چھوٹی چارپائیاں ہم نے لاکر ڈال دی تھیں۔ سرکاری پانی کے نل وہاں تک نہیں پہنچے تھے، اور خود دارالعلوم کی زمین میں جو قدیم کنواں تھا، اُس کا پانی کھارا تھا جو پینے کے لائق نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے روزمرہ کے استعمال کیلئے پانی شرافی گوٹھ کے ایک کنویں سے آتا تھا جو تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع

تھا۔وہاں سے پانی لانے کیلئے ایک گدھا گاڑی خرید لی گئی تھی جس پر ایک بڑے ٹینک میں پانی بھر کر لانے کی خدمت ایک خوش طبع جوان کے سپرد تھی جسے ہم موسیٰ بہشتی کہا کرتے تھے۔وہ دن میں دو تین مرتبہ وہاں سے پانی بھر کر لاتا، اور دارالاقامہ کے درمیان کھڑے ہو کر زور سے آواز لگاتا: "پانی!" بلکہ اس کا لہجہ کچھ ایسا تھا کہ اس کی آواز "پانڑی" سنائی دیتی تھی۔ اور یہ آواز سنکر ہم اپنے گھڑے اور صراحیاں اُٹھا کر گدھا گاڑی کے پاس پہنچ جاتے، اور موسیٰ بہشتی باری باری ہمارے برتنوں میں پانی بھر کر دیدیتا تھا۔

یہ پانی بھی اگرچہ پورا میٹھا نہیں تھا، لیکن پینے کے لائق ہوتا تھا۔ پینے کیلئے پانی صراحی میں اور وضو وغیرہ کیلئے گھڑے میں بھر لیا جاتا تھا، اور اُس سے لوٹے میں نکال کر وضو ہوتا تھا۔ بعد میں ہمیں کچھ تعیش سوجھا، تو پانی کی ایک چھوٹی سی ٹنکی لاکر اپنے کمرے کے سامنے برآمدے میں رکھ لی تھی جس کے نل سے وضو کرنے اور ہاتھ وغیرہ دھونے میں آسانی ہوگئی تھی۔ لیکن کبھی پانی ختم ہو جاتا، تو اُس کا فوری مداوا اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ جبتک موسیٰ بہشتی کی گاڑی کا وقت نہ ہو جائے، خود مدرسے کے کنویں سے کھارا پانی بھر کر لائیں، اور اُسی کو غنیمت سمجھیں۔ اُس وقت اس گدھا گاڑی کی قدر بھی معلوم ہوتی تھی۔

گدھا گاڑی کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اگر کوئی وی آئی پی مہمان بس کے ذریعے دارالعلوم آرہا ہوتا، تو اُسے لانڈھی سے دارالعلوم تک پیدل چلنے کی زحمت سے بچانے کے لئے گدھا گاڑی لانڈھی کے بس اسٹاپ پر بھیج دی جاتی تھی، اور وہ اس وی آئی پی گاڑی میں سوار ہو کر دارالعلوم پہنچ جاتا تھا۔ یہ شاہانہ سفر بیماروں کو بھی نصیب ہو جاتا تھا۔

اس دور افتادہ علاقے میں بجلی کے باقاعدہ کنکشن کا تو سوال ہی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ حضرت مولانا نور احمد صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، انہوں نے شروع میں کہیں سے ایک چھوٹے سے جنریٹر کا انتظام کر کے وہاں نصب کر دیا تھا۔ وہ کچھ ایسا جنریٹر تھا کہ جب چلتا، تو جہاں جہاں بلب تھے، اُن میں روشنی جھپک جھپک کر آتی تھی، یعنی روشنی کے ہر لمحے کبھی کم کبھی زیادہ ہونے کا سلسلہ مستقل جاری رہتا تھا، البتہ آواز کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اس ویرانے میں یہ جنریٹر بہت غنیمت معلوم ہوتا تھا، اور اُس کی صحیح قدر اُس وقت معلوم ہوئی جب چند ہی ہفتوں کے بعد وہ اپنی عمر طبعی کو پہنچ کر ناقابل علاج ہو گیا، اور اب یہ ویرانہ اپنی فطری حالت پر لوٹ گیا۔

ہم نے ایک لالٹین اپنے کمرے میں رکھی ہوئی تھی جس کیلئے مٹی کا تیل لائن لگا کر ملا کرتا تھا، اور اُس کی چمنی کی صفائی اور اُس میں پرانی بتی کے جل جانے کے بعد نئی بتی ڈالنے کی خدمت میرے سپرد تھی، اور اسی لالٹین کے اردگرد بیٹھ کر ہم مطالعہ کیا کرتے، اور جب میری اور بھائی صاحب کی تکرار کی جماعتیں الگ ہوگئیں، تو ہم نے ایک اور لالٹین لے لی، اور ہم اپنی اپنی لالٹین درسگاہ میں لیجا کر وہاں تکرار کیا کرتے۔ البتہ مسجد میں ایک گیس کا ہنڈا جلایا جاتا تھا جس کے اردگرد طلبہ بیٹھ جاتے، اور تکرار اور مطالعے کی ضرورت اجتماعی طور پر پوری کرتے تھے۔

صبح کو ناشتے میں طلبہ کو مطبخ سے ایک روٹی ملتی تھی، اور چائے یا دودھ خود گرم کرنا ہوتا تھا۔ ہم نے چائے کی عادت چھوڑ دی تھی، اور اُس کے بجائے روٹی دودھ سے کھالیتے تھے۔ دودھ بھی بھینس کا دستیاب نہ تھا۔ گائے کا دودھ ایک کیلومیٹر دور گوٹھ سے لانا پڑتا تھا۔ گوٹھ سے دودھ لانے کی خدمت میں یا حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم انجام دیا کرتے تھے۔ اس کے ذائقے سے منہ کو مانوس کرنے کیلئے کافی عرصہ لگا۔ ناشتے میں اور دوپہر یارات کے کھانے کے وقت اُسے گرم کرنے کے لئے ایک پرانا سا مٹی کے تیل کا اسٹوو رکھا ہوا تھا جس کا آگ پکڑنے والا حصہ بار بار ناکارہ ہوجاتا تھا، اور اُسے گرم کرنے کیلئے خاصی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

مدرسے کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اُس کے مغرب میں میلوں تک ریگستان تھا، اور اُس سمت میں سمندر تک نہ کوئی آبادی تھی، نہ کوئی عمارت، نہ کوئی درخت۔ ریت کے ٹیلوں کے درمیان کہیں کہیں کچھ خودرو جھاڑیاں ضرور تھیں، مگر وہ بھی ریت سے اَٹی ہوئی۔ چونکہ مدرسے میں ہوا کا رخ مغرب ہی کی طرف سے تھا، اس لئے وہاں سے آنے والی ہوا عام حالات میں بھی ریت کے ذرات ساتھ لایا کرتی تھی، لیکن گرمی میں بعض اوقات ریت کا طوفان چلا کرتا تھا جو کئی کئی دن جاری رہتا تھا، اور اُس میں ایک گز کے بعد کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی، اور کمرے کی ہر چیز یہاں تک کہ بستر پر بھی ریت کی موٹی تہہ جم جاتی تھی۔

جنوب کی طرف بھی تقریباً ایک میل تک صحرا ہی تھا، لیکن اُس میں کہیں کہیں جنگلی درختوں کی قطاریں نظر آتی تھیں۔ اور ایک میل کے جنگل کے بعد لانڈھی کالونی نمبر ۶ کی بستی شروع ہوتی تھی، جو اُس وقت نئی نئی آباد ہورہی تھی۔

لیکن مدرسے کے مشرق میں کچھ دور چلنے کے بعد کھجوروں کا ایک باغ تھا، اور اُس کے بعد بھی دور تک

کئی باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔شمال میں بھی کچھ دور تک صحرا طے کرنے کے بعد کھیت اور باغات شروع ہو جاتے تھے، اور شمال مشرق میں وہ گاؤں تھا جو شرافی گوٹھ کہلاتا ہے۔وہ ایک چھوٹے سے چھپر نما ہوٹل سے شروع ہوتا تھا، جو اپنے مالک کے نام پر "شیدل " کا ہوٹل کہلاتا تھا۔اور اُس کے بعد کچھ مکانات تھے جن کے درمیان وہ کنواں تھا جہاں سے ہمارے لئے پانی آتا تھا۔

شہر سے دارالعلوم آنے کے لئے عام طریقہ تو یہ تھا کہ لی مارکیٹ سے ایک بس نمبر ۴۷ چلا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ اور ملیر سے ہوتی ہوئی لانڈھی آتی، اور پوری لانڈھی کالونی طے کرنے کے بعد لانڈھی ۶ نمبر اتارتی تھی۔یہ بس لسبیلہ ہاؤس سے بھی گذرتی تھی، لیکن مختلف اسٹاپوں پر رکتی ہوئی آخر میں وہ ملیر پر بہت دیر رکتی تھی۔اس لئے اُس کے ذریعے سفر کرنے میں دو سے تین گھنٹے لانڈھی چھ نمبر پہنچنے میں لگ جاتے تھے۔پھر وہاں سے ہمارا تقریباً ڈیڑھ میل کا پیدل سفر شروع ہوتا تھا جس میں ہمیں دارالعلوم کے جنوبی جنگل سے گذرنا ہوتا تھا۔البتہ اس طرح مدرسے تک پہنچنے میں تین سے چار گھنٹے لگ جانا معمولی بات تھی۔اور جنگل سے گذرتے ہوئے اگر بارش آجاتی، تو اُس سے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں تھا۔چنانچہ ایسا بھی ہوا کہ اس جنگل سے گذرتے ہوئے جو بارش آئی، تو ہم سر سے پاؤں تک شرابور ہوگئے، اور نہ صرف پہنے ہوئے کپڑے بری طرح بھیگ گئے، بلکہ تھیلے میں جو کپڑے ہفتے کے دوران پہننے کے لئے لائے تھے، وہ بھی تربتر ہوگئے۔اللہ تعالیٰ حضرت مولانا شمس الحق صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، انہوں نے ہمیں اپنے گنبد والے کمرے کی عقبی کھڑکی سے اس طرح بھیگتے ہوئے آتے دیکھا، تو اپنے کمرے میں بلایا، اور عارضی طور پر خشک کپڑوں کا انتظام کیا۔

شرافی گوٹھ آنے کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دن میں دو مرتبہ ایک بس نمبر ۵۲ لی مارکیٹ سے چلتی تھی، اور وہ کالے پل اور کورنگی روڈ سے ہوتی ہوئی چکرا گوٹھ (جہاں آجکل کورنگی نمبر ار واقع ہے) جاتی، اور وہاں سے کچی سڑک کے ذریعے عین شرافی گوٹھ میں لے جا کر اتارتی تھی۔اگر کبھی یہ بس مل جائے تو یہ ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہ تھی، کیونکہ اس میں وقت بھی کم لگتا تھا، اور پیدل بھی کم چلنا پڑتا تھا، لیکن اس میں سوار ہونے کیلئے ایک مقررہ وقت پر لی مارکیٹ پہنچنا ضروری تھا۔اگر لی مارکیٹ پہنچنے کا نشانہ صحیح نہ بیٹھے، تو یہ بس نکل جاتی تھی، اور پھر وہی ۴۷ر نمبر والی بس لازمی ہو جاتی تھی، اور سفر اور زیادہ لمبا ہو جاتا تھا۔

دارالعلوم پہنچنے کے بعد ہمارا رابطہ پورے شہر سے بالکل کٹ جاتا تھا، کیونکہ ٹیلی فون دور دور نہیں تھا۔

ابھی ہمیں یہاں آئے ہوئے دوتین دن ہی ہوئے تھے کہ حکیم مشرف حسین صاحبؒ انفلوئنزا کا شکار ہوگئے۔ بخار اتنا تیز تھا کہ حواس قابو میں نہ تھے۔ قریب میں کوئی قابل اعتبار علاج میسر نہ تھا۔ اسلئے رائے ہوئی کہ گھر والوں کو اطلاع کر کے انہیں گھر بھیج دیا جائے۔ لیکن گھر اطلاع کرنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ آخر بھائی صاحب (حضرت مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم) نے ایک سائیکل مستعار لی، مجھے پیچھے بٹھایا، اور جنگلوں سے ہوتے ہوئے بابر مارکیٹ کے قریب ایک تھانے سے جا کر گھر فون کیا، اور وہاں سے گاڑی منگوا کر انہیں گھر بھیجا گیا۔

مولانا عبدالرحمٰن صاحب فیض آبادی رحمۃ اللہ علیہ ہم سے ایک سال آگے کی جماعت میں تھے، اور اس سال انہیں دورۂ حدیث کی جماعت میں شامل ہونا چاہئے تھا، لیکن حضرت مولانا نوراحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں اُس وقت سے یہاں بھیج دیا تھا جب یہاں ایک چوکی دار اور بکریوں کے سوا کوئی اور نہیں رہتا تھا۔ پھر اُن کے ذمے ہر قسم کے انتظامی کام سونپ دیئے تھے، اور ان کی شادی بھی ایک بری خاتون سے کرادی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں میاں بیوی کو اپنے فضل خاص سے نوازیں، انہوں نے دارالعلوم کے اس انتہائی مشکل دور میں پورے دارالعلوم کی ایسی خدمات اپنے سر لے رکھی تھیں جو ایک گھر کی گھرِتن ہی انجام دے سکتی ہے۔ تعمیرات کی نگرانی سے لے کر دارالعلوم کے طلبہ اور اساتذہ کی ہر قسم کی ضروریات وہی پوری کرتے تھے۔ جب کسی شخص کو کوئی مسئلہ پیش آتا، وہ مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ ہی کا رُخ کرتا تھا۔ اُن کا واحد معاون ایک چوکی دار تھا جس کا نام عبدالعزیز تو بہت عرصے بعد پتہ چلا، لیکن سب اُس کو "لالہ" کہا کرتے تھے۔ وہ بڑا خوش مزاج پٹھان تھا، اور سارے طلبہ سے اُس کی دوستی تھی۔ وہ بہت تیز تیز بولنے کا عادی تھا، لیکن دارالعلوم کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کی ایسی رکھوالی کرتا تھا جیسے گھر کی کوئی مالکہ اپنے گھر کی رکھوالی کرتی ہے۔

جب ہم شروع شروع میں یہاں آئے، تو مولانا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کو یہ احساس ہوا کہ ہم لوگ گھر کے کھانے کے عادی ہیں، اور مطبخ کا کھانا ہم سے شاید نہیں چل سکے گا، اس لئے انہوں نے اپنی اہلیہ کی مرضی لے کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ پیشکش کی کہ ان کا کھانا ہمارے گھر میں پکا کرے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ پیشکش اس شرط کے ساتھ منظور فرمالی، کہ اُس کے اخراجات وہ ادا کیا کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ ان دونوں میاں بیوی کو بہترین جزا عطا فرمائیں، کچھ عرصے تک ہمارا کھانا اُن کے گھر سے آتا رہا۔

لیکن ان کے اخلاص کے باوجود مستقل طور پر اُن سے یہ خدمت لینے کا طبیعتوں پر ایک بار سا تھا، اس لئے کچھ عرصے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سلسلہ موقوف فرمادیا، اور فرمایا کہ: ''الحمدللہ مجھے یہ استطاعت ہے کہ تمہارے لئے الگ باورچی رکھ کر تمہارا کھانا الگ بنوادیا کروں، لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ جو کھانا عام طلبہ کھاتے ہیں، وہی تم بھی کھاؤ، تاکہ طالب علمی کا صحیح ذائقہ اور اُس کی برکات تمہیں حاصل ہوں''۔ ہم نے بخوشی یہ تبدیلی منظور کرلی، اور ہم مطبخ سے قیمت دیکر کھانا لینے لگے۔

اُس وقت مطبخ دارالعلوم کے جنوب مشرق میں ایک گیرج نما کمرہ تھا جس کا دروازہ کوئی نہیں تھا، اور اوپر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی۔ اُس کے شمال میں ایک تنور تھا، اور اُسی کے برابر ایک یا دو چولھے تھے جن میں لکڑیاں یا کوئلے جلتے تھے، اور اُن کے ذریعے سالن پکتا تھا۔ روزانہ کا مینیو (menue) یہ تھا کہ ہر روز دوپہر کو چنے کی دال اور شام کو پانی کی طرح پتلا شوربا پکا کرتا تھا، لیکن محمود باورچی کی کاریگری یہ تھی کہ اُسی پتلے سے شوربے میں ایسی سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی کہ وہ آج بھی یاد آتی ہے۔ چونکہ مطبخ کا دروازہ کوئی نہیں تھا، اس لئے روٹی ہو، یا دال، یا شوربا، بکثرت اُن میں سامنے اُڑتی ہوئی ریت کی کچھ نہ کچھ ملاوٹ ہو ہی جایا کرتی تھی۔ مطبخ کے ناظم جناب مولانا مجیب الرحمٰن صاحب مومن شاہی مدظلہم تھے جو آجکل ڈھاکہ میں مقیم ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو دونوں جہان میں سرخ روئی عطا فرمائیں، وہ بڑی کفایت شعاری سے مطبخ کا انتظام چلایا کرتے تھے، اور اُس وقت جبکہ اس دور افتادہ صحرا میں اشیائے ضرورت کی فراہمی بڑا مشکل کام تھا، بڑی تن دہی سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ نہ ریت بردار ہواؤں پر ان کا قابو تھا، اور نہ وہ بجٹ سے باہر جاکر کھانا بنواسکتے تھے۔

ہماری والدہ صاحبہ رحمہا اللہ تعالیٰ ہر ہفتے کچھ گھی ہمیں بھیج دیا کرتی تھیں۔ اُس کا فائدہ یہ تھا کہ ہم ناشتے میں روٹی اُس سے تل لیتے تھے، اور جب تک وہ گھی باقی رہتا، دوپہر کو چنے کی دال میں گھی ڈالکر کھاتے۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو اُس وقت نوجوان تھے، اور ہمارے کمرے کے برابر ہی رہتے تھے، انہوں نے یہ ترکیب بتائی تھی کہ روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے انہیں گھی میں تل لیا کرو، اور اُنہیں دال میں ڈال کر دال کو گرم کرو، تو اُس کا مزہ دوگنا ہوجائے گا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا موقع مل جاتا، تو وہ ہمارا اعلیٰ درجے کا کھانا ہوتا۔ اور کبھی مرچوں کے کھیت میں جانا ہوتا، تو مالک کی اجازت سے کچھ ہری

مرچیں توڑ لاتے، اور دال میں اُس سے ذائقہ حاصل کرلیتے تھے۔

اپنے گھر میں شاہانہ زندگی گذارنے کے بعد اس ویرانے سے اپنے آپ کو مانوس کرنا اور شہر کے پُر تعیش ماحول سے کٹ کر جفاکشی کی دیہاتی فضا میں رہنا ہمارے لئے ایک مجاہدے سے کم نہ تھا۔ میری عمر اُس وقت چودہ سال کے قریب تھی، اور اس سے پہلے والدین اور بہن بھائیوں کے بھرے پُرے کنبے سے الگ رہنے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ اس لئے شروع کے کچھ دن ایسے گذرے کہ میں چھپ چھپ کر رودیا کرتا تھا۔ لیکن انسان کی فطرت اللہ تعالیٰ نے کچھ ایسی بنائی ہے کہ جب وہ کوئی مشقت اٹھانے کا پکا ارادہ کرلے تو رفتہ رفتہ وہ اُس کی عادت بن جاتی ہے، اور مشقت میں بھی کمی آجاتی ہے۔ ہم پر یہ بات اچھی طرح واضح تھی کہ اپنی تعلیم کو بہتر بنانے کیلئے ہمیں ہر قیمت پر یہ مشقت برداشت کرنی ہے، اس لئے ذہن کو اس کے لئے پوری طرح تیار کرلیا تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ہم نے اپنے آپ کو اس ماحول میں اس طرح مدغم کرلیا کہ اب اسی میں اپنی راحت اور لطف کے نئے راستے تلاش کرلئے۔ اور کم از کم اپنے بارے میں یہ بات میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس زمانے میں یہ تھوڑی سی مشقت نہ اُٹھائی ہوتی، تو جاہل تو میں آج بھی ہوں، لیکن اُس صورت میں آج سے کہیں زیادہ جاہل ہوتا۔

شروع کے چند مہینے تو ہم نے دارالطلبہ کے اُسی کمرہ نمبر ۱۶ میں گذارے۔ پھر دارالعلوم کے ایک معاون حاجی کبیر الدین صاحب مرحوم نے جو مشرقی پاکستان کے ایک تاجر تھے، دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر درسگاہوں کے قریب بنوا کر دارالعلوم کو دیدیا تھا، یہ مقصد بھی تھا کہ جب کبھی وہ کراچی آئیں، تو اُس میں ٹھہر سکیں۔ انہوں نے ہی ہمیں یہ پیشکش کی کہ ہم ان میں سے ایک کمرے میں منتقل ہو جائیں۔ چنانچہ ہم وہاں منتقل ہوگئے۔ یہ چھوٹا سا گھر دوسری تمام عمارتوں سے الگ تھلگ تھا۔ دن میں تو درسگاہوں کے قریب ہونے کی وجہ سے تنہائی کا زیادہ احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن رات کو اُس کے چاروں طرف شدید سناٹا چھا جاتا تھا۔ البتہ اُس کے شمالی جانب میں ایک کچی سڑک گذرتی تھی جس پر سے کبھی کبھی کوئی اونٹ گاڑی گذر جاتی، اور اونٹ کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز آجایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ خاص طور پر سردی کی راتوں میں گیدڑ ہمارے گھر کا محاصرہ کرلیتے، اور ان کے رونے کی آواز دیر تک آتی رہتی تھی۔ لیکن یہ گھر نسبۃً کشادہ ہونے کی وجہ سے زیادہ آرام دہ بھی تھا، اور سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ کمروں کے باہر اُس میں ایک غسل خانہ بنا ہوا

تھا، اس لئے ہمیں مشترک غسل خانے استعمال کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ پھر جب ہمارے چچا زاد بھائی جناب مولانا خورشید عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ دیوبند سے فارغ ہوکر یہاں استاذ بنے، تو اس گھر کا ایک کمرہ انہیں دیدیا گیا جو دن کے وقت اُن کی درسگاہ ہوتی، اور باقی اوقات میں انکا رہائشی کمرہ۔ اور دوسرے کمرے میں ہم دونوں بھائی اور مولانا حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ مقیم تھے۔ یہ گھر چونکہ درس گاہوں کے قریب تھا، اس لئے متعدد اساتذہ بھی سبقوں کے درمیان دم لینے کیلئے کبھی کبھی وہاں تشریف لے آتے تھے۔

دیہاتی زندگی میں جہاں کچھ مشقتیں ہوتی ہیں، وہاں کچھ ایسے فوائد بھی ہوتے ہیں جو شہروں میں حاصل نہیں ہوسکتے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں، اس وقت دارالعلوم کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ اُس کے مغرب میں تو سمندر تک لق ودق صحرا تھا، لیکن اُس کے مشرق میں ایک بہت بڑا اور گھنا نخلستان تھا، اور اُس کے بعد مختلف پھلوں کا بڑا خوبصورت باغ تھا جس میں چیکو، امرود اور لیموں وغیرہ کے درخت بڑے قرینے سے لگے ہوئے تھے۔ یہ پیر بخش کا باغ کہلاتا تھا۔ اس کے علاوہ دارالعلوم کے شمال میں تقریباً ایک کیلومیٹر کی حدود میں مرچوں اور مختلف ترکاریوں کے کھیت تھے جن کی پشت پر شرافی گوٹھ آباد تھا، اور گوٹھ کے ختم ہونے کے بعد بیلوں کی نسل کشی کے لئے ایک سرکاری فارم تھا جو اب بھی کیٹل فارم کہلاتا ہے۔ اس میں اعلیٰ نسل کے بیلوں کی پرورش اور نسل کشی بھی ہوتی تھی، اور بہت سے سائنسی تجربات بھی کئے جاتے تھے۔ اس کیٹل فارم کے پاس زمین کا بڑا وسیع رقبہ تھا جس میں کیٹل فارم کی طرف سے جنوب میں جانوروں کے چارے کے لہلہاتے ہوئے کھیت تھے جو کئی میل تک چلے گئے تھے، اور اُس جگہ تک پھیلے ہوئے تھے جہاں آج شاہ فیصل کالونی آباد ہے۔ یہ قدرتی مناظر شہری زندگی میں میسر نہیں آسکتے تھے۔ چنانچہ دن بھر کی پڑھائی سے فارغ ہوکر عصر کی نماز کے بعد ہم ان مناظر کا طرح طرح سے مزہ لیتے تھے۔

میرے بھانجے حکیم مشرف حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر میں کئی بار کرچکا ہوں، وہ مجھ سے عمر میں دو سال بڑے تھے، لیکن میں ان کا ماموں تھا، اور پڑھائی میں اُن سے ایک سال آگے۔ اس طرح ہمارے درمیان عمر اور رشتے کا مقاصہ (set.off) ہوگیا تھا، جس کے نتیجے میں وہ میرے واحد دوست تھے جو بچپن سے کھیل کود اور تفریح سے لیکر مدرسے کی زندگی تک ہر چیز میں ساتھ تھے۔ چنانچہ عصر کے بعد ہم دونوں مدرسے

سے نکل کر پہلے گوٹھ جاتے، جہاں ایک چھپر نما ریسٹورنٹ تھا جو اپنے مالک "شیدل" کے نام پر "شیدل کا ہوٹل" کہلاتا تھا۔ عصر کے بعد وہاں ہم دونوں چائے پیتے اور پھر کھیتوں اور باغوں میں نکل جاتے۔ یہاں کے باغات میں امرود بڑا خوشبودار اور لذیذ ہوتا تھا، اور باغ والے ہمیں آٹھ آنے فی سیر کے حساب سے اپنے ہاتھوں سے امرود توڑ کر کھانے کی اجازت دیدیتے تھے۔ یہ لذت شہر میں کہاں میسر آسکتی تھی؟ عصر کے بعد کا وقت ان سبزہ زاروں میں گذارنے کے بعد ہم اپنے مدرسے میں واپس آتے، لالٹین جلاتے، اور اُس کی روشنی میں عشاء تک کل کے اسباق کا مطالعہ اس طرح کرتے کہ اُس میں کوئی مخل نہیں ہوتا تھا۔ عشاء کے بعد مطبخ سے خریدا ہوا کھانا ایک اسٹوو کی مدد سے گرم کرتے، یہ عموماً ایک پتلا سا شوربا ہوتا تھا جس کے پانی کی طرح پتلا ہونے کا فائدہ یہ تھا کہ اگر کپڑے پر گرجائے (جو مجھ سے بکثرت گرجاتا تھا)، تو اُس کے دھبے کو دھونے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ بھوک کے عالم میں یہ شوربا عصر سے پہلے کے پکے ہوئے تنوری نان کے ساتھ کھانے میں اب لذت آنے لگی تھی۔ پھر فوراً ہی ہمارے تکرار کا وقت ہوجاتا، جو لالٹین کی روشنی میں رات گئے تک جاری رہتا۔

ہم جب شروع میں یہاں آئے، تو ہم جماعت طلبہ نے "والی بال" کی ایک ٹیم بنالی تھی جس میں عصر کے بعد طلبہ کے ساتھ حضرت مولانا شمس الحق صاحب اور حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمہما اللہ تعالیٰ بھی شریک ہوا کرتے تھے۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر تم لوگ والی بال کے بجائے "بنوٹ" کا کھیل کھیلا کرو تو میں بھی تمہارے ساتھ شریک ہوجاؤں گا۔

"بنوٹ" ایک لاٹھی کا کھیل ہوتا تھا جس میں لاٹھی چلانے اور لاٹھی سے دشمن کا مقابلہ کرنے کے بڑے زبردست ہنر کا مظاہرہ کیا جاتا تھا، اور اگر کوئی شخص "بنوٹ" کا ماہر ہو، اور لاٹھی چلانے کا ہنر جانتا ہو تو وہ تنہا بڑے سے بڑے مجمع سے نمٹ سکتا تھا۔ یہ کھیل دارالعلوم دیوبند میں بھی سکھایا جاتا تھا، اور اُس کے باقاعدہ استاذ مقرر تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ ہنر وہیں سیکھا تھا، اور میرے چاروں بڑے بھائی بھی اس کی مشق دیوبند ہی سے کیا کرتے تھے، اور ہمارے بھائی جان جناب محمد زکی کیفی صاحبؒ تو اس کے اچھے خاصے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ حضرتؒ کی تحریک پر کچھ عرصے ہم نے عصر کے بعد بنوٹ کی بھی مشق کی۔

پھر نانک واڑہ میں رہتے ہوئے شہری دفاع اور ابتدائی طبی امداد کی جو تربیت ہم نے حاصل کی تھی، اُس کی

وجہ سے ہمیں یہ شوق بھی تھا کہ باقاعدہ عسکری تربیت بھی حاصل کریں۔ ہم نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی تو حضرتؒ نے ایک ریٹائرڈ فوجی انسٹرکٹر کی خدمات حاصل کرلیں، اور میری یادداشتوں کے مطابق ۱۰ ار اگست ۱۹۵۸ء سے عصر کے بعد ان کی تربیت کا سلسلہ شروع ہوگیا جس میں انہوں نے شروع میں ہمیں پریڈ سکھائی، پھر دشمن پر قابو پانے کے مختلف طریقوں کی عملی مشق کرائی۔ عمارتوں اور دیواروں پر چڑھنے، اور پھر زخمیوں کو کندھے پر سوار کر کے چڑھنے کے طریقے سکھائے۔ آخر میں مصنوعی بندوقوں کے ذریعے بندوقوں کے استعمال کی بھی مشق کرائی، لیکن یہ تربیت کچھ عرصے ہی جاری رہی، اور اس کے بعد اس کا سلسلہ موقوف ہوگیا۔

اُس سال ہمیں ملاحسن، تصریح اور سراجی حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ کے پاس پڑھنی تھی ہدایہ اخیرین اور میبذی حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم کے پاس اور توضیح حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، شرح عقائد اور حصون حمیدیہ حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اور دیوان حماسہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔

یہ تمام اساتذۂ کرام ماشاء اللہ اپنے علم وفضل اور دلنشین طرز تدریس کے اعتبار سے ایسے تھے کہ ایک سے ایک بڑھکر تھا۔ اور ان تمام حضرات کے درس ایسے تھے کہ ان کی دلکشی نے اس صحرا کی جفاکش زندگی کو بھی حسین بنادیا تھا۔

حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ میں نقوش رفتگاں میں کرچکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ اُس سال ہمارے تین درس اُن کے پاس تھے۔ ایک ملاحسن، دوسرے سراجی اور تیسرے تصریح۔

میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ منطق میں شرح تہذیب کے بعد کی کتابوں سے مجھے کچھ خاص لگاؤ نہیں تھا۔ لیکن حضرتؒ کا انداز تدریس ایسا تھا کہ اُس میں بھی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اس سے پہلے مجھے منطق کی کتاب کا پیشگی مطالعہ کرنے کی عادت نہیں تھی، لیکن ملاحسن کا میں مطالعہ کر کے جاتا، اور سبق بھی دلچسپی سے پڑھتا اور اُس کا تکرار بھی کراتا تھا۔ اس طرح منطق میں مجھے اپنی جو کمزوری محسوس ہوتی تھی، وہ بڑی حد تک دور ہوئی۔

دوسری کتاب سراجی تھی جو علم میراث کی مشہور کتاب ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے میراث پر خود ایک

مستقل کتاب "تسہیل المیراث" کے نام سے لکھی تھی جس میں میراث کے مسائل آسان انداز میں بیان فرمائے تھے، نیز انہوں نے میراث کے حصے نکالنے کا ایسا طریقہ بھی حساب کی بنیاد پر تجویز کیا تھا جو حصے نکالنے کے قدیم طریقے سے مختلف تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے سراجی پڑھانے کے بجائے "تسہیل المیراث" کی بنیاد پر علم میراث کی تعلیم دی، اور اُس کی خوب مشق کرائی، یہاں تک کہ ہم مناسخے کے طویل طویل مسائل آسانی سے حل کرنے لگے تھے۔ بعد میں سراجی پڑھنا ہمارے لئے آسان ہوگیا۔

تیسرا اہم سبق حضرتؒ کے پاس تصریح کا تھا۔ حضرتؒ کو فقہ کے ساتھ فلکیات اور ریاضی میں خصوصی مہارت حاصل تھی، چنانچہ تصریح کے درس میں حضرتؒ کی اس مہارت سے خوب خوب استفادہ ہوا۔ پھر حضرتؒ نے خود اپنی طرف سے ہمیں "خلاصۃ الحساب" کا بھی ایک حصہ پڑھایا، اور اسطرلاب اور اربعہ مجیبہ اور ربعہ مقنطرہ کے استعمال کا طریقہ بھی سمجھایا۔ (یہ سب فلکیات اور جغرافیہ میں پیمائش کے قدیم آلات تھے۔) تصریح میں تو بطلیموسی فلکیات کا بیان ہے جس کی تشریح حضرتؒ ایک کُرے کی مدد سے فرماتے تھے، لیکن اُس کے ساتھ ساتھ فلکیات کے بارے میں جدید فیثاغورسی نظریات اور معلومات سے بھی مستفید فرماتے تھے۔

استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت عہد شباب میں تھے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اور میرے شیخ ثانی حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب قدس سرہ کے مدرسے مفتاح العلوم جلال آباد میں طویل عرصے تدریس کی خدمات انجام دیکر مستقل سکونت کی غرض سے پاکستان تشریف لائے تھے۔ اگرچہ اُس سال ہدایہ اخیرین اور میبذی، ہماری دو کتابیں، حضرت کے پاس تھیں، لیکن جہاں تک یاد ہے، اسباق دن میں اجتماعی طور پر شروع ہوئے، اور شام کو اُن کے پاس میبذی کا گھنٹہ تھا، اس لئے اُن سے ہم نے پہلا سبق میبذی کا پڑھا تھا۔ مجھے طبعی طور پر منطق اور فلسفے سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، بس ضرورۃً ہی منطق کی کتابیں پڑھتا آیا تھا، البتہ فلسفے کی یہ پہلی اور آخری کتاب تھی۔ لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تبارک وتعالی دونوں جہانوں میں اپنے فضل خاص سے نوازیں، انہوں نے پہلا سبق ہی اس شان سے پڑھایا کہ کتاب اور استاذ دونوں سے حد درجہ مناسبت پیدا ہوگئی، اور اپنے سابق طرز عمل کے برعکس پورے سال میں نے میبذی بڑی محنت اور ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی۔ اُن

کے پاس دوسرا سبق ہدایہ اخیرین کا تھا۔ وہ بھی ماشاء اللہ خوب ہوا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ہدایہ اخیرین حضرت شیخ الادب والفقہ مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی، اس لئے انہیں درس میں اپنے شیخ کی اتباع کا بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ صبح کے پہلے گھنٹے میں وہ ہمیشہ وقت پر درس کیلئے تشریف لاتے، اور دو گھنٹے مسلسل درس دیتے ہوئے اپنے شگفتہ چہرے اور دلکش انداز گفتگو سے ہمیں اس طرح نہال کر دیتے تھے کہ تھکن کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔

اس سال ہمارے تیسرے استاذ حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ وہ مظاہر علوم سہارنپور کے نہایت قابل اور مقبول استاذ تھے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے منظور نظر، اور حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسوں کے حاضر باش۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ انہوں نے پاکستان آنے کا ارادہ کرکے دار العلوم میں تدریس کے فرائض انجام دینے کو قبول فرمالیا تھا۔ اُن کی تدریس کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مشکل سے مشکل مباحث کو اس طرح پانی کرکے سمجھا دیتے تھے کہ طالب علم کے ذہن پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا تھا۔ ان کی تقریر ایسی مربوط اور دلنشین ہوتی تھی کہ اگر اُس کو لفظ بہ لفظ قلم بند کرلیا جاتا، تو الفاظ کو زیادہ آگے پیچھے کئے بغیر وہ ایک شگفتہ تحریر کی صورت میں شائع کی جاسکتی تھی۔ اُس سال ہماری اصول فقہ کی کتاب "توضیح" اُن کے سپرد تھی، اور انہوں نے یہ کتاب ہمیں اس طرح آسان کرکے پڑھائی کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ یہ کوئی مشکل کتاب ہے۔ آئندہ جب "توضیح" خود پڑھانے کی نوبت آئی تو اندازہ ہوا کہ کتاب اتنی آسان نہیں ہے جتنی ہم پڑھنے کے زمانے میں سمجھتے تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ.

اُس سال ہماری خوش قسمتی سے دار العلوم کے اساتذہ میں ایک بیش قیمت اضافہ اور ہوا۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت جیکب لائن میں "ادارۂ شرقیہ" کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ چلا رہے تھے جس میں مشرقی زبانوں (عربی، فارسی اور اردو) کے امتحانات (فاضل عربی، فاضل فارسی، فاضل اردو وغیرہ) کی تیاری کرائی جاتی تھی۔ لیکن ان کی خواہش تھی کہ وہ کسی درس نظامی کے مدرسے میں تدریس کی خدمت انجام دیں۔ اس سال انہوں نے دار العلوم میں کچھ اسباق بلا معاوضہ پڑھانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ میں عرض کرچکا ہوں کہ اُس زمانے میں شہر سے دار العلوم کی نئی عمارت میں آنا بڑا جان جوکھوں کا کام تھا، لیکن حضرتؒ نے بڑی قربانی دی کہ روزانہ شہر سے دار العلوم اس طرح تشریف لاتے تھے کہ لانڈھی کے

بس اسٹاپ پر اتر کر تقریباً ایک میل پیدل آنا پڑتا تھا۔ وہ چائے اور پان کے بلانوشی کی حد تک عادی تھے، اور اس وقت اس ویرانے میں ان چیزوں کا انتظام مشکل تھا، اس لئے ان دونوں چیزوں کا ذخیرہ وہ اپنے ساتھ ہی لایا کرتے تھے۔ اُس سال ہماری ایک کتاب "دیوان حماسہ" ان کے پاس تھی۔ اور انہوں نے یہ کتاب جس اہتمام سے پڑھائی، وہ ہماری طالب علمانہ زندگی کی نہایت خوشگوار یاد ہے۔ وہ حماسہ کے اشعار کی تشریح اس طرح فرماتے تھے کہ نہ صرف عربی محاورات اور ضرب الامثال کی بہترین وضاحت ہوجاتی تھی، بلکہ زمانہ جاہلیت اور ابتدائے اسلام کے عہد کا پورا قبائلی اور ثقافتی منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔

اُس سال تکرار کا نظم کچھ اس طرح ہوگیا کہ تکرار کی بڑی جماعت بنانے کے بجائے دو دو طالب علموں کی ٹولیاں بنگئی تھیں۔ ہمارے ہم سبق ساتھیوں میں برما کے دو ساتھیوں سے ہمیں خاص مناسبت اس لئے ہوگئی تھی کہ وہ مچھلی بڑی لذیذ پکاتے تھے، انہوں نے ایک دو مرتبہ خود ہماری دعوت کی تھی، وہ اس قدر پسند آئی کہ بعد میں جب زیادہ دن گذر جاتے، تو ہم خود اُن سے فرمائش کر کے دعوت کرواتے تھے۔ ان میں سے ایک مولانا محب اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور ایک مولانا مفتی عبداللہ صاحب مد ظلہم (جو آج کل دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے استاد اور تخصص فی الافتاء کے نگراں ہیں) مولانا محب اللہ صاحب ؒ میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی مد ظلہم کے حصے میں آئے، اور مفتی عبداللہ صاحب کو مجھ سے سابقہ پڑا۔ اُنہوں نے شاید میری رعایت سے مجھ سے فرمایا کہ تکرار تم کرایا کرو، میں نے بھی تکلف نہ کیا، اور میں عشاء کے بعد چھوٹی سی بھڑکتی پھڑکتی لالٹین لیکر درسگاہوں کے درمیان ایک زیر تعمیر گول کمرے کے کنارے چلا جاتا، مولانا بھی وہاں آجاتے، اور تمام کتابوں کا تکرار میں ہی کراتا تھا۔ برما کے ساتھیوں کا تجربہ ہمیشہ مجھے یہ رہا کہ ان میں سے جو طلبہ ذہین اور ذی استعداد ہوتے، وہ بلا کے ذہین اور قابل ہوتے تھے۔ مولانا مد ظلہم میرے تکرار کو خاموشی سے سُنا کرتے تھے، اور تکرار کے دوران کبھی کچھ بولتے نہیں تھے، اس سے۔ اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے۔ یہ غلط فہمی ہوگئی کہ شاید مولانا کو سبق پر پورا قابو نہیں ہے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ میں میبذی کے سبق میں کسی وجہ سے پہنچ نہیں سکا۔ اُس دن "برہان سلمی" کا سبق تھا جو خاصا مشکل سمجھا جاتا ہے۔ میں نے سبق کے بعد اُسے مطالعے سے حل کرنے کی کوشش کی، تو وہ حل نہ ہوا۔ جب تکرار کا وقت آیا تو میں نے مولانا عبداللہ صاحب سے کہا کہ میں تو آج سبق میں آنہیں سکا، اور مطالعے سے یہ بحث مجھے اتنی سمجھ میں نہیں آئی کہ میں اُس کا تکرار کراسکوں،

لہٰذا آج اس سبق کا تکرار آپ کرائیں۔ مجھے ان کی خاموش طبعی اور اپنی مذکورہ بالا غلط فہمی کی وجہ سے خطرہ تھا کہ شاید وہ عذر کریں یا شرمائیں، لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار حیرت ہوئی کہ مولانا فوراً راضی ہوگئے، اور پھر جو انہوں نے تکرار کرایا تو اُس دن اُن کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ انہوں نے اس اچھی خاصی مشکل بحث کو ایسے دلنشین انداز سے بیان فرمایا کہ جو مقامات میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے، وہ خوب سمجھ میں آگئے۔ ان کے تکرار کرانے سے مجھے جو خوشی ہوئی، وہ آج تک یاد ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں بعافیت سلامت رکھیں، اور ان کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائیں کہ اُن سے جو محبت اس تکرار کے زمانے میں قائم ہوئی تھی، وہ بڑھتی ہی چلی گئی۔ وہ اپنے علم کے علاوہ اپنے ذوق عبادت، زہد وتقویٰ اور عالی ہمتی کی وجہ سے میرے لئے ہمیشہ قابل رشک رہے۔ ان کی عالی ہمتی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے عین دورۂ حدیث کے سال قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ اور اب بھی وہ دارالعلوم میں نہ صرف استاذ حدیث ہیں، بلکہ دارالافتاء کے محترم ترین رُفقاء میں سے ہیں۔ درجہ تخصص کی نگرانی انہی کے سپرد ہے۔

غرض اس طرح ہمارا یہ تعلیمی سال پورا ہوا۔ اور امتحان سالانہ میں میرے نتائج یہ تھے:

تصریح: ۵۰، حماسہ: ۵۰، میبذی: ۴۷، توضیح: ۵۰، ملاحسن: ۴۷، ہدایہ اخیرین: ۵۰
سراجی: ۴۹، حسامی: ۴۵۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(سترہویں قسط)

چونکہ یہ دارالعلوم کے شرافی گوٹھ منتقل ہونے کے بعد پہلے تعلیمی سال کا اختتام تھا، اس لئے اس موقع پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۵/سے ۱۷/ شعبان ۱۳۷۷ھ (مطابق ۷ تا ۹ مارچ ۱۹۵۸ء) تک تین روزہ سالانہ جلسے کا اہتمام فرمایا۔ اس جلسے کی کچھ باتیں میری ایک ڈائری میں لکھی ہوئی مل گئیں، اور کچھ انہیں دیکھ کر مجھے یاد آگئیں جو فائدے سے ان شاء اللہ خالی نہ ہوں گی۔

اس جلسے میں حضرت مولانا اطہر علی صاحب، حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب اور حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہم کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ ملک کے دوسرے ممتاز علماء بھی موجود تھے۔ ملک کے دو سابق وزیر اعظم جناب چودھری محمد علی صاحب اور جناب اسماعیل ابراہیم چندریگر صاحب بھی مدعو تھے۔ پہلے دن حضرت مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہوا۔ اُس کے بعد چندریگر صاحب مرحوم کا، اور پھر مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ دوسرے دن پہلی نشست چودھری محمد علی صاحب سابق وزیر اعظم پاکستان کی صدارت میں تھی۔ اسی نشست میں ملائشیا سے آئے ہوئے ہمارے ایک ساتھی بن یامین کو اور مجھے عربی میں تقریر کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے ایک ٹوٹی پھوٹی تقریر لکھی تھی، جو اپنے شامی استاذ احمد الاحمد صاحب کو دکھائی، انہوں نے اُس میں ضروری تبدیلیاں کر کے اُسے ایک بامعنیٰ تقریر بنا دیا، اور میں نے وہ تقریر رٹ لی، استاذ احمد الاحمد صاحب نے اُس کے القاء کی بھی مشق کرائی، اور اس مشق کے نتیجے میں جب میں نے وہ رٹی ہوئی تقریر جلسے میں کی، تو ایسے انداز سے کی جیسے فی البدیہہ کی جا رہی ہو۔ میری عمر کے اُس وقت پندرہ سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے، اس لئے حاضرین نے، اور خاص طور پر چودھری محمد علی صاحب

نے، بڑی ہمت افزائی کی۔

اگلی نشست میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریر فرمائی، اور اُس تقریر کی ایک بات مجھے ابتک یاد ہے۔ حضرتؒ نے عربی زبان کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے مثال دی کہ گھوڑوں کی ریس میں جیتنے والے گھوڑوں میں دس نمبر تک ہر گھوڑے کا الگ نام ہوتا ہے، چنانچہ پہلے نمبر آنے والے گھوڑے کو "سابق" کہتے ہیں، دوسرے نمبر پر آنے والے کو "مصلّی"، تیسرے نمبر پر آنے والے کو "مُسلّی" یا "مجلّی"، چوتھے نمبر پر آنے والے کو "تالی"، پانچویں نمبر پر آنے والے کو "مُرتاح"، چھٹے نمبر پر آنے والے کو "عاطف"، ساتویں نمبر پر آنے والے کو "حظی"، آٹھویں نمبر پر آنے والے کو "مؤمّل"، نویں نمبر پر آنے والے کو "لطیم" اور دسویں نمبر پر آنے والے کو "سُکّیت" کہتے ہیں۔ جس روانی سے حضرتؒ یہ تمام نام بتارہے تھے، مجمع اُس پر حیرت زدہ تھا۔ حضرتؒ نے تو کسی سابق تیاری کے بغیر عربی زبان کی وسعت ظاہر کرنے کے لئے سادگی کے ساتھ یہ نام اس طرح گنوادیئے، لیکن مجمع نے اُسے جس تعجب کے ساتھ اور جس تعریفی انداز میں سُنا، اُسے دیکھ کر، اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سامعین پر رعب جمانے کا یہ اچھا نسخہ ہے۔ چنانچہ میں نے ثعالبی کی "فقہ اللغة" سے نہ صرف یہ نام یاد کرلئے، بلکہ اس طرح کے اور متعدد الفاظ، مثلاً عربی میں نیند کے مختلف مدارج کے جو الگ الگ نام ہیں، وہ بھی یاد کر کے مختلف مجلسوں میں، اور ادب پڑھانے کے زمانے میں طلبہ پر رعب جمایا۔ بعد میں جب احساس ہوا کہ یہ تو خالص ریاکاری تھی، تو اُس پر استغفار کیا، اور یہ الفاظ بھلا دیئے، یہاں تک کہ آج یہ واقعہ لکھتے ہوئے مجھے اوپر کے ناموں میں سے کچھ یاد نہ آئے، تو "فقہ اللغة" کی مدد سے لکھے ہیں۔

جلسے کے تیسرے دن صبح حضرت مولانا اطہر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت تھی۔ اُس میں ایک اور طالب علم کو تقریر کرنی تھی، مگر وہ غیر حاضر تھے، اچانک مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ نے میرے نام کا اعلان کردیا۔ اب میں بہت سٹپٹایا کہ اگر بعینہٖ وہی تقریر دوبارہ کرتا ہوں جو کل کی تھی، تو اُس کے رٹے ہوئے ہونے کا پول کھل جائے گا، اور کوئی دوسری فی البدیہہ تقریر کرنے کی اہلیت نہیں۔ اس مشکل کا حل نکالنے کے لئے میں نے شروع میں یہ جملے کہے:

"امرت أن أعيد كلمتي التي ألقيتها بالأمس، وليست ذاكرتي قوية ولكني

احاول ان اعرضھا علیکم کما کانت".

یعنی "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں نے جو تقریر کل کی تھی، اُسے دہراؤں، میرا حافظہ بہت مضبوط نہیں ہے، لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ تقریر اُسی طرح پیش کروں جس طرح کل کی گئی تھی۔"

میرے بزرگ حضرات، خاص طور پر مولانا ظفر احمد انصاری صاحب، میرے ان جملوں پر خوب ہنسے۔ بہر حال، کسی طرح لاج رہ گئی۔ آخری نشست حضرت مولانا شمس الحق افغانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صدارت میں تھی، اور اُس میں میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے تدوین فقہ کے موضوع پر تقریر فرمائی جو واقعۃً تقریر تھی، اور بزرگوں نے بہت پسند فرمائی۔ مغرب کے بعد دستار بندی پر یہ جلسہ ختم ہوا۔

چھٹیاں ہم نے گھر پر گذاریں، رمضان کے ایک بڑے حصے میں میں ٹائیفائڈ کا شکار رہا اور عید کے بعد ۱۵ شوال ۱۳۷۷ھ مطابق ۵؍ مئی ۱۹۵۸ء کو نیا تعلیمی سال شروع ہوا، تو اُس سال ہمیں مشکوۃ، جلالین اور شرح عقائد پڑھنی تھی۔ مشکوۃ شریف حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھی، جلالین شریف حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، شرح عقائد اور اُس کے بعد حصون حمیدیہ حضرت مولانا قاری رعایۃ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس۔

یوں تو میرے سارے ہی اساتذہ کے مجھ پر احسانات اتنے ہیں کہ ساری عمر میں ان کا حق ادا نہیں کرسکتا، لیکن خاص طور پر ابتدائی تعلیم میں حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے، اور اوپر کے درجات میں حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب قدس سرہ کے احسانات سب سے زیادہ ہیں۔ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے تحقیق کا خاص ذوق عطا فرمایا تھا۔ کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایسی ہوتی جس کے بارے میں حضرتؒ کو کوئی شک ہوتا تو جب تک اُس کی تحقیق نہ فرمالیتے، آپ کو چین نہیں آتا تھا۔ اور خاص بات یہ تھی کہ وہ اپنے شاگردوں کو اس قسم کی تحقیق میں ساتھ لگائے رکھتے تھے جس سے یہ ذوق اُن میں بھی منتقل ہوتا تھا۔ حضرتؒ کے درس میں متعلقہ کتاب اور مضمون کے علاوہ بھی بہت سی تحقیقی معلومات شاگردوں کو حاصل ہوتی رہتی تھیں۔ اُس سال ہمارے جو سبق حضرتؒ کے پاس تھے، اُن میں سب

سے اہم سبق تو مشکوۃ شریف کا تھا، اور حدیث کا پہلا باقاعدہ سبق ہونے کی وجہ سے ہمیں اُس کا بڑا شوق لگتا تھا۔ حضرتؒ اس درس میں بہت لمبی بے فائدہ تقریر کرنے کے بجائے حدیث کی عبارت کی تصحیح، اُس کی واضح تشریح اور متعلقہ مباحث کا چھنا چھنایا خلاصہ اس طرح بیان فرماتے کہ اُسے یاد کرنا آسان ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ درس کے دوران نحو وصرف اور فقہ اور اصول فقہ کے خاص خاص نکات بھی بیان فرماتے، اور اگر درس کے دوران یا کسی طالب علم کے سوال کے نتیجے میں کوئی بات قابل تحقیق آجاتی تو اُسی وقت کسی طالب علم کے ذمے لگا دیتے کہ فلاں کتاب میں اس کی تحقیق کر کے بتاؤ۔ اس کے نتیجے میں طلبہ کو غیر درسی کتابوں کی پہچان بھی ہوتی، اور اُن سے استفادے کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا تھا۔

درس کے دوران حضرتؒ بہت سے علمی اور ادبی لطیفے بھی بیان فرمایا کرتے تھے جن میں سے چند اس وقت یاد آگئے۔

یہ واقعہ میں نے سب سے پہلے حضرتؒ ہی سے سُنا تھا کہ ابو العلاء معرّی جو شام کا مشہور شاعر تھا، اور اپنے ملحدانہ خیالات کیلئے مشہور۔ اُس نے چور کا ہاتھ کاٹنے پر ایک شعر میں یہ اعتراض کیا تھا کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کا ہاتھ کاٹ لے، تب تو اُس کی دیت (خوں بہا) سونے کے پانچ سو دینار ہوتی ہے، لیکن اگر کوئی چوتھائی دینار چوری کرلے تو (امام مالکؒ وغیرہ کے مذہب کے مطابق) اُس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک جگہ تو ہاتھ کی قیمت پانچ سو دینار ہے، اور دوسری جگہ چوتھائی دینار۔ چنانچہ اُس نے کہا:

یدٌ بخمس مئين من عسجدٍ وُدِيَت

فما بالها قُطعت في رُبع دينار

یعنی: "ایک ہاتھ کی دیت پانچ سو سونے (کے دینار) کے برابر ہوتی ہے۔ تو پھر یہ کیا بات ہے کہ اسے صرف چوتھائی دینار کی (چوری کی) وجہ سے کاٹ دیا جاتا ہے؟"

اس کے جواب میں امام شافعیؒ نے شعر ہی میں جواب دیتے ہوئے فرمایا:

هُناک مظلومةٌ غالت بقیمتها

وههنا ظلمت، هانت علی الباري

یعنی وہاں تو ایک مظلوم ہاتھ ہے، اس لئے اُس کی قیمت گراں ہے، اور یہاں ظالم ہاتھ ہے، اس لئے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک اُس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اور ابوالفتح بُستی نے اس کا جواب بھی شعر میں دیا اور کہا :

عزّ الأمانة أغلاها، و ارخصها

ذلُّ الخيانة، فافهم حكمةَ البارى

یعنی: " امانت کی عزت نے اُس ہاتھ کی قیمت بڑھادی تھی، اور خیانت کی ذلت نے اُس کو سستا کر دیا، لہٰذا اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ لو۔ "

ایک مرتبہ حضرتؒ نے فرمایا کہ: بتاؤ کہ ایک صغریٰ ہے : "الغَلَط غَلَطٌ " اور اُس کا کبریٰ ہے:" والغَلَط صحيحٌ" ان دونوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ۔ " الغَلَطُ صحيحٌ " حالانکہ یہ شکل اول کا نتیجہ ہونے کے باوجود غلط ہے۔ پھر فرمایا کہ یہاں حدّ اوسط مکرر نہیں ہورہی ہے، اس لئے کہ صغریٰ میں " غَلَطٌ " کے معنی مراد ہیں، اور کبریٰ میں "الغَلَط " سے مراد لفظ" الغلط "ہے، اس کے معنی نہیں۔ لہٰذا یہاں کوئی حدّ اوسط ہے ہی نہیں، جس کو گراکر نتیجہ نکالا جائے۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ اس شعر کا مطلب بتاؤ:

ہست استثنا ز مثبت منفی واز عکس عکس

شد " عليّ عشرةٌ الّا توالی " پنج تا

پہلا مصرع تو کسی طرح سمجھ میں آ گیا کہ اگر کسی مثبت جملے سے کوئی استثنا کیا جائے، تو مستثنیٰ منفی ہوتا ہے، اور منفی جملے سے کیا جائے تو مستثنیٰ مثبت ہوجاتا ہے، لیکن دوسرے مصرعے کا مطلب واضح نہیں ہورہا تھا۔ پھر حضرتؒ نے سمجھایا کہ " الاّ توالی " کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اقرار کرتے ہوئے یہ کہے کہ : "لفلان عليّ عشرة دراهم، إلّا تسعة، إلّا ثمانية، إلّا سبعة، إلّا ستّة، إلّا خمسة، إلّا أربعة، إلّا ثلاثة، إلّا اثنين، إلّا واحداً " تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس پر پانچ درہم واجب ہیں، کیونکہ ہر استثنا سے مستثنیٰ کے سوا باقی عدد کی نفی ہوتی چلی جائیگی تو اس کے نتیجے میں پانچ کا اثبات ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرتؒ دین کی تعلیم و تبلیغ اور دینی سرگرمیوں کے بارے میں "الأهمّ فالأهمّ" کے اصول کی اہمیت بیان فرمارہے تھے۔ اس پر فرمایا کہ تاتاریوں کے فتنے میں مسلمانوں کا جو قتل عام ہوا، اُس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اُس وقت مسلمان عالم اسلام کے عظیم فتنے کا متحد ہوکر مقابلہ کرنے کے بجائے آپس کے

اختلافات کا شکار ہوگئے تھے، اور چھوٹے چھوٹے فروعی مسائل پر مناظروں میں مشغول تھے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اس کے بارے میں ایک شاعر نے بڑا اچھا تبصرہ کیا ہے:

جب چلی بغداد میں تاتار کی تیغ نیام
مفتیانِ شرع میں جاری تھی اک جنگِ کلام
ایک کہتا تھا کہ کوّا ثابت وسالم حلال
دوسرا کہتا کہ کالی چونچ سے تا دُم حرام
اُس زمانے کے مؤرخ نے جو دیکھا تو کہا
مفتیاں را مژدہ! کار ملت بیضا تمام

یہ بات بھی سب سے پہلے حضرتؒ ہی سے سنی کہ "وسْط" (بسکون السین) اور "وَسَط" (بفتح السین) میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر (یعنی "وسْط") کسی چیز کے دو کناروں کے درمیان کسی بھی جگہ کو کہہ سکتے ہیں، لیکن "وَسَط" بالکل بیچوں بیچ کو کہتے ہیں، اسی لئے "وسط" کے سین کے بارے میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ: "اذا تحرّک سکن، واذا سکن تحرّک" یعنی جب "وسط" کا سین ساکن ہوتا ہے، تو حرکت کرتا ہے، یعنی دونوں کناروں کے درمیان کسی بھی جگہ کو "وسْط" کہہ سکتے ہیں، لیکن جب سین متحرک ہوتا ہے، تو ساکن ہوجاتا ہے، یعنی بس بالکل بیچوں بیچ ہی کو "وَسَط" کہا جاسکتا ہے، کوئی چیز بالکل بیچ میں ہونے سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہو تو اُسے "وسط" نہیں کہہ سکتے۔

حضرتؒ کی زبان سے کسی کے یہ حکیمانہ اشعار بھی بار بار سُنے:

بزرگے رفت بخواب در فکرے
دید دنیا بہ صورتِ بکرے
کرد ازوے سوال: "اے دلبر!
بکر چونی بہ ایں ہمہ شوہر؟"
گفت: "یک حرف با تو گویم راست
کہ مرا آنکہ بود مرد نہ خواست

وانکہ نامرد بود خواست مرا
زیں بکارت ہمیں بجاست مرا

یعنی : ایک بزرگ نے خواب میں دنیا کو ایک کنواری لڑکی کی شکل میں دیکھا، تو اُس سے پوچھا کہ : "تمہارے شوہر تو بہت ہیں، اس کے باوجود تم اب تک کنواری کیوں ہو؟" اس کے جواب میں اُس نے کہا کہ: " وجہ یہ ہے کہ جو واقعی مرد تھے، انہوں نے مجھے چاہا نہیں، اور جنہوں نے چاہا، وہ نامرد تھے۔ اس لئے میں ابھی تک کنواری کی کنواری ہوں"۔

میں نے ایک مرتبہ یہ اشعار اپنے شامی دوست ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ کو سنائے، اور ان کا مطلب بھی سمجھایا، تو انہیں یہ اشعار بہت پسند آئے، اور چونکہ وہ خود بھی شعر کہتے ہیں، اس لئے انہوں نے عربی اشعار میں ان کا ترجمہ اس طرح کیا:

رأیت فی النّوم دنیانا وقد بقیت
عذراءَ، مَعْ أنّها زوجٌ لأجیالِ
فقلت: ما السرّ؟ قالت: إنّ مَن طلبوا
صنفان ما غیّرا ما کان من حالی:
ذو عُنّةٍ، أعرضتُ عنه أنا
وذو الفحولة، عنّی راغبٌ سالی

حضرتؒ ہی سے سب سے پہلے وہ دو شعر سُنے تھے جو بعد میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر لکھے ہوئے دیکھے، اور آج تک لکھے ہوئے ہیں۔ حضرتؒ نے فرمایا تھا کہ یہ شعر ایک اعرابی نے روضۂ اقدس پر پڑھے تھے، اور بعد میں وہ جالیوں کے ستونوں پر لکھ دیئے گئے:

یا خیرَ من دُفنت فی التّرب اعظمه
فطاب من طیبھنّ القاع والأکم،
نفسی الفداء لقبرٍ أنت ساکنه

فيه العفاف، وفيه الجود والكرم،

غرض حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس طرح کے بہت سے نکتے اور لطیفے درس کے دوران سنایا کرتے تھے جو ہم طالب علموں کے لئے دلچسپی کا بھی باعث ہوتے، اور ان سے معلومات میں بھی اضافہ ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اور بھائی صاحب مدظلہم کو فقہی کتابوں سے مسائل نکالنے کی مشق کرائی۔ حضرتؒ ہمیں کوئی مسئلہ بتاتے کہ یہ مسئلہ علامہ شامیؒ کی ردالمحتار سے نکال کر دکھاؤ۔ پہلے دن حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی عورت ولی کی اجازت کے بغیر کفو سے باہر نکاح کرلے، تو نکاح کا کیا حکم ہے؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہ مسئلہ تو ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ نکاح منعقد ہو جاتا ہے، لیکن وہ ولی کی اجازت پر موقوف رہتا ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا: "اسی لئے تو آپ سے کہہ رہا ہوں کہ یہ مسئلہ شامی میں نکال کر دیکھیں"۔ میں نے ردالمحتار میں نکالا، تو پتہ چلا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور قول تو یہی ہے کہ نکاح ولی کی اجازت پر موقوف رہتا ہے، لیکن حضرت حسن بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ کی روایت یہ ہے کہ نکاح ہوتا ہی نہیں، اور متاخرین نے اُسی پر فتوی دیا ہے۔

غرض اس طرح حضرتؒ نے فقہ کی غیر درسی کتابوں تک ہماری رسائی بھی کرائی، اور اُن سے مسئلہ نکالنے کی مشق بھی۔

ان حضرات اساتذہ کی شفقتوں نے گھر سے دور رہنے کے احساس کو رفتہ رفتہ کم کردیا۔ پھر بھی سارے ہفتے جمعرات کا شوق لگا کرتا تھا، کیونکہ جمعرات کی شام کو ہم گھر جایا کرتے تھے۔ عصر کے قریب دارالعلوم سے چل کر تقریباً عشاء کے وقت گھر پہنچتے، اور ایک دن ایک رات والدین اور بھائیوں کے ساتھ قیام کرکے واپس آجاتے۔ کتابوں کا شوق تو مجھے شروع سے تھا۔ اساتذہ کی شفقتوں نے اس میں اور اضافہ کردیا تھا۔ اُدھر ہمارے گھر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی کتابوں کا اچھا بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ اس لئے جمعرات یا جمعہ کو گھر والوں سے مل ملا کر جو وقت بچتا، میں حضرت والد صاحبؒ کے ذاتی کتب خانے میں گھس جاتا، اور ایک ایک کتاب کو اُٹھا کر اُسے الٹ پلٹ کر دیکھتا کہ یہ کس موضوع پر ہے؟ کس کی لکھی ہوئی ہے؟ اور اُس کا اتنا حصہ پڑھ کر جس سے کتاب کا تعارف حاصل ہوجائے، دوبارہ اُس کی جگہ پر رکھ دیتا، اور اس الٹ پلٹ

کے دوران اگر کسی کتاب میں دلچسپی بڑھتی تو اُس کا باقاعدہ مطالعہ بھی کرلیتا تھا۔اس طرح مجھے پوری طرح یاد ہوگیا تھا کہ کون سی کتاب کہاں رکھی ہے؟ اور جب کسی بات کی تحقیق مطلوب ہوتی تو میں آسانی سے متعلقہ کتاب نکال کر اُس کی تحقیق کرلیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جو ہفتہ وار رسالے اور ماہنامے آیا کرتے تھے، اُن کو بھی ذوق وشوق سے دیکھ کر اپنی دلچسپی کے مضامین اُن میں سے منتخب کرتا اور موقع ملنے پر اُن سے استفادہ کرتا۔

جاری ہے.........

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اٹھارہویں قسط)

دارالعلوم کی مسجد

دارالعلوم کے شرافی منتقل ہونے کے بعد درسگاہوں اور دارالاقامہ کی عمارتیں تو بن گئی تھیں، لیکن کوئی باقاعدہ مسجد فوری طور سے نہیں بن سکی تھی، اور شروع میں نمازیں ایک کنویں کے قریب بنے ہوئے فرش پر ادا کی جاتی تھیں۔ پھر طلبہ زیادہ ہوئے تو شمالی درسگاہ کے ہال کمرے کو مصلے کے طور پر استعمال کیا گیا۔ باقاعدہ مسجد کا سنگ بنیاد ۱۵ر شعبان ۱۳۷۷ھ (مطابق ۷ر مارچ ۱۹۵۸ء) کو سالانہ جلسے کے وقت رکھا گیا تھا۔ اس کی تعمیر رفتہ رفتہ جاری رہی، یہاں تک کہ ۶ر ربیع الثانی ۱۳۷۸ھ کو اس کی چھت پڑنے کا کام ہونا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چھت ڈالنے کا کام مزدوروں سے کرانے کے بجائے دارالعلوم ہی کے افراد انجام دیں۔ چنانچہ اُس روز مدرسے کے تمام اساتذہ، طلبہ اور منتظمین سارے دن چھت ڈالنے کے کام میں مصروف رہے۔ ہمیں بھی یہ سعادت الحمد للہ حاصل ہوئی۔ سالہا سال اسی مسجد میں جماعت ہوتی رہی۔ پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد یہ مسجد بھی تنگ پڑی، تو اس میں توسیع کا بڑا منصوبہ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کی نگرانی میں شروع ہوا، اور اب الحمد للہ تعالیٰ تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ سابق مسجد پوری کی پوری اس میں آگئی ہے۔

دارالعلوم کی طرف سے طلبہ کو تقریر وتحریر کی مشق کرانے کے لئے مختلف اجتماعات منعقد ہوتے رہتے تھے۔ اس سال جمادی الثانیہ ۱۳۷۸ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۸ء کو ایک تحریری مقابلہ منعقد ہوا جس میں تحصیل علم سے متعلق تین سوالات دیئے گئے تھے۔ میں نے "علم کے متعلق اسلام کی روش" کے موضوع پر مقالہ لکھا جو پہلے انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔

بہر حال! اس طرح ہمارا یہ تعلیمی سال اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بخیر وخوبی پورا ہوا، اور امتحان سالانہ میں بھی الحمد للہ اچھی کامیابی ہوئی۔ لیکن اس امتحان کے ایک واقعے کا صدمہ بھی اب تک یاد ہے۔ ہم نے امتحان کی

بفضلہ تعالیٰ اچھی تیاری کی تھی، اور توقع یہ تھی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اچھے نمبر ملیں گے، چنانچہ بیشتر کتابوں میں ایسا ہی ہوا۔ لیکن شرح نخبۃ الفکر کا پرچہ حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا جو سخت امتحان لینے اور کَس کر نمبر دینے میں مشہور تھے، اس لئے ڈر لگا ہوا تھا۔ چنانچہ جب پرچہ آیا تو ایک سوال دیکھ کر دماغ چکرا گیا۔ وہ سوال بھی مجھے اب تک یاد ہے۔ سوال میں شرح نخبۃ الفکر کی یہ عبارت درج تھی :

"فإن قيل :إنما اتفقوا على وجوبِ العملِ به لا على صحته، منعناه."

اس عبارت کے تحت سوال یہ تھا کہ " : اس عبارت کی تشریح کیجئے، اور سند منع بیان کیجئے۔"

چونکہ عبارت اتنی ہی مذکور تھی، اس لئے میں اپنی کم فہمی کی بنا پر سیاق وسباق کے بغیر عبارت کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہا، نہ " وجوب العمل به " کی ضمیر کا مرجع سمجھ میں آیا۔ نہ "منع " کا مطلب سمجھ سکا، "سند منع" تو کیا سمجھتا۔ لہٰذا نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ جواب لکھ دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے اس پرچے میں حضرت مولانا اکبر علی صاحب قدس سرہ نے (شاید دوسرے دو جوابوں کے پیش نظر) اکتالیس نمبر دیئے جو ادنیٰ درجے کے نمبر تھے۔ مشکوۃ شریف میں اگرچہ میں نے اچھی محنت کی تھی، مگر اس میں بھی نمبر بہت کم آئے، اور مجھے یاد نہیں ہے کہ کسی اور کتاب کے امتحان میں کبھی مجھے اتنے کم نمبر ملے ہوں۔ اس کا صدمہ بہت ہوا، اور اسی صدمے کی یہ " برکت " ہے کہ مجھے آج چھپن سال گذرنے کے بعد بھی یہ سوال یاد ہے۔

اس سال میرے امتحان سالانہ کا نتیجہ یہ رہا:

مشکوۃ شریف:۴۱، نخبۃ الفکر:۴۱، شرح عقائد: ۵۰، جلالین شریف:۵۰، الفوز الکبیر:۴۹، حصون حمیدیہ:۴۹۔ میں نے اپنی ڈائری میں جہاں یہ نتیجہ درج کیا ہے، وہاں یہ نوٹ لکھا ہے کہ :" مشکوۃ اور نخبۃ الفکر کا امتحان مولانا اکبر علی صاحب نے لیا تھا۔"

میری پہلی فقہی تحریر

تعلیمی سال ختم ہونے پر ہم شعبان اور رمضان کی چھٹیاں گذارنے کے لئے گھر آگئے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رمضان میں تہجد کی جماعت کے بارے میں ایک مفصل استفتاء آیا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ اس مسئلے کے بارے میں فقہ کی کتابوں سے حوالے اکٹھے کرلو، تاکہ مجھے جواب لکھنے میں آسانی ہوجائے، اور تمہیں کتابوں سے مراجعت کی مشق ہو۔ مجھے بھی اپنا شوق پورا کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانے میں

جتنی فقہ کی کتابیں میسر آئیں، میں نے ان میں اس مسئلے کا مواد اکٹھا کر کے کتابوں کا ایک ڈھیر نشان لگا لگا کر اپنے سرہانے جمع کرلیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے، وہ ڈھیر دیکھا تو بہت خوش ہوئے، اور فرمایا کہ تم نے میرے مزاج والا کام کیا ہے کہ اتنی کتابیں جمع کرلیں۔ اس پر مجھے حوصلہ ہوا تو میں نے عرض کیا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ان حوالوں سے جو بات سمجھ میں آرہی ہے، وہ میں قلم بند کر کے آپ کو پیش کردوں؟ حضرت والد صاحبؒ نے اجازت دیدی تو میں نے ایک مفصل تحریر لکھی، اور حضرت والد صاحب قدس سرہ کی خدمت میں پیش کردی۔ حضرتؒ اُسے دیکھ کر کھل اٹھے، اور بہت دعائیں دیں۔ اور پھر خط کے جواب (مؤرخہ ۱۴/ شوال ۱۳۷۸ھ) میں مکتوب نگار کو شروع میں یہ تحریر فرمایا:

"اپنے چھوٹے لڑکے محمد تقی سلمہ کو جو اس سال دورۂ حدیث میں شریک ہونے والا ہے، یہ مسئلہ حوالے کیا، خیال یہ تھا کہ اس کو مشق ہوگی، اور کتابوں کے حوالے یہ نکال کر پیش کردے گا، تو پھر میں کچھ لکھوں گا، مگر ماشاء اللہ یہ لڑکا ذہین ہے، اس لئے تمام کتابوں کے حوالے بھی بغیر میری کسی امداد کے نکالے، پھر ان کے اقتباسات لیکر خود ہی ایک تحریر لکھ دی۔ اب جو تحریر دیکھی تو میری نظر میں بالکل کافی وافی تھی، اس لئے اسی پر تصدیق لکھ دی، وہ بھیج رہا ہوں۔"

اور فتوی کے آخر میں یہ عبارت تحریر فرمائی:

"لله درّ المجيب، حيث أصاب فيما اجاب ، واجاد فيما افاد ، مع ملاحظة ادب الأكابر، وفقه الله تعالى لما يُحبّ ويرضى "

یہ میری پہلی علمی تحریر تھی جو بعد میں سلہٹ کے جناب مجدالدین صاحب مرحوم نے "جماعت تہجد در رمضان" کے نام سے رسالے کی شکل میں بھی شائع کی۔ یہ میری عمر کا پندرہواں سال تھا، اور عید کے بعد ہمارا دورۂ حدیث شروع ہوگیا۔

دورۂ حدیث کا سال

اس سال (شوال ۱۳۷۸ھ مطابق اپریل ۱۹۵۹ء) ہمارا بخاری شریف کا درس حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا، ترمذی شریف کا حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، صحیح مسلم کا حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، ابوداود شروع میں حضرت مولانا محمد

حقیق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھی، اور بعد میں حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس منتقل ہوگئی، اور بیشتر حصہ ہم نے انہی سے پڑھا۔ سنن نسائی اور موطأ امام محمد حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس، سنن ابن ماجہ حضرت مولانا محمد حقیق صاحبؒ کے پاس اور موطأ امام مالک اور شمائل ترمذی حضرت والد صاحب قدس سرہ کے پاس ہوئیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت شہر میں رہتے تھے، اور ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ دارالعلوم تشریف لاتے، اور اُنہی دنوں میں یہ اسباق پڑھاتے تھے۔

پڑھائی میں انہماک

دورۂ حدیث کا سال ایک طالب علم کی زندگی کا بڑا یادگار سال ہوتا ہے۔ اس سال میں انسان ہر دوسرے موضوع سے الگ ہوکر صرف اور صرف حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے، اور صبح سے لیکر شام تک ایک ہی دھن ہوتی ہے، ہر گھنٹے میں احادیث ہی احادیث کا درس ہورہا ہوتا ہے۔ اور مجھے حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر یاد آیا کرتا تھا کہ :

اُن کا ذکر، اُن کی تمنا، اُن کی یاد
وقت کتنا قیمتی ہے آج کل

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے فیض صحبت سے کتابوں کا شوق تو پچھلے سال ہی سے پیدا ہوگیا تھا۔ دورۂ حدیث کا سال شروع ہوا، تو دل میں خواہش یہ تھی کہ ہر سبق اچھی طرح مطالعہ کرکے پڑھا جائے۔ چنانچہ ہم چند کتابیں تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی کتب خانے سے لے آئے تھے۔ ایک صحیح مسلم کی شرح فتح الملہم، اور دوسرے ترمذی شریف کی ایک نامکمل شرح "الطیب الشذی" جو حضرت مولانا اشفاق احمد صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھی ہوئی تھی، اور بڑے سائز میں قدیم زمانے کے ٹائپ پر چھپی ہوئی تھی۔ اُس وقت تک حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی شرح "معارف السنن" چھپی نہیں تھی، اس لئے اُس وقت کے لحاظ سے یہ ترمذی کی بہترین شرح تھی، لیکن صرف کتاب الطہارۃ تک پہنچی تھی۔ نیز "العرف الشذی" اور "الکوکب الدری" بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عطا فرمادی تھی۔ اس کے علاوہ حضرت والد ماجد قدس سرہ نے حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی جو تقریر ترمذی خود ضبط فرمائی تھی، وہ بھی موجود تھی، اور حضرت والد ماجد قدس سرہ نے اپنے چچازاد بھائی حضرت مولانا ظہور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اُسے پورا نقل کرواکر اُس کے حاشیے پر "الکوکب الدری" اور

"العرف الشذی" سے بہت سے اضافے بھی شامل کروالئے تھے، اور وہ ایک ضخیم جلد میں مجلد کروا کر رکھی ہوئی تھی۔ وہ بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ نے ہمیں عطا فرمادی تھی۔ لہٰذا ترمذی شریف کے مطالعے کے لئے ہمارے پاس عمدہ مواد موجود تھا۔

اس کے علاوہ بخاری شریف کے مطالعے کے لئے شروع میں "عمدۃ القاری" اور "فتح الباری" کا جتنا مطالعہ کرنا ممکن ہوتا، اُس کا بھی مطالعہ کرنے کو دل چاہتا تھا۔ یہ دونوں کتابیں اپنے پاس موجود نہ تھیں، اس لئے ان کے مطالعے کے لئے دارالعلوم کے کتب خانے میں جانا پڑتا تھا۔ کتب خانہ اُس وقت اُس بوسیدہ عمارت میں تھا جو پرانا بنگلہ کہلاتی تھی ۔ یہ وہی بنگلہ تھا جو زمین وقف کرنے والے حاجی ابراہیم دادا بھائی صاحب مرحوم نے زمین کے ساتھ ہی دارالعلوم کو دیا تھا۔ اس کی مشرقی جانب میں دو منزلہ رہائشی عمارت تھی، اور پھر ایک صحن چھوڑ کر مغربی سمت میں ایک لمبی سی عمارت تھی جس کے ایک حصے کو دفتر اہتمام بنالیا گیا تھا۔ دفتر اہتمام کیا تھا؟ ایک لمبی سی دری بچھا کر اُس کے ایک جانب ایک زمینی ڈیسک رکھدیا گیا تھا، اور ایک گاؤ تکیہ۔ اسی لمبی سی عمارت کے دوسرے حصے کو کتب خانہ بنادیا گیا تھا جس میں لکڑی کی بہت سی بے ہنگم الماریاں انمل بے جوڑ رکھی ہوئی تھیں جن میں موضوعات کے لحاظ سے کتابیں رکھی رہتی تھیں۔ حضرت مولانا عبد الحی صاحب سہارن پوری رحمۃ اللہ علیہ ناظم کتب خانہ تھے، اور اپنی سخت گیری میں مشہور۔ لیکن وہ ہماری کتب بینی کے شوق کو دیکھ کر ہم پر بہت مہربان ہوگئے تھے۔ چنانچہ چوتھے گھنٹے میں ترمذی شریف کا سبق پڑھنے کے بعد ہم وہاں چلے جاتے۔ "عمدۃ القاری" اور "فتح الباری" کا حسب توفیق مطالعہ کرتے، اور اسی دوران دوسری کتابوں سے بھی شناسائی حاصل کرتے۔ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کسی کتاب کے مطالعے میں محویت کے دوران ہی کتب خانہ بند ہونے کا وقت آ گیا، تو میں نے مولاناؒ سے درخواست کی کہ آج ظہر تک مجھے یہیں رہنے دیں، اور آپ کھانے کے لئے تشریف لے جائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے کرم فرمایا، اور اس کی اجازت دیدی۔

صحیح بخاری میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ رواں تقریر فرمایا کرتے تھے، اور میں اُسے اردو ہی میں ضبط کرتا تھا۔ اس کی کاپی ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ اس کے برعکس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی کے درس میں اپنی تقریر املاء کرایا کرتے تھے، اور چونکہ املاء کرانے میں کچھ وقفہ مل جاتا تھا، اس لئے ان کی تقریر میں عربی میں ضبط کرتا تھا، اور حقیقت یہ ہے کہ حضرتؒ کی یہ تقریر اتنی

منضبط ہوتی تھی کہ اُس سے مسئلے کے تمام پہلو بڑے حسن ترتیب کے ساتھ یکجا ہوجاتے تھے، اور جو باتیں شروح میں منتشر ملتی ہیں، وہ یہاں نہایت منطقی ترتیب کے ساتھ چھنے چھنائے انداز میں مہیا ہوجاتی تھیں۔ان دونوں تقریروں کے مسودات میرے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔

اس طرح طالب علمی میں جو لطف اور انہماک تھا، اُس کی وجہ سے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ ہم اُس وقت دارالعلوم میں نقل وحرکت کے لئے کھڑاویں استعمال کرتے تھے، اب تو شاید کھڑاوں کا مطلب سمجھنے والے بھی کم رہ گئے ہوں۔ یہ ایک لکڑی کی چپل ہوتی تھی جس کے اوپر کے حصے میں ربر لگی ہوتی تھی، اور اُسی ربر کے نیچے پاؤں داخل کرکے اُسے پہنا جاتا تھا۔ اگر کسی پکے فرش پر کھڑاوں پہن کر چلیں تو کھٹ کھٹ کی آواز دور تک جاتی تھی۔ عام طور سے کھڑاویں غسل خانے میں وضو کے لئے استعمال ہوتی تھیں، لیکن ہم نے انہیں مستقل جوتے کے طور پر استعمال کیا ہوا تھا۔ جب ہم جمعرات کو گھر جاتے، تو ایک جوڑا جمعہ کو پہن کر آجاتے، اور ایک جوڑا ساتھ لاتے، اور وہ پیر یا منگل کو بدلا جاتا تھا۔ رات کو دیر تک تکرار، مطالعے اور بعض اوقات سبق دیر تک ہونے کی وجہ سے نیند کم ہوتی تھی، اور صبح ہی سے اسباق کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا، لیکن اگر کسی وقت کسی استاد کے آنے میں دیر ہوتی، تو تھوڑی دیر کے لئے برآمدے کے ایک کونے میں لیٹنے کا موقع مل جاتا تھا۔ چنانچہ ہم ننگے فرش ہی پر کچھ دیر ستالیا کرتے تھے۔

حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں فتویٰ کی تربیت کے طور پر فقہی مسائل نکالنے کی جو مشق پچھلے سال سے شروع کرا رکھی تھی، وہ اس سال بھی جاری رہی۔ اس کے علاوہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی کبھی کبھی کوئی تحریری کام دیدیا کرتے تھے۔ اُس وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ امداد الفتاویٰ کا نیا تصحیح شدہ اڈیشن شائع فرمارہے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس کے شروع میں صاحب فتاویٰ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات زندگی بھی ہونے چاہییں، چنانچہ آپ نے مجھے حکم دیا کہ تم حضرتؒ کے حالات پر ایک مختصر مضمون لکھ دو۔ اُس وقت میری دورۂ حدیث کی تعلیم شروع ہی ہوئی تھی۔ میں نے "اشرف السوانح" اور منشی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کی کتاب "سیرت اشرف" سامنے رکھ کر ایک مختصر مضمون لکھا جو شاید میرا کسی کتاب میں طبع ہونے والا پہلا مضمون تھا۔ یہ اب بھی امداد الفتاویٰ کے شروع میں چھپا ہوا ہے، اور اس کے آخر میں محرم ۱۳۷۹ھ (جولائی ۱۹۵۹ء) کی تاریخ درج ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ امتحان سہ ماہی سے پہلے پہلے ہی میں یہ مضمون لکھ چکا تھا، اور میری عمر اُس وقت سولہ سال تین ماہ تھی، بلکہ

شمسی حساب سے سولہ سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔ یہ بات اس لئے لکھ رہا ہوں کہ اگر اُس مضمون میں ناپختگی نظر آئے، تو اس کی وجہ بھی معلوم ہو جائے۔

اُس سال سہ ماہی امتحان آیا، تو اُس میں مجھے یہ اعزاز حاصل ہوا کہ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں میں جماعت میں اول رہا، اور بخاری شریف میں مجھے ۵۴ نمبر ملے، جو اس سے پہلے کبھی کسی کو نہیں ملے تھے، اور جامع ترمذی اور شمائل وموطأ میں بھی ۵۲ نمبر رہے۔ ششماہی امتحان میں بھی میں جامع ترمذی کے امتحان میں اول رہا، اور سوائے سنن ابي داود کے، جس میں میرے نمبر ۴۷ تھے، کسی بھی کتاب میں پچاس سے کم نمبر نہیں تھے، بلکہ بخاری میں ۵۲، طحاوی میں ۵۱ اور باقی سب کتابوں میں ۵۰ نمبر تھے۔

دورۂ حدیث کے سال میں عموماً ششماہی کے بعد رات کو بھی سبق ہوتے ہیں۔ اُس وقت ہماری دورۂ حدیث کی جماعت تقریباً تمیں افراد پر مشتمل تھی۔ چنانچہ رات کو ایک ہنڈے کی روشنی میں عشاء کے بعد حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پرانے بنگلے کے قریب دو درختوں کے نیچے صحیح بخاری کا درس دیا کرتے تھے۔ یہ نیم اور املی کے درخت تھے، جو اوپر جا کر یکجان ہو گئے تھے، اور ابھی تک زندہ ہیں۔ میں جب ان کے نیچے سے گذرتا ہوں تو اس درس کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔

خاص طور پر صحیح بخاری میں آخر سال کے دروس ایسے ہوتے ہیں کہ اکثر احادیث پہلے گذری ہوئی ہوتی ہیں اور استاذ ان پر تقریر کر چکے ہوتے ہیں، اس لئے صرف عبارت پڑھ لینا کافی ہوتا ہے۔ اس لئے درس بہت تیز چلتا ہے، اور عبارت پڑھنے کے لئے صرف ان منتخب طلبہ کو اجازت دی جاتی ہے جو عبارت تیز بھی پڑھ سکیں، اور صحیح بھی۔ چنانچہ ہماری جماعت میں چار طلبہ کو استاذ نے عبارت پڑھنے کے لئے مقرر فرمایا ہوا تھا۔ دو تو ہم دو بھائی تھے، تیسرے مولانا محمد امین کوٹوی صاحب اور چوتھے مولانا محمد ایرانی۔ جب استاذ محسوس فرماتے کہ ایک طالب علم پڑھتے پڑھتے پڑھتے سست پڑ گیا ہے، تو فرماتے: "چلو اب ڈرائیور بدل دیتے ہیں" اور پھر ہم میں سے کسی کا نام لے کر فرماتے کہ "اب تم پڑھو"۔ اس طرح یہ سبق رات گئے تک جاری رہتا تھا۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی کے درس میں اپنی تقریر املاء کرایا کرتے تھے، لیکن ظاہر ہے کہ حضرت استاذ کو املاء کرانے میں وقت لگتا تھا۔ اس لئے درس کی رفتار کم رہتی تھی۔ یہاں تک کہ آخر سال تک کتاب ارکان اربعہ تک ہی ہو پائی تھی۔ دوسری طرف ترمذی جلد ثانی حضرت نے املاء کے بغیر شروع کرا رکھی تھی، جس کی مقدار نسبۃً زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن جب سال ختم ہونے

میں بہت کم وقت رہ گیا، تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب بیشتر احادیث ایسی ہیں جو صحیح بخاری یا صحیح مسلم یا ابوداود وغیرہ میں گذر چکی ہیں، اس لئے باقی کتاب روایۃً پڑھ لینا بھی کافی ہوگا۔ اس کے لئے حضرت نے اضافی وقت دیکر کتاب مکمل کرانی شروع فرمائی۔ یہاں تک کہ جب تقریباً سو صفحات باقی رہ گئے ہوں گے، تو حضرت نے ایک پوری رات سبق پڑھایا۔ اس کے لئے درسگاہ ہی میں اسٹوو منگوا کر وقفے وقفے سے چائے بنانے اور پلانے کا سلسلہ بھی جاری رہا، یہاں تک کہ شاید ایک یا دو راتوں میں کتاب مکمل ہوگئی۔

اسی زمانے میں نہ جانے کس دھن میں اپنے درس کے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے میں نے کچھ شعر بھی کہہ دیئے تھے:

بہت ہی سخت آگے گردش ایام ہے، پی لو!
غنیمت ہے کہ گردش میں ابھی تک جام ہے، پی لو

تمہیں تصویر ہستی میں وفا کا رنگ بھرنا ہے
جفا و جور کی ظلمت جہاں میں عام ہے، پی لو!

تمہیں طاغوت کی بے رحم طغیانی سے لڑنا ہے
بہت سا کام ہے، پی لو، بہت سا کام ہے، پی لو!

سخاوت جام و مینا کی بڑی نعمت ہے دیوانو!
یہ ساقی کی توجہ بھی بڑا انعام ہے، پی لو!

یہاں ایک بات واضح کردینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، اور وہ یہ کہ ہمارے مدارس میں دورۂ حدیث جس طرح پڑھایا جاتا ہے، اُسے دیکھ کر ہمارے زمانے کے ماہرین تعلیم کے دل میں شاید یہ اعتراض پیدا ہو کہ اس طرح اتنی ساری کتابوں کو اول سے آخر تک پڑھنے کا کیا فائدہ ہے؟ جبکہ ان سب کتابوں میں ایک ہی طرح کی احادیث بار بار آتی رہتی ہیں۔ بہت سی احادیث پر کئی کئی استاذ بحث کرتے ہیں، اور آخر سال میں عموماً تلاوت پر ہی اکتفا کرلیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس یونی ورسٹیوں کے طریقے پر اگر کتابوں کے خلاصے تیار کرکے پڑھائے جائیں، تو نہ اتنی محنت کرنی پڑے، اور نہ پوری کتاب کی تلاوت کی ضرورت پیش آئے۔

اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ حدیث پڑھانے کے دو مقصود ہوتے ہیں، اور ان میں سے کسی بھی مقصد کو غیر اہم نہیں کہا جاسکتا۔ ایک یہ کہ احادیث کے متعلقہ مضامین و مباحث طالب علم کے سامنے آجائیں، اور

اُسے احادیث کو سمجھنے اور ان سے نتائج کے استنباط کا سلیقہ بھی آئے، اور احادیث کی جرح وتعدیل سے بھی مناسبت پیدا ہو، جسے دوسرے الفاظ میں "درایۃ الحدیث" کہہ سکتے ہیں۔ لیکن دوسرا مقصد "روایۃ الحدیث" ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ امہات کتب کی احادیث طالب علم کو براہ راست استاذ کے سامنے پڑھنے کا موقع ملے، تاکہ ان تمام احادیث میں وہ خود سند حدیث کا ایک حصہ بن جائے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے احادیث کی حفاظت کے لئے اسناد حدیث کا وہ سلسلہ جاری فرمایا ہے جس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی علم وفن میں موجود نہیں ہے۔ اسی اسناد کی بدولت آج ہم ہر حدیث کے بارے میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں حدیث کو کس کس نے روایت کیا ہے، اور روایت کرنے والے کس حد تک قابل اعتماد ہیں۔ چنانچہ سلف صالحین کے وقت سے یہ طریقہ چلا آتا ہے، کہ استاذ جو حدیث کسی کو پڑھاتا ہے، وہ اُس حدیث کے بارے میں اپنی سند بیان کرتا ہے کہ وہ اُسے کس سند سے پہنچی ہے۔ شاگرد کے استاذ کے سامنے بیٹھ کر حدیث پڑھنے کا یہ سلسلہ صحابۂ کرامؓ کے وقت سے چلا آتا ہے اور ہمارے اکابر نے کتابوں کے طبع ہو کر شائع ہونے کے بعد بھی اس کو اس لئے جاری رکھا ہے کہ اس طرح حدیث کی اسناد کا ایک حصہ بن جانا بذات خود ایک سعادت ہے۔ اس سعادت کے حصول کے لئے احادیث کا استاذ کے سامنے صرف پڑھ لینا بھی کافی ہے کہ اس کے ذریعے انسان کا رشتہ اُس سلسلۃ الذھب سے قائم ہو جاتا ہے جو سلف صالحین سے گذرتی ہوئی سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے۔ اس کی برکتیں خلاصوں کا مطالعہ کرنے سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ برصغیر کے علاوہ عالم اسلام میں چونکہ ٹھیٹھ دینی مدارس ناپید ہو گئے ہیں، اس لئے وہاں درسگاہوں کی سطح پر یہ طریقہ متروک ہو چکا ہے۔ البتہ انفرادی سطح پر کہیں کہیں بعض مشائخ اس طرح کتب احادیث اب بھی روایۃً پڑھاتے ہیں، اور شوقین لوگ اپنے طور پر یہ سعادت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن بفضلہٖ تعالیٰ برصغیر کے مدارس میں یہ طریقہ اب تک جاری ہے۔

بہر حال اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دورۂ حدیث کا سال پورا ہوا۔ اور جمعرات ۷ رجب ۱۳۷۹ھ مطابق تقریباً ۴ جنوری ۱۹۶۰ء کو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بخاری شریف کے آخری باب کا درس دیکر اُس کی تکمیل فرمائی (۱)۔ اور شعبان ۱۳۷۹ھ مطابق فروری ۱۹۶۰ء میں امتحان کا وقت آگیا۔ اُس وقت میری عمر کا چاند کے حساب سے سترھواں سال پورا ہونے میں دو مہینے باقی تھے، اور شمسی اعتبار سے آٹھ مہینے۔ اُس وقت تک دارالعلوم کراچی وفاق المدارس العربیہ کے ساتھ ملحق نہیں تھا، وفاق کا اُس وقت تک وہ مقام بھی نہیں تھا

(۱) یہ تاریخ میری ضبط کی ہوئی تقریر بخاری (قلمی) میں لکھی ہوئی ہے۔

جو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آج اس کو حاصل ہے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُس وقت کے حالات کے مطابق متعدد وجوہ کی بنا پر وفاق سے علیحدہ رہنے ہی کو پسند فرمایا تھا۔ چنانچہ دارالعلوم کے تمام امتحانات اپنے مدرسے ہی کی سطح پر ہوتے تھے۔ البتہ بعض حضرات اساتذہ کی خواہش تھی کہ دارالعلوم بھی وفاق میں شامل ہوجائے، اور اس کے لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو وفاق سے الحاق جن اسباب کی وجہ سے ناپسند تھا، انہیں دور کرنے کے لئے مختلف تجاویز بھی سامنے آتی رہتی تھیں۔

دوسری طرف اللہ تعالیٰ کا خاص فضل وکرم تھا کہ ہم دونوں بھائیوں کو اپنے اساتذۂ کرام کی بھرپور شفقت حاصل تھی، اور وہ سب حضرات ہمارے بارے میں حسن ظن بھی رکھتے تھے۔ ہم تمام امتحانات میں اپنا پرچہ عربی میں لکھا کرتے تھے جسے اساتذۂ کرام عموماً پسند فرماتے تھے۔ اس لئے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک موقع پر اساتذہ کی محفل میں یہ فرمایا کہ اگر وفاق سے دارالعلوم کو ملحق کرنا ہے، تو اسی سال کرنا بہتر ہوگا، کیونکہ اگر اس سال دارالعلوم کا سالانہ امتحان وفاق کے تحت ہوا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ تقی کو پورے وفاق میں پہلی پوزیشن حاصل ہونے کی امید ہے، اور اس طرح وفاق سے الحاق کے پہلے ہی سال دارالعلوم کو وفاق میں پہلی پوزیشن حاصل ہوسکتی ہے۔

وفاق سے تو اُس سال بھی الحاق نہ ہوسکا لیکن جب دارالعلوم ہی کی سطح پر امتحانات ہوئے، تو اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ہمارے جوابات پر اساتذۂ کرام نے بڑی حوصلہ افزائی فرمائی۔ اُس وقت تک دارالعلوم کراچی میں دارالعلوم دیوبند کے قدیم طریقے پر ہر پرچے کے کل نمبر پچاس ہوتے تھے، لیکن اگر کسی طالب علم کا پرچہ بہت اچھا ہوتا، تو ممتحن پچاس سے اوپر بھی انعامی نمبر دیدیتا تھا۔ عام طور پر ایسے پرچوں کو اکیاون نمبر دیئے جاتے تھے اور اگر بہت غیر معمولی طور پر پرچہ اچھا ہو، تو باون، اور شاذ ونادر حالات میں ترپن نمبر بھی دیدیئے جاتے تھے۔

میرے دورۂ حدیث کے امتحان میں یہ ریکارڈ صورت حال پیش آئی کہ حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ امتحانی پرچوں پر نمبر لگانے میں انتہائی سخت گیر مشہور تھے، اور ان کی سخت گیری کا ایک مظاہرہ خود میرے ساتھ ہوا تھا جس کا تذکرہ میں پچھلے سالانہ امتحان کے ذیل میں کرچکا ہوں کہ انہوں نے پچھلے سال شرح نخبۃ الفکر کے پرچے میں مجھے اکتالیس نمبر دیئے تھے، جو اُس وقت کے لحاظ سے اونیٰ درجے کے نمبر سمجھے جاتے تھے، اور مجھے اُس کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ اس مرتبہ سنن نسائی کا پرچہ ان کے پاس تھا، اور انہوں نے اُس پرچے پر مجھے پچپن نمبر دیئے، (جو دارالعلوم کے امتحانات کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکا) اور پرچے پر کوئی تعریفی نوٹ بھی

لکھا تھا۔ افسوس ہے کہ مجھے خود حضرتؒ کی یہ تحریر دیکھنے کا موقع نہیں ملا، کیونکہ طلبہ کو جوابی پرچے دکھائے نہیں جاتے تھے، لیکن حضرت مولاناؒ نے حضرت والد صاحبؒ اور حضرت ناظم صاحب (رحمۃ اللہ علیہم) سے غالباً یہ بیان فرمایا تھا کہ میں نے اپنی تدریسی زندگی میں ایسا پرچہ نہیں دیکھا۔ دوسری طرف ہمارے نتائج تو بعد میں ہمیں معلوم ہوئے، لیکن حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ جب میرا پرچہ دیکھ رہے تھے، تو انہوں نے اُسی وقت حضرت والد صاحبؒ کو مبارکباد کا فون کیا، اور مجھے چون نمبر دیئے۔ میرا جو نتیجہ اُس وقت شائع ہوا، وہ یہ تھا:

بخاری شریف: ۵۴، مسلم شریف: ۵۲، ابوداود شریف: ۵۲، نسائی شریف: ۵۵، ترمذی شریف: ۵۰، طحاوی شریف: ۵۲، موطأ امام محمد: ۵۲، شمائل ترمذی: ۵۰، موطأ امام مالک: ۵۱، ابن ماجہ: ۵۱۔

میرے برادرِ بزرگ حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کا نتیجہ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(انیسویں قسط)

حضرت والد صاحب قدس سرہ کو ہم دونوں بھائیوں کے دورۂ حدیث کی تکمیل کی اتنی مسرت تھی کہ انہوں نے اس موقع پر ایک دعوت کا اہتمام فرمایا، اور اُسے ولیمہ کا نام دیا جس میں خاندان کے لوگوں کے علاوہ خاص اہل تعلق کو بھی مدعو فرمایا گیا تھا۔ پھر مدرسے کے سالانہ جلسے میں ہماری دستار بندی بھی ہوئی۔ چونکہ اُس وقت تک یہ طے نہیں تھا کہ دورۂ حدیث کے بعد ہمیں کیا کرنا ہے، اس لئے میں نے دارالعلوم سے رخصت ہونے پر ایک نظم بھی کہی تھی جس کے کچھ اشعار یہ ہیں:

سلام اے میرے گلشن، علم وفن کے پاک گہوارے
ہدایت کے فلک پر علم کے تابندہ سیارے

تری آغوش شفقت سے نکل کر جارہا ہوں میں
مرے قلب وجگر بے چین ہیں، گھبرا رہا ہوں میں

چلا جاؤں گا میں ان علم کی دلکش فضاؤں سے
تری ان روح پرور اور کیف افزا ہواؤں سے

جہاں پر عمر کے میں نے سہانے دن گذارے ہیں
جہاں کے پھول تو ہیں پھول، مجھکو خار پیارے ہیں

جہاں کا ذرہ ذرہ واقف اسرار الفت ہے
جہاں کا ایک اک گوشہ مرے خوابوں کی جنت ہے

جہاں آکر میں آسی اپنی ہستی بھول جاتا تھا
خدا کی نعمتوں میں خود پرستی بھول جاتا تھا

مگر اے میرے گلشن ! تو نہ ہو اندوہگیں اتنا
ہماری اس جدائی پر ملول اتنا، حزیں اتنا

سبق تو نے پڑھایا ہے ہمیں عزم اور ہمت کا
صداقت کا، شجاعت کا، امانت کا، عدالت کا

نہ بھٹکیں جس سے ہم تو نے ہمیں وہ رہ دکھائی ہے
تری تعلیم ہی تو ہم پہ بنکر نور چھائی ہے

خدا توفیق دے، اُس سے ہمیں زائل نہ دیکھے گا
اور اپنی کوششوں کو ہم پہ لا حاصل نہ دیکھے گا

امنگیں ہیں ہمارے دل میں اب کچھ کام کرنے کی
ترے پیغام کو مشہور کرنے، عام کرنے کی

چمن پر باغباں کے بھیس میں صیاد بیٹھے ہیں
نہیں ہے کوہکن کوئی، مگر فرہاد بیٹھے ہیں

بسے، پھولے پھلے تُو، اور جہاں میں جگمگائے تُو
بہاروں کے حسیں جھرمٹ میں رہکر مسکرائے تُو

دورۂ حدیث کے بعد

درس نظامی کی تکمیل کے بعد ہم دونوں بھائی اپنے لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں واپس چلے آئے۔ اُس وقت تک یہ بات واضح نہیں تھی کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے؟ ایک رائے یہ تھی کہ ہمیں مزید تعلیم اور عربی زبان میں مہارت کے لئے جامعۃ الازہر بھیج دیا جائے۔ میری کم عمری کی وجہ سے والدۂ ماجدہ رحمہا اللہ تعالیٰ مجھے مصر بھیجنے پر راضی نہیں تھیں، لیکن بھائی صاحب مدظلہم کے بارے میں وہ اس کو کسی قدر گوارا کرسکتی تھیں، اس لئے ان کے بارے میں لوگوں کا کافی اصرار تھا کہ انہیں ازہر بھیج دیا جائے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ہمیں دارالعلوم ہی

میں تدریس کا آغاز کرنا چاہئے۔ تیسری رائے یہ تھی کہ ہمیں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق دین کی خدمت کے لئے انگریزی تعلیم بھی حاصل کرنی چاہئے۔ چوتھی رائے یہ تھی کہ ہمیں حضرت والد صاحب قدس سرہ کے سائے میں فتویٰ کی تربیت حاصل کرنی چاہئے۔

حضرت والد صاحب قدس سرہ کو ہمیں مصر بھیجنے پر شرح صدر نہیں تھا، کیونکہ " ازہر " اب پرانا جیسا " ازہر " نہیں رہا تھا، اور اُس کے ماحول میں کافی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ شاید حضرت والد صاحبؒ نے استخارہ بھی فرمایا تھا، اس لئے وہاں بھیجنے کی رائے نہیں بنی۔ اور آخر کار فیصلہ یہ فرمایا کہ ہم دو گھنٹے دارالعلوم میں تدریس شروع کریں، اور باقی وقت فتویٰ کی تربیت حاصل کریں۔ اس وقت تک دارالعلوم میں تخصص کا کوئی شعبہ نہیں تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا کہ اگلے سال سے فتویٰ کا تخصص شروع کیا جائے گا۔ ادھر مجھے یہ شوق بھی تھا کہ میں انگریزی زبان سیکھ کر انگریزی کے ذریعے دین کی جو خدمت بن پڑے، اُس کی کوشش کروں۔ اس لئے شعبان اور رمضان کی چھٹیوں میں میں نے اپنے بڑے بھائی مولانا محمد ولی رازی صاحب مدظلہم سے درخواست کی کہ وہ مجھے انگریزی شروع کرادیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی ذہانت اور تدریس کا خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے۔ انہوں نے محسوس کرلیا کہ مجھے انگریزی پڑھانے کے لئے کوئی ریڈر قسم کی کتاب پڑھانے کے بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ مجھے انگریزی گرامر کا معتد بہ حصہ دو مہینوں میں پڑھا دیا جائے۔ ان کا خیال تھا، اور بالکل صحیح تھا، کہ میں چونکہ عربی صرف ونحو اچھی طرح پڑھا ہوا ہوں، اس لئے انگریزی گرامر کو سمجھنا اور اسے صحیح استعمال کرنا میرے لئے آسان ہوگا۔

چنانچہ انہوں نے کوئی کتاب سامنے رکھے بغیر مجھے انگریزی کی گردانیں (ٹینسیز) شروع کرادیں جو مجھے بڑی آسانی سے نہ صرف سمجھ میں آتی چلی گئیں، بلکہ مجھے ان کے استعمال کی بھی مشق ہوگئی، اور اس طرح جملوں کا بنیادی ڈھانچہ بڑی حد تک ذہن نشین ہوگیا۔

تدریس اور تخصّص کا آغاز

جب شوال (۱۳۷۹ھ) کا مہینہ آیا، تو میری عمر کے سترہ سال پورے ہورہے تھے، اور رسمی طالب علمی کی تکمیل کے بعد عملی زندگی کا آغاز۔ آنے والے دس سال میں میری مصروفیات چار مختلف دائروں میں تقسیم تھیں۔ تدریس، فتویٰ، تصنیف اور انگریزی تعلیم۔

تدریس کا آغاز

طے یہ پایا تھا کہ درس نظامی سے فراغت کے اگلے سال ہمارے دو گھنٹے تدریس میں، اور باقی اوقات فتویٰ کی مشق میں لگائے جائیں گے۔ لہٰذا مجھے پہلی بار دارالعلوم کے استاذ کی حیثیت میں دو گھنٹے پڑھانے کے لئے ملے۔ مجھے عربی کے پہلے درجے کی "عربی کا معلم" اور "طریقۃ جدیدۃ" پڑھانے کے لئے دی گئیں۔ لینے کو تو میں نے یہ دونوں سبق پڑھانے کی ذمہ داری لے لی، "عربی کا معلم" میں نے ہدایہ کے سال میں ایک طالب علم کو پڑھایا بھی تھا، جس کا پرلطف واقعہ میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ اس لئے پڑھانے کی حد تک تو مجھے کوئی اشکال نہیں تھا، لیکن میری حالت یہ تھی کہ ابھی تک میری داڑھی بھی نہیں نکلی تھی، اور جب میں اپنی عمر اور اپنے پتلے دبلے جثّے کو دیکھتا، تو درسگاہ میں استاذ کی حیثیت سے داخل ہونا ایک آزمائش معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف جس جماعت کو مجھے پڑھانا تھا، اُس میں مجھ سے بڑی عمر کے لڑکوں کی اچھی خاصی تعداد تھی، اور دو ایک صاحبان تو اچھی خاصی داڑھی والے بھی تھے۔ مجھے از خود درسگاہ میں جاتے ہوئے شرم سی معلوم ہوتی تھی، اس لئے میں نے اپنے محسن استاذ گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ وہ درسگاہ میں مجھے لے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرتؒ نے پہلا سبق پڑھایا، اور اس کے بعد میں نے پڑھانا شروع کیا۔ اپنی کم عمری اور پتلے دبلے جسم پر کسی قدر پردہ ڈالنے کے لئے میں گرمی کے موسم میں بھی شیروانی پہن کر خود ساختہ وقار کے ساتھ جاتا، اور قدرے بلند آواز سے پڑھاتا، تاکہ کچھ تو استادی کی لاج رہے۔ شروع میں جب مین درسگاہ میں اکیلا داخل ہوا، تو بعض داڑھی والے طلبہ کے چہروں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، گویا وہ زبان حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ: "اچھا! یہ ہیں ہمارے استاذ جن کی ہمیں شاگردی کرنی ہوگی"۔

لیکن یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خاص فضل وکرم ہی تھا کہ چند ہی دنوں میں تمام طلبہ مجھ سے مانوس ہوگئے، اور میری عمر کی کمی کا احساس اُن کے دلوں سے جاتا رہا، یہاں تک کہ ان سے کام لینے کے معاملے میں میری سختی بھی ان کو گوارا ہوگئی۔ اس جماعت کے طلبہ میں جو لوگ مجھے یاد رہ گئے ہیں، ان میں سے مولانا عبدالصمد ایرانی سلمہ بطور خاص قابل ذکر ہیں کہ وہ ہر امتحان میں نمایاں پوزیشن حاصل کرتے تھے، اور آج اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ایران کے بڑے علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ مولانا عبدالقیوم گلگتی صاحب جہاں تک یاد ہے، ہر امتحان میں اول آیا کرتے تھے، اور پھر وہ مکہ مکرمہ کی جامعۃ ام القریٰ میں عرصے تک بطور

باحث کام کرتے رہے، اور انہوں نے وہاں متعدد تحقیقی کام کئے، اور آجکل مکتبۃ الحرم المکی میں باحث کے طور پر کام کررہے ہیں۔

اس سال بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کو دوسرے درجے کی کتابیں ہدایۃ النحو، علم الصیغہ اور تیسیر المنطق پڑھانے کے لئے دی گئی تھیں۔ ان کے اُس وقت کے شاگردوں میں مولانا عزیز الرحمٰن صاحب (جو آجکل ماشاء اللہ دورۂ حدیث کے استاذ اور ماہنامہ البلاغ کے مدیر ہیں) مولانا محمد اسحاق صاحب جہلمی، (جو اس وقت دارالعلوم میں درجہ علیا کے استاذ اور دارالاقامہ کے ناظم ہیں) مولانا مہتاب صاحب (جو ماشاء اللہ اپنے علاقے کے ممتاز علماء میں شامل ہیں، اور تبلیغی جماعت کے سرگرم رکن) وغیرہ شامل تھے۔ ان میں سے کچھ حضرات مدرسے کے اوقات کے علاوہ مجھ سے بھی کچھ پڑھتے تھے۔ اور بعد میں ان کے کچھ اسباق، مثلاً مقامات حریری بھی میرے پاس آگئے تھے۔

ہماری تدریس کی کتابوں میں ہر سال کچھ نہ کچھ ترقی ہوتی رہی۔ ہم دونوں بھائیوں کو تدریس اور اُس کے مطالعے سے بڑی دلچسپی تھی، اور ہم جب اپنی قیام گاہ پر ہوتے، تو کھانے تک کے اوقات میں ہماری گفتگو کا زیادہ تر موضوع اپنی زیرِ تدریس کتابوں کی خاص خاص باتیں، طلبہ کی مجموعی کیفیت اور تدریس کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کی تجاویز ہوا کرتی تھیں۔ اگرچہ دارالعلوم کی صحرائی زندگی اب بھی بڑی حد تک برقرار تھی، لیکن استاد بن جانے کے بعد بہت سے محبت کرنے والے طلبہ نے بعض وہ خدمتیں اصرار کرکے اپنے ذمے لے لی تھیں جو پہلے ہم خود انجام دیتے تھے، مثلاً لالٹین اور اسٹوو کے لئے مٹی کا تیل لانا، یا دوسری ضروریات کی خریداری۔ لیکن تدریس اور فتویٰ کے کام میں انہماک ایسا تھا کہ اس صحرائی زندگی کی مشکلات خوشگوار بن گئی تھیں۔ عصر کے بعد قریبی باغات کی تفریح کے دوران بھی ہماری باتیں عموماً اسباق کے کسی نہ کسی موضوع کے متعلق ہی ہوتی تھیں۔

انہی دنوں میں ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ رات کو مطالعے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد ذہن کچھ تھکا ہوا تھا۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہمارے کمرے میں آگئے۔ چودھویں تاریخ کی چاندنی رات تھی، سب کا دل چاہا کہ کچھ دیر باہر چہل قدمی کر آئیں۔ چنانچہ بھائی رفیع صاحب، حضرت مولانا شمس الحق صاحب، حکیم مشرف حسین صاحب اور میں ٹہلنے کے لئے باہر نکلے۔ چونکہ چاندنی رات میں باغات کے

بجائے صحرا زیادہ اچھا لگتا ہے، اس لئے ہم مغرب کی سمت چل نکلے۔ اس سمت میں اُس وقت سمندر تک کوئی عمارت وغیرہ نہیں تھی۔ دور تک پھیلی ہوئی چاندنی میں ٹھنڈی ریت بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی تھی۔ ہم باتیں کرتے کرتے بہت دور نکل گئے، یہاں تک کہ دارالعلوم کی عمارتیں اتنی پیچھے رہ گئیں کہ ہمیں نظر نہیں آتی تھیں۔

جب اور آگے بڑھے، تو دُور ایک آدمی کا سراپا محسوس ہوا جو دیر سے اپنی جگہ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ اس ویرانے اور رات کے اس حصے میں یہ شخص صحرا کے بیچوں بیچ بے حرکت کیوں کھڑا ہے؟ بہر حال! ہم رفتہ رفتہ اُس کے قریب پہنچے، تو دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں رائفل بھی ہے۔ اس نے ہمیں دور سے دیکھ کر ایکشن لیا، اور رائفل کا رُخ ہماری طرف کر کے گرج دار آواز میں کہا:

" خبردار! وہیں ٹھہر جاؤ! "

ہم رُک گئے، اور وہ ہماری طرف روانہ ہوا۔ قریب آنے پر ہم نے دیکھا کہ وہ فوجی وردی میں ہے۔ وردی کو دیکھ کر اتنا تو اطمینان ہوا کہ وہ کوئی ڈاکو نہیں ہے، لیکن اس نے ہمارے سامنے کچھ دور ترچھا کھڑے ہو کر پوزیشن لی، اور رائفل کا رُخ ہماری طرف کر کے پوچھا:

"تم کون ہو؟ اور یہاں رات گئے کیا کرنے آئے ہو؟"

ہم نے بتایا کہ " یہاں سے مشرق میں کچھ دور دارالعلوم واقع ہے، ہم اس کے استاد ہیں، اور ٹہلتے ہوئے یہاں آ نکلے ہیں"۔ تھوڑی سی ردوقدح کے بعد اس نے ہماری بات تسلیم کر لی، اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ہم مسلح نہیں ہیں، رائفل بھی نیچے کر لی، اور پھر ہمارے ساتھ ریت پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

ہمارے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا کہ اُس کا نام میجر سلطان ہے، وہ فوج میں میجر ہے، اور اس علاقے سے کچھ حساس پائپ لائنیں گذرتی ہیں۔ اس کی ڈیوٹی ان کی حفاظت پر لگی ہوئی ہے۔ تھوڑی سی دیر میں میجر صاحب ہم سے گھل مل گئے، اور انہوں نے بتایا کہ ان کا اصل وطن چکوال ہے، اور وہ مولانا قاضی مظہر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملتے رہے ہیں۔ ہم نے انہیں دارالعلوم آنے کی دعوت دی، چنانچہ وہ دارالعلوم بھی کئی مرتبہ آئے۔ انہوں نے اپنا فون نمبر بھی ہمیں دیدیا تھا۔

اس واقعے کے کافی عرصے کے بعد جب دارالعلوم کی چار دیواری بن چکی تھی، اور اس پر گیٹ لگ چکے تھے، ایسا ہوا کہ دارالعلوم سے کچھ عناد رکھنے والوں نے شرافی گوٹھ کے کچھ لوگوں کو دارالعلوم کے خلاف اُکسایا کہ دارالعلوم نے چار دیواری بنا کر تمہارا کورنگی کی طرف آنے جانے کا راستہ بند کر دیا ہے (حالانکہ دارالعلوم کی

مشرقی دیوار کے ساتھ ساتھ ان کے لئے آمد ورفت کا راستہ موجود تھا، بلکہ انہیں قریب پڑتا تھا) چنانچہ ان کے بہکائے میں آکر ان کے کچھ مسلح لوگوں نے دارالعلوم کے شمالی گیٹ پر دھاوا بول دیا، گیٹ پر فائرنگ بھی کی، اور گیٹ کو توڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آرہا تھا، تو گیٹ پر شدید ہنگامہ نظر آیا۔ گیٹ پر مسلسل ضربوں کی آوازیں آرہی تھیں، اور فائر بھی ہو رہے تھے۔ میں نے اس وقت میجر سلطان صاحب کو فون کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میں اس وقت قریب ہی ہوں، اور جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت ہم نے دارالعلوم کی حفاظت کے لئے کچھ اسلحہ کا لائسنس لے لیا تھا، اور ایک پستول چوکی دار کو دے رکھی تھی، اس نے یہ منظر دیکھ کر میری اجازت سے گیٹ پر پہنچ کر ہوائی فائرنگ کی، تو اس کی آواز سُن کر حملے کا زور کچھ رُکا۔ اتنے میں میجر سلطان صاحب اپنی فوجی گاڑی لے کر وہاں پہنچ گئے، اور نہ صرف یہ کہ مجمع کو منتشر کیا، بلکہ اس کے بعد گوٹھ کے بڑوں سے جا کر ان لوگوں کی شکایت کی جس کے نتیجے میں گوٹھ کے ذمہ داروں نے دارالعلوم آکر اس واقعے پر اپنے افسوس کا اظہار کیا، اور آئندہ کے لئے لائحۂ عمل طے کر لیا گیا۔ الحمد للہ! اس کے بعد گوٹھ کے لوگوں سے دارالعلوم کے تعلقات کبھی خراب نہیں ہوئے۔

اس سارے واقعے میں میجر سلطان صاحب کا بڑا اہم کردار تھا۔ اور یہی میجر سلطان ہیں جو آج کرنل امام کے نام سے معروف ہیں، جنہوں نے بعد میں روس کے خلاف افغانستان کے جہاد میں نمایاں کارنامے انجام دیئے، اُن سے اس دور میں بھی رابطے جاری رہے، قندھار میں بھی ملاقات ہوئی، اور آخری ملاقات راولپنڈی میں ہوئی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس مردِ مجاہد کو آخر میں پاکستانی طالبان نے جاسوس قرار دیکر بڑے ظالمانہ انداز سے گولی مار کر شہید کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

شہر کی گہما گہمی سے اکتائے ہوئے لوگوں کے لئے ہمارا یہ ویرانہ کبھی کبھی پکنک کا ذریعہ بھی بن جاتا تھا، چنانچہ ہمارے بھائی، رشتہ دار اور احباب کچھ وقت اس پُرسکون ماحول میں گذارنے کے لئے ہمارے پاس آجاتے تھے، اور اس طرح ہمیں بھی ان کے ساتھ لطف اندوز ہونے کا موقع مل جاتا تھا۔

ایک مرتبہ برادرِ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کے کچھ دوست رات گذارنے کے لئے آگئے۔ رات عشاء کے بعد ایک اونٹ گاڑی کرائے پر لی گئی، اور اُس میں سوار ہو کر کورنگی کریک کے ساحل پر جانے کا پروگرام بنا۔ چودھویں کا چاند اپنی آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا، اور اُس نے حدّ نظر تک پھیلے ہوئے صحرا کو ایک نورانی چادر اُڑھا رکھی تھی۔ صحرائی ریت کی لہروں میں اونٹ اپنی بے نیاز چال کے ساتھ رواں دواں تھا۔ اس مسحور کن ماحول میں بھائی صاحب کے ایک دوست نے دلآویز ترنم کے ساتھ چاندنی کے

بارے میں ایک نظم پڑھ کرسماں باندھ دیا۔ رات کورنگی کریک کے ساحل پر گذار کر صبح سویرے ہم واپس آئے۔

ہمارے بھائی جان حضرت محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود بھی قادرالکلام شاعر تھے، اور اُس وقت کے مشہور شاعروں سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جناب جگر مرادآبادی مرحوم کراچی آئے ہوئے تھے۔ بھائی جان بھی کراچی میں تھے۔ انہوں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایماء پر جناب جگر مرحوم کو ایک رات دارالعلوم میں گذارنے کے لئے مدعو کیا۔ اس مناسبت سے انہوں نے کراچی کے مشہور شعراء کو بھی دعوت دی۔ چنانچہ سرِ شام حضرت جگر مرادآبادی صاحب کے ساتھ جناب ماہر القادری، جناب ادیب سہارن پوری اور جناب تابش دہلوی (رحمہم اللہ تعالیٰ جمیعا) دارالعلوم آئے۔ دارالعلوم کی قدیم ترین عمارت جسے ہم پرانا بنگلہ کہا کرتے تھے، اُس میں ان حضرات کے لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے رات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد شعروسخن کی محفل جمی۔ حضرت جگر مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دو غزلیں اپنے منفرد ترنم کے ساتھ سنائیں، جو ان کے لب ولہجے کے ساتھ آج بھی کانوں میں گونج رہی ہیں۔

بے تاب ہے، بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دل ماہیٔ بے آب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے، لیکن
کشتی سی تہِ آب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و بہ اصرار
وہ جرعہ بھی زہراب ہے، معلوم نہیں کیوں؟

اور یہ غزل:

نغمہ ترا نفس نفس، جلوہ ترا نظر نظر
اے مرے شاہدِ حیات اور ابھی قریب تر

عرض و نیاز عشق کا چاہئے اور کیا صلہ؟
میں نے کہا بہ چشمِ نم، اُس نے سُنا بہ چشمِ تر

دوسرے شعراء نے بھی اپنا کلام سُنایا، اور پھر بھائی جان نے جب ان حضرات کو یہ بتایا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ بھی شعر کہتے رہے ہیں، تو سب کا اصرار ہوا کہ وہ بھی اپنا کلام سُنائیں۔ چنانچہ پھر بھائی جان

نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دو فارسی غزلیں سُنائیں۔

ایک غزل یہ تھی:

دیوانہ خوشتر است، نہ فرزانہ خوشتر است
کانانکہ خواست جلوۂ جانانہ خوشتر است

زاہد! مبیں حقیر گدایانِ عشق را
انفاسِ شاں زسُبحۂ صد دانہ خوشتر است

دیدی کہ رنج ہائے جہاں را کنارہ نیست
پس با منے بہ گوشۂ کاشانہ خوشتر است

خوش درسِ علم و شغلِ فتاویٰ بہ دیوبند
لیکن شبے بہ خانقہِ تھانہ خوشتر است(۱)

حضرت جگر صاحب اس غزل کے ہر شعر سے محظوظ ہوتے، اور بے ساختہ داد دیتے رہے۔ دوسری غزل یہ تھی:

بگذر زمن کہ حالت زارم نہ دیدہ بہ
بگذار حال من کہ ہمیں ناشنیدہ بہ

چشمت اگر رود بتماشائے غیر دوست
زیں گونہ دیدہا، بخدا، کور دیدہ بہ

ناکندنی ست در رہِ محبوب خارِ پا
کیں خارِ عشق در رگِ جانم خلیدہ بہ

☆☆☆

۱۔ یہ دونوں غزلیں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ کلام "کشکول" میں پوری چھپی ہوئی ہیں، یہاں صرف چند اشعار لکھے گئے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(بیسویں قسط)

کورنگی ٹاؤن شپ کی تعمیر

یہ زمانہ وہ تھا کہ جنرل محمد ایوب صاحب مرحوم کا مارشل لاء نیا نیا لگا تھا، اور انہوں نے بہت سے انقلابی کام شروع کئے ہوئے تھے۔ پاکستان کے قیام کے بعد مہاجرین کی مسلسل آمد کی وجہ سے ان کی آبادکاری کا مسئلہ ابھی تک پوری طرح حل نہیں ہوا تھا۔ مہاجرین کی اکثریت جھونپڑیاں ڈال کر ان میں رہ رہی تھی، اور بہت سے لوگ فٹ پاتھ پر سوتے تھے۔ ان کی آبادکاری کے لئے جنرل محمد ایوب خان صاحب نے کورنگی ٹاؤن شپ کا منصوبہ شروع کیا، اور جنرل محمد اعظم خان صاحب مرحوم کو اس کی تکمیل کا فریضہ سونپا، چنانچہ انہوں نے انتہائی برق رفتاری سے کورنگی کے وسیع علاقے میں مکانات کی تعمیر شروع کی، جس کی نگرانی وہ بذات خود موقع پر آ کر کیا کرتے تھے، چنانچہ بہت مختصر عرصے میں چند سالوں میں دیکھتے ہی دیکھتے کورنگی روڈ سے لے کر ہمارے دارالعلوم کے سامنے تک ایک وسیع آبادی تیار ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں بھی رفتہ رفتہ شہری زندگی کی کچھ سہولیات حاصل ہوگئیں۔ پانی کی لائن کورنگی کالونی تک آئی تو ہمیں بھی اُس میں سے حصہ ملا، اور پائپ لائن دارالعلوم تک پہنچ گئی، جس کی وجہ سے شرافی گوٹھ سے پانی لانے کی زحمت باقی نہ رہی، اور دارالعلوم ہی میں ایک زیر زمین حوض تعمیر کر کے پانی کا ذخیرہ اُس میں جمع کیا جانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ بجلی کی لائن بھی ہم تک پہنچ گئی، اور لالٹینوں اور ہنڈوں کے بجائے اب ہم براہ راست بجلی سے فیض یاب ہونے لگے۔

ہمارا قیام بدستور اسی چھوٹے سے مکان میں رہا جو حاجی کبیر الدین صاحب مرحوم نے بنا کر دارالعلوم کو دیا تھا۔ حضرت مولانا خورشید عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے گھر والوں کو دیوبند سے لے آئے تھے، اور ایک الگ مکان میں منتقل ہوگئے تھے۔ اس لئے اب اس مکان کے دونوں کمرے ہم تین آدمیوں کے تصرف میں تھے۔ میں، بھائی صاحب اور حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم۔ حکیم مشرف صاحب اگلے سال تعلیم سے فارغ ہوگئے، تو ہم اس گھر میں دو ہی رہ گئے۔ یہ گھر دارالعلوم کی دوسری عمارتوں سے الگ تھلگ تھا، اُس کے دائیں

طرف ایک کچی سڑک گذرتی تھی جس پر کبھی کبھی اونٹ گاڑیوں کی آواز آجایا کرتی تھی۔ اُس کے بعد جنگل ہی جنگل تھا، گھر کے سامنے مغرب میں دور تک ریتیلا صحرا پھیلا پڑا تھا، بس جنوب مغرب میں قریب ترین عمارت درس گاہوں کی تھی جو رات کو سنسان ہو جاتی تھی، چنانچہ جب رات کا اندھیرا گہرا ہوتا، تو پورے ماحول پر ایک مہیب سا سناٹا چھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد بھائی صاحب کی شادی ہوگئی تو انہیں بار بار لاہور جانا پڑتا، اور اس طرح بکثرت مجھے تنہائی اور سناٹے کے اس ماحول میں تنہا بھی رہنا پڑتا تھا۔

شہر سے تعلقات

پڑھنے کے زمانے سے پڑھانے کے دور تک ہمارا اکثر قیام دارالعلوم ہی میں رہا، لیکن چونکہ والدین اور دو بھائی ہمارے لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں مقیم تھے، اس لئے ہر جمعرات کو ہم گھر جایا کرتے تھے۔

میرا اس قسم کا کوئی باقاعدہ دوست نہیں تھا جیسے لڑکپن کے دور میں عام طور سے لوگوں کے بہت سے دوست بن جایا کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ کھیلوں اور تفریحات میں وقت گذرا کرتا ہے۔ لے دے کر حکیم مشرف حسین صاحب (مرحوم) تھے، جن کا میں پیچھے بار بار ذکر کر چکا ہوں، لیکن وہ بذات خود ایک باغ و بہار آدمی تھے جن کے بہت سے دوست تھے، اور ان کی چھٹی کے دن ان کے ساتھ گذرا کرتے تھے، اور میں چھٹی میں ان کی رفاقت سے محروم رہتا تھا۔ البتہ جناب محمد کلیم صاحب جن سے ہمارے برنس روڈ کے قیام کے زمانے میں دوستانہ تعلقات قائم ہوئے تھے، وہ کبھی کبھی جمعہ کے دن ہمارے یہاں آجایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا شاہ عبد الغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے ہوئے تھے، کلیم صاحب ان سے بیعت ہوگئے تھے، اور ان پر حضرتؒ کی تعلیمات کا ایک رنگ چڑھا ہوا تھا، چنانچہ وہ تشریف لاتے، تو اکثر حضرتؒ ہی کی باتیں کیا کرتے، اور میں ان سے خوب خوب استفادہ کیا کرتا۔

بعد میں کبھی کبھی حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم بھی جمعہ کو عصر کے بعد ہمارے یہاں آنے لگے، اور پھر کافی عرصہ یہ معمول رہا کہ عصر کے بعد ہم تینوں کہیں سیر کے لئے چلے جاتے۔ اس زمانے میں شہر میں ہجوم کا وہ عالم نہیں تھا جو آج نظر آتا ہے، اس لئے ہماری سیر صدر کے علاقے میں کسی جگہ چائے پی کر فریئر ہال یا ایوان صدر تک ہوا کرتی، اور کبھی کبھار کلفٹن کے ساحل پر بھی چلے جاتے تھے۔

اس سے زیادہ دوستیوں کا کوئی سلسلہ میری لڑکپن کی زندگی میں نہیں تھا، بلکہ جب میں اپنے دوسرے ہم

عمروں کو دیکھتا، تو کبھی کبھی مجھے تنہائی کا بھی احساس ہوتا تھا۔

جمعرات کی شام سے جمعہ کی شام یا ہفتے کی صبح تک کا وقت شہر میں گذرتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گھر میں بڑا اچھا کتب خانہ رکھا ہوا تھا۔ یہ وہ کتابیں تھیں جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کم آمدنی کے باوجود مختلف جگہوں سے خرید خرید کر جمع کی تھیں، اور تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ تاریخ اور شعروادب، فلسفہ، اور سائنس کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ مجھے چونکہ کتابوں کا شوق تھا، اس لئے جمعرات کو گھر پہنچنے اور گھر والوں سے ملنے کے بعد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس کتب خانے سے رشتہ جوڑ لیتا تھا۔ ظاہر ہے کہ پورے کتب خانے کا مطالعہ تو ممکن نہیں تھا۔ لیکن میں ہر کتاب کو الٹ پلٹ کر اس کے نام، موضوع اور اُس کے مصنف کے بارے میں معلومات حاصل کرتا، اور فہرست پر نظر ڈال کر جس موضوع سے کچھ دلچسپی معلوم ہوتی، اُس کا مطالعہ بھی کر لیتا تھا۔ اس طرح میں نے الحمد للہ رفتہ رفتہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی الماریوں میں سے ایک ایک کتاب کا تعارف حاصل کرلیا تھا، اور مجھے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ کونسی کتاب کہاں رکھی ہے۔ چنانچہ جب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کسی کتاب کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھ سے منگواتے، اور میں تلاش کئے بغیر فوراً لے آیا کرتا تھا۔ اس طریقے سے مجھے اس کا بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ جب کسی مسئلے کی تحقیق کی ضرورت ہو تو مجھے کونسی کتابوں سے مدد مل سکتی ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس برصغیر کے اہم رسالے اور ہفتہ وار اخبارات کثرت سے آیا کرتے تھے، اور ہر ہفتے میں تازہ آئے ہوئے اخبارات اور رسالوں پر ایک نظر ضرور ڈالتا تھا، اور ان سے یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ برصغیر کے علمی حلقوں میں کونسے معاملات زیر بحث ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے چونکہ مطالعے اور ادب وانشاء کا شوق تھا، اس لئے میں اپنے پڑھنے کے زمانے ہی سے معاصر علماء اور اہل قلم کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ اکابر علماء دیوبند کے علاوہ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی،" حضرت مولانا سید سلیمان ندوی،" مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبلی نعمانی" وغیرہ کی کتابوں سے میں مضامین سے زیادہ ادب وانشاء اور علمی باتوں کو عام فہم اور ادبی انداز میں بیان کرنے کا طریقہ خاص طور پر دیکھا کرتا تھا۔ دینی گھرانوں میں ناولوں کا مطالعہ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا، لیکن میں نے نسیم حجازی مرحوم کے تمام ناول بھی اس لئے پڑھے تھے کہ اگر عربی ادب سیکھنے کے لئے مقامات، متنبی اور سبعہ معلقہ پڑھے جاسکتے ہیں تو اردو ادب اور تاریخ کے لئے نسیم حجازی کے ناول ان سے بدرجہا غنیمت ہیں، اور ان سے ادب اردو کا ایک خاص ذوق حاصل ہوتا ہے، اور فی الجملہ دینی فکر کو بھی مدد ملتی ہے۔

اسی حوالے سے میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ کی متعدد کتابیں بھی ذوق وشوق سے پڑھی تھیں۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مجھے اپنے اساتذہ اور خاص طور پر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت وتربیت حاصل تھی، اور فی الجملہ اسلامی علوم سے بھی کچھ نہ کچھ مناسبت پیدا ہوگئی تھی، اس لئے مولانا مودودیؒ کی کتابوں میں جو باتیں جمہور سے ہٹی ہوئی نظر آتیں، ان کا احساس بھی ہوجاتا تھا، اور ان سے اختلاف بھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علمی مضامین کی تفہیم کے لئے ان کا اسلوب بیان مجھے مذکورہ بالا تمام مصنفین سے کہیں زیادہ مؤثر اور بلیغ معلوم ہوتا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے مغربی افکار پر جس انداز سے تنقید کی ہے، وہ بھی مجھے بہت قابل تعریف معلوم ہوتی تھی، اور ساتھ ہی یہ حسرت بھی ہوتی تھی کہ کاش! مغرب کا اتنا مؤثر نقاد فقہی اور اعتقادی مسائل میں جمہور سے الگ راستہ اختیار نہ کرتا یا کم ازکم اپنے اجتہادات کی تائید میں دوسرے اہل علم کے خلاف جارحانہ اسلوب اختیار نہ کرتا، تو امت ایک بڑے انتشار سے بچ جاتی۔ لیکن اللہ تعالیٰ اُنہیں اپنی مغفرت سے نوازیں، انہوں نے جس تندی اور تیزی کا مظاہرہ مغربی افکار کے خلاف کیا، ادبیت کے جوش میں تقریباً اُتنی ہی تیزی روایتی علماء کے خلاف بھی استعمال کی، اور اس کا یہ نتیجہ نکلا کہ جو حضرات دین کے معاملے میں انہی کے لٹریچر پر اکتفاء کرتے ہیں، (اور کم ازکم اُس وقت جماعت اسلامی اور اسلامی جمعیت طلبہ کے عام کارکنوں کی صورت حال کچھ ایسی ہی تھی) ان کے دلوں میں یہ تصور شعوری یا غیر شعوری طور پر جاگزین ہوجاتا ہے کہ دین کی جو فہم مولانا مودودیؒ نے پیش کی ہے، وہ کسی اور نے پیش نہیں کی، اور روایتی علماء نے دین کی جامعیت کو سمجھنے کے بجائے بزرگوں کی تقلید کے تحت اپنے آپ کو چند مسائل کے خول میں بند کرکے امت کی صحیح رہنمائی میں کوتاہی کی ہے، اور خاص طور پر اسلام کے سیاسی پہلو میں ان کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے۔

بعض حضرات کے ذہن میں یہ تصور اس درجہ سما جاتا ہے کہ روایتی علماء اور طلبہ کے ساتھ ان کے رویے میں ان کی فی الجملہ تحقیر اور اپنی فکر پر غرور ادا ادا سے ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔ الحمد للہ بعد میں، خاص طور پر حضرت قاضی حسین احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی امارت کے دور میں، اس رویے میں کافی بہتری پیدا ہوئی ہے، لیکن اُس وقت صورت حال کچھ ایسی ہی تھی۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں مشکوۃ یا دورۂ حدیث کی جماعت میں تھا تو اسلامی جمعیت طلبہ کی ایک ٹیم دارالعلوم دیکھنے کیلئے آئی۔ اُس وقت میرے ہاتھ میں ایک فائل تھی جس میں میں اپنے استاذ کی وہ تقریر لکھا

کرتا تھا جو وہ درس کے دوران ارشاد فرماتے تھے۔ اسلامی جمعیت طلبہ کی وہ ٹیم مجھے راستے میں ملی، اور اُس کے سربراہ نے (جن سے بعد میں میرے کسی قدر دوستانہ مراسم بھی ہوگئے تھے، پھر وہ لندن چلے گئے تھے،) میرے سلام کا جواب دینے کے بعد قدرے ٹیڑھی گردن کے ساتھ میری اُس فائل کے بارے میں مجھ سے پوچھا: "مولوی صاحب! یہ آپ کیا لئے ہوئے ہیں؟" میں نے عرض کیا: "یہ میرے استاذ کی تقریر ہے جو میں درس کے دوران لکھا کرتا ہوں۔" انہوں نے چھوٹتے ہی ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا: "اس میں علم غیب کے بارے میں گفتگو ہے؟" اس میں یہ واضح طنز پنہاں تھا کہ آپ لوگ تو مدرسوں میں اسی قسم کے فرقہ وارانہ مسائل میں الجھے رہتے ہیں، دین کے اصل کام سے (جو درحقیقت ہم کررہے ہیں) آپ کا کیا واسطہ؟

میں نے اُن کے انداز گفتگو کے پیش نظر ان سے زیادہ بات کرنا مناسب نہ سمجھا، اور ایک مختصر سا جواب دے کر آگے روانہ ہوگیا۔ لیکن اس قسم کے متعدد واقعات میرے سامنے تھے کہ مولانا مودودی صاحبؒ سے ہٹ کر انہیں ہر دینی کام فرقہ واریت، تنگ نظری اور کوتاہ بینی کا مظہر نظر آتا تھا۔

لسبیلہ ہاؤس کا وہ علاقہ ہمارے وہاں آباد ہونے کے وقت نیا نیا آباد ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہاں کچھ مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ اس وقت انہی غریبوں نے ایک چھپر نما مسجد تعمیر کرلی تھی، اور اس کا نام "مسجد نعمان" رکھا تھا۔ اس کے امام صاحب بھی انہوں نے ہی منتخب کئے تھے جن کی قراءت ایسی تھی کہ ان کے پیچھے نماز کی صحت کا فیصلہ بڑے تأمل کے بعد ہی کیا گیا، اور بعض بدعات اس کے علاوہ تھیں، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ انفراداً نماز پڑھنے کے بجائے ان کے پیچھے پڑھنے کو گوارا فرمالیتے تھے۔ بعد میں انگلش بوٹ ہاؤس کے بانی جناب تاج صاحب مرحوم نے مسجد کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے کر مسجد کو باقاعدہ تعمیر فرمایا، تو اُس وقت اُن امام صاحب کی مناسب خدمت کرکے ان کے بجائے مولانا عزیز الرحمٰن صاحب کو امامت پر مقرر کیا، جو آج تک ماشاء اللہ خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

لیکن مسجد کے آس پاس تیزی سے پڑھے لکھے لوگوں کے مکانات کا اضافہ ہوتا رہا۔ وہاں ایک دوکان کے مالک جناب مسعود صاحب مرحوم جماعت اسلامی کے بڑے فعال کارکن تھے، اور انہوں نے محلے کے نوجوانوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کا کام پھیلانے میں بڑی سرگرمی سے حصہ لیا تھا۔

جب مسجد نعمان میں اسلامی جمعیت طلبہ کے میرے ہم عمر نوجوان مجھے ملتے، تو میں ان سے کنارہ کرنے کے بجائے اُن سے خندہ پیشانی سے ملتا، اور ان کے اچھے کاموں میں تعاون بھی کرتا۔ رفتہ رفتہ ان کے دلوں

میں یہ احساس پیدا ہوا کہ یہ شخص ہم سے کوئی اجنبیت نہیں رکھتا، چنانچہ ان میں سے کچھ ساتھی مجھ سے بے تکلف بھی ہوگئے، اور کبھی کبھی مجھ سے نماز روزے وغیرہ کے بارے میں کوئی مسئلہ بھی پوچھ لیتے تھے، لیکن اس انداز سے کہ "ہم آپ سے پوچھ تو رہے ہیں، لیکن آپ قرآن وحدیث سے اس کی دلیل بھی بتائیں، کیونکہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو بس مولوی صاحب کی بات پر بھروسہ کرکے کوئی بات مان جائیں۔ ہمیں قرآن وسنت سے سمجھائیں"۔ یہ بات جمعیت کے ایک ایسے ساتھی نے کہی جن کا میرے پاس بکثرت آنا جانا ہوگیا تھا، اور بے تکلفی بھی ہوگئی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ: "میرے بھائی! اگر میں آپ کے اس مطالبے پر کوئی آیت یا حدیث پڑھ دوں، تو کیا آپ سمجھ جائیں گے کہ اس آیت یا حدیث کا کیا مطلب ہے؟ اور اُس سے وہ مسئلہ نکل رہا ہے یا نہیں؟" کہنے لگے: "نہیں، مگر آپ اس کا ترجمہ بھی تو بتائیں، اس سے ہماری سمجھ میں آجائے گا کہ دلیل صحیح ہے یا غلط؟" میں نے کہا کہ: "یہ آپ کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں نے ترجمہ صحیح کیا ہے یا نہیں؟" کہنے لگے کہ "یہ ہم جانتے ہیں کہ آپ ترجمہ غلط نہیں کریں گے" میں نے کہا کہ "ایک ہی عبارت کے بعض مرتبہ کئی ترجمے صحیح ہوسکتے ہیں، آپ کو کیا پتہ کہ میں نے کون سا ترجمہ کیا ہے؟ اور اگر بالفرض ترجمہ صحیح بھی ہو، تو آپ کے پاس یہ پتہ لگانے کا کیا راستہ ہے کہ اس آیت یا حدیث کے مخالف کوئی اور آیت یا حدیث ہے یا نہیں؟" اس پر وہ خاموش ہوگئے اور اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کے مطالبات دھیمے پڑ گئے، اور پھر رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں تبدیلی بھی آئی۔

ایک طرف مجھے ان کے اس ذہن کا اندازہ تھا، لیکن دوسری طرف اُس وقت ملک میں نفاذِ اسلام کے لئے کوئی اور مؤثر تحریک سامنے نہیں تھی، اس لئے ان کی جو کوشش امت کے اجتماعی مسائل کے لئے ہورہی تھی، اُس میں ان کی تائید وحمایت بھی مناسب معلوم ہوتی تھی، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کے بارے میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جملہ بکثرت ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ:

"إن هم احسنوا فأحسن معهم، وإن أساؤوا، فاجتنب إساء تهم"

یعنی: "جب وہ کوئی اچھا کام کریں، تو تم بھی ان کے ساتھ اچھا کام کرو، اور جب وہ کوئی برائی کریں تو ان کی برائی سے اجتناب کرو"۔

اس لئے میں نے اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکنوں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے، اور کبھی کبھی ان کے اجتماعات میں ان کی فرمائش پر خطاب بھی کیا۔ اُسی زمانے میں جناب منور حسن صاحب، جو بعد میں جماعت

اسلامی کے امیر بھی رہے، اسلامی جمعیت طلبہ کے کارکن تھے، ان اجتماعات میں ان کا بھی کئی مرتبہ ساتھ رہا۔ جمعیت کے کارکنوں میں مجھے بہت سی خوبیاں بھی نظر آئیں، ان میں سے بہت سے نوجوان مجھے اپنے جذبے اور جدوجہد میں قابل رشک بھی محسوس ہوئے، اور میں ان کی تنظیمی صلاحیتوں کا بھی معترف رہا، البتہ ان کی جس فکر کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، موقع بہ موقع اس کے بارے میں اپنی گذارشات بھی پیش کرتا رہا جن کا الحمدللہ اثر بھی ظاہر ہوا۔ پھر میری اپنی مصروفیات خود اتنی بڑھ گئیں کہ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ ختم ہوگیا۔

نحو وصرف کی تدریس

تدریس کے ابتدائی سالوں میں عربی نحو وصرف کی تمام کتابیں نحو میر سے لے کر شرح جامی تک پڑھانے کی نوبت آئی، لیکن مجھے نحو وصرف کو فلسفہ بنا کر پڑھانے سے کبھی مناسبت نہیں ہوئی۔ اس لئے کافیہ اور شرح جامی میں تحریر سنبٹ، سوال کابلی، اور سوال باسولی وغیرہ کی بنیاد پر جو چون وچرا کی جاتی ہے، (بلکہ اب تو یہ چون وچرا ہدایۃ النحو ہی سے شروع ہونے لگی ہے) میں اُس سے گذرا ضرور، لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن نشین رہی، اور طلبہ کو بھی سمجھائی کہ نحو وصرف کا اصل مدار کلام عرب کے سماع پر ہے، اور اُسے عقلی اور منطقی دلائل کے تابع قرار دینا ایسا نکتہ بعد الوقوع ہے جس میں الجھ کر نحو وصرف کا جو اصل مقصد ہے، (یعنی تحریر وتقریر کی درستی) وہ فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ عام طور پر اس کی تاویل یوں کرلی جاتی ہے کہ اس سے طلبہ کا ذہن کھلتا ہے، اور انہیں نکتہ رسی کی عادت پڑتی ہے، جسے مدارس کی اصطلاح میں "تشحیذ الاذہان" (ذہن تیز کرنا) کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ بات اُس وقت تو فی الجملہ درست ہوتی، جب نحو وصرف کے قواعد کو استعمال کرنے کی صلاحیت طلبہ میں پوری طرح پیدا ہوگئی ہوتی، اور طلبہ صحیح پڑھنے، صحیح لکھنے، اور صحیح بولنے پر پوری طرح قادر ہوچکے ہوتے، پھر ایک اضافی فائدے کے طور پر یہ مقصد بھی حاصل کرلیا جاتا، چنانچہ شاید ابتدا میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ طلبہ کو ابھی عربی عبارت صحیح پڑھنے پر بھی قدرت نہیں ہوئی ہوتی، چہ جائیکہ وہ صحیح بول اور لکھ سکیں، اور شروع ہی میں انہیں ان بحثوں میں الجھا دیا جاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ نحو وصرف کا اصل فائدہ حاصل نہیں کرپاتے۔

لیکن مدارس میں " کافیہ "وغیرہ پڑھانے کا جو طریقہ عرصے سے جاری تھا، طلبہ بھی اُس کے عادی تھے، اور کسی استاذ کے لئے اُس طریقے سے انحراف اپنے آپ کو طلبہ میں غیر مقبول بنانے کے لئے کافی تھا۔ اگر استاذ خود سے وہ بحثیں نہ چھیڑے، تو کوئی نہ کوئی طالب علم اُن سے متعلق کوئی سوال کردیتا تھا۔ اس کا

حل میں نے اس طرح کیا کہ "کافیہ" پڑھاتے ہوئے میں نے شروع کے چند دن اُسی معمول کے طریقے کو اختیار کیا۔لیکن پھر طلبہ کو بتایا کہ اس کے کیا نقصانات ہیں؟ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتی کتابوں میں علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب "الاقتراح فی اصول النحو" مجھے ہاتھ لگ گئی تھی۔ میں نے اُس کی مدد سے نحو کی اصل بنیادیں طلبہ کے سامنے بیان کیں، اور اُس کے بعد جب کوئی طالب علم چون وچرا پر اصرار کرتا، میں اُس سے عبارت پڑھوالیتا جس میں وہ لازماً غلطی کرتا، اور اس طرح اُس پر یہ واضح ہوجاتا کہ وہ اس چون وچرا کے چکر میں نحو کی غرض وغایت (یعنی الاحتراز عن الخطأ اللفظی فی الکلام) سے کتنی دور چلا گیا ہے۔اور اُس کے بعد میں نے اپنے طریقے سے ساری کتاب پڑھائی۔

جاری ہے.....

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اکیسویں قسط)

ادب عربی کی تدریس

مجھے بچپن سے شعر و ادب کے ساتھ خصوصی دلچسپی اور مناسبت تھی۔ اس لئے میں جس جماعت کو صرف ونحو اور فقہ وغیرہ پڑھا رہا ہوتا، ادب میں مجھے اُس سے اگلی جماعت کا کوئی سبق ضرور دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب مجھے مقامات حریری پڑھانے کے لئے دی گئی، تو اگرچہ مجھے اُس کے مسجع اور پر تکلف قافیہ بند اسلوب سے مناسبت نہیں تھی، اور مجھے سلیس عبارتیں زیادہ اچھی لگتی تھیں، لیکن میں نے مقامات پڑھانے میں بڑی محنت کی، کیونکہ اُس میں عربی الفاظ اور محاورات کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ میں اُس کے مطالعے کے دوران نہ صرف "سریشی" سے لیکر "افاضات" تک اُس کی تمام شروح کو دیکھتا، بلکہ لغات کی تحقیق کے لئے براہ راست لغت کی کتابوں کی طرف رجوع کرتا، اور اپنے پاس ان معلومات کی یادداشتیں محفوظ کرلیتا۔ البتہ طلبہ کے سامنے اتنی باتیں ہی بیان کرتا جنہیں وہ ہضم کرسکیں۔ خاص طور پر الفاظ کے مواقع استعمال بتانے کے لئے قرآن کریم کی آیات اور بعض مرتبہ عربی محاورات کا حوالہ دیدیتا تھا۔ اس کے بعد "دیوان متنبّی"، "سبعہ معلقہ" اور دیوان حماسہ بھی میں نے اسی ذوق وشوق سے پڑھائیں۔ متنبّی کی شرح "عکبری" "سبعہ معلقہ اور "حماسہ" کی شرح "زوزنی" مستقل میرے مطالعے میں رہیں، اور "حماسہ" کے ساتھ میں نے "مفضلیات" کو بھی مطالعے میں رکھنے کی کوشش کی، تاکہ اُس دور کے شعر کا مزاج پیش نظر رہ سکے۔

" مقامات" شروع کرنے سے پہلے میں نے جب علم ادب کے تعارف سے متعلق مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا، تو کسی کا یہ مقولہ سامنے آیا کہ عربی ادب کے چار ستون ہیں: "البیان والتبیین للجاحظ"، "الکامل للمبرد"، "ادب الکاتب لابن قتیبة" اور "الأمالی لأبی علی القالی"۔ ان میں سے تیسری اور چوتھی کتابیں تو دارالعلوم کے کتب خانے میں اُس وقت موجود نہیں تھیں، لیکن پہلی دو کتابیں موجود

تھیں، اور میں فرصت کے اوقات میں اُن کا تفریحی مطالعہ بھی کیا کرتا تھا۔اس کے علاوہ مجھے کتب خانے میں "العقدالفریدلابن عبدربه " مل گئی تھی جو مجھے ان دونوں سے زیادہ اچھی لگی کہ اُس میں عربی نثرونظم اور خطبات کا بہترین انتخاب تھا۔ پھر میں اُس کو بکثرت مطالعے میں رکھتا تھا۔اصول لغت پر علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "المزھر "بھی مجھے بہت پسند آئی، اور اُس سے بھی میں نے بہت استفادہ کیا۔ابن رشیق کی "العمدة "اور عسکری کی "کتاب الصناعتین"میں کسی کباڑیے سے خرید لایا تھا، ان کا مطالعہ بھی بڑا لطف دیتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے جدید عربی ادب کی کتابیں پڑھنے کا بھی شوق تھا، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ،شکیب ارسلان، عباس محمود العقاد، منفلوطی، شیخ مصطفیٰ السباعی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کی تحریریں بھی شوق سے پڑھا کرتا تھا۔

علم ادب کا مقدمہ

عام طور سے جب کوئی کتاب پڑھائی جاتی ہے، تو اس کے شروع میں استاذ مقدمۃ العلم کے طور پر اس علم کی تعریف، موضوع اور غرض وغایت، نیز اُس کی مختصر تاریخ بیان کیا کرتا ہے۔دوسرے تمام علوم کے مقدمات عموماً اس علم کی کتابوں کے شروع میں مذکور ہوتے ہیں، لیکن علم ادب کے بارے میں مجھے اس قسم کا کوئی منضبط اور جامع مقدمہ نہ مل سکا۔"مقامات" کی شروح میں اس موضوع پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اُس سے میری تشفی نہیں ہوئی۔اس لئے مجھے خیال آیا کہ میں علم ادب کا ایک مقدمہ خود لکھوں۔اور میں نے اوپر جن کتابوں کا ذکر کیا ہے، اُن کے حاصل مطالعہ کو اُس مقدمے میں اس طرح درج کروں جس سے ادب کی مختلف اصناف کا تعارف اور ان کی مختصر تاریخ واضح ہوجائے۔چنانچہ میں نے بڑے ذوق وشوق سے عربی میں یہ مقدمہ تحریر کیا جس میں ادب کی تعریف، وجہ تسمیہ، موضوع اور غرض وغایت کے علاوہ اُس کو نثر اور نظم دو حصوں میں تقسیم کرکے نثر کی مختلف اصناف ذکر کیں، جن میں مکالمہ، خطبات، مکتوب نگاری، مقالہ نویسی، اور توقیعات وغیرہ شامل تھیں، اور ان میں سے ہر صنف کے بارے میں یہ بتایا کہ ان کے اسلوب میں مختلف زمانوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، اور ان تبدیلیوں کو مثالوں سے واضح کیا۔اسی طرح نظم کے حصے میں یہ بتایا کہ شعرگوئی کی شروعات کس طرح ہوئیں؟ پھر شعر کی مختلف اصناف کا تعارف کرایا جن میں قصیدہ، غزل اور رجز کے علاوہ اندلس کی"موشحات "اور "اجزال " کا تعارف بھی شامل تھا۔پھر عرب شعراء کے مختلف

ادوار جاہلیین، مخضرمین، اسلامیین اور مولدین کا تعارف اور ان کی خصوصیات بیان کیں، اور ہر صنف کا انتخاب بھی شامل کیا، اور اس طرح یہ ایک مفصل کتاب بن گئی جسے میں نے بڑے پیار سے ایک فائل میں رکھا ہوا تھا، اور اپنی تدریس کے زمانے میں اُس میں حذف واضافہ بھی کرتا رہتا تھا۔

اسی دوران مجھے اطلاع ملی کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے ہیں۔ مجھے خواہش ہوئی کہ میں اپنی یہ کاوش حضرتؒ کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کروں، اور کم از کم اُس پر حضرتؒ کی نظر ہی پڑ جائے تو یہ میرے لئے باعث سعادت ہوگا۔ چنانچہ میں وہ فائل لیکر حضرتؒ کی خدمت میں پہنچا۔ حضرتؒ نے بڑی شفقت سے اُسے ملاحظہ فرمایا، اور جہاں تک یاد ہے، اُس پر میری ہمت افزائی بھی فرمائی۔ چونکہ مجھے معلوم تھا کہ حضرتؒ بہت مصروف رہتے ہیں، اس لئے میں نے اُن سے کوئی تقریظ وغیرہ لکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ حضرتؒ کا اُس پر نظر ڈال لینا ہی میرے لئے باعث برکت تھا۔ لیکن اُس کے بعد جو المیہ پیش آیا، اُس کا صدمہ اب بھی جب یاد آجاتا ہے، تو بدن میں جھرجھری سی آجاتی ہے۔ ہوا یہ کہ واپسی میں جس ٹیکسی میں میں سوار ہوا، اُس میں مجھے اپنی ایک عزیزہ کو بھی اپنے گھر لانا تھا، جن کے ساتھ سامان بھی اچھا خاصا تھا۔ جب ہم گھر پہنچے، تو ان کا سامان اتارنے کی فکر میں مجھے یہ خیال نہ رہا کہ میری وہ فائل بھی ٹیکسی کی نشست کے پیچھے رکھی ہے۔ چنانچہ اور سارا سامان تو اُتر گیا، لیکن میری وہ فائل جس میں میرا مسودہ تھا، ٹیکسی میں رہ گئی، اور ٹیکسی روانہ ہوگئی۔ جب ٹیکسی میری پہنچ سے باہر ہوگئی، تو مجھے یاد آیا، اور میرے پاس کفِ افسوس ملنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ پھر میں نے ٹیکسی کو تلاش کرنے کے جتنے جتن اُس وقت ہوسکتے تھے، وہ کئے، شاید اخبار میں اشتہار بھی دیا، لیکن ٹیکسی کا پتہ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ ما شاء اللہ کان وما لم یشا لم یکن۔ کمپیوٹر اور فوٹو اسٹیٹ کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا کہ مسودے کی کاپی بنا کر اُسے الگ محفوظ رکھ سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خاصے طویل عرصے کی یہ محنت ضائع ہوکر رہ گئی۔

بہر حال! مشیت خداوندی کو یہی منظور تھا کہ میری وہ تالیف منظر عام پر نہ آئے اور یقیناً اسی میں کوئی مصلحت تھی۔

عربی تقریریں

عربی میں طالب علمانہ تقریر کرنے کی مشق مجھے اپنے شامی اساتذہ، خاص طور پر استاذ احمد الاحمد کے طفیل پہلے ہی سے تھی، لہٰذا جب کوئی مہمان دارالعلوم میں آتا، تو مجھے عربی میں ان کے خیر مقدم کے لئے کہا جاتا۔

اسی دوران جمادی الاولیٰ ۱۳۸۲ھ (مطابق اکتوبر ۱۹۶۲ء) میں شام کے مشہور عالم حضرت شیخ عبدالفتاح بو غدہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے پاکستان کے پہلے دورے پر تشریف لائے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شام کے دورے کے موقع پر اُن سے مل چکے تھے، اور وہاں سے انہوں نے ہمیں جو خط لکھا تھا، اُس میں انہوں نے شیخ کا بڑے تعریفی انداز میں تذکرہ کیا تھا۔ اس موقع پر ان کی صحبت میں رہنے کی سعادت ملی، تو دل ان پر فریفتہ ہوگیا۔ جب وہ دارالعلوم تشریف لائے، تو حسب معمول اساتذہ کی طرف سے ترحیبی تقریر کے لئے مجھ سے کہا گیا۔ میں نے اس تقریر میں حضرتؒ کے خیر مقدم کے علاوہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا پس منظر اور اکابر علمائے ہند کی خدمات کا بھی قدرے جذباتی انداز میں تذکرہ کیا، تو حضرتؒ نے دارالعلوم کی معائنے کی کتاب میں میری ہمت افزائی کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

"لقد كان من فصاحة الأخ الحبيب في الله الشيخ محمد تقي العثماني ما كشف عن تقصير العرب في لغتهم ".(روداد دارالعلوم کراچی، ۱۳۸۰ھ تا ۱۳۸۲ھ، صفحہ ۲۶)

"میرے بھائی شیخ محمد تقی عثمانی، جن سے مجھے اللہ تعالیٰ کی خاطر محبت ہے، اُن کی فصاحت ایسی تھی کہ اُس نے خود عرب لوگوں کی اپنی زبان میں کوتاہی کو واضح کر دیا"۔

یہ تبصرہ تو یقیناً حضرتؒ کی طرف سے اپنے ایک چھوٹے سے شاگرد کی ہمت افزائی تھی جس میں انہوں نے مبالغے کو بھی برا نہیں سمجھا، لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مجھے ان کے اس سفر میں ان کی غیر معمولی شفقت میسر آئی، وہ جہاں تشریف لے جاتے، میں ان کے ساتھ رہنے کی کوشش کرتا، ان کی تقریروں کا اردو میں ترجمہ کرتا، اور ان کے علمی افادات سے خوب فائدہ اٹھاتا۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر انہوں نے مجھ سے فرمایا: "لو كنت تفاحةً لأكلتك "۔ یعنی: " اگر تم ایک سیب ہوتے تو میں تمہیں کھالیتا ".اس کے بعد انہوں نے مجھے تفاحۃ الہند وباکستان کا لقب دیدیا، اور اپنی ایک تالیف (" التصریح " کے حاشیے) میں میرے نام کے ساتھ یہ لقب بھی تحریر فرمایا۔ ان کے ساتھ تعلقات کا کچھ مفصل حال میں نے "نقوش رفتگاں" میں ان کے تذکرے کے تحت بیان کیا ہے۔ اور کچھ مزید ان شاء اللہ تعالیٰ آگے آئے گا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ۔

نحو وصرف اور ادب کے ساتھ الحمد للہ بلاغت، فقہ، اصول فقہ، فرائض، منطق، فلسفہ، کلام اور تمام علوم

مروجہ کی کتابیں پڑھانے کا موقع ملا، اور اس طرح درس نظامی کی تمام کتابیں مختلف سالوں میں پڑھائیں، صرف تین کتابیں ایسی تھیں جو پڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔ایک "مختصر المعانی"، دوسرے "سلم العلوم" اور تیسرے "میبذی"۔البتہ بلاغت میں "دروس البلاغۃ" اور "البلاغۃ الواضحۃ" پڑھاتا رہا، اور منطق میں شرح تہذیب اور قطبی تک پہنچ سکا۔شرح عقائد باقاعدہ درس کی شکل میں تو پڑھانے کی نوبت نہیں آئی، لیکن مولانا افتخار احمد صاحب کا (جو ماشاء اللہ اس وقت دار العلوم میں صحیح مسلم پڑھاتے ہیں) وہ سبق کسی وجہ سے رہ گیا تھا، اس لئے ان کو خارج میں اس کا کچھ حصہ پڑھایا۔

مشرقی پاکستان کا سفر ۲۷ جنوری ۱۹۶۱ء

۱۹۶۱ء کے شروع ہی میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کے ساتھ پہلی بار مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کے سفر کی نوبت آئی۔سلہٹ کے ایک متدین رئیس جناب مجد الدین صاحب (رحمہ اللہ تعالیٰ) حضرت والد صاحبؒ کو کافی عرصے سے لکھ رہے تھے کہ سلہٹ عرصے تک اکابر علماء دیوبند کی توجہات کا مرکز رہا ہے، اور یہاں حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی (رحمۃ اللہ علیہ) طویل طویل قیام فرماتے رہے ہیں، نیز حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے دوسرے شاگرد حضرت مولانا سہول عثمانی صاحبؒ بھی یہاں عرصے تک مقیم رہے ،اور سلہٹ کے لوگوں میں اس طرح بزرگوں سے استفادے کا خاص ذوق ہے۔لہٰذا ہماری خواہش ہے کہ آپ سلہٹ تشریف لائیں، مقصود رسمی جلسے نہیں ہیں، بلکہ آپ چند ہفتے یہاں مقیم رہیں، اور سہولت کے مطابق لوگ آپ کی مجالس سے استفادہ کرتے رہیں۔حضرت والد صاحبؒ نے آخر کار جنوری ۱۹۶۱ء میں دو ہفتے کے لئے سفر کا ارادہ فرمالیا، اور میرے لئے انتہائی خوشی کی بات یہ تھی کہ اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔یہ شعبان (۱۳۸۰ھ) کا مہینہ تھا، اور ہمارا تعلیمی سال ختم ہو رہا تھا، اس لئے دار العلوم سے غیر حاضر رہنے میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔بنگال کے حالات بہت سُن رکھے تھے، اور اُسے دیکھنے کا شوق بھی تھا، اس موقع پر اچانک اس سفر میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ جانے کی اتنی خوشی تھی جو ابتک یاد ہے۔ چنانچہ ۲۷ جون کی صبح اس یادگار سفر کے لئے روانگی ہوئی۔حضرت والد صاحبؒ کے ایک شاگرد مولانا جمیل احمد صاحب اکیابیؒ جو اُس وقت دار الافتاء میں ناقل فتاویٰ بھی تھے، اور حضرت والد صاحبؒ کے خطوط اور بیانات وغیرہ بھی نقل کیا کرتے تھے، وہ بھی سفر میں ساتھ تھے۔یہ جدہ سے مدینہ منورہ کے ۱۹۵۱ء والے چھوٹے سے سفر کے بعد (جو میرے بالکل بچپن میں ہوا تھا) میرا ہوائی جہاز کا پہلا طویل سفر تھا۔میری عمر کا اٹھارواں

سال چل رہا تھا، اس لئے حضرت والد صاحبؒ کی معیت اور بنگال کی سیاحت کی اصل مسرت کے علاوہ جہاز میں سفر کرنے کی بھی اپنی خوشی تھی۔ اُس وقت تک جیٹ طیارے اتنے عام نہیں ہوئے تھے، اور جس جہاز میں ہم سوار ہوئے، وہ پنکھوں والا سپر کانسٹی لیشن طیارہ تھا جو دس گیارہ ہزار فیٹ سے زیادہ بلند نہیں ہوتا تھا، اس لئے اُس کی کھڑکی سے زمین نظر آتی رہتی تھی۔ میں سارے راستے کھڑکی سے پہلے سندھ، پھر ہندوستان کا نظارہ کرتا رہا، الہ آباد میں دریاؤں کا سنگھم، پھر بھوپال، اور اُس کے بعد دور تک پھیلا ہوا کلکتہ دیکھنا ابتک یاد ہے۔ آخر تقریباً ساڑھے پانچ گھنٹے کے سفر کے بعد ڈھاکہ پہنچے تو ایک بڑا مجمع حضرت والد صاحبؒ کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ حضرت مولانا مفتی محی الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والد صاحبؒ کے خاص جاں نثار شاگرد تھے، انہی کا مدرسہ اشرف العلوم محلہ "بڑا کٹرہ" میں واقع تھا، وہیں قیام ہوا۔ مدرسے کے مہتمم حضرت پیر جی حضورؒ کے لقب سے مشہور تھے، اور اپنے تقدس میں بنگال کے بزرگ ترین عالم اور اہل اللہ میں ان کا شمار ہوتا تھا، ان کی زیارت ہوئی۔ اگلا دن ڈھاکہ ہی میں گذرا، اور لال باغ کے مدرسے میں جانا ہوا، جہاں حضرت مولانا شمس الحق صاحب فرید پوریؒ اور حضرت مولانا احمد اللہ صاحبؒ (جو حافظ جی حضورؒ کے لقب سے مشہور تھے) ان کی زیارت ہوئی۔ سلہٹ سے جناب مجد الدین صاحب کے سمدھی، جو بذات خود وہاں کے بڑے نواب تھے، حضرت والد صاحبؒ کو سلہٹ لے جانے کے لئے ڈھاکہ پہنچے ہوئے تھے، اور مدرسہ عالیہ سلہٹ کے ناظم کتب خانہ مولانا تفضل علی صاحبؒ بھی ان کے ساتھ آئے تھے جن سے بعد میں میرے بڑے بے تکلف تعلقات ہو گئے تھے۔ رات کو عشاء کے بعد ٹرین کے ذریعے سلہٹ روانہ ہوئے، اور رات ٹرین کے فرسٹ کلاس کے ایک مخصوص کمپارٹمنٹ میں گذاری۔ صبح سویرے آنکھ کھلی۔ تو ٹرین کلاوڑہ اسٹیشن پر کھڑی تھی، وہاں سے چند گھنٹے کا سفر بڑے سرسبز و شاداب اور خوبصورت مناظر سے گذرتے ہوئے طے ہوا۔ مولانا تفضل علی صاحبؒ کی ایک بات مجھے ابتک یاد ہے۔ نواب صاحب کے ساتھ ان کا ایک خادم دوسرے ڈبے میں سفر کر رہا تھا۔ جب صبح کے وقت بستر تہہ کرنے کا وقت آیا، تو نواب صاحب اس انتظار میں تھے کہ اگلے اسٹیشن پر وہ خادم آ کر بستر تہہ کر دے گا، مولانا تفضل صاحبؒ نے بستر پھیلے دیکھے، تو وہ خود تہہ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ نواب صاحب نے کہا کہ "آپ رہنے دیں، ابھی آدمی آئیگا تو وہ بستر سمیٹ لے گا"۔ مولانا تفضل صاحبؒ نے جواب دیا: "ہم بھی تو آدمی ہیں" اور پھر خود ہی سارے بستر سمیٹ کر رکھ دیئے۔ ان کے اس جملے سے سبق ملا کہ جب انسان اپنا کوئی ضروری کام خود کر سکتا ہو، تو خادم کے

انتظار میں اُسے کیوں ٹلائے؟

سلہٹ اسٹیشن پر استقبال کرنے والوں کا اتنا بڑا ہجوم تھا کہ چلنا مشکل ہوگیا۔ جناب مجد الدین صاحب مرحوم کے بارے میں یہ سُن رکھا تھا کہ وہ یہاں کے بہت بڑے رئیس ہیں، لیکن جب انہیں دیکھا، تو انکے حلیے اور لباس وپوشاک سے ایک انتہائی متواضع اور متدین بزرگ کا تصور آتا تھا، اور مجھے ان کے سراپا میں ہندوستان کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر مرحوم کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ وہ علیگڈھ سے ایم اے کئے ہوئے تھے، اور اُس وقت کے صدر مملکت جنرل محمد ایوب خان صاحب مرحوم کے دوست تھے، اور ایوب خان صاحب مرحوم جب کبھی سلہٹ آتے، انہی کے یہاں ٹھہرتے تھے۔ وہ اپنے گھر لے گئے جو اُس وقت "پھولباڑی ہاؤس" کے نام سے موسوم تھا۔ گھر کے ڈرائنگ روم میں ایک شیر کی کھال لٹکی ہوئی تھی جو کسی وقت خود اُنہوں نے شکار کیا تھا۔ اسی خوبصورت گھر کے ایک بیرونی کمرے میں حضرت والد صاحبؒ کا قیام ہوا۔ یہ گھر سلہٹ کے درگاہ محلے میں واقع تھا، جو حضرت شاہ جلال مجرد یمنی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار اور درگاہ مسجد کے قریب واقع تھا۔ حضرت شاہ جلال مجرد یمنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت یہ ہے کہ وہ یمن سے تشریف لائے تھے، اور یہاں ان کی بزرگی اور تقدس کا تقریباً وہی مقام تھا جو ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین صاحب چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سمجھا جاتا ہے۔

مجد الدین صاحب مرحوم کا مکان نہایت پُر فضا جگہ پر واقع تھا۔ مجد الدین صاحب مرحوم نے جس قدردانی، مزاج شناسی اور شائستگی کے ساتھ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی میزبانی کی، اُس کا گہرا نقش ابتک دل پر قائم ہے۔ ان کے صاحب زادے جناب محی السنہ صاحب مرحوم اُس وقت نوجوان تھے، اور سفر وغیرہ کے تمام تر انتظامات وہی کیا کرتے تھے۔ اس قیام کے دوران میری نوعمری کے پیش نظر دو صاحبان میری تفریح طبع کا خاص خیال رکھتے تھے، ایک مولانا تفضل علی صاحب، اور دوسرے جناب نجابت علی صاحب جو وہاں کی "انجمن ترقی اردو" کے ذمہ دار تھے، اور اُنہیں اردو کے محاورات سیکھنے کا بڑا شوق تھا، وہ ہر صبح مجھے آس پاس کے علاقوں میں لے جایا کرتے تھے۔ سلہٹ چھوٹی چھوٹی سرسبز پہاڑیوں سے بھرا ہوا ہے، جو وہاں ٹیلے کہلاتے ہیں، فجر کے بعد ہم سیر کے لئے ان کے ساتھ کسی نہ کسی ٹیلے پر چلے جاتے، اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے۔ سلہٹ کسی وقت آسام کا حصہ تھا، اور یہاں سے افق پر آسام کے پہاڑ کھاسیا جنتا دھند میں لپٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ انہی پہاڑوں میں سے نکلتا ہوا دریائے سُرما سلہٹ تک آتا ہے، اور شہر اُس کے

دونوں طرف آباد ہے، اور ہم کبھی کبھی سیر کے لئے اُس کے پل پر چلے جاتے تھے۔

شب براءت بھی اُس سال سلہٹ کے قیام کے دوران آئی، اور یہ عجیب منظر میں نے دیکھا کہ صرف سلہٹ شہر سے نہیں، آس پاس کے دیہات اور دور کے شہروں سے بھی لوگوں کے قافلے بوریا بستر اٹھائے جوق در جوق حضرت شاہ جلال صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مقبرے کا رُخ کر رہے تھے۔ مسجد اور اُس کا دور تک پھیلا ہوا صحن تو کھچا کھچ بھر ہی گیا تھا، لوگوں نے آس پاس کی گلیوں اور سڑکوں پر بھی دور تک ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ درگاہ مسجد میں شب براءت منانے آئے ہوئے تھے، اور ان کی تعداد کسی طرح دو ڈھائی لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ شب براءت کے موقع پر ہر سال یہاں یہی حال ہوتا ہے۔

سلہٹ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تقریباً دو ہفتے قیام رہا۔ دن میں دو بار وہیں پر مجلس ہوتی جس میں علاقے کے علماء اور عوام شریک ہوتے، اور اس موقع پر وہاں کی ایک بڑی تعداد نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا، اور بعض حضرات بیعت بھی ہوئے۔ حضرت مولانا سہول عثمانی صاحب حضرت شیخ الہندؒ کے خاص شاگرد تھے، اور مدت تک سلہٹ میں مقیم رہے۔ (مجد الدین صاحب نے ان کی بڑی صحبت اٹھائی تھی جس کے اثرات ان پر نمایاں تھے۔) حضرت مولانا سہول صاحبؒ کے صاحب زادے مولانا محمود صاحبؒ روزانہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آتے، اور مجلسوں سے سیراب ہوتے، اور بالآخر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی ہوئے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ چونکہ اُس وقت ہمارے لسبیلہ ہاؤس کے مکان میں رہتے تھے، اور ہم دونوں بھائیوں کا قیام دارالعلوم کی مصروفیات کی وجہ سے شرافی میں تھا، اس لئے مجھے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اصلاحی مجلسوں سے استفادے کا موقع کم ملتا تھا۔ الحمد للہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے اُس کا موقع بھی عطا فرمایا۔

درگاہ محلے کی جامع مسجد کے امام حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جو انتہائی متواضع اور سادہ بزرگ تھے، ان کے حلیے اور چال ڈھال سے کوئی پتہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ کوئی عالم ہوں گے، ان کی ادا ادا میں بلا کی معصومیت تھی، اور وہ روزانہ تہجد کے وقت حضرت والد صاحبؒ کے لئے چائے بنا کر لاتے تھے۔ اسی قیام کے دوران حضرت والد صاحبؒ نے انہیں مسجد کے ساتھ ایک مدرسہ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا، چنانچہ انہوں نے قاسم العلوم کے نام سے مدرسہ قائم فرمایا جو اب بنگلہ دیش کے ممتاز مدارس میں شمار ہوتا ہے۔

جناب مجد الدین صاحب مرحوم کے سلہٹ اور اُس کے مضافات میں چار چائے کے باغ تھے۔ ان میں

سے دوباغوں میں ایک ایک رات کے قیام کے لئے وہ حضرت والد صاحبؒ کو لے گئے، چائے کے باغات اُسی وقت پہلی بار دیکھنے کا موقع ملا۔ باغ کیا تھے؟ میلوں میں پھیلی ہوئی پوری پوری ریاستیں تھیں۔ ہر باغ میں ان کی فیکٹری بھی تھی، اور نہایت آراستہ پیراستہ بنگلہ بھی تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں نے اُن سے زیادہ خوبصورت، منظم اور خوش منظر باغ پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے شاید اُن کے بعد بھی ایسے باغ کہیں اور نظر نہیں آئے۔ مجدالدین صاحب مرحوم نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی راحت کے خیال سے کسی عام جلسے میں شرکت کا کوئی نظم نہیں رکھا تھا، لیکن ہندوستان کی سرحد کے قریب ایک گاؤں میں ایک بڑا مدرسہ تھا جہاں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اجازت سے ان کے سالانہ جلسے میں شرکت منظور کر لی تھی۔ وہاں جانے کے لئے دریائے سُرما میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ مجدالدین صاحب مرحوم نے ایک آرام دہ اور خوبصورت کشتی کا اہتمام کیا تھا جس کے ذریعے تقریباً دو گھنٹے کا دریائی سفر کر کے وہاں پہنچے۔ جلسہ اتنا بڑا تھا کہ حدِ نظر تک سر ہی سر نظر آ رہے تھے، لیکن ان میں بڑی تعداد علماء اور دینی مدارس کے طلبہ کی تھی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہاں تقریباً ایک گھنٹے خطاب فرمایا، اور مجھے یاد ہے کہ خطبے کے بعد گفتگو کی تمہید میں یہ شعر پڑھا تھا:

امیر جمع ہیں احباب، دردِ دل کہہ لے
پھر اجتماعِ دلِ دوستاں رہے، نہ رہے

اور اس کے بعد اہلِ علم کے طبقے میں جو قابلِ اصلاح باتیں ہوا کرتی ہیں، ان کا بطورِ خاص ذکر فرمایا تھا۔

بہرکیف! سلہٹ کا یہ قیام بڑا مفید، دلچسپ اور یادگار تھا۔ رمضان شروع ہونے سے کچھ ہی پہلے ہم واپس گھر آ گئے۔

اس کے بعد ایک مرتبہ اور مجھے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں یہاں آنے کا موقع ملا، مگر اُس وقت قیام مختصر رہا۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(بائیسویں قسط)

اب تک حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قیام ہمارے لسبیلہ ہاؤس والے مکان میں تھا، ہمارے دو بڑے بھائی جناب محمد رضی صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) اور جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم بھی ان کے ساتھ مقیم تھے، اور ہم دارالعلوم شرافی میں رہتے تھے، اور صرف چھٹیوں کے موقع پر گھر آنے کا موقع ملتا تھا۔ دارالعلوم کی انتظامی ذمہ داریوں کا تقاضا یہ تھا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش بھی دارالعلوم میں ہو، لیکن شہر میں ان کی طرح طرح کی مصروفیات اجازت نہیں دیتی تھیں۔ آخر ہم لوگوں کے اصرار پر انہوں نے دارالعلوم منتقل ہونے کا ارادہ فرمالیا، اور حاجی کبیر الدین صاحب مرحوم کے بنائے ہوئے جن دو کمروں میں ہم رہتے تھے، ان کے متصل کھپریل کی چھت کے دو کمرے مزید بنالئے گئے، اور آخر کار ۴؍ اپریل ۱۹۶۳ء مطابق ۹؍ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ ہجری کو ہمارے والدین لسبیلہ ہاؤس کا مکان چھوڑ کر دارالعلوم منتقل ہوگئے۔[1] اس پر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، کیونکہ چھ سال اپنے والدین سے دور رہنے کے بعد مستقل طور پر ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں رہنے کا موقع مل رہا تھا۔ اس کے علاوہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہروقت استفادے کی نعمت بھی میسر آ گئی تھی۔

حج کا موسم قریب تھا، اس لئے یہاں منتقل ہونے کے کچھ ہی عرصے کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ، والدہ صاحبہ اور بڑے بھائی محمد رضی صاحب (رحمۃ اللہ علیہا) کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوگئے۔ والدین کے سفر کے دوران کچھ عرصے کے لئے پھر وہی تنہائی! لیکن میں اپنی دارالعلوم کی تدریس، افتاء

(۱) یہ تاریخ میری ۱۹۶۱ء کی ڈائری میں لکھی ہوئی ہے۔

اور تصنیف کی خدمات کے ساتھ انٹر میڈیٹ کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا، اس لئے اس میں مشغول ہوگیا۔

عمرے کا بحری سفر ۱۹۶۳ء

یوں تو ہر مسلمان کا دل حرمین شریفین کی زیارت کی خواہش سے آباد ہوتا ہے، لیکن خاص طور پر دورۂ حدیث کے سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وسنت کے واقعات پڑھنے کے بعد یہ خواہش ایک تڑپ بن گئی تھی۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بچپن ہی میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حج کی سعادت حاصل ہوئی تھی، لیکن میری عمر اُس وقت کل آٹھ سال تھی، لہٰذا اس سفر کے چند دھندلے سے نقوش کے سوا (جن کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں) نہ کچھ یاد تھا، اور نہ اس وقت اتنا شعور تھا کہ ان مقامات مقدسہ کی روحانی اور تاریخی اہمیت کو کسی درجے میں محسوس کرسکتا۔ چنانچہ ہر سال جب لوگ حج کو جاتے، تو رشک اور حسرت کے جذبات دل میں اٹڈتے، اور میں تصور ہی تصور میں انہیں مختلف مقامات مقدسہ سے فیض یاب ہوتے دیکھتا، اور دعا کرتا کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس دولت سے فیض یاب فرمادیں۔ اسی دوران (محرم ۱۳۸۲ھ مطابق جون ۱۹۶۲ء میں) میری بڑی بہن (محترمہ عتیقہ خاتون صاحبہ مدظلہا) جنہیں ہم آپا بی کہتے ہیں، حج کے سفر سے واپس آئیں تو میں نے یہ اشعار کہے:

مبارک تم کو آپا بی! بڑی دولت ملی تم کو
جو ہر نعمت سے بڑھ کر ہے وہی نعمت ملی تم کو

مبارک ہو دیارِ مصطفیٰ کو دیکھ کر آنا
خدا کی رحمتوں سے دامنِ امید بھر لانا

تمہارے یہ قدم بیتِ خدا کے گرد گھومے ہیں
انہوں نے وادیٔ بطحا کے سنگریزے بھی چومے ہیں

مجھے تو رشک آتا ہے تمہاری ان نگاہوں پر
جو سجدے کرکے آئی ہیں نبی کی سجدہ گاہوں پر

الٰہی اپنے آسی پر تو یہ احسان فرما دے
کہ اُس کو اک دفعہ پھر وادیٔ بطحا میں پہنچا دے

تمنا بھی تھی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید بھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے اس نالائق بندے پر یہ کرم ضرور فرمائیں گے، لیکن بظاہر حالات وسائل نہیں تھے۔ ۱۹۶۳ء میں حضرت والد صاحب میری والدۂ محترمہ اور جناب بھائی محمد رضی صاحب (رحمۃ اللہ علیہم) کے ساتھ حج کو تشریف لے گئے۔ اس کے بارے میں مجھے اپنی ڈائری [(۱)] کے ۱۴؍مئی ۱۹۶۳ء مطابق ۳؍محرم ۱۳۸۳ھ کے صفحے پر اپنی یہ تحریر ملی ہے:

"رات دو بجا رہی ہے، اور میں اس سکون آفریں سناٹے میں ان مسرت خیز واقعات کا تصور کر رہا ہوں جو آج کا دن اپنے دامن میں لیکر آیا تھا۔ آج صبح سب سے پہلے تو میرا (انٹر کا) دوسرا پرچہ انتہائی قابل اطمینان انداز میں پورا ہوگیا۔ شام سے رات دس بجے تک کا وقت بڑی مشکل سے کٹا، کیونکہ آج والدین دیارِ حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) سے واپس آنے والے تھے۔ طیارہ گیارہ بجے پہنچا، اور ایک بجے رات والدین گھر تشریف لا چکے تھے۔ دیارِ حبیب کے پرکیف حالات سن کر دل گھنٹوں ان دلفریب مناظر میں گم رہا جہاں سے امن وسکون کی زندگی بخش کرنیں انسانیت پر طلوع ہوئی تھیں۔"

اور اگلے دن کی ڈائری میں لکھا ہے:

"آج میں تمام دن تصور ہی تصور میں امن وسکون کی ان بہار آفریں وادیوں میں گھومتا رہا جہاں آج سے چودہ سو سال پہلے انسانیت کے رکھوالوں نے تہذیب کی قندیلیں بلند کی تھیں۔ میں آج اپنے آپ کو سرزمین حجاز کی زندگی افروز آغوش میں دیکھ رہا تھا، میرے تخیل کی نگاہیں ان نخلستانوں کو بوسے دے رہی تھیں جن کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں سسکتی ہوئی انسانیت نے عدل وانصاف کا آبِ حیات نوش کیا تھا۔ میں کبھی ان تلواروں کا دیدار کرتا تھا جن کے سائے میں اُس روشنی نے جنم لیا جو بعد میں مشرق

(۱) واضح رہے کہ میں اپنے لڑکپن میں واقعات کو محفوظ رکھنے کی خواہش سے زیادہ مضمون نگاری کی مشق کے طور پر ڈائری لکھا کرتا تھا اس لئے اگر اس میں ناپختہ مضمون نگاری نظر آئے تو تعجب نہ کیا جائے۔

ومغرب کو چمکا گئی، اور کبھی اُن روح پرور مجلسوں کا تصور کرتا تھا جن کے "دُودِ چراغ" نے کائنات پر ایک عظیم ترین نظام زندگی کے نقوش ثبت کیے۔ مجھ پر کیف وسرور کی ایک غیر معمولی کیفیت طاری ہو جاتی، مگر میں پھر عالم وجود کی طرف لوٹتا، تو تصورات کی وہ راگنی اُس نالۂ شبگیر میں تبدیل ہو جاتی جو وقت کے بے رحم طوفانوں نے ہر حسّاس مسلمان کے دل میں پیدا کردیا ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل! وقت دعا ہے
امّت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے"

اس طرح حرمین شریفین کی زیارت کی آرزو دل میں پل رہی تھی، اور تصورات کا عالم میری نوعمری کی اس جذباتی تحریر سے واضح ہے، لیکن اس آرزو کی جلد تکمیل کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ لیکن حج سے واپسی پر حضرت والد صاحبؒ نے ایک ایسی بات ارشاد فرمائی کہ امیدوں کے نئے چراغ روشن ہوگئے۔ انہوں نے فرمایا کہ پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کے مالک نے انہیں یہ پیشکش کی ہے کہ ان کے پانی کے جہاز جب حج کے بعد حاجیوں کو کراچی پہنچا کر واپس دوسرے حاجیوں کو لینے کراچی سے جدہ جاتے ہیں، تو وہ تقریباً خالی جاتے ہیں، اس موقع پر اگر کوئی عمرے کے لئے جانا چاہے، تو برائے نام کرائے پر اُسے لے جانے کے لئے تیار ہیں (جہاں تک یاد ہے، یہ کرایہ صرف نوے روپے تھا)

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس پیشکش کا ذکر گھر میں فرمایا، تو خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی، اور صرف ایک دن پہلے جو باتیں میں صرف تصورات کی حد تک ہی سوچ رہا تھا، شاید ان کے عمل میں آنے کا وقت آ رہا تھا۔ چنانچہ میں نے اور میرے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب نے فوراً اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کرلیا، لیکن میرے پاس اُس وقت پاسپورٹ نہیں تھا، اور اُس وقت انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوانا انتہائی مشکل کام تھا، اسٹیٹ بینک سے غیر ملکی سفر کی الگ اجازت لینی پڑتی تھی، غرض بہت سے مراحل درپیش تھے، پاسپورٹ کے لئے پولیس ہیڈکوارٹر سے منظوری حاصل کرنے کے لئے کئی کئی دن میں نے صبح سے شام

تک کے اوقات اُس کے برآمدے میں گذارے، اور میں صبح کو اس برآمدے میں جاکر پولیس والوں کی منتیں کرنے اوران کی بے نیازی بلکہ بعض اوقات ان کی ڈانٹ سہنے میں لگ جاتا۔ کئی دن اس طرح گذارنے کے بعد اللہ کرکے وہاں سے این او سی ملا، پھر پاسپورٹ آفس کے چکر لگائے، غرض ایک ہفتے میکلوڈ روڈ (موجودہ چندریگر روڈ) کے مختلف دفتروں کی خاک چھاننے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے تمام مراحل طے ہوگئے، اور مؤرخہ ۱۷ ارمحرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۰ ارجون ۱۹۶۳ء کو میں اپنے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم کے ساتھ سفینۂ حجاج میں سوار ہوگیا۔

یہ تقریباً دس منزلہ جہاز تھا، اور پورے ایک شہر کے برابر۔ چونکہ یہ حجاج کو واپس لانے کے لئے جدہ جارہا تھا، اس لئے اُس وقت مسافروں سے تقریباً خالی تھا، اور ہمیں فرسٹ کلاس کا ایک آرام دہ کیبن ملا تھا جس میں ہم دو بھائی اور ایک اور صاحب ہم سفر تھے۔ جہاز کے کپتان پہلے سے حضرت والد صاحبؒ کی نسبت سے ہم پر بہت مہربان تھے۔ جب ہم اپنے کیبن میں پہنچے، تو تھوڑی دیر بعد جہاز کے ایک اور افسر اچانک کیبن میں آئے، اور پوچھا کہ "محمد تقی عثمانی کون ہیں؟ "میں نے بتایا، تو وہ کہنے لگے کہ "میرا نام رشید ہے، میں جہاز کا چیف انجینئر ہوں، اور ضبط ولادت پر آپ کی کتاب پڑھ رہا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ آپ جہاز پر ہی ہیں، اس لئے ملنے آگیا ہوں۔" اس طرح جہاز کے دونوں بڑے ذمہ دار، یعنی کپتان اور چیف انجینئر، دونوں سے رسم وراہ ہوگئی، اور ان کی وجہ سے جہاز کا پورا عملہ سفر کے دوران ہمارا دوست بنا رہا۔ اور انہوں نے برج (Bridge) سے لیکر انجینئر نگ روم تک ہر چیز کا معائنہ کرایا، اور جہاز چلانے کے تمام اسرار ورموز بھی ہمیں بتائے، اور تھوڑی دیر کے لئے جہاز کا اسٹیرنگ بھی ہمارے ہاتھ میں دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ بحری جہاز سے حرمین شریفین کے سفر میں ہر لمحے بڑھتے ہوئے ذوق وشوق کی جو ناقابل بیان کیفیت ہوتی تھی، آج ہوائی جہاز کے سفر میں اُس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے اس سفر میں ہر روز ڈائری کی شکل میں مختصر یادداشتیں لکھی تھیں۔ افسوس ہے کہ اب جو میں نے وہ ڈائری نکالی، تو اُس کے بہت سے صفحات پر روشنائی اس طرح پھیل گئی ہے کہ اُسے پڑھنا مشکل ہے۔ لیکن بعض صفحات پڑھے جاتے ہیں۔ روانگی کے دن (۱۰ ارجون ۱۹۶۳ء) کی ڈائری میں یہ تحریر پڑھی گئی:

"سفینۂ حجاج میں بیٹھا اپنے مالک کی اُن بے پایاں قدرتوں کا تصور کرکے حیران

ہو رہا ہوں جنہوں نے ایک ہفتے میں ایک ذرّۂ خاک سے زیادہ ناچیز انسان کو اُس منزل کی طرف رواں کردیا جس تک رسائی کا اُسے چند روز قبل کوئی تصور تک نہیں تھا۔ ہمارا جہاز تلاطم خیز موجوں کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے، اور اُس سے ٹکراتی ہوئی موجوں کے شور سے ایک خواب آفریں نغمہ پیدا ہو رہا ہے۔ مشرق کے افق سے اٹھارویں رات کا چاند ابھی ابھی نکلا ہے، اور اُس نے اٹھتی ہوئی لہروں کو پگھلی ہوئی چاندی کی طرح تابناک بنادیا ہے۔"

اگلے دن کی یادداشت اس طرح درج ہے:

"رات کا وقت ہے، اور ہمارا جہاز موجوں کی آغوش میں جُھول رہا ہے۔ جہاز کے باہر سوائے تاریکی کے کچھ نظر نہیں آتا۔ تاریکی نے زمین اور آسمان کو باہم اس طرح مدغم کردیا ہے کہ سمندر اور آسمان میں امتیاز کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہے۔ (واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے سورۂ نور میں اتھاہ تاریکی کے وقت سمندر کی موجوں کا جس طرح ذکر فرمایا ہے، اُس کی گہرائی کا صحیح اندازہ سمندر کا اندھیرا دیکھے بغیر نہیں ہوسکتا۔) میں اپنے کمرے میں نیم دراز اُن ملے جلے تصورات سے باتیں کررہا ہوں جو آج دن بھر دل ودماغ پر چھائے رہے۔۔۔ اور اس تصور سے پورا وجود ایک شاداب گلزار بنا ہوا ہے کہ گذرتا ہوا ہر منٹ مجھے اُس عظیم اور محبوب سرزمین سے قریب کررہا ہے جسکے تصور نے نہ جانے کب سے کتنے نقشے بنائے ہوئے ہیں، اس کے ذرے ذرے سے عشق، اُس کے نظاروں کی آرزو، اور اس کے ایک ایک خم وپیچ پر نظروں ہی سے سجدے کرنے کی خواہش مسلمان کی گھٹی میں پڑی ہوتی ہے"

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، سفینۂ حجاج اتنا بڑا جہاز تھا کہ وہ پورا شہر لگتا تھا، دوسری طرف ہم یہ سفر جون کے مہینے میں کررہے تھے جب سمندر اپنے شباب پر تھا۔ اس لئے جب پہاڑوں جیسی موجیں اٹھتیں تو جہاز ان کے مقابلے میں ایک بے حقیقت تنکا معلوم ہوتا تھا۔ صبح کے وقت جس ہال (mess) میں ہم ناشتہ کرتے، اُس کے دونوں جانب سمندر نظر آتا تھا، اور یہ منظر ہم روزانہ دیکھتے کہ ہمارے دائیں جانب دور تک

سمندر اور اُس کے آخری سرے پر آسمان نظر آرہا ہوتا، پھر جہاز کسی موج پر گذرتے ہوئے دائیں طرف اٹھنا شروع ہوتا، جس کے نتیجے میں دور تک پھیلا ہوا سمندر سمٹنا شروع ہوتا، اور چند لمحوں میں پورا سمندر دائیں طرف سے غائب ہوکر بائیں طرف نظر آنے لگتا، اور دائیں طرف صرف آسمان کا درمیانی حصہ نظر آتا، اور پھر رفتہ رفتہ سمندر بائیں طرف سے غائب ہونے لگتا، اور دائیں طرف آسمان کے نیچے سمندر کی ایک لکیر ابھرتی، اور چند لمحوں میں پھر سمندر دوبارہ ظاہر ہوجاتا۔

سفر کے پانچویں دن ہمارا جہاز عدن کے ساحل پر پہنچا۔ عدن کی بندرگاہ ایسی نہ تھی کہ اُس پر اتنا بڑا جہاز لگایا جاسکے۔ اس لئے وہ ساحل سے کچھ فاصلے پر لنگر انداز ہوا۔ یہاں اُسے ایک دن ٹھہرنا تھا، اور ہمیں ساحل تک جانے کی اجازت مل گئی۔ چنانچہ ہم رسی کی سیڑھی کے ذریعے جہاز سے اتر کر کشتی میں سوار ہوئے جو ہمیں ساحل تک لے گئی۔ یہ ساحل "اسٹیمر پوائنٹ" کہلاتا تھا جس کے آس پاس تھوڑی سی آبادی بھی تھی، لیکن اصل شہر جو "کریٹر" کہلاتا تھا، وہاں سے کافی دور تھا۔ اس لئے ہم وہاں سے ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے، اور ایک درمیانی محلے یا شہر (جس کا نام غالباً معلاۃ تھا) سے ہوتے ہوئے کریٹر پہنچے۔ راستے میں مسجد ابان کے نام سے ایک مسجد کی زیارت بھی ہوئی، اُس کے ساتھ ایک مزار بھی تھا، اور صاحب مزار ہی کے نام پر مسجد کا نام رکھا گیا تھا۔ ہم اُس وقت یہ سمجھے کہ شاید یہ کسی صحابی کا نام ہے، بعد میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک تحریر سے جو انہوں نے ۱۳۸۲ھ کے سفر عمرہ کے بارے میں لکھی تھی، (اور ان شاء اللہ ان کے سفرناموں کے مجموعے میں شائع ہورہی ہے) معلوم ہوا کہ یہ مزار حضرت حکم بن ابان بن عثمانؒ کا ہے جو دوسری صدی ہجری کے بزرگ تھے، اور حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے احادیث لی ہیں۔[1] وہاں کے امام صاحب شیخ مطہر الغربانی نے جو ایک صاحب تصنیف عالم تھے، حضرت والد صاحبؒ کو یہ بھی بتایا کہ یہ مسجد عہد رسالت میں قائم ہوئی تھی، اور جب حضرت علی کرم اللہ وجہہ یمن تشریف لائے، تو انہوں نے دو مرتبہ یہاں نماز پڑھی۔

(۱) اگرچہ بندہ کو سرسری تلاش سے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اساتذہ میں حکم بن ابان بن عثمان کا نام نہیں ملا، اور نہ حضرت عثمانؓ کے صاحبزادے ابانؒ کے کسی بیٹے کا نام حکم مل پایا، ہوسکتا ہے کہ یہ امیر المومنین حضرت عثمان کے بجائے عثمان نام کے کسی اور بزرگ کے پوتے ہوں۔

بہر حال! عدن کی سیر کے بعد ہمارا جہاز دوبارہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔ میری اگلے دن کی ڈائری میں لکھا ہے:

"جوں جوں جدّہ نزدیک آرہا ہے، دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی ہیں۔اس وقت ہم جدّہ سے صرف ۱۸۰ میل دور ہیں، اوران شاءاللہ تعالیٰ کل بارہ بجے اس منزل تک پہنچ جائیں گے جس کا تصور دماغ کو مہکتا ہوا گلزار بنا دیتا ہے۔آج جہاز نے اپنا رُخ بدل کر شمال مغرب کی طرف کرلیا ہے۔مغرب میں افریقہ کا براعظم ہے، اورمشرق میں یمن اور سعودی عرب کی دلکش پہاڑیاں نظرنواز ہوجاتی ہیں۔آج ہی ہم نے کنٹرول روم اورانجن کا تفصیلی نظارہ کیا۔"

اوراگلے دن (۱۷ر جون) کی ڈائری یوں لکھی ہے :

"آج ہمارا سفینۂ مراد اُس ساحل تک پہنچ گیا جو امن وسکون کی ایک حیات آفریں وادی کی طرف رہبری کرتا ہے۔آج ساڑھے بارہ بجے ہی سے داہنی جانب جزیرۂ عرب کی دھندلی پہاڑیاں نظرآنے لگی تھیں۔صبح سے ہرلحظہ دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہورہا تھا، یہاں تک کہ جدّہ کی عمارتیں افق پرنمودار ہوئیں، اورایک ایک منٹ کاٹنا مشکل ہوگیا،مگر قدرت کوصبر کا ایک اور امتحان منظور تھا۔بندرگاہ سے کچھ فاصلے پر جہاز تقریباً پون گھنٹے لنگرڈالے کھڑا رہا، اور بڑی مشکل سے آگے بڑھا۔جہاز ٹائم کے مطابق تقریباً دو بجے ہم جدہ کی بندرگاہ پراتر چکے تھے۔حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک متوسل جناب اشرف سروجی صاحب کے یہاں سامان رکھا۔۔۔اب دل یوں چاہتا تھا کہ جلد ازجلد مکہ مکرمہ پہنچیں، مگررات کا قیام ضروری سمجھ کردل کوکل پرٹال دیا۔"

دراصل مکہ مکرمہ جانے سے پہلے کچھ قانونی کارروائی ضروری تھی جوکل صبح ہی ہوسکتی تھی۔اشرف سروجی صاحب کواللہ تعالیٰ بہترین جزاءعطا فرمائیں، وہ حضرت والدصاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں سے تھے، اورانہوں نے اپنا گھرحج اورعمرے پرآنے والوں کے لئے کھولا ہوا تھا، وہ بندرگاہ پربھی ہمیں لینے پہنچ گئے

تھے، اور انہی کے گھر پر قیام رہا۔ نماز کے لئے قریب کی مسجد میں گئے، تو سجدہ کرتے ہوئے اس احساس سے دل خوشی اور تشکر سے لبریز تھا کہ جس کعبے کا رُخ کر کے ہم اب تک سجدے کرتے رہے ہیں، اب وہ یہاں سے صرف ۵۴ کیلومیٹر دور رہ گیا ہے۔

نماز سے واپس جاتے ہوئے ایک مسقّف بازار سے گذر ہوا، تو وہاں لوگ تھڑے لگا کر ایک تھالی میں رکھے ہوئے زیتون بیچ رہے تھے جن کا تیل بھی تھالی میں پھیلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی زیتون نہیں دیکھا تھا، اور اُس کا ذائقہ بھی اس سے پہلے کبھی چکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اُس وقت مجھے اُس کی شکل وصورت کچھ ایسی لگی جیسے چھوٹی چھوٹی گلاب جامنیں رس میں بھیگی ہوئی رکھی ہوں۔ میں نے بڑے شوق سے اسی تصور کے تحت اُسے منہ میں رکھا کہ وہ کوئی میٹھا پھل ہوگا، لیکن منہ میں رکھنے کے بعد توقع کے بالکل برخلاف جب اُس کا کسیلا ذائقہ زبان اور تالو کو لگا، تو اُسے چبا کر نگلنا مشکل ہوگیا، اور میں بڑا حیران ہوا کہ وہ زیتون جس کی اتنی تعریفیں سُنی ہوئی ہیں، کیا ایسا ہوتا ہے؟ لیکن بعد میں ہوا یہ کہ حجاز میں اُسی قیام کے دوران جب لوگوں کی دیکھا دیکھی، تھوڑا تھوڑا کھانے کی عادت پڑی، تو رفتہ رفتہ اسی کسیلے پن میں مزہ آنے لگا، اور اب وہ میری پسندیدہ غذاؤں میں شامل ہوگیا ہے۔ سبق یہ ملا کہ شریعت کے بعض احکام پر جب انسان عمل کرنا شروع کرتا ہے، تو وہ بھی شروع شروع میں کڑوے کسیلے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اگر انسان ہمت اور استقامت سے کام لیکر رفتہ رفتہ اپنے آپ کو ان کا عادی بنالے، تو پھر وہ اتنے محبوب ہوجاتے ہیں کہ ان کے بغیر چین نہیں آتا۔

بہر کیف! اُس رات کے بارے میں یہ یاد ہے کہ مرطوب گرمی اتنی شدید تھی کہ پنکھے کے سامنے بیٹھنے کے باوجود پسینہ کسی طرح خشک نہیں ہورہا تھا۔ اشرف سروجی صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کے باوجود دل یوں چاہ رہا تھا کہ یہ رات لمحوں میں گذر جائے، اور ہم کسی طرح مکہ مکرمہ پہنچ جائیں۔ اللہ اللہ کر کے رات گذری، اور صبح تقریباً آٹھ بجے ہم ٹیکسی اسٹینڈ پہنچے جہاں ٹیکسیاں سواریوں کے حساب سے چلتی تھیں، ایک ٹیکسی میں سوار ہوئے، اور وہ جدہ شہر سے نکل کر مکہ مکرمہ جانے والی سڑک پر آ گئی، اُس وقت تک موجودہ ہائی وے نہیں بنا تھا، اور سڑک چھوٹی، مگر ہموار تھی۔ تھوڑی ہی دیر

میں دائیں بائیں پہاڑیاں نظر آنے لگیں، اور بھیگی ہوئی نگاہیں ان پہاڑیوں اور پگڈنڈیوں کو دیکھ سکتی تھیں جنہوں نے کبھی سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے فدا کار صحابہؓ کے قدم چومے ہوں گے۔ ہم خاموشی کے ساتھ ان سنگلاخ صحراؤں کو دیکھ کر ماضی کے تصورات میں گم تھے کہ اتنے میں "شمیسی" آ گیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے بتایا تھا کہ یہ "حدیبیہ" کا نیا نام ہے۔ اب جدہ سے مکہ مکرمہ جانے کے لئے جو ہائی وے استعمال ہوتی ہے، وہ اس مقام سے کچھ دور ہٹ کر گذرتی ہے، لیکن اس وقت کی سڑک خاص "حدیبیہ" کے مقام سے گذرتی تھی، لہٰذا اس مقام پر پہنچ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر حدیبیہ کے واقعات ایک ایک کر کے تصور کی نگاہ میں قطار بنائے ہوئے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمرے کے لئے تشریف لانا، آپ کی اونٹنی کا یہاں پہنچ کر آگے بڑھنے سے انکار کر دینا، حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قریش کے لوگوں سے بات چیت کے لئے مکہ مکرمہ روانہ فرمانا، ان کی شہادت کی خبر مشہور ہو جانا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابۂ کرامؓ سے بیعت لینا کہ جنگ کی ضرورت پیش آئی تو سب فداکاری کا مظاہرہ کریں گے، پھر قریش کے وفود کی آمد، اور صلح کی بات چیت، نرم شرائط پر صلح نامے کی تیاری، حضرت ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد، اور صلح نامے کی شرائط کے مطابق ان کی واپسی، صحابۂ کرامؓ کا جوش و خروش، اور آخر کار قرآن کریم کا اس صلح کو "فتح مبین" قرار دینا۔ وہ مقدس سرزمین نگاہوں کے سامنے تھی جہاں یہ سارے واقعات پیش آئے تھے۔ یہیں سے کچھ فاصلے پر حدودِ حرم شروع ہو رہی تھیں، جن کی علامت کے طور پر سڑک کے دونوں طرف ستون نصب تھے۔ انہی ستونوں کے بالکل سائے میں ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی تھی جس کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ حدیبیہ کے قیام کے دوران حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نمازیں پڑھنے کے لئے یہاں تشریف لاتے تھے، تاکہ نمازیں حدودِ حرم میں ادا ہوں، اور سیرت کی روایات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیئسویں قسط)

حدیبیہ سے آگے بڑھے تو سامنے پہاڑوں کا ایک سلسلہ تھا، اور ان کے درمیان ایک پہاڑی اس طرح نظر آرہی تھی جیسے اُس کے سر پر کوئی تاج رکھا ہو، ہمارے ایک عرب رفیق سفر نے اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا: "جبل النور!" یعنی وہ پہاڑ جس میں غار حراء واقع ہے جہاں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز فرمایا گیا، اور جہاں وہ وحی پہلے پہلے اترنی شروع ہوئی جس نے ہدایت کا نور پوری دنیا میں پھیلا دیا۔

غرض سینے میں جذبات کا تلاطم لئے ہوئے ہم مکہ مکرمہ شہر میں داخل ہوئے۔ مدرسہ صولتیہ اُس وقت حارۃ الباب میں واقع تھا، وہاں مدرسے کے مہتمم حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی شفقت سے ہمیں مدرسے کے ایک کمرے میں جگہ دی۔ اس زمانے میں زیادہ تر لوگ ہندوستان اور پاکستان سے پانی کے جہاز کے ذریعے حج کو آیا کرتے تھے، اور مہینوں حرمین شریفین میں قیام کرنا ہوتا تھا، اور ہوٹلوں کے بجائے رہنے کے لئے حرم کے قریب مکان کرائے پر لے لیتے تھے یا مختلف ممالک کے مخیر حضرات نے حجاج کے لئے مسافر خانے بنائے ہوئے تھے جنہیں "رباط" کہا جاتا تھا۔ بہت سے لوگ ان رباطوں میں قیام کرتے تھے۔ ہوٹلوں کا رواج بہت کم تھا۔ اس لئے حجاج اپنے ساتھ کھانا پکانے کا انتظام کر کے لاتے تھے۔ آٹا، چاول، مسالے وغیرہ سب پانی کے جہاز سے لائے جاتے تھے۔ اور بہت سے اہل خیر مدرسہ صولتیہ میں کھانے پینے کی اجناس حاجیوں کے لئے بھیج دیتے تھے جو مدرسہ کے منتظمین حاجیوں میں تقسیم کرتے تھے۔ جس کمرے میں ہم نے زمین پر بستر بچھایا تھا، اس کے سرہانے گندم کا بڑا سا ڈھیر اسی مقصد کے لئے پڑا ہوا تھا۔

ہم نے سامان رکھ کر تازہ وضو کیا، اور دھڑکتے دلوں کے ساتھ حرم شریف میں حاضری ہوئی۔ یہ کوئی دس بجے صبح کا وقت ہوگا۔ کعبہ شریف سامنے آیا، تو آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ بیت اللہ ان کے سامنے ہے جس کے تصور میں سال بیت گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اُس وقت مطاف بالکل خالی تھا، اور شاید بیس تیس آدمی

طواف کر رہے ہوں گے۔ اس لئے ہر چکر میں حجرِ اسود کا بوسہ کسی تکلف کے بغیر نصیب ہوا۔ ملتزم پر حاضری دی، وہاں بھی صرف چند افراد تھے، اس لئے بھڑاس نکالنے کا خوب موقع ملا۔ مقام ابراہیم اُس وقت ایک چھوٹی سی عمارت میں تھا، اور ہم نے اپنے قیام کے دوران اُسی کو اپنا مستقر بنالیا تھا، کیونکہ وہاں سے بیت اللہ کا دروازہ اور ملتزم ہر وقت سامنے رہتا تھا۔ اور امام صاحب نماز پڑھاتے ہوئے اسی کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ زمزم کا کنواں بھی ایک عمارت میں تھا، اور وہاں اپنے ہاتھ سے ڈول ڈال کر پانی نکالا جاسکتا تھا، چنانچہ یہ سعادت بھی حاصل ہوئی۔

اگلے دن فجر سے پہلے جب ہم حرم شریف جارہے تھے، تو ہجرت کی وہ رات یاد آرہی تھی جس میں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کا محاصرہ توڑ کر مکہ مکرمہ کی گلیوں سے روانہ ہوئے تھے۔ اشراق کے بعد ہم حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دوست حاجی داود مائت صاحب مرحوم کو ایک خط دینے کے لئے سوق المدعیٰ گئے۔ یہ حرم شریف کے شمال مشرق میں ایک مسقف بازار تھا (جواب ختم ہوگیا ہے) جس کی ابتدا میں کچھ چڑھائی تھی، اور جہاں یہ چڑھائی ختم ہوکر اُترائی شروع ہوتی تھی، وہاں ایک مربع جنگلہ بنا ہوا تھا، اور مشہور یہ تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اہلیہ اور صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس خشک وادی میں چھوڑ کر واپس شام جاتے ہوئے وہ دعا مانگی تھی جو قرآن کریم نے سورۂ ابراہیم میں نقل فرمائی ہے۔ لوگوں میں مشہور یہ تھا کہ اس بازار کا نام " مدعیٰ " اسی لئے رکھا گیا ہے، کیونکہ اس کے معنیٰ ہیں "دعا مانگنے کی جگہ " اور اس کا قرینہ بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں چڑھائی ختم ہورہی تھی، اور ممکن ہے کہ یہ وہ آخری مقام ہو جہاں انہوں نے اپنی اہلیۂ محترمہ اور صاحب زادے پر آخری نگاہ ڈالی ہو، کیونکہ اترائی میں اترنے کے بعد ان کو آنکھوں سے اوجھل ہوجانا تھا۔ عزیمت و استقامت اور اللہ تعالیٰ پر بھروسے کی یہ بے نظیر تاریخ بظاہر یہیں رقم ہوئی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرے کی شکل میں رہتی دنیا تک جاودانی زندگی عطا فرمادی۔

یہیں اسی بازار "مدعیٰ" کی طرف سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر حرم میں داخل ہوئے تھے۔ ہزاروں درود وسلام اُس فاتح پر جس نے اپنے خون کے پیاسوں پر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر فتح حاصل کی، سب کو معاف فرمادیا، اور فتح کے وقت تنے ہوئے سینے اور اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ نہیں، بلکہ جھکی ہوئی گردن اور شکر کے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ اپنے اس مفتوحہ علاقے میں داخل ہوا، اور زبان

مبارک پر فاتحانہ نعروں کے بجائے یہ آیات تھیں کہ: " إنّا فتحنا لک فتحاً مبیناً ".

یہیں اسی بازار سے حرم جاتے ہوئے بائیں جانب حضرت ابو سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ گھر تھا جس کے بارے میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان عام فرما دیا تھا کہ "جو ابو سفیان کے گھر میں داخل ہو جائے گا، اُسے امن ہے۔" یہ گھر خالی تھا، اور خصوصی فرمائش پر زیارت کے لئے کھلوا دیا جاتا تھا۔ الحمد للہ! ہمیں بھی اس کی زیارت کا موقع ملا، اور دل سے دعا نکلی کہ "یا اللہ! آپ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر میں داخل ہونے والوں کو امن عطا فرمایا تھا، یا اللہ! ہمیں بھی اپنے غضب اور عذاب سے امن عطا فرما دیجئے۔"

بازار "مدعی" سے واپس ہوتے ہوئے اُس رشک آسمان زمین کی بھی زیارت ہوئی جسے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ اس مولد نبوی میں اس وقت ایک مکتبہ قائم تھا۔ دھڑکتے دلوں کے ساتھ اس میں حاضری دی۔ کیسی مبارک تھی وہ زمین جس میں انسانیت کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو جنم دیا!

اُس وقت حرم شریف کے جنوب میں شاہی محلات نہیں بنے تھے، اور حرم شریف کے صحن سے جبل ابو قبیس کی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ اس چوٹی پر ایک چھوٹی سی مسجد بھی نظر آتی تھی جو مسجد بلال رضی اللہ عنہ کے نام سے مشہور تھی، اور مکہ مکرمہ کے لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ اسی مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کو دو ٹکڑے فرما کر وہ عظیم معجزہ ظاہر فرمایا تھا جس کا ذکر قرآن کریم کی سورۂ قمر میں فرمایا گیا ہے۔ اسی لئے اس مسجد کا دوسرا نام "مسجد شق القمر" بھی بیان کیا جاتا تھا۔ جبل ابو قبیس پر آبادی بھی تھی، اور اوپر چڑھنے کے لئے پگڈنڈیاں بنی ہوئی تھیں۔ عصر کے بعد ہم ان پگڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے چوٹی تک پہنچے، اور اس مسجد کی زیارت کی۔ یہاں سے مکہ مکرمہ کی پوری وادی اکٹھی نظر آ رہی تھی جس نے تصورات کو ہزاروں سال پیچھے پہنچا دیا، جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس سنگلاخ وادی کو اپنے گھر کی تعمیر کے لئے منتخب فرما کر اُسے سبزہ زاروں سے کہیں زیادہ حسن و جمال عطا فرما دیا۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ جوتے کے بغیر پاؤں زمین پر رکھنا پاؤں جلا دینے کے مرادف تھا، خود حرم شریف میں سنگریزوں یا سیمنٹ کی جگہ پاؤں چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں رکھا جا سکتا تھا، لیکن ہم اس مقدس سرزمین کے نظاروں میں ایسے گم تھے کہ دل و دماغ کو گرمی کا ذرا احساس نہیں تھا، اور دل کو وہ سرور حاصل

تھا جو سرسبز وشاداب باغوں میں بھی میسر نہیں آتا۔

دو دن مکہ مکرمہ میں گذارنے کے بعد نہ جانے کس وجہ سے ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ پہلے مدینہ منورہ حاضری دیں، اور پھر یہاں نسبۃً زیادہ قیام کریں۔ اُس وقت مکہ مکرمہ سے براہ راست مدینہ منورہ کی کوئی سڑک نہیں تھی، اس لئے پہلے جدہ جاکر وہاں سے کسی بس یا ٹیکسی کے ذریعے جانا ہوتا تھا۔

چنانچہ ۲۰ رجون ۱۹۶۳ء (۲۷ رمحرم ۱۳۸۳ھ) کو ظہر کی نماز حرم میں پڑھکر ہم نے جدہ کے لئے سواریوں کے حساب سے چلنے والی ٹیکسی لی، اور روانہ ہوگئے۔ گرمی اپنے شباب پر تھی، اور فجر کے وقت بھی لُو چلتی تھی، ظہر کے بعد تو گرمی کا کچھ ٹھکانا نہیں تھا۔ اُس وقت ایئر کنڈیشنڈ گاڑیوں کا بھی اتنا رواج نہیں تھا۔ جب گاڑی شہر سے باہر نکلی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے پوری گاڑی تنور بن گئی ہے۔ اُس وقت ہمیں احساس ہوا کہ شدت شوق میں ہم نے سفر کے لئے وقت کا انتخاب درست نہیں کیا۔ اللہ اللہ کرکے جدہ پہنچے تو عصر کا وقت ہو رہا تھا، وہاں سے دوسری ٹیکسی لی، اور مدینہ منورہ کا پُر کیف سفر شروع ہوا۔ ماہر صاحب مرحوم کے یہ شعر یاد آرہے تھے:

پاک دل، پاک نفس، پاک نظر کیا کہنا
بعد مکے کے مدینے کا سفر کیا کہنا

سنگریزے ہیں کہ جاگی ہوئی قسمت کے نجوم
خار منزل ہیں کہ انگشت خضر کیا کہنا

تپش شوق بھی ہے، گرمیٔ موسم بھی ہے
اور اُس پہ مرا سوزِ جگر کیا کہنا

اُس وقت مدینہ منورہ جانے والی سڑک اُس علاقے سے گذرتی تھی جسے تہامہ کہتے ہیں، اور جہاں کی رات اپنی ٹھنڈک اور خوشگواری میں مشہور ہے، چنانچہ مغرب کے بعد گرمی کی وہ شدت نہ رہی، اور سفر موسم کے لحاظ سے بھی خوشگوار ہوگیا۔ مستورہ کے مقام پر پہنچ کر ایک روایتی قہوہ خانے میں کھانا کھایا۔ بحر احمر کی تازہ بھنی ہوئی مچھلی نے ذائقے کی خوب تواضع کی۔ وہاں جو صاحب قہوہ خانے کی طرف سے کھانا کھلانے پر مقرر تھے، وہ اصیل عرب تھے، اور انکا نام حمود بن غالی تھا۔ انہوں نے عرب کی روایتی مہمان نوازی کا مظاہرہ اس خوبی سے کیا کہ اُن سے طبیعت بہت مانوس ہوگئی۔ میں نے اُن سے تواضعاً کہا کہ: "آپ پاکستان آئیں۔"

اس کے جواب میں وہ بولے: " نہیں کبھی نہیں " میں نے کہا: " کیوں؟ " تو بولے: "إنّ الراقد فی بلادنا کالعابد فی بلادکم " یعنی: " ہمارے ملک میں سونے والا بھی تمہارے ملک کے عبادت گذار جیسا ہے،" اُن سے ایسی دوستی ہوگئی کہ اس کے بعد بھی کئی بار مدینہ منورہ جاتے ہوئے مستورہ میں ہم انہیں تلاش کرکے ان سے ملاقات کرتے، اور وہ بھی بڑی محبت کرتے تھے۔ چنانچہ جب اگلے سال ہم حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ حج پر آئے، تو میں نے حمود کو ڈھونڈ کر حضرت والد صاحبؒ سے اس کا تعارف کرایا، تو وہ جیسے حضرت والد صاحبؒ پر فریفتہ ہوگیا، اور اس نے یہ وعدہ لے لیا کہ آئندہ جب کبھی یہاں سے گذر ہو، تو اس سے مل کر ضرور جائیں۔ چنانچہ کئی برس تک یہ معمول جاری رہا، یہاں تک کہ طریق الہجرۃ کی تعمیر کے بعد راستہ بدل گیا کہ اس میں مستورہ نہیں آتا تھا۔

مدینہ منورہ کی وہ سڑک بدر کے مقام سے بھی گذرتی تھی، اور ہم نے ڈرائیور سے یہ طے کیا تھا کہ وہ ہمیں بدر میں ٹھہرنے کا موقع دیگا۔ چنانچہ عشاء کے کچھ دیر بعد ہم اُس وادی میں پہنچ چکے تھے جس نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سرکردگی میں کفر واسلام کا پہلا معرکہ دیکھا تھا، اور جہاں اللہ تعالیٰ نے تین سو تیرہ نہتے افراد کو ایک ہزار مسلح سورماؤں پر فتح مبین عطا فرمائی تھی۔ سب سے پہلے اُس پہاڑی کی زیارت ہوئی جسے قرآن کریم نے " العدوۃ الدنیا " کے نام سے یاد فرمایا ہے، اور جہاں مسلمانوں کا پڑاؤ تھا، پھر وہیں سے سامنے " العدوۃ القصویٰ " بھی نظر آیا جہاں ابوجہل کے لشکر نے ڈیرے ڈالے تھے۔ انہی دو پہاڑیوں کے درمیان وہ معرکہ ہوا جسے جنگوں کی تاریخ کا ایک معجزہ کہنا چاہئے۔ یہیں سے کچھ فاصلے پر ایک مسجد تھی، جو " مسجد عریش " کہلاتی تھی۔ " عریش " عربی زبان میں چھپر کو کہتے ہیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں حضور سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے لئے ایک چھپر بنایا گیا تھا۔ یہیں آپ نے سجدے میں گر کر معرکے میں فتح کی دعا مانگی تھی۔ اس مقدس سرزمین سے گذرتے ہوئے ایک ایک قدم پر دل میں جذبات وتصورات کا ایک تلاطم برپا تھا۔ آخر میں شہداء بدر کے قبرستان پر حاضری دی جو کچھ دور واقع تھا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، یہ وہ سعید روحیں تھیں جنہوں نے جہاد کے دوران اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کی سعادت تاریخ میں سب سے پہلے حاصل کی۔ انہیں سلام عرض کرکے ہم نے دوبارہ سفر شروع کردیا۔

مدینہ منورہ کا یہ سفر اس قدر پُرکیف تھا کہ شدید گرمی میں دن بھر کے طویل سفر کے باوجود ہر ہر قدم پر نیا

ولولہ پیدا ہو رہا تھا۔ مدینہ منورہ قریب آنے لگا، اور اُس کی روشنیاں نظر آنی شروع ہوئیں، تو بھائی (جناب محمد ولی رازی) صاحب بیساختہ جناب نظرؔ امروہوی کا یہ شعر پڑھنے لگے:

سجدہ طلب ہے راہ کا ہر ذرّہ اے نظرؔ!
کیا ہم حدودِ کوچۂ جاناں میں آ گئے؟

دھڑکتے دلوں کے ساتھ رات کے آخری حصے میں مدینہ منورہ پہنچے۔ مسجد نبوی رات کے وقت بند ہوا کرتی تھی، اس لئے وہاں حاضری فوراً نہیں ہوسکتی تھی۔ مسجد نبوی کے سامنے اصطفا منزل کے نام سے ایک رباط ہوتی تھی، جو پاکستان اور ہندوستان کے زائرین کے لئے وقف تھی، اور اُس کے متولی حاجی اصطفا خان صاحب مرحوم کراچی کے باشندے تھے۔ (اب یہ جگہ مسجد نبوی کی توسیع میں آ گئی ہے) ہمیں اُسی منزل میں قیام کرنا تھا، لیکن جب ہم رات گئے وہاں پہنچے، تو اُسکے دروازے بھی بند تھے البتہ مسجد کے سامنے فٹ پاتھ پر چارپائیاں کرائے پر ملا کرتی تھیں۔ ہم نے دو دو ریال میں دو چارپائیاں کرائے پر لیں، اور ان پر سو گئے۔

اگلی صبح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ گھڑی آ گئی جس کے انتظار اور اشتیاق میں سال گذر گئے تھے۔ ایک ذرۂ ناچیز اُس روضۂ اقدس کے سامنے کھڑا تھا جس کے جلال و جمال کے آگے لفظ وبیان کی ساری توانائیاں دم توڑ دیتی ہیں:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

عام طور سے یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں جلال ہے، اور مدینہ منورہ میں جمال۔ لیکن مجھ ناکارہ کو تو دونوں جگہ جمال وجلال دونوں کے مظاہر محسوس ہوتے ہیں۔ اس پیکر جمال (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے ہر دم یہ خیال رہتا ہے کہ اظہار محبت میں کوئی بات مزاج اقدس کے خلاف سرزد نہ ہوجائے، بقول میرے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحبؒ کے:

میرے محبوب! مری ایسی وفا سے توبہ!
جو ترے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

بہر کیف! جو لمحات اُس وقت روضۂ اقدس کے سامنے گذرے، ان کی کیفیات کا احاطہ الفاظ میں کرنا ممکن نہیں۔

اس کے بعد گیارہ دن مدینہ منورہ میں رہنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اصطفا منزل جس میں ہمارا قیام تھا، اس لحاظ سے بڑی متبرک جگہ تھی کہ اُسی میں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ باغ تھا جس کا نام بیر حاء تھا، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کے کنویں کا پانی پسند فرماتے تھے۔ یہ کنواں اُس وقت موجود تھا، اور اُس کی زیارت اور اُس کا پانی پینے کی سعادت ہمیں بھی حاصل ہوئی۔ مدینہ منورہ کے قیام کے دوران فجر سے ظہر تک کا بیشتر وقت ہم مختلف مقامات کی زیارتوں میں گذارتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دوست مولانا احمد عبداللہ میمنی صاحب" کو مدینہ منورہ کے مقامات کے بارے میں بڑی معلومات تھیں، اور ہمارے، ہم سبق ساتھی مولانا عبدالرزاق صاحب مراد آبادی" بھی اُس وقت مدینہ منورہ ہجرت کر چکے تھے۔ ان دونوں حضرات نے ہماری بڑی رہنمائی فرمائی، اور اُن معروف زیارتوں کے علاوہ جو اب بھی میسر ہیں، بہت سی وہ زیارتیں بھی اس سفر میں نصیب ہوئیں جن کا اب کوئی امکان نہیں رہا۔ چنانچہ قباء کی پہلی حاضری کے موقع پر حضرت کلثوم بن ہدمؓ کے اُس مکان کی بھی زیارت ہوئی جس میں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ روز قیام فرمایا تھا۔ یہ مکان اس کے بعد بھی کافی عرصے تک موجود رہا، مگر اب اُس کی کوئی علامت باقی نہیں رہی۔ اسی طرح مسجد قبا کے مغربی جانب وہ باغ اور وہ کنواں بھی موجود تھا جو "بئر اریس" کہلاتا تھا، اور جس میں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے تین خلفاء کا پائے مبارک لٹکا کر بیٹھنا حدیث میں منقول ہے۔ وہاں بھی حاضری ہوئی۔ اب یہ کنواں سڑک کے اندر آ گیا ہے۔ اس قیام کے دوران ہم تین مرتبہ پیدل قباء گئے، اور اللہ تعالیٰ مولانا عبدالرزاق صاحب کو اپنی مکمل مغفرت سے نوازے، انہوں نے ہمیں نخلستانوں سے گذرتے ہوئے مختلف راستے دکھائے۔ اُس وقت گرمی اتنی شدید تھی کہ فجر کے وقت بھی تیز لُو چلتی تھی، لیکن یہ نخلستانوں کا راستہ ٹھنڈا اور خوشگوار تھا، اور قدم قدم پر یہ تصور خوب لطف دیتا تھا کہ یہ راستے کبھی سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی رہگذر رہے ہونگے۔ تینوں دن ہم فجر کی نماز شیخ عبدالعزیز بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کی اقتدا میں پڑھکر باغات کے راستے قباء روانہ ہو جاتے، اور اشراق مسجد قباء میں پڑھتے تھے۔ میری عمر بیس سال تھی، اور بھائی محمد ولی صاحب کی انتیس سال، اور جسم تھکن سے آشنا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے ہم زیادہ تر

زیارتوں کے لئے پیدل جاتے، احد کی وادی میں بھی پیدل جانا ہوا، راستے میں مسجد مستراح جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم احد جاتے ہوئے ٹھہرے تھے، وہاں کچھ دیر رک کر آگے روانہ ہوئے۔ اور احد کے میدان میں جنگ کے نہ جانے کتنے نقشے ذہن میں بنائے، پھر اُس غار میں جاکر اشراق پڑھی جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زخمی ہونے کی حالت میں قیام فرمایا تھا۔ بس دل یہ چاہتا تھا کہ مدینہ منورہ کی یہ بابرکت فضائیں رگ وپے میں سما جائیں۔

اُس وقت مسجد نبوی سے متصل حضرت عثمان، حضرت عباس اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مکانات بھی (تجدید کے بعد) محفوظ تھے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں ایک کمان زیارت کے لئے رکھی ہوئی تھی جس کے بارے میں مشہور یہ تھا کہ یہ وہ کمان ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ احد کے موقع پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا فرماکر اُن سے فرمایا تھا: " ارم یا سعد! فداک ابی و امی "(سعد! تیر چلاؤ، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں) یہ یقین کرنے کا تو کوئی راستہ نہیں تھا کہ یہ واقعی وہی کمان تھی، لیکن اس معاملے میں شہرت کی بنا پر کم از کم ایک قوی احتمال پیدا ہوجانا بھی ایک محبت کرنے والے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس کی زیارت سے بھی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ مسجد نبوی کے مشرقی جانب ایک پتلی سی گلی جنۃ البقیع کی طرف جاتی تھی، اُس میں قدیم طرح کے مکانات تھے، اور بقیع کے پیچھے عوالی کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا جس میں نخلستان بھی تھے، اور کچھ کچے مکانات بھی۔ میں کبھی کبھی پرانے زمانے کا تصور جمانے کے لئے اس راستے سے گذرا کرتا تھا، اور اُس میں ایک عجیب کیف محسوس ہوتا تھا۔ غرض ہماری کوشش یہ تھی کہ:

جہاں جہاں ترے نقش قدم نظر آئے
جبینِ شوق لئے ہم وہیں وہیں پہنچے

اُس وقت مدینہ منورہ میں بڑے بڑے بزرگوں کا اجتماع تھا۔ حضرت مولانا بدرعالم صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ اُس وقت معذور ہوچکے تھے، لیکن لیٹے لیٹے ان کی تالیف کا سلسلہ بھی املاء کے ذریعے جاری تھا، اور روزانہ ان کی اصلاحی مجلس بھی ہوا کرتی تھی۔ الحمدللہ! ان کی مجلس سے بھی اس قیام کے دوران

خوب استفادے کا موقع ملا۔ حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جو نقشبندی سلسلے کے بڑے جلیل القدر شیخ تھے، ان کی مجلس میں بھی حاضری نصیب ہوئی، اور انکی ضیافت کریمانہ سے بھی وافر حصہ ملا۔ حضرت مولانا شیر محمد صاحب سندھی رحمۃ اللہ علیہ جن کی زبدۃ المناسک حج کے مسائل پر حجت سمجھی جاتی ہے، اور جنہیں اپنے دور کا "امام المناسک" کہا جائے تو بیجا نہیں ہوگا، ان کی خدمت میں بھی بارہا حاضری نصیب ہوئی، اور ان کا درویشانہ طرز رہائش دیکھ کر عقل حیران رہگئی کہ علم وفضل کا یہ پہاڑ کس سادگی کے ساتھ زندگی گذاررہا ہے۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو اپنے وقت کے بڑے ولی اللہ تھے، اور ہمارے خالو کے والد ماجد، ان کی خدمت میں ان کی جگہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر پہنچے، وہ بھی معذور ہو چکے تھے، اور ایک انتہائی تنگ وتاریک گھر میں مقیم تھے، اور ان کی خدمت کے لئے ان کی سن رسیدہ اہلیہ کے علاوہ کوئی گھر میں موجود نہیں تھا، معلوم ہوا کہ کسی کسی وقت حضرتؒ کے کچھ متوسلین آ کر خدمت کرجاتے ہیں، طرح طرح کے عوارض اور انتہائی کمزوری کی حالت میں تھے، لیکن صبر وقناعت کے پیکر !

یہ سب حضرات وہ تھے جنہوں نے مدینہ منورہ کسی روزگار وغیرہ کے لئے نہیں، بلکہ خالصۃً مدینہ منورہ کی وجہ سے اور وہاں دفن ہونے کی خواہش میں ہجرت کی تھی۔ اُس کے لئے بڑی مشکلات سہی تھیں، اور بڑی قربانیاں دی تھیں۔ آج یہ سب اپنی منزل مقصود پر پہنچ چکے ہیں:

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

اس طرح گیارہ دن اپنے جذبات وتصورات کی اس جنت میں گذارنے کے بعد ہم دوبارہ مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوئے۔ ذوالحلیفہ سے احرام باندھا، راستے میں ایک بار پھر شہدائے بدر کے حضور سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور جدہ سے ہوتے ہوئے دوبارہ مکہ مکرمہ کی آغوش میں پہنچ گئے۔ اس مرتبہ یہاں تقریباً سترہ دن قیام رہا۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چوبیسویں قسط)

مکہ مکرمہ کے اس قیام کے دوران ہمیں تبلیغی جماعت کے بزرگ حضرت مولانا سعید خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھرپور شفقتیں حاصل رہیں۔ اُس وقت حرمین شریفین میں پاکستانی ریسٹورنٹ نہیں ہوتے تھے، اس لئے دیسی کھانے میسر نہیں تھے، اور عربی کھانوں کی عادت نہیں تھی۔ بہت تلاش کے بعد ایک مراکشی مطعم ملا تھا جس میں کوفتے جیسا سالن "داود پاشا" کے نام سے ملتا تھا، جس دن کہیں دعوت نہ ہوتی، اُس دن ہم وہاں چلے جاتے تھے۔ ناشتہ میں بھی یہاں "فول" کا رواج تھا جو ایک طرح کی دال ہوتی ہے جس سے مناسبت نہیں تھی، یہ ناشتہ انڈے سے بے نیاز ہوا کرتا تھا، اور ہماری عادت بد انڈے کے بغیر کسی کھانے کو ناشتہ تسلیم کرنے کی روادار نہیں تھی۔ آخر دریافت ہوا کہ اشراق کے کافی دیر بعد تقریباً نو بجے (جو اُس وقت حجاز میں رائج وقت کے مطابق تین بجے صبح کا وقت کہلاتا تھا) خاص دو کانوں پر "مطبق" ملتا ہے، جو انڈے یا کیلے سے مرکب ایک پراٹھا جیسا ہوتا تھا، اُس سے ناشتہ کرنے کا معمول بن گیا تھا، مگر جہاں مطبق ملتا، وہاں چائے نہیں ہوتی تھی، لہٰذا کسی قہوہ خانے میں بغیر دودھ کی چائے بعد میں پی لی جاتی تھی۔ لیکن کچھ دن بعد حضرت مولانا سعید خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اصرار فرما کر کھانا اپنے گھر سے بھیجنا شروع کردیا۔

حضرت مولانا سعید خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مکہ مکرمہ کی زیارتوں کا خاص ذوق بھی تھا، اور معلومات بھی خوب تھیں۔ وہ ہمیں بذاتِ خود بہت سے مقامات پر لے گئے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا مکان جس میں حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مقیم تھے، باب السلام کے سامنے ایک بلند محلے میں واقع تھا۔ اُس وقت اُسے ایک مدرسہ بنا دیا گیا تھا۔ وہاں کئی بار حاضری ہوئی۔ افسوس ہے کہ اب وہ محفوظ نہیں رہا۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان حرم کے جنوب مغرب میں تقریباً اُس جگہ کے قریب واقع تھا جہاں آجکل شرکۃ مکہ (ابراج ہیلٹون) کی عمارت کا مشرقی سرا ہے (خدا جانے یہ عمارت بھی کب تک قائم

رہتی ہے) یہاں بھی قرآن کریم کی تعلیم کا ایک مدرسہ قائم تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے یاد آ گیا کہ کسی وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہجرت کا ارادہ کر کے مکہ مکرمہ سے نکلے تھے، راستے میں ایک قبائلی سردار ابن الدغنہ انہیں اپنی طرف سے امان دیکر واپس مکہ مکرمہ لے آیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے گھر کے احاطے میں ایک مسجد بنالی تھی جس میں وہ نماز ادا کرتے، تو قرآن کریم کی تلاوت میں محو ہو کر روتے رہتے، اور مشرکین کی عورتوں بچوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔ مشرکین مکہ کو یہ ڈر تھا کہ ہماری عورتیں اور بچے قرآن کریم کی معجزانہ تاثیر سے کہیں اپنا دین نہ چھوڑ بیٹھیں، اس لئے انہوں نے ابن الدغنہ سے اس کی شکایت کی کہ آپ نے انہیں اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ علانیہ قرآن کی تلاوت نہ کیا کریں۔ اب انہوں نے علانیہ یہ کام شروع کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہمیں اپنے بچوں عورتوں کے بارے میں تشویش ہے۔ ابن الدغنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سمجھایا، لیکن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی امان کی ضرورت نہیں ہے۔ وہی جگہ جہاں مشرکین کو ان کی تلاوت کی وجہ سے اپنے بچوں کے مذہب سے برگشتہ ہونے کا اندیشہ ہوا تھا، آج وہاں بچے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے!

حضرت مولانا سعید خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کی رہنمائی میں جنۃ المعلیٰ میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مزار پر حاضری نصیب ہوئی۔ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہما کے مزارات کا بھی انہوں نے ہی پتہ دیا، اور وہاں بھی حاضری ہوئی۔ شعب ابی طالب جہاں حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بنو ہاشم کے ساتھ مشرکین مکہ کے بائیکاٹ کے زمانے میں مقیم رہے، وہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکان بھی انہوں نے دکھایا۔

مکہ مکرمہ کے زیریں علاقے کا ایک محلّہ "حارۃ الشہداء" کہلاتا ہے، اور مشہور یہ ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس راستے سے داخل ہوئے تھے، اور یہاں کچھ لڑائی بھی ہوئی تھی۔ یہاں کچھ قبریں ہیں جن کے بارے میں مشہور یہ ہے کہ یہ ان صحابۂ کرامؓ کی قبریں ہیں جو اس موقع پر شہید ہوئے، اور اسی وجہ سے اسے "شہداء" کا محلّہ کہا جاتا ہے۔ (واللہ سبحانہ اعلم) یہاں ایک مسجد ہے جو تبلیغی مرکز بھی ہے، اور دوسرے تبلیغی مراکز کی طرح یہاں بھی شب جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ حضرت مولانا سعید خان

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جمعرات ۱۲؍صفر ۱۳۸۳ھ (مطابق ۲۰؍جولائی ۱۹۶۳ء) کی شام ہم وہاں گئے، اور رات وہاں گذاری، اور تبلیغی اجتماع میں شرکت کی۔ اگلی صبح مولانا نے ہمیں بتایا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مزار یہیں قریب واقع ہے۔ چنانچہ وہ ہمیں مزار پر لے گئے، اور اُس جلیل القدر صحابی کو سلام عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی جس کا بچپن اور جوانی کے ابتدائی دن سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و رفاقت میں، اور کہولت اور بڑھاپا آپ کے ذکر اور آپ کے اقوال و افعال دنیا تک پہنچانے میں صرف ہوئے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ارضاہ! نماز جمعہ واپس حرم شریف آکر ادا کی۔

اُس وقت چونکہ بیشتر حجاج اپنے اپنے وطن واپس جا چکے تھے، اس لئے حرم شریف میں ہجوم بالکل نہیں تھا، اور طواف کے دوران بار بار حجر اسود کا بوسہ بھی اطمینان سے مل جایا کرتا تھا، ملتزم پر اور حجر اسماعیل علیہ السلام میں حاضری بھی بہت آسان تھی، اس لئے حرم شریف میں سرور و سکون کا عالم ناقابل بیان تھا۔

وہیں مکہ مکرمہ کے ایک بزرگ مالکی عالم حضرت شیخ حسن المشاط رحمۃ اللہ علیہ کا مغرب کے بعد درس حدیث ہوا کرتا تھا۔ وہ اُس زمانے میں سنن نسائی کا درس دے رہے تھے۔ ان کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی، اور ۱۸؍صفر ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۰؍جولائی ۱۹۶۳ء کی شام انہوں نے مجھے حدیث مسلسل بالاولیۃ پڑھ کر اُس کی اور اپنی تمام مرویات کی اجازت عطا فرمائی، اور اپنا ثبت بھی اپنے دستخط سے عطا فرمایا جو میرے پاس محفوظ ہے۔ اُس کے بعد ان کے سنن نسائی کے درس میں بھی شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہ اپنے چہرے مہرے، وضع قطع، اور انداز و ادا میں بڑے متبع سنت بزرگ تھے۔ ان کا سفید عمامہ ہمارے برصغیر کے علماء کے عماموں جیسا ہوتا تھا، اور ہر آنے والے سے بڑی خندہ پیشانی سے ملتے، اور سوالات کا جواب بھی دیتے، نصیحتیں بھی فرماتے، اور ان کے حلقے میں شمولیت کا ایسا کیف محسوس ہوتا تھا جیسے ہم اسلاف کے کسی بزرگ کی محفل میں بیٹھے ہوں۔ اس مجلس میں شرکت کا جو لطف تھا، اُس کی وجہ سے بعض اوقات یہ کشمکش ہو جاتی تھی کہ مغرب کے بعد طواف کروں، یا اس مجلس میں حاضر ہوں۔

جمعہ ۲۰؍صفر ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۲؍جولائی کو حرم شریف میں جمعہ اور عصر پڑھ کر ہم کچھ ساتھیوں کے ساتھ طائف روانہ ہوئے۔ مغرب کی نماز منیٰ میں ادا کی، اور عرفات سے ہوتے ہوئے جبل کرع کے دامن میں پہنچ گئے۔ طائف کا یہ راستہ جو جبل کرع سے ہو کر گذرتا ہے، بظاہر وہی راستہ تھا جس سے حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ

علیہ وسلم تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے تھے، یہاں پختہ سڑک حال ہی میں بنی شروع ہوئی تھی، اس لئے ہفتے کے بیشتر دنوں میں یہ راستہ بند رہتا تھا، اور "سیل" کے طویل راستے سے جانا پڑتا تھا، لیکن اُس دن یہ راستہ کھلا ہوا تھا۔ اور ہم تقریباً تین گھنٹے میں طائف پہنچ گئے۔ مکہ مکرمہ میں گرمی اپنے شباب پر تھی، لیکن یہاں موسم ٹھنڈا تھا۔ یہاں ایک مسجد میں قیام کیا، اور اگلے روز حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مسجد میں نماز پڑھنے اور ان کے مزار پر سلام عرض کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے طائف کی سکونت اس لئے اختیار کی تھی کہ مکہ مکرمہ میں رہائش رکھ کر اُس کی حرمت وعظمت کا حق ادا کرنا مشکل ہے۔ وہ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کل دس سال کے تھے، لیکن آپ کی دعا کی بدولت انہیں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی خصوصی فہم عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے وہ امام المفسرین کہلاتے ہیں۔ ہم طالب علم ان کے احسانات سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔

اُسی دن ہم کچھ جاننے والوں کی رہنمائی میں "ہدیٰ" کے مقام پر گئے جو طائف سے کچھ نیچے واقع ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب اہل مکہ کے ظلم وستم سے دل برداشتہ ہوکر طائف اس خیال سے تشریف لے گئے تھے کہ شاید وہاں کے لوگ ہدایت کو قبول کرلیں۔ لیکن وہاں کے سرداروں نے آپ کے ساتھ بہت بدسلوکی کی، اور اوباش قسم کے لڑکوں نے آپ پر پتھر برسائے، یہاں تک کہ آپ زخمی ہوگئے، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو آپ کے واحد رفیق سفر تھے، پتھروں کے سامنے خود کھڑے ہوجاتے تھے، تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر نہ پہنچیں، اس کے باوجود آپ کے پاؤں اس قدر زخمی ہوگئے کہ ان سے خون بہنے لگا۔ اس موقع پر آپ طائف سے واپسی میں عتبہ اور شیبہ کے باغ سے گذرے، تو وہاں ایک درخت کے سائے میں دم لیا تھا۔ "ہدیٰ" کے مقام پر ایک باغ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہی وہ باغ ہے جس میں آپ نے کچھ دیر آرام فرمایا تھا۔ اور ایک درخت کے سائے میں ایک پتھر کے بارے میں مقامی لوگوں کا کہنا تھا کہ آپ اسی پتھر پر تشریف فرما ہوئے تھے، اس بات کی تحقیق اور تصدیق کا تو کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن مقامی لوگوں میں شہرت کی وجہ سے اس کی تردید کی بھی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اس لئے ہم نے اُس باغ اور اُس پتھر کی بھی زیارت کی، چشم تصور کائنات کے محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے درد میں لہولہان دیکھ کر پُرنم تھی کہ جو پوری کائنات کے لئے رحمت بن کر آئے تھے، ناقدری کے پیکروں نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا،

اور اُس رحمت مجسم نے اُس کا کیا جواب دیا؟ اس موقع پر آپ نے یہ پُر درد دعا مانگی تھی:

اللّھمّ إلیک أشکو ضُعفَ قوّتی وقلّةَ حیلتی، وھوانی علی النّاس.یا أرحم الراحمین!أنت ربُّ المستضعفین،إلی من تکِلُنی؟إلی عدوّ بعید یتجھّمنی،ام إلی صدیق قریبٍ ملّکته أمری.إن لم تکن غضبان علیّ فلا أبالی، غیر أنّ عافیتَک أوسعُ لی.أعوذ بنور وجھِک الّذی أشرقت له الظّلمات،وصلح علیه أمر الدّنیا والآخرة من أن تُنزل بی غضبَک أو یحِلّ بی سخطُک ، ولک العُتبی حتّی ترضی ولا حول ولا قوّة إلاّ بک .

یا اللہ! میں آپ سے اپنی کمزوری، تدبیر کی کمی اور لوگوں کی طرف سے بے توقیری کی شکایت کرتا ہوں، اے ارحم الراحمین! آپ کمزوروں کے پروردگار ہیں، آپ مجھے کس کے سپرد کریں گے؟ کسی بغض رکھنے والے دشمن کے جو میرے ساتھ بری طرح پیش آئے؟ یا کسی قریبی دوست کے جسے آپ نے میرا معاملہ سونپ دیا ہو؟ اگر آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں تو مجھے پروا نہیں، البتہ آپ کی طرف سے ملنے والی عافیت میرے لئے زیادہ سہولت کا باعث ہے۔ آپ کی بزرگ ذات جس سے تمام ظلمتیں منور ہوئیں، اور جس کے نور سے دنیا و آخرت کے معاملات درست ہوئے، اُس کا واسطہ دیکر میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ آپ کا غضب مجھ پر نازل ہو، یا میں آپ کی ناراضی کا مورد بنوں، اور آپ کا حق ہے کہ آپ کو منایا جائے، یہاں تک کہ آپ راضی ہو جائیں، اور کسی میں کسی کام کی کوئی طاقت نہیں، سوائے اُس کے جو آپ کی طرف سے عطا ہو"۔

غالباً یہی وہ جگہ تھی جہاں اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں پر مقرر فرشتہ آپ کے پاس اس پیشکش کے ساتھ بھیجا کہ اگر آپ چاہیں دو پہاڑوں کو ملا کر اس بستی کے لوگوں کو تباہ کر دیا جائے، لیکن لاکھوں درود و سلام اُس رحمت مجسم (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جنہوں نے فرمایا کہ شاید اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی نسل سے ایسے لوگ پیدا فرمادیں جو حق کو قبول کر کے اس کے داعی بنیں۔ چنانچہ پھر وہ وقت بھی آیا جب طائف کے لوگ خود آ کر نہ صرف مسلمان

ہوئے، بلکہ انہی کے قبیلے ثقیف کے ایک فرد محمد بن قاسم بھی تھے جنہوں نے آخر کار سندھ کا علاقہ فتح کر کے برصغیر میں اسلام کی روشنی پھیلائی، اور انہی کے طفیل آج ہم لوگ ایمان کی نعمت سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان احسانات کا تصور دل میں لئے ہم اس مقام سے واپس ہوئے۔

اگلے دن مکہ مکرمہ واپس جانے کے لئے دوسرا راستہ اختیار کیا جو "سیل" کا راستہ کہلاتا ہے۔ اس راستے میں پہاڑ نہیں آتے، بلکہ ہموار زمین اس طرح بتدریج نیچے ہوتی چلی جاتی ہے کہ اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ ہم کسی بلندی سے نیچے اتر رہے ہیں۔ اسی راستے میں وہ جگہ بھی آتی ہے جہاں زمانۂ جاہلیت میں "عکاظ" کا میلہ لگا کرتا تھا، شعر و شاعری اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں، اور یہاں بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ کے لئے تشریف لاتے تھے۔ پھر "جعرانہ" کا وہ مقام آیا جو اس طرف سے آنے والوں کی میقات "قرن المنازل" کے مقابل ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ حنین اور طائف سے واپسی پر یہیں سے احرام باندھ کر عمرہ ادا فرمایا تھا، ہمیں بھی وہاں سے احرام باندھنے کی سعادت حاصل ہوئی، اور مکہ مکرمہ پہنچ کر عمرہ ادا کیا۔

طائف سے واپسی کے بعد پانچ دن اور مکہ مکرمہ میں قیام کی دولت نصیب ہوئی۔ اور بالآخر جمعہ پڑھ کر ہم مغموم دلوں کے ساتھ مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے، دیر تک پیچھے مڑ مڑ کر حرم شریف کے میناروں کو دیکھتے رہے کہ نہ جانے کب ان کی زیارت دوبارہ نصیب ہو۔ جدہ پہنچ کر رات وہاں گذاری، اور ہفتہ ۲۰؍جولائی ۱۹۶۳ء مطابق ۲۸؍صفر ۱۳۸۳ھ کی دوپہر واپسی کے سفر کے لئے سفینۂ حجاج پر سوار ہوئے، عصر کے بعد جہاز نے لنگر اٹھایا، اور ہم عرشے پر کھڑے ہوئے دیر تک جزیرۂ عرب کے دور ہوتے ہوئے ساحل کا نظارہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ افق پر کھنچی ہوئی ایک خاکی لکیر نظر آنے لگا، رفتہ رفتہ وہ لکیر بھی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی، اور سورج بھی سمندر میں جا چھپا۔ اور پھر سات دن تک سمندر تھا، اور ہم تھے۔ جب تک جہاز بحر احمر میں رہا، سمندر اتنا پُرسکون تھا کہ حد نظر تک وہ ایک ہموار زمین کی طرح نظر آتا تھا۔ حبس بھی بے پناہ تھا، اور جہاز کے سب سے بلند عرشے پر بھی ہوا کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ پھر بھی میں زیادہ وقت عرشے پر ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اس مقدس اور حسین ترین سفر کا سفرنامہ لکھتا رہتا تھا، یہاں تک کہ جہاز عدن پہنچ کر رُکا۔ عصر کے بعد ہم پچھلی مرتبہ کی طرح کشتیوں کے ذریعے بندرگاہ تک پہنچے، اور کچھ دیر ساحل پر گذارنے اور شیخ احمد عراقی رحمۃ

اللہ علیہ کے مزار پر سلام عرض کرنے کے بعد ہم ٹیکسی کے ذریعے کریٹر کے بازار کی طرف روانہ ہوگئے۔

کریٹر کا بازار فری پورٹ تھا، اس لئے وہاں ٹیکس کے بغیر چیزیں فروخت ہوتی تھیں۔ بازار چھوٹی چھوٹی پیچ در پیچ گلیوں میں پھیلا ہوا تھا۔ دو دن کے بعد خشکی میسر آئی تھی، اس لئے ہم وہاں سیر کرتے رہے، اور گھر والوں کے لئے کچھ خریداری بھی کی۔ ہم دونوں بھائیوں نے اپنا پاسپورٹ، ٹکٹ اور ساری کرنسی ایک ایسے چھوٹے سے تھیلے میں رکھی ہوئی تھی جو گلے میں لٹکایا جاسکتا تھا، اور میں نے لٹکا رکھا تھا، اور جب بازار سے کوئی چیز خریدنی ہوتی، تو اُسے گلے سے نکال کر ہاتھ میں لے لیتا تھا۔ عشاء کے بعد وہاں سے واپس ٹیکسی میں روانہ ہوئے، اور جب اسٹیمر پوائنٹ پر پہنچے، اور ٹیکسی والے کو پیسے دینے کا وقت آیا، تو اچانک دیکھا کہ وہ تھیلا موجود نہیں ہے، ٹیکسی میں جس قدر ممکن تھا، تلاش کیا، مگر جب نہ ملا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ اب ہمارے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ ٹیکسی کا کرایہ ادا کرسکیں، نہ پاسپورٹ تھا، نہ ٹکٹ جس میں ایک مسافر کی جان اٹکی ہوئی ہوتی ہے۔ پاسپورٹ اور ٹکٹ کی غیر موجودگی میں جہاز پر جانے اور باقی سفر پورا کرنے کا بھی کوئی راستہ نہیں تھا، نیز یہ بھی معلوم تھا کہ مسافروں کو واپس جہاز پر سوار کرنے کے لئے سیڑھی رات بارہ بجے ہٹالی جائے گی، اور ہم اسی غریب الوطنی میں رہ جائیں گے جہاں ٹھہرنے یا وہاں سے واپس جانے کی کوئی سبیل بھی نہیں ہے۔ ادھر یہ بھی بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ تھیلا ہم نے کہاں چھوڑ دیا تھا، اور ٹیکسی والا پیسے لیکر واپس جانے کے لئے اصرار کر رہا تھا۔ اُس کے ساتھ واپس جانے کے لئے بھی کرائے کی ضرورت تھی جو موجود نہیں تھا۔ بے بسی کا وہ عالم ابھی تک یاد آتا ہے، تو جھرجھری آجاتی ہے۔

ایسی بے بسی کے عالم میں انسان کا واحد سہارا اللہ تعالیٰ سے دعا کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ دل سے دعا نکل رہی تھی کہ یا اللہ! اس آزمائش سے کسی طرح نکال دیجئے۔ اتنے میں ایک اور ٹیکسی آکر رکی جس سے جہاز کے عملے کے کچھ ذمہ دار حضرات اترے جن سے پانچ دن میں بڑی دوستی ہوگئی تھی۔ وہ واپس جہاز میں جانے کے لئے آئے تھے۔ ہم نے اُن سے سارا معاملہ ذکر کیا۔ پاسپورٹ اور ٹکٹ کا تو ان کے پاس بھی کوئی حل نہیں تھا، البتہ انہوں نے ہمیں اتنے پیسے قرض دیدیئے جس سے ہم ٹیکسی کا موجودہ اور آئندہ کرایہ ادا کرسکیں، اور اس طرح ہمیں کم از کم واپس کریٹر جانے کا موقع مل گیا۔ دوسری درخواست ہم نے اُن سے یہ کی کہ جہاز کے

کپتان سے ہماری اس مشکل کا ذکر کر کے یہ گذارش کردیں کہ جہاز کو چونکہ صبح نو دس بجے روانہ ہونا ہے، اس لئے سیڑھی آخر وقت تک نہ ہٹائی جائے۔ انہوں نے اس کا وعدہ کرلیا، اور ہم دوبارہ وہاں جانے کے لئے روانہ ہوگئے۔ راستے بھر سوچتے رہنے سے بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ تھیلا کہاں رہا ہوگا؟ دن بھر اتنی مختلف جگہوں پر گئے تھے کہ ان میں سے کسی کا انتخاب ممکن نہیں تھا۔ بس انا للہ وانا إلیہ راجعون اور قرآن کریم کی اس آیت کا ورد کرتے رہے، جس کے بارے میں بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ گمشدہ چیز کی تلاش کے لئے اس کی تلاوت بہت مفید ہوتی ہے۔ آیت یہ ہے:

یَا بُنَیَّ اِنَّھَا اِنْ تَکُ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِنْ خَرْدَلٍ فَتَکُنْ فِی صَخْرَۃٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِھَا اللّٰہُ اِنَّ اللّٰہَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ (لقمان: ۱۶)

اس آیت کا ورد کرتے ہوئے ہم کریٹر پہنچے، تو وہاں دوکانیں بند ہورہی تھیں۔ پیچ در پیچ گلیوں میں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ ہم کہاں کہاں گئے تھے۔ جس بند ہوتی دوکان کے پاس جاتے، وہ صاف انکار کردیتا، یہاں تک کہ ایک ایک کر کے ساری دوکانیں بند ہوگئیں، اور سناٹا چھانے لگا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ دن بھر کی تھکن سے بدن چور تھا، اس لئے سوچا کہ آخری صورت یہی ہوسکتی ہے کہ یہاں دوکانیں جلدی کھلتی ہیں، اس لئے رات یہاں گذار کر صبح کو تلاش پھر شروع کریں۔ وہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل نظر آیا، سوچا کہ رات یہاں گذار لی جائے، مگر اُس کا کرایہ معلوم کیا تو وہ ہمارے پاس موجود پیسوں سے زیادہ تھا۔ قریب میں ایک مسجد تھی، وہاں گئے تو پتہ چلا کہ اُس پر عشاء کی نماز کے بعد تالا لگ جاتا ہے، لہٰذا وہاں سونا بھی ممکن نہ تھا۔ ظاہری اسباب کے تمام راستے بند ہوگئے، اور سڑک پر رات گذارنے کے سوا چارہ نہیں رہا۔ اسی بے بسی کے عالم میں ہم آیت کا ورد کرتے ہوئے جارہے تھے کہ ایک گلی کے سامنے سے گذرتے ہوئے ایک چھوٹی سی دوکان پر ٹمٹماتا ہوا بلب نظر آیا، اور اندازہ ہوا کہ شاید یہ دوکان کھلی ہے، اور کچھ کچھ یہ بھی یاد آیا کہ شاید ہم اس دوکان میں گئے تھے۔ چنانچہ اُس کے سامنے پہنچے تو دوکان کا مالک آدھا دروازہ بند کر کے کچھ حساب کتاب کررہا تھا۔ ایسے میں دو اجنبیوں کو دیکھ کر اُس کا موڈ خراب ہوگیا، اور اُس نے دوکان بند ہونے کا سخت لہجے میں اعلان کیا، مگر ہم نے اُس سے بڑی عاجزی کے لہجے میں اپنی داستان سُنائی، اُس نے سُن کر کہا

کہ یہاں کوئی ایسا شنطہ (تھیلا) نہیں ہے۔اس آخری امید کے خاتمے سے ہمارے چہروں پر کچھ ایسی بے چارگی چھاگئی کہ اُس کو کچھ رحم آ گیا۔ اُس نے کہا: "وہ شنطہ کیسا تھا؟ اور اُس میں کیا تھا؟" ہم نے جھٹ پوری تفصیل بیان کردی ۔ وہ بولا: "اچھا تھوڑی دیر ٹھہرو" پھر وہ دوکان کی اوپر کی منزل پر چلا گیا۔ ہم پر ایک ایک لمحہ بھاری ہورہا تھا، ہم نے دعائیں اور زیادہ عاجزی کے ساتھ مانگنی شروع کردیں ۔تھوڑی دیر میں وہ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں وہ تھیلا صاف نظر آرہا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوا جیسے نئی زندگی مل گئی ہو۔اُس نے وہ ہمارے حوالے کرکے کہا کہ: " آئندہ کبھی ایسا نہ کرنا"۔ بس پھر کیا تھا؟ ہم سراپا شکر بن کر واپس ہوئے۔ٹیکسی لی، اور اسٹیمر پوائنٹ پہنچے۔اور دیکھا کہ جہاز تک جانے والی آخری کشتی تیار کھڑی ہے۔ بارہ بجے کے قریب ہم جہاز پر پہنچے، تو ہمارے وہ ساتھی جن سے ہم نے اپنی داستان بیان کی تھی، ہمارے منتظر تھے، اور دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ ہم نے ان کا قرض شکریہ کے ساتھ واپس کیا، اور جب اپنے کمرے میں بستر پر پہنچے، تو اندازہ ہوا کہ یہ عارضی قیام گاہ بھی جو چند دنوں کے لئے ہمیں ملی ہوئی تھی، کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرے شیخ حضرت عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب گھر میں آرام دہ بستر پر لیٹو، تو تھوڑا سا یہ تصور کرلیا کرو کہ اگر تم کسی سفر میں ہوتے، اور رات کے وقت راستہ بھٹک گئے ہوتے، یا تمہاری گاڑی جنگل میں خراب ہوگئی ہوتی، تو اس وقت تمہیں اپنا یہ بستر کیسا یاد آتا، اور کتنی بڑی نعمت معلوم ہوتی۔اب جبکہ تمہیں یہ بستر کسی مشقت کے بغیر حاصل ہوگیا ہے، تو اس پر خوب شکر ادا کرکے سویا کرو۔ ہم لوگ اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں سے غفلت کی حالت میں فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں، اور اُن پر شکر ادا کرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ اس غفلت کا علاج یہ ہے کہ یہ تصور کیا جائے کہ اگر یہ نعمت نہ ہوتی، تو ہمارا کیا حال ہوتا؟ اس قسم کے واقعات اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(پچیسویں قسط)

حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی

عمرے کی ادائیگی کا تو اللہ تعالیٰ نے ایسا انتظام فرمایا تھا کہ اُس میں کچھ زیادہ خرچ کرنا نہیں پڑا، لیکن حج کا باقاعدہ سفر کرنے کی اُس وقت استطاعت نہیں تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اگلے ہی سال حج کا بھی عجیب طریقے پر انتظام فرمادیا۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کو حرمین کی حاضری کا خاص ذوق تھا، لیکن ۱۳۸۳ھ (مطابق ۱۹۶۴ء) کے حج کے موقع پر انہیں تأمل تھا کہ پاکستان میں اُنہیں کچھ ضروری دینی کام انجام دینے تھے۔ ہمارے بہنوئی حضرت مولانا نوراحمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے (جو اُس وقت ناظم دارالعلوم بھی تھے) حضرت والد صاحبؒ کو توجہ دلائی کہ آپ ہمیشہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ عالم اسلام اور بالخصوص حجاز کے علاقے میں بہت سے قابل اصلاح امور ہیں جن کی طرف علماء اور ذمہ داروں کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ چونکہ حج کے موقع پر علماء وصلحاء کا اجتماع ہوتا ہے، اس لئے حج کی ادائیگی کے ساتھ اس کام کا بھی موقع مل جائے گا۔ چونکہ حضرت والد صاحبؒ کو بھی اس ضرورت کا احساس تھا کہ حتی الوسع اس کی کوشش کی جائے، تو انہوں نے حضرت مولانا نوراحمد صاحبؒ کے ساتھ حج کا ارادہ فرمالیا۔ اس سفر کی مختصر یادداشتیں بھی انہوں نے لکھی تھیں۔ اُن میں یہ بھی لکھا ہے:

> "جب حج کے ساتھ اس مقصد کا تصور آیا، تو اپنے ساتھ دارالعلوم کراچی کے دو استاذ میرے لڑکے مولوی محمد رفیع اور مولوی محمد تقی سلمہم کا رفیق سفر ہونا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ ان کو عربی زبان میں تحریر وتقریر پر خاصی قدرت ہے، اور اپنی ضعیفی کے پیش نظر سفر

کی ضروریات میں اُن سے کافی امداد کی توقع ہے۔"

اس ضرورت کے احساس کے باوجود اُس وقت اتنی استطاعت نہیں تھی کہ اپنے خرچ پر حج کرسکیں۔ لیکن چند دن میں حضرت مولانا نوراحمد صاحبؒ نے بتایا کہ اُن کے ایک دوست حضرت والد صاحبؒ کے مذکورہ بالا کام میں ان کی مدد کے پیش نظر دو افراد کو اپنے خرچ پر حج کے لئے بھیجنا چاہتے ہیں، اس لئے میرے اور بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کے لئے حج پر جانے کا اچھا موقع ہے۔ ایک تو حج کا شوق تھا ہی، اوپر سے یہ نعمت کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت میں یہ مبارک سفر ہوگا، ہم دونوں بھائیوں نے بڑے ذوق وشوق سے کارروائی شروع کردی، لیکن چونکہ قرعہ اندازی میں نام نہیں دیا گیا تھا، اس لئے چند در چند مشکلات حائل تھیں، ان مشکلات کے علاوہ قرعہ اندازی کے بغیر حج پر جانے کا ایک ہی راستہ تھا کہ بونس واؤچر خرید کر اُس کے ذریعے ادائیگی کی جائے۔ اس طریقے کا خرچ بھی عام حج کے خرچ سے زیادہ تھا، (یعنی تین ہزار روپے کا ٹکٹ تھا، جو اُس وقت کے لحاظ سے ایک بڑی قیمت تھی) سرکاری مراحل طے کرتے ہوئے وقت گذرتا گیا، یہاں تک کہ حضرت والد صاحبؒ اور مولانا نوراحمد صاحبؒ کی روانگی کا وقت آگیا، اور وہ اس امید پر روانہ ہوگئے کہ دو تین دن میں ہماری کارروائی بھی مکمل ہوجائے گی تو ہم بھی ان سے جاملیں گے۔ حضرت مولانا نوراحمد صاحبؒ ہمیں ان صاحب کا پتہ بھی دے گئے تھے جو حج کرانا چاہتے تھے، تاکہ جب ادائیگی کا وقت آئے تو اُن سے رقم وصول کرکے ادائیگی کردی جائے۔ چنانچہ کارروائی کی تکمیل کے بعد جب اُن صاحب سے رابطہ کیا گیا، تو انہوں نے دفعۃً (شاید اپنی کسی مجبوری کے تحت) معذرت کرلی۔ یہ معذرت سن کر ایک مرتبہ تو دل پر بجلی سی گرگئی، خود اپنے پاس اتنی گنجائش نہیں تھی کہ خود ادائیگی کرکے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاسکے، دوسری طرف ہفتوں کی کوشش کے بعد یہ موقع میسر آیا تھا جسے کھونا دل پر بہت شاق تھا۔ بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے احباب میں سے کسی سے رجوع کرکے قرض کا انتظام کیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ساری عمر کسی سے قرض مانگنے سے محفوظ رکھا تھا۔ (دوسروں کے خرچ پر حج کا جو ارادہ کیا گیا تھا، اُس میں بھی اپنی کسی تحریک کو ادنیٰ دخل نہیں تھا، خواہش کا اظہار انہی کی طرف سے ہوا تھا) آخرکار دل نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی سے قرض مانگ کر حج کرنے کا کوئی جواز نہیں، چنانچہ ارادہ ملتوی کردیا۔ ابھی ارادہ ملتوی کئے ہوئے چند گھنٹے ہی گذرے ہوں گے کہ دارالعلوم کے ایک طالب علم مولوی

محمد علی صاحب مرحوم ملنے کے لئے آئے، یہ تنِ تنہا آدمی تھے، اور سرکاری ملازمت چھوڑ کر دینی علم حاصل کرنے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے بڑی لجاجت سے کہا کہ میں ایک درخواست لے کر آیا ہوں، آپ اُسے رد نہ کریں۔ درخواست یہ ہے کہ میرے پاس اپنی ملازمت کے زمانے کی کچھ رقم بیکار پڑی ہوئی ہے، میں تنہا آدمی ہوں، اور مجھے کئی سال تک اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، میری دلی خواہش ہے کہ یہ رقم یا اس کا کچھ حصہ آپ کے حج میں استعمال ہو جائے۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں وہ ہدیہ کے طور پر پیش کروں گا، تو آپ قبول نہیں کریں گے، اس لئے اس گذارش کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس کی واپسی کی کوئی جلدی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ آپ کے حج میں یہ رقم استعمال ہوگی، تو میں اسے اپنے لئے سعادت سمجھوں گا۔

انہوں نے یہ پیشکش کچھ ایسے انداز سے کی کہ اُس کو رد کرنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری معلوم ہوا، اور ہم نے اس نیت سے یہ پیشکش قبول کرلی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اپنی دوسری ضروریات میں کمی کر کے جلد از جلد اسے ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ حج کے بعد سال پورا ہونے سے پہلے قرض کی واپسی کا انتظام ہوگیا، اور ہم نے وہ ان کو واپس کردی، لیکن ان کے جذبے کی دل میں جو قدر ہے، اس کی وجہ سے ان کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اب وہ اللہ تعالیٰ کے پاس جا چکے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اس نیکی کا بہترین صلہ عطا فرمائیں، اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازیں۔ آمین

حج کی جس پرواز سے جانے کا ارادہ تھا، وہ چلی گئی تھی۔ صرف آخری پرواز باقی تھی۔ بمشکل اُس میں جگہ ملی، اور ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُس میں سوار ہو کر ۷ ذوالحجہ کو مکہ مکرمہ پہنچے، جبکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارا انتظار کرنے کے بعد تقریباً ناامید ہو چکے تھے۔ چونکہ وہ معلم شاکر سکندر صاحب مرحوم کے ذریعے حج کیا کرتے تھے، انہوں نے ہمارے عُمرے کے دوران بھی ہماری بہت مدد کی تھی، اس لئے ہم عصر کے بعد سیدھے ان کے دفتر میں پہنچے جہاں حاجیوں کے سامان کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا، اور اسی ڈھیر کے پیچھے ایک کونے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ لوٹا ہاتھ میں لئے وضو کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک ہمیں دیکھ کر ان کی خوشی کا عالم قابلِ دید تھا۔ اس موقع پر اُن کا کِھلا ہوا چہرۂ مبارک آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے، اور اس ملاقات کی حلاوت آج تک دل میں محسوس ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت والد صاحبؒ معلم کے اسی دفتر میں مقیم ہیں جہاں حاجیوں کا سامان بکھرا پڑا ہے، اور ہر وقت لوگوں کی آمد و رفت لگی ہوئی ہے۔

ان کا مزاج ایسا ہی درویشانہ تھا کہ انہیں حرمین شریفین کی حاضری کے سوا قیام وطعام کے کسی اچھے انتظام کی طرف کوئی خاص توجہ ہی نہیں تھی۔ان کے چاہنے والے بہت تھے، اور چاہتے تو رہائش کا بہتر سے بہتر انتظام کرسکتے تھے، لیکن حج قریب تھا، اور قیام کے لئے کسی پُر سکون جگہ کی تلاش میں جتنا وقت گذرتا، وہ وقت حرم میں گذارنا انہیں زیادہ پسند تھا۔اسی لئے بظاہر انہوں نے کسی کو اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔لیکن ہمیں شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ اس عمر میں اس طرح کا قیام ان کی صحت کے لئے مضر ہوگا۔لیکن اگلی صبح ہی منیٰ روانہ ہونا تھا، اور کوئی مناسب جگہ تلاش کرنے کا وقت نہیں تھا، اس لئے وہ رات وہیں گذار کر ہم اگلی صبح منیٰ روانہ ہوگئے۔اور الحمد للہ، حج کے مناسک حضرت والد صاحبؒ کی رہنمائی میں ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہ اپریل کا مہینہ تھا، اور مکہ مکرمہ کا موسم بھی بہت خوشگوار تھا، حضرت والد ماجد قدس سرہ کی طبیعت پر بھی ایسا نشاط تھا جو خال خال ہی کبھی دیکھا ہوگا۔چنانچہ ان کی معیت میں اس سفر حج کا ایک ایک لمحہ یادگار برکتوں کا ذخیرہ ثابت ہوا۔قدم قدم پر وہ علم ومعرفت کے شہہ پاروں سے نہال فرماتے رہے۔ میں اُس زمانے میں دارالعلوم میں دیوان حماسہ پڑھاتا تھا، اس لئے اس کے اشعار خوب یاد تھے، لیکن اس موقع پر اندازہ ہوا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کو زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام کے اشعار اُس سے کہیں زیادہ یاد ہیں، وہ حسب موقع اُن اشعار سے بھی مستفید فرماتے تھے۔اسی سال ہمارے دو استاذ حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ اور حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ بھی حج کررہے تھے۔حج کے دنوں میں اللہ تعالیٰ نے ان کی معیت بھی نصیب فرمائی۔حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ نے اس سفر میں اپنے والد صاحبؒ کے ساتھ حضرت مولانا اکبر علی صاحبؒ کی جس طرح خدمت فرمائی، اُس کا دل پر بہت گہرا اثر رہا۔

۱۱رذوالحجہ کو عشاء کے بعد حضرت والد صاحبؒ پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ایک عشائیے پر مدعو تھے۔لیکن اس سے پہلے جمرۂ اولیٰ کے قریب ایک مکان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب، امیر تبلیغی جماعت اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ ٹھہرے ہوئے تھے۔ان کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے۔حضرت والد صاحبؒ نے اس سفر کی جو یادداشتیں لکھی تھیں، اُن کے مطابق اس موقع پر حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مالکی مذہب میں یہ جو مشہور ہے کہ منیٰ وغیرہ میں قصر کرنا مناسک کا حصہ ہے، اس لئے مقیم پر بھی واجب ہے، اس

کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مکہ مکرمہ کا رہنے والا جب حج کے لئے روانہ ہوتا ہے، تو منیٰ، عرفات، مزدلفہ کا جانا اور آنا مل کر مسافت سفر بن جاتی ہے، یہاں اس مجموعی مسافت کا اعتبار اس لئے کیا گیا ہے کہ حاجی اپنے اس سفر کو کسی بھی جگہ اپنی مرضی سے ختم نہیں کرسکتا، بلکہ اُسے یہ ساری مسافت ہر حال میں طے کرنی ہوتی ہے، بخلاف دوسرے مسافروں کے کہ وہ جب چاہیں، اپنا سفر ختم کرسکتے ہیں، اس لئے ان کے حق میں جانے آنے کی مسافت کا مجموعہ مدنظر نہیں رکھا جاتا۔ (۱)

عشاء کی نماز مسجد خیف میں ادا کی، وہیں حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی مقیم تھے، ان کی زیارت ہوئی، اور اُس کے بعد سفیر پاکستان عبدالفتاح میمن صاحب کی دعوت میں شرکت کی جس میں انہوں نے مسلمان ملکوں کے منتخب حضرات کو جمع کیا ہوا تھا۔ یہاں نائجیریا کے وزیر اعظم بلّو صاحب نے اپنی تقریر میں مصر کے جنرل ناصر کی طرف سے لگائے گئے عرب وحدت کے نعرے پر تنقید کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اتحاد پر زور دیا، اور اس سلسلے میں فلسطین اور زنجبار کے ساتھ کشمیری مسلمانوں کی آزادی پر بھی مؤثر تقریر کی۔

حضرت والد صاحبؒ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس کے بعد سفیر اردن نے بھی اسلامی وحدت پر زور

۱۔ اس مسئلے کی تحقیق کی ضرورت ہے، البیان والتحصیل (۲/ ۵۶) سئل ابن القاسم عن اهل منى هل يقصرون اذا أرادوا الافاضة، أو أهل عرفة؟فقال: اما اهل عرفة فيقصرون ولايقصر أهل منى، قال ابن القاسم : وكل من كان بمنى يقصر ،فاذا أفاض قصر، وكل من كان بمنى يتم، فاذا افاض اتم. قال محمد بن رشد : قوله فى الحاج من اهل منى انهم لا يقصرون فى افاضتهم من منى الى مكة صحيح، لقرب مابين منى ومكة، وقوله فى أهل عرفة : انهم يقصرون فى افاضتهم من منى الى مكة صحيح ايضا، على قياس قوله انهم يقصرون بمنى، لأنهم اذا كانوا يقصرون بمنى فهم على ذلك يرجعون الى وطنهم بعرفة. وفى قوله انهم يقصرون بمنى نظر، لانه انما قال انهم يقصرون بها قياساً على تقصير الحاج من أهل مكة بها، وذلك انما فيه الاتباع لرسول الله صلى الله عليه وسلم فى تقصيره بها، ولايتعدى بالسنة موضعها. اذا لم تكن موافقة للأصول، لاسيما وقد قيل ان رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يكن مقيماً بمكة، ولذلك قصّر بمنى؛ والى ذلك ذهب أهل العراق، فلم يجيزوا للحاج من أهل مكة التقصير بمنى وعرفة، وقد مضى هذا فى رسم شك فى طوافه من سماع ابن القاسم. وقول ابن القاسم وكل من كان بمنى يقصر، فاذا افاض قصر، مثل قوله اولاً اما أهل عرفة فيقصرون، لأن أهل عرفة يقصرون عنده بمنى. على ما تقدم؛ ووقع فى بعض الروايات :وكل من كان بعرفة يقصر، فاذا أفاض قصر. وهو غلط، لأن قوله يتناقض بذلك، من أجل ان أهل منى يقصرون بعرفة، وهو قد قال أنهم يتمون اذا أفاضوا.

دیا، اس کے بعد عربی وفد کے رئیس شعبہ نے تقریر کی، اور اُس میں بھی پورے عالم اسلام کی وحدت پر اور قضیۂ کشمیر پر بھی کلام کیا۔ آخر میں مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین حسینیؒ کی مفصل تقریر ہوئی جس میں انہوں نے کشمیر کے قضیے پر نہایت مؤثر گفتگو فرمائی۔

۱۲؍ ذوالحجہ کو منیٰ سے واپسی پر ایک بس میں سوار ہوئے جس نے حرم لے جانے کے بجائے ایک اور جگہ اتار دیا۔ اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ جگہ محصب ہے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ سے واپسی پر کچھ دیر قیام فرمایا تھا۔ اگرچہ یہاں ٹھہرنا اکثر علماء کے نزدیک مناسک کا حصہ نہیں ہے، لیکن فی الجملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے قیام پر رکنے کی سعادت بھی غیر اختیاری طور پر حاصل ہوگئی۔ یہاں ترکوں کے زمانے کی ایک مسجد بنی ہوئی تھی، وہاں نماز مغرب ادا کر کے حضرت والد صاحبؒ نے کچھ دیر آرام فرمایا۔ پھر پیدل مکہ مکرمہ کی طرف چلنا شروع کیا۔ تقریباً دو میل کا فاصلہ تھا حرم شریف پہنچتے پہنچتے حضرت والد صاحبؒ بہت تھک چکے تھے، اور قیام گاہ (شاکر سکندر صاحبؒ کے مکان) تک پہنچنے کی ہمت نہ تھی، رات حرم شریف ہی میں گذارنے کا فیصلہ فرمالیا۔ ہم قیام گاہ سے اپنا بستر، تکیہ اور چادر لے آئے، اور ایک پیالے میں تھوڑا سا کھانا بھی۔ اُس کے بعد حرم شریف کے ایک گوشے ہی میں رات گذاری۔

ہمارا اگلا دن اس فکر میں گذرا کہ حضرت والد صاحبؒ کی رہائش کے لئے کوئی مناسب جگہ تلاش کریں، کیونکہ شاکر سکندر صاحبؒ کے دفتر میں ہجوم اور شور کی وجہ سے مستقل رہنا مشکل تھا۔ آخرکار حضرت والد صاحبؒ ہی کے ایک دوست کی معرفت شارع اجیاد پر فندق السورتی کے نام سے ایک متوسط ہوٹل میں مناسب کرائے پر ایک جگہ مل گئی، اور حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ہم وہاں منتقل ہوگئے، لیکن یہ جگہ چوتھی منزل پر تھی، اور لفٹ خراب۔ دو دن یہاں گذارے، پھر باب العمرہ کے قریب فندق خوقیر میں دو دن قیام رہا۔ اس کے بعد سورتی ہوٹل کی لفٹ صحیح ہوئی، تو دوبارہ وہیں مقیم ہوگئے، اور ۲؍محرم تک وہیں قیام رہا۔

حضرت شیخ حسن المشاط رحمۃ اللہ علیہ جن سے پچھلے عمرے میں اجازت حدیث اور تلمذ کا شرف حاصل ہوا تھا، اب بھی حرم شریف میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، حضرت والد صاحبؒ بھی اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے، اور حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے بھی ان سے اجازت حدیث حاصل فرمائی۔ اور حضرت شیخ مشاطؒ نے حضرت والد صاحبؒ سے۔

چونکہ میرے پچھلے عمرے کو صرف دس مہینے ہوئے تھے، اس لئے حرمین شریفین کے اُس وقت کے مقامات بھی خوب یاد تھے، اور میں اپنے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کے ساتھ ان مقامات کی زیارت کے لئے آسانی سے چلا جاتا تھا، لیکن پچھلے سفر میں غارِ ثور کی زیارت کا موقع نہیں ملا تھا۔ حج سے واپسی کے بعد مکہ مکرمہ میں قیام کے دوران ہم نے وہاں جانے کا پروگرام بنایا، ہم نے یہ سوچا تھا کہ اشراق کے بعد وہاں جائیں، تاکہ ظہر تک واپس آکر حرم کی جماعت میں شریک ہوسکیں۔ ہم دونوں بھائیوں کے علاوہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب اور حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہما اور کچھ مزید احباب پر مشتمل گیارہ افراد کا قافلہ تیار ہوگیا، اور ہم جبل ثور کے دامن میں پہنچ گئے۔ سامنے جو پہاڑ نظر آرہا تھا، وہ بہت اونچا محسوس نہیں ہوتا تھا، لیکن اُس کی چوٹی پر پہنچ کر پتہ چلا کہ آگے اُس سے بھی بلند ایک اور پہاڑ ہے، ذوق وشوق کے عالم میں اُس پر بھی چڑھتے رہے، یہاں تک کہ اُس کی چوٹی پر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ ابھی مزید چڑھائی چڑھنی ہے۔ جہاں تک یاد ہے، غارِ ثور تک پہنچتے پہنچتے دو ڈھائی گھنٹے صرف ہوئے۔ لیکن اُس وقت خوشی کی انتہا نہ رہی جب غارِ ثور کے دہانے تک ہماری رسائی ہوگئی۔ یہ غار درحقیقت پہاڑ پر رکھی ہوئی ایک بڑی سی چٹان ہے جو اندر سے کھلی اور چاروں طرف سے بند ہے، صرف اُس کے نیچے ایک بڑا سا سوراخ ہے جس کے ذریعے لیٹ کر اندر جانا ممکن ہے۔ یہی وہ سوراخ ہے جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روپوشی کے دوران مکڑی نے جالا تن دیا تھا، اُس وقت وہ سوراخ کھلا ہوا تھا، اور ہم یکے بعد دیگرے لیٹ کر اُس میں داخل ہوئے۔ اندر عجیب منظر نظر آیا کہ اُس میں فرش پر دو پتھر کی سلیں اتنی لمبی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک پر ایک آدمی لیٹ سکتا تھا۔ لیکن ان میں سے ایک سل قدرے اونچی اور دوسری اُسکے مقابلے میں تھوڑی نیچی تھی، گویا اس غار میں اللہ تعالیٰ نے قدرتی طور پر یہ انتظام فرما رکھا تھا کہ اُس میں سرورِ کائنات (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے یارِ غار (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) فرقِ مراتب کے ساتھ لیٹ سکیں۔ بیت اللہ شریف کے بعد ہمارے لئے یہ وہ پہلی زمین اور پہلے پتھر تھے جنہیں یقینی طور پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک سے مَس ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تھی، اور ابتک وہ جوں کے توں موجود تھے۔ یہاں امت کے افضل ترین انسانوں نے تین دن تین راتیں روپوش ہو کر گذاری تھیں۔ روایات میں جو آیا ہے کہ دشمن آپ کی تلاش میں غار کے دہانے تک پہنچ گئے تھے، اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ

اگر ان لوگوں کی نظر اپنے پاؤں کی طرف پڑ جائے، تو ہمیں دیکھ لیں گے، اُس کا صحیح مطلب یہاں غار میں پہنچ کر ہی واضح ہوا۔ اس لئے کہ غار کا دہانہ نیچے بالکل زمین سے ملا ہوا تھا، اور باہر کھڑا ہوا آدمی غار کے اندر اُسی وقت دیکھ سکتا تھا جب وہ جھک کر اپنے پاؤں کی طرف دیکھے۔ اسی موقع پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ جملہ ارشاد فرمایا تھا جو قرآن کریم نے نقل فرمایا ہے:

لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا (سورۃ التوبۃ:۴۰)

غم نہ کرو، یقین رکھو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

اور حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے یہ (بھی) فرمایا:

ما ظنّک باثنین اللہُ ثالثھما

تمہارا ان دو کے بارے میں کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ تعالیٰ خود ہے۔

اُس ذات پاک پر لاکھوں سلام جو اپنے خون کے پیاسوں کو اتنے قریب دیکھ کر بھی سکینت واطمینان اور پروردگار پر بھروسے کا پیکر بنی ہوئی تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے ہی یہ انتظام فرما رکھا تھا کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا تن دیا تھا، اس لئے تلاش کرنے والے دشمن یہ جالا دیکھ کر واپس چلے گئے۔

کچھ دیر تک غارِ ثور میں ماضی کے تصورات میں گم رہنے کے بعد ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا، اترنے کا عمل چڑھنے کے مقابلے میں زیادہ تیز ہوتا ہے، چنانچہ جس چڑھائی میں ہمیں دو گھنٹے سے زیادہ لگے تھے، واپسی کے وقت تقریباً ۴۵ منٹ میں ہم نیچے پہنچ چکے تھے۔ سفر کے دوران ذوق وشوق کی زیادتی نے تھکن کا احساس نہیں ہونے دیا، لیکن واپس پہنچے تو کئی ساتھیوں کو بخار آ گیا، کئی کے جوتے پھٹ گئے، اور شدید تھکن تو سبھی کو تھی۔ اُس وقت خیال آیا کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ مکہ مکرمہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کی دن بھر کی کارروائیوں کی خبر لیکر رات کو عشاء کے بعد غارِ ثور جاتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رات گذارتے، اور صبح کو پَو پھٹنے سے پہلے واپس مکہ مکرمہ پہنچ جایا کرتے تھے۔ اسی طرح حضرت عامر بن فہیرہ بکریوں کا ریوڑ ساتھ لیکر وہاں جایا کرتے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

سعودی علماء سے حضرت والد صاحبؒ کی ملاقاتیں اور ان کے نام یادداشت

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ بات عرصے سے محسوس فرماتے تھے کہ نجد وحجاز کے بااثر علماء فروعی

فقہی اور کلامی مسائل پر ضرورت سے زیادہ زور دیتے ہیں، اور مغربی افکار کے زیر اثر جو منکرات رفتہ رفتہ اس مقدس خطے میں پہنچ رہے ہیں، ان کی طرف ان کی زیادہ توجہ نہیں ہے۔ چنانچہ اس سفر کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس میں بعض سرکردہ علماء سے ملاقاتیں کر کے اُن کو اس طرف متوجہ کیا جائے۔ اس غرض کے لئے انہوں نے ایک یادداشت مرتب فرمائی تھی جسے لکھنے میں میرا بھی حصہ لگا دیا تھا، حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ بھی اُس سال حج میں شریک تھے، اور حضرت والد صاحبؒ چاہتے تھے کہ اُن سے سے بھی اُس یادداشت پر نظر ثانی کروائیں۔ چنانچہ ایک دن اُن کو پیغام بھیجا کہ وہ مغرب کے بعد میزاب رحمت کے نیچے مل لیں۔ جب وہ وقت آیا تو حضرت والد صاحبؒ نے مجھے ان کو تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ میں وہاں پہنچا، تو وہ نہیں ملے، لیکن وہاں شام کے علماء کا ایک اور مجمع نظر آیا، میں نے اُن سے شیخ کے بارے میں پوچھا، تو اُن سے شناسائی ہوگئی۔ ان کے امیر محفل شیخ تیسیر مخزومی تھے، جو بڑی محبت سے پیش آئے، اور جب میں نے اُنہیں حضرت والد صاحبؒ کے بارے میں بتایا، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات کرنے کے لئے چل کر ان کی جگہ پر آگئے، اور فرمایا" :شبلكم جال جولة لطلب الشيخ عبدالفتاح ،ولم يجده، فصادنا صيدا، فها أنا بمحضر كم ".(آپ کے صاحبزادے نے شیخ عبدالفتاح کی تلاش میں ایک چکر لگایا، مگر وہ نہ ملے، تو یہ ہمیں شکار کر کے آپ کے پاس لے آئے ہیں، اس لئے ہم آپ کے سامنے موجود ہیں)

شیخ تیسیر بڑے خوش مزاج اور بڑے خوش مذاق عالم تھے، حضرت والد صاحبؒ اُن سے مل کر بہت خوش ہوئے، انہوں نے حضرت والد صاحبؒ سے حدیث کی اجازت کی بھی درخواست کی، اور گفتگو کے دوران بتایا کہ ہم بنو مخزوم سے تعلق رکھتے ہیں، اور صفا پہاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا خاندان کبھی یہاں آباد تھا۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا "لیکن اب تو آپ یہ کہتے ہوں گے کہ :

كأن لم يكن بين الحجون إلى الصّفا

أنيس، ولم يسمُر بمكّةَ سامر، [1]

ا۔۔ یہ عربی کا مشہور شعر ہے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے کچھ حضرات کو مکہ مکرمہ بعض مخالفین کی وجہ سے چھوڑنا پڑا تھا، پھر ان میں سے ایک صاحب کسی طرح چھپ چھپا کر صفا کی پہاڑی پر آئے، اور وہاں سے مکہ مکرمہ کی وادی پر نظر ڈالی جس کے ایک طرف کوہ صفا تھا اور دوسری طرف کوہ حجون اور یہ شعر کہا جس کا مطلب یہ ہے کہ اب تو ایسا لگتا ہے کہ حجون سے لے کر صفا تک نہ میرا کوئی جان پہچان والا کبھی یہاں تھا اور نہ کبھی مکہ کی چاندنی راتوں میں کسی سے میں نے باتیں کی تھیں۔

شیخ تیسیر اس بر موقع شعر سے بہت لطف اندوز ہوئے، پھر عشاء تک وہ ساتھ رہے، اور علمی گفتگو ہوتی رہی۔ عشاء کے بعد شیخ عبدالفتاحؒ سے بھی ملاقات ہوگئی، اور اگلے دن صبح کو اُن کے ساتھ ملاقات طے ہوئی جس میں مجوزہ یادداشت ان کے مشوروں سے تیار کی گئی۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ جن کا عربی کا خط اتنا خوبصورت تھا کہ موتی ٹکے ہوئے معلوم ہوتے تھے، انہوں نے اس کی نقل تیار کی۔ اس میں بنیادی خطاب سعودی عرب کے اُس وقت کے مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، اور اُن کے واسطے سے دوسرے علماء کرام سے بھی۔ چنانچہ ۲۳ ذوالحجہ کو مغرب کے بعد مفتیٔ اکبرؒ سے ان کے مکان محلہ شیشہ میں ملاقات کے لئے گئے، وہاں ان کے صاحبزادے سے ملاقات ہوئی جو رئیس القضاۃ بھی تھے۔ وہیں پر اُن کے بھائی شیخ عبدالملک بن ابراہیمؒ جو ہیئۃ الأمر بالمعروف کے رئیس تھے، تشریف لے آئے، اور مشہور کتاب "القومیۃ فی نظر الاسلام" کے مؤلف محمد احمد باشمیل صاحب بھی موجود تھے۔ ان سب حضرات سے عالم اسلام کے مسائل پر بات ہوتی رہی، لیکن مفتیٔ اکبر کسی وجہ سے اُس وقت تشریف نہ لا سکے، اس لئے یادداشت اُن کے صاحبزادے کو دی گئی کہ وہ ان کو پیش کردیں، انہوں نے وعدہ کیا۔ ۲۴ ذوالحجہ کو شیخ عبدالحمید فارسی صاحب کے ذریعے یادداشت کو ماہنامہ "الحج" کے دفتر میں ٹائپ کرانے کے لئے والد صاحبؒ نے مجھے بھیجا، اور وہ ٹائپ ہوکر تیار ہوگئی۔ اُسی دن ہیئۃ الأمر بالمعروف کے رئیس شیخ عبدالملک بن ابراہیم سے ملاقات کا وقت طے تھا، وہ بڑے تپاک سے ملے، اور انہوں نے بتایا کہ کل جو خط مفتیٔ اکبر کو دیا گیا تھا، وہ انہوں نے ہمارے سامنے ہی اہتمام سے سنا ہے، ہم سب اسے ایک مفید کوشش سمجھتے ہیں، اور مفتیٔ اکبر اُس کا جواب بھی آپ کو دیں گے۔ حضرت والد صاحبؒ نے اپنا احادیث کا ثبت "الازدیاد السنی" ان کو دیا، اُس کے آخر میں حضرت والد صاحبؒ کے عربی اشعار پڑھکر وہ بہت محظوظ ہوئے، اور شیخ ابن دقیق العید رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "الالمام" جو انہوں نے چھپوائی ہے، اس کے پانچ نسخے بھی انہوں نے پیش کئے۔

جاری ہے.........

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ———— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چھبیسویں قسط)

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جو یادداشت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سعودی علماء کو پیش کی تھی، وہ یہاں نقل کردی جائے، کیونکہ اس نے سعودی عرب کے حالات پر مثبت اثرات ڈالے ہیں۔ اصل یادداشت تو عربی زبان میں ہے، اور حضرت والد صاحبؒ کے عربی مکاتیب میں شائع ہورہی ہے۔ لیکن اس یادداشت کا جو اردو ترجمہ میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم نے کیا تھا وہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی جناب مفتیٔ اکبر شیخ محمد بن ابراہیم وعلمائے کرام حفظہم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سب سے پہلے میں اُس ذات باری تعالیٰ کا شکر بجالاتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ اُس نے مجھے بے شمار انعامات سے نوازا، اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق بخشی، اور پھر آپ جیسے علمائے کرام کے ساتھ اجتماعات کا موقع عنایت فرمایا جنہوں نے اپنا شاندار ماضی دینی خدمات اور اسلام کے تحفظ کے لئے صرف کیا ہے اور جو اللہ کے مقدس ترین شہر میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے منصب جلیل پر فائز ہیں۔

آپ حضرات کی سابقہ اور موجودہ دینی خدمات کا احساس واعتراف مجھے مجبور کررہا ہے کہ میں آپ سے وہ سب باتیں کہہ ڈالوں جو اس مقدس سرزمین کے بارے میں میں کہنا چاہتا ہوں۔

جو شخص بھی مسلمانوں کے موجودہ حالات سے باخبر ہے، اس پر الحاد، دین سے تمسخر اور مذہب سے عام بیزاری کی وہ وباء مخفی نہیں رہ سکتی جو آج عالمِ اسلام کے نوجوانوں اور نونہالوں میں سرایت کرچکی ہے۔ حتیٰ کہ

دین سے بیزاری اور الحاد کے یہ امراض مصر کے جامعۃ الازہر میں بھی پھوٹ پڑے اور وہاں سے پھیل کر اب یہ حرمِ مکہ تک آن پہنچے ہیں۔

کوئی بھی صاحب بصیرت اس میں شک نہیں کرسکتا کہ یہ وباء کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں، بلکہ یہ سب کچھ دشمنانِ اسلام کی ایک سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ہورہا ہے اور اس اسکیم کو ایسے ادارے چلارہے ہیں جو اسلامی ممالک میں بھی قائم ہیں اور غیر مسلم ممالک میں بھی۔

اب جبکہ یہ ہمہ گیر بیماری ہمارے ملک میں، ہمارے نوجوانوں اور طلباء میں بھی پھیلی ہوئی ہے ہم حجازِ مقدس میں رہنے والے اپنے دوستوں اور علمائے کرام سے یہ پوچھنے کے لئے آئے ہیں کہ یہ نئی بُت پرستی جو اس وقت دنیا کے دل ودماغ پر چھائی ہوئی ہے، اُمت کو اُس کے پنجوں سے چھڑانے کے لئے وہ کیا علاج تجویز فرماتے ہیں۔

کسی مسلمان کو اس میں بھی شک نہیں ہوسکتا کہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو جمع کرنا اور اس کو راہِ مستقیم پر گامزن کرنے کا کام سوائے اس کے ممکن نہیں کہ مسلمان پھر قرآنِ حکیم اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب لوٹ آئیں۔

امامِ مالکؒ کا ارشاد ہے کہ "اس امت کے آخری دور کی اصلاح بھی صرف اُسی طریقہ سے ہوسکے گی جس سے اس کے ابتدائی دور کی اصلاح ہوئی تھی"۔

لیکن آج ہماری آنکھیں یہ منظر دیکھ رہی ہیں کہ نوجوان طبقہ قرآن وسنت سے روز بروز تیزی کے ساتھ برگشتہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اسلام سے یہ بیزاری کہیں بہت زیادہ ہے اور کہیں کم۔ ہماری رائے میں اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کا اتحاد پارہ پارہ ہوچکا ہے اور علمائے اسلام کا بھی کوئی متحدہ پلیٹ فارم باقی نہیں رہا۔ حالانکہ اس وقت کفر واسلام کے درمیان ایک ایسی جنگ چھڑی ہوئی ہے جو کسی خاص ملک یا طبقے کیساتھ مخصوص نہیں، بلکہ یہ جنگ ہمہ گیر اور عالمگیر ہے۔

ان حالات کا تقاضا تھا کہ امت کے ذمہ دار علماء باہمی اختلافات کو بھلا کر اپنے مشترک دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے متحد جہد وجہد کرتے، اور اسلام کے بنیادی اصول اور متفق علیہ مسائل کے لئے کام کرنے کا متحد ہوکر بیڑا اٹھالیتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی زندگی جنہوں نے اسلام کو مشرق سے لیکر

مغرب تک پھیلا دیا تھا، ہمارے لئے بہترین نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسلام کی مدد اور اس کی اشاعت کے معاملہ میں ہمیشہ متحد و متفق رہے۔ اور اجتہادی مسائل میں ان کے درمیان جو اختلاف تھا، اُس کا کوئی اثر کبھی بھی انہوں نے اسلام کی نشر و اشاعت، اس کی بقاء اور اس کے تحفظ پر نہ پڑنے دیا۔ اور یہی وہ فریضہ ہے جو ہماری رائے میں اس وقت بھی دین اور علمِ دین کے پاسبانوں پر عائد ہوتا ہے۔

ایک نصرانی بادشاہ نے حضرت علی اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے باہمی اختلاف کو غنیمت سمجھ کر جب حضرت معاویہؓ کو اپنی مدد کی پیشکش کی تو حضرت معاویہؓ نے اُس کو جو جواب بھیجا تھا وہ ہمیشہ کانوں میں گونجتا رہے گا۔ انہوں نے نصرانی بادشاہ کو لکھا تھا کہ:

> "تیرا وہ خط مجھے مل گیا جس میں تو نے مجھے دعوت دی ہے کہ میں تجھ سے آملوں، تا کہ تو میرے دوست علی کے مقابلہ میں میری مدد کرے، لیکن تو خوب جان لے کہ میں اپنے دوست علی کا ساتھی اور تیرا بدترین دشمن ہوں، اور یاد رکھ کہ اگر کبھی علی کی فوجیں تجھ پر حملہ آور ہوئیں تو اس کے لشکر سے سب سے پہلے میں نکلکر تیرے مقابلہ پر آؤں گا، اور تیرا سر گردن سے اس طرح اکھاڑوں گا جیسے زمین سے گاجر اکھاڑی جاتی ہے۔"

تاریخ نے ہمارے واسطے اس قسم کے بیشمار واقعات کو محفوظ رکھا ہے۔ حتیٰ کہ تاریک ترین دور میں بھی جبکہ اسلام پر ہر طرف سے یلغار تھی، اس قسم کی مثالیں ناپید نہیں ہوئیں۔ شیخ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ تعالیٰ کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے کہ جب انہوں نے دیکھا کہ تاتاری خدا و رسول کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر چکے ہیں۔ اور عالمِ اسلام پر آسمانی قہر بنکر نازل ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کی آبادیوں اور نسلوں کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں تو شیخ اپنے ہم عصر علماء کو لیکر تاتاریوں کے مقابلہ میں جا پہنچے، اور اُس اختلاف کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا جو شیخ اور وفد کے دوسرے علماء کے درمیان چلا آرہا تھا۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ آج جو جنگ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف لڑی جا رہی ہے، وہ صلیبی جنگوں اور تاتاریوں کی جنگ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ آج اسلام کی دشمن قوموں کے پاس مہلک وسائل بھی پہلے سے مختلف ہیں، اور ان کا طریقہ جنگ بھی بدلا ہوا ہے۔ چنانچہ آج ہم پر فکری عقلی اور مادی ہر قسم کے ہتھیار آزمائے جا رہے ہیں۔

معزز علمائے کرام ! یہ حالات ہم سے تقاضا کر رہے ہیں کہ ہماری آواز متحد ہو، اور باہمی بغض اور عداوت کو بھول کر ہم سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ کیونکہ ہم اس وقت عین میدانِ جنگ میں کھڑے ہیں اور خطرناک دشمن ہمارے سامنے ہے۔

عالمِ اسلام کا کوئی بھی مسلمان ایسا نہیں جو اتحاد و اتفاق کی ضرورت کو نہ مانتا ہو۔ ہر شخص مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے، جیسا کہ موسمِ حج اور رابطہ عالمِ اسلامی کے مختلف اجتماعات میں مشاہدہ ہوتا رہا۔ لہٰذا اتحاد و اتفاق کی نصیحت کر دینا یہ اسلام اور مسلمانوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ اتحاد کی ضرورت پر تو پورے عالمِ اسلام کا مکمل اتفاق ہے، لیکن مشکل اور اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلاف و انتشار کے اسباب کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے، اور غور کیا جائے کہ ان اختلافات سے نجات کی صورتیں کیا ہیں؟ اور وہ طریقے معلوم کئے جائیں جن سے ہم اسلام اور اس کے شعائر کا تحفظ کر سکیں، اور دین کے اہم مقاصد اور اس کے شعائر کے تحفظ کے لئے متحد ہو سکیں۔

اس پیچیدہ مسئلے پر ہم عرصہ سے غور کر رہے ہیں، اور جوں جوں ہم نے غور و فکر کیا، یہ تاریخی حقیقت سامنے آتی چلی گئی کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعینؒ جو اس امت کے بہترین افراد اور ہمارے لئے بہترین نمونہ ہیں، ان کے درمیان بھی اجتہادی مسائل میں اختلاف پیدا ہوا، لیکن اس کے باوجود اصول اسلام اور ان کی حفاظت کے بارے میں کبھی بھی اُن کی یکجہتی میں فرق نہیں آیا۔ جنانچہ شیخ ابن القیمؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ اسلاف کے درمیان جزوی اختلاف پیدا ہوا، اور ایک نے کسی چیز کو حرام کہا اور دوسرے نے حلال، لیکن اس اختلاف نے کسی کو بھی دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے یا اس کے عام اسلامی حقوق ادا کرنے سے نہیں روکا۔

ان قابلِ اقتداء حضرات کے عمل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ مطلوبہ اسلامی وحدت سوائے اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ مختلف فیہ اجتہادی مسائل میں چشم پوشی سے کام لیا جائے، اور متفق علیہ مسائل اور ان کے دفاع کے بارے میں پوری سختی اختیار کی جائے۔

لیکن افسوس کہ ہم نے معاملہ بالکل برعکس کر دیا کہ اُن فروعی مسائل اور ذاتی اغراض کے معاملہ میں تو ہم آپس میں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں جن کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے

ہمیں عفو و درگذر اور چشم پوشی کی تعلیم دی تھی، لیکن اسلام اور اس کے بنیادی اصولوں کو ہم نے دشمنوں کے مقابلہ میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے کہ وہ اُن میں جو چاہیں، اور جس طرح چاہیں، تصرف کرتے رہیں۔

مسلمانوں کے مختلف طبقات میں بدکاری، بے حیائی، سود، جوا، رشوت ستانی، شراب خوری، عریانی، موسیقی اور سینما، تھیٹر روز بروز پھیلتے چلے جارہے ہیں، اور یہ وہ برائیاں ہیں جن کی حرمت میں کسی کو اختلاف نہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمیں ایسے مرشد علماء بہت کم نظر آتے ہیں جو ان کی وجہ سے متفکر یا بے چین ہوں۔ اس کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ فروعی مسائل میں جس کا مسلک اُن کے مسلک کے خلاف ہو، اُس پر اُن کو غصہ آجاتا ہے، اور وہ اپنی پوری توانائی اپنی رائے کو صحیح ثابت کرنے پر صرف کر دیتے ہیں، حالانکہ ان فروعی مسائل میں اختلاف صحابہ کرام و تابعینؒ کے زمانے میں بھی موجود تھا اور آئندہ بھی اِن کو دلائل کے تبادلے اور مناظروں سے رفع کرنا ممکن نہیں۔

تو کیا مبلغین اسلام اور اس کے پاسبانوں پر یہ لازم نہیں کہ وہ اپنی مخصوص کوششیں متفق علیہ منکرات کو دور کرنے کے لئے وقف کر دیں، اور مختلف فیہ فروعی مباحث کو درسگاہوں اور فتاویٰ تک محدود رکھیں؟ بایں طور کہ ہر عالم دین اپنے حلقۂ درس اور فتاویٰ میں قرآن و سنت کی تفسیر اپنے مسلک کے مطابق کرتا رہے، اور اس پر عمل بھی کرے۔ لیکن دوسرے مسلک والوں سے چشم پوشی کا برتاؤ کرے، مگر منکرات کے مقابلہ اور اسلام کے دفاع کے لئے ہر مکتبِ خیال کے علماء جسمِ واحد ہو کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

میری رائے میں مشرق سے لیکر مغرب تک بسنے والے مسلمانوں کے اتحاد کی اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں واللہ ولیّ التوفیق۔ مسلم ممالک کے حالات کا بھی ہم نے طویل جائزہ لیا تو اُن کو کتاب و سنت پر متحد کرنے اور ان کی اصلاح کے لئے بھی ہمیں حجازِ مقدس کے علماء و حکام سب سے زیادہ مناسب نظر آتے ہیں۔ کیونکہ پورے عالمِ اسلام میں جس کسی کو کسی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ انہی حضرات کی جانب متوجہ ہوتا ہے، اور انہی کی بستیوں میں اس کو اسلام کی بدولت امن و امان اور عزت نصیب ہوتی ہے۔ (آپ حضرات کا) یہی وہ امتیاز ہے۔ جس نے ہمیں آپ حضرات سے امیدیں وابستہ کرنے پر آمادہ کیا ہے کہ شاید اس اجتماع کے نتیجہ میں ہم اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مفید خدمت انجام دے سکیں۔ اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے رابطہ عالمِ اسلامی بھی ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوسکتا ہے جو اس مبارک مملکت میں قائم ہے۔ جس نے اپنے

مقاصد کی بنیاد اسلام کے ٹھوس اُصولوں پر قائم کی ہے، اور جو اپنی امکانی جدوجہد مسلمانوں کو متحد کرنے اور دنیا بھر میں بکھرے ہوئے مسلمانوں کو باہمی افتراق وانتشار سے پاک کرنے کے لئے صرف کرنا چاہتا ہے۔

لیکن یہ عظیم ترین مقصد ایسی ٹھوس جدوجہد کا مطالبہ کرتا ہے جس کو علمائے عالمِ اسلام کی بھاری جمیعت لیکر اُٹھے، اور یہ علماء بھی ایسے ہوں جن کے علم و دیانت پر مسلمانوں کو مکمل اعتماد ہو، جو اسلام کے محافظ اور دین کا درد رکھنے والے ہوں، اور ان کی باوقار دینی وعلمی شخصیت پر سب کا اتفاق ہو۔ اس طریقہ سے رابطہ عالمِ اسلامی پورے عالمِ اسلام سے مختلف ممالک اور مختلف طبقات کے اہم ترین اور جید اشخاص کو اپنے اردگرد جمع کر سکے گا جس کے نتیجہ میں رابطہ کو ایسی قوت حاصل ہو جائے گی جو زبردست بھی ہوگی اور قابلِ اعتماد بھی۔

ہماری رائے ہے کہ رابطہ عالم اسلامی کے اجتماعات مکہ مکرمہ کے علاوہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں بھی جہاں جہاں ممکن ہو منعقد کیے جایا کریں، تاکہ رابطہ وہاں کے حالات کا قریب سے جائزہ لے سکے اور وہاں کے لوگوں میں بھی رابطہ کی وجہ سے امنگ اور دینی تعلقات میں پختگی پیدا ہو۔

قبل اس کے کہ میں اپنا یہ مراسلہ ختم کروں۔ اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذمہ دار حضرات علمائے کرام کو اُن خرابیوں کی جانب بھی توجہ دلاؤں جو اس مبارک شہر مکہ مکرمہ میں میرے مشاہدہ میں آئیں، حالانکہ وہ دین وشریعت اور قرآن وسنت کے سراسر خلاف ہیں۔

خلاصہ کے طور پر چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ جانداروں کے مجسمات کی کثرت، جو بعینہ وہی بُت ہیں، جن کو اسلام نے حرام کیا ہے، اور جن کو بغیر کسی پس وپیش کے مٹا دینے کا حکم ہے۔ لیکن افسوسناک بات ہے کہ ہم نے بعض حاجیوں کو دیکھا کہ جہاں وہ اور چیزیں اس مقدس سرزمین سے خرید کر اپنے رشتہ داروں کیلئے لے جا رہے ہیں، اُنہی کے ساتھ وہ یہ بُت بھی تبرک کے طور پر خرید رہے ہیں، باوجود اس بات کے کہ یہ تصاویر اور یہ بت کافر ممالک سے محض اس لئے یہاں لائے گئے ہیں تاکہ مسلمانوں کے عقائد میں رخنہ پڑے، اور دلوں سے اسلام کی خصوصیات کا تصور غائب ہوتا چلا جائے۔ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کو روکنا حکام کا منصبی فریضہ ہے۔

۲۔ جس اسلام نے زنا اور اس کے اسباب کو حرام کیا ہے، وہی گانے باجے کو بھی حرام کر چکا ہے۔ کیونکہ یہ بھی بڑی بڑی بدکاریوں کا بہت قریبی سبب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ارشاد ہے کہ: لیکونن من امتی اقوام یستحلّون الحِرَ والحریر، والخمر والمعازف

ترجمہ : آئندہ میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا اور ریشم کو، اور شراب اور گانے باجے کو حلال کر ڈالیں گے۔

لیکن آج مکہ مکرمہ کی دوکانوں اور مکانات میں موسیقی اور گانے باجے کی آوازیں عام سنائی دیتی ہیں۔ مکہ مکرمہ جیسے مبارک شہر میں جو کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی پناہ گاہ ہے، یہ چیز اخلاقی اقدار کا خاتمہ کر ڈالے گی، اور فواحش اور بدکاری کا وہ طوفان یہاں بھی برپا کر دے گی جو دوسرے ممالک کو مختلف طریقوں سے اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔

۳۔ طواف کے دوران مردوں اور عورتوں کا اختلاط ہر حاجی، عامی اور عالم کے دل میں ایک بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی خرابی اور فساد ہے کہ اس سے غفلت برتنا کسی بھی حال میں صحیح نہ ہوگا۔ کیونکہ شریعت مطہرہ نے تو مرد وعورت کے اس اختلاط کو نماز میں بھی جائز نہیں رکھا۔ اسی لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مردوں اور عورتوں کے طواف کا الگ الگ انتظام فرما دیا تھا، تاکہ کسی قسم کا شرّ پیدا نہ ہو سکے، اور ہر شخص اپنی عبادت اور طواف خشوع وخضوع کے ساتھ پورا کر سکے۔ اس لئے ہماری رائے میں دین کے تحفظ کے لئے اس کا بندوبست کرنا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ جس کا تعلق اُس مقدس ترین مقام سے ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی، اور جو قرآنی آیات کی تلاوت کا مرکز بنا رہا۔

۴۔ اسی طرح مسلمانوں کے دلوں کو مجروح کرنیوالی ایک چیز یہ ہے کہ حرم شریف میں نماز کے دوران بھی عورتیں عام طور سے مردوں کی صفوں میں کھڑی ہو جاتی ہیں، حتیٰ کہ اب یہ اختلاط نہایت ہی تکلیف دہ اور گھناؤنی صورت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ یہ کیفیت تو مشرق سے مغرب تک کسی بھی مسجد میں ہماری نظر سے نہیں گذری، پھر مسجدِ حرام جس کو اللہ جلّ شانہ نے پورے عالم کا قبلہ بنایا ہے، اُس کے بیچوں بیچ یہ صورتحال کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟ کوئی بھی مسلمان جب حج کیلئے یہاں آکر اللہ کے مقدس ترین گھر میں یہ منظر دیکھے گا تو حیرت میں رہ جائے گا۔ اس ملک کے غیرتمند علماء جن کی خدمات بدعات ومنکرات کے مقابلہ میں معروف ہیں، اس بات کے سب سے زیادہ مستحق ہیں کہ وہ اس خرابی کو دور کریں، اور عورتوں کی نماز کا انتظام مسجد کے ایسے متعین مقامات پر کر دیں جو صرف عورتوں ہی کیلئے مخصوص ہوں۔ تاکہ حرم شریف کے عین درمیان میں اس تکلیف دہ حرام کا اعادہ نہ ہو سکے۔

۵۔ چونکہ ہماری دلی خواہش ہے کہ اسلام کا یہ مرکز اور اس کے باشندے کفر کی ہر چال سے محفوظ رہیں، اسلئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جو باتیں ہم نے یہاں کے بعض مسلمانوں میں دیکھی یا محسوس کی ہیں وہ بھی آپ کے سامنے بیان کریں۔

یہ بات واضح طور پر محسوس ہوئی کہ یہاں اسلامی عربی خصوصیات روز بروز نہایت تیزی کے ساتھ مٹتی چلی جارہی ہیں، اور اس کے مقابلے میں غیر مسلموں کی گمراہ کن معاشرت ترقی کررہی ہے، حتیٰ کہ یہ بیماری حرم اور مضافاتِ حرم میں بھی داخل ہو کر جڑ پکڑ چکی ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو مسلمانوں کی کوئی پناہ گاہ ایسی باقی نہیں رہے گی جو ان کافرانہ آلودگیوں سے پاک ہو۔ کیونکہ دوسرے ممالک تو اس سیلاب کی لپیٹ میں پہلے ہی آچکے ہیں۔

۶۔ سب سے مؤثر ذریعہ جو نوجوانوں میں شرعی احکام سے غفلت، دین سے بیزاری، اور فسق و فجور پھیلا رہا ہے، مغربیت میں رنگے ہوئے ادب کی وہ کتابیں ہیں جو یہاں کے کتب خانوں اور لائبریریوں میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ دراصل اس جدید ادب کی بنیاد ہی مذہب سے آزادی، دین سے تمسخر اور ملحدانہ نظریات پر رکھی گئی ہے۔ یہ رسائل جو گھٹیا درجہ کے عشقیہ ناولوں، اور شرمناک عریاں تصاویر پر مشتمل ہیں، نوجوانوں کو الحاد، فسق و فجور اور بے حیائی کے علاوہ کسی اور چیز کا سبق نہیں دے سکتیں، اور ہر صاحب بصیرت جانتا ہے کہ یہ رسالے اور کتابیں نوجوانوں کو متاثر کرنے کے لئے اہم ترین وسائل میں سے ایک ہیں۔ لہٰذا ہم اپنے دوست علمائے کرام کا فرض منصبی سمجھتے ہیں کہ وہ اِن امور کی جانب بغیر کسی تاخیر کے توجہ فرمائیں۔ تاکہ اس سیلاب کو سر تک پہنچنے سے پہلے روکا جاسکے۔ اور اس مقدس مملکت میں اہل بدعت کی کتابوں کی طرح رسالوں کا داخلہ بھی ممنوع قرار دے دیں۔ جزاھم اللہ تعالیٰ خیر الجزاء۔

مذکورہ بالا امور کی یاددہانی ہم اس امید پر کررہے ہیں کہ اصحابِ فکر و نظر ان کا تدارک فرمائیں گے۔ جب تک مسلمان اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہے، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ اُس کی مدد میں لگے رہتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کی مدد کیوں نہیں فرمائیں گے جو اُس کے دین و شریعت کی نصرت پر کمربستہ ہو جائیں، اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت ایسے لوگوں کے ساتھ تو بدرجۂ کمال ہوگی۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ہماری دعاء ہے کہ وہ ہمیں اور آپ کو اپنے دین کی خدمت ایسے طریقہ سے کرنے کی توفیق عطاء فرمائیں جو ان کو پسند اور محبوب ہو۔ میری جانب سے تعظیم و احترام کے گہرے جذبات قبول فرمایئے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بندہ فقیر محمد شفیع، صدر دار العلوم کراچی مقیم حال مکہ مکرمہ۔

ترجمہ از محمد رفیع عثمانی خادمِ طلبہ دار العلوم کراچی نمبر ۳۰،

۲۴/ ذوالحجہ سنہ ۱۳۸۳ھ

حضرت والد صاحب ابھی مکہ مکرمہ ہی میں مقیم تھے کہ مفتیٔ اکبرؒ کی طرف سے اس کا جواب بھی مل گیا جس کا متن یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مملکت عربیہ سعودیہ..........رقم ۴۶۰۲

خصوصی دفتر تاریخ ۸۳/۱۲/۲۵ ھ

کاپیاں برائے : مفتی ورئیس القضاۃ والکلیات والمعاہد العلمیۃ

از محمد بن ابراہیم بخدمت گرامی قدر فضیلۃ الشیخ محمد شفیع، عمید دار العلوم کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مؤرخہ ۱۳۸۳/۱۲/۲۴ ھ ہمیں موصول ہوا، اور اس خط کو بڑی خوشی کے ساتھ پڑھا کہ معرفت کی جو باتیں اللہ تعالیٰ نے آپ پر واضح فرمائیں آپ نے اس مکتوب میں تحریر فرمائیں، اور آپ نے بڑے اہم امور کی طرف توجہ دلائی، جن کی طرف توجہ دینا اور ان کے بارے میں اہتمام کرنا بہر حال ضروری ہے۔ بلاشبہ ہم اور ہمارے مشائخ بھائی اس جذبہ میں آپ کے شریک ہیں، جب مسلمان آپ کی ذکر کردہ باتوں کی طرف توجہ نہیں دیں گے اور ان بیماریوں سے ان کے لگ جانے سے قبل احتیاط نہیں برتیں گے اور اُن کے اندر پیش آنے کے بعد ہی اس کے علاج میں ہر طرح کی کوشش کریں گے، اور اپنے معاشروں کو اس سے پاک کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ پناہ میں رکھے۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعاء کرتا ہوں کہ مسلمانوں اور ان کے حکمرانوں کو حق کی طرف دعوت دینے کی توفیق عطا فرمائے اور حق کی نصرت، اور اسے بیان کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور باطل کو مٹانے کی توفیق عطا فرمائے۔ بلاشبہ وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ــــــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(ستائیسویں قسط)

شیخ عبدالعزیز بن بازؒ سے ملاقات

شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے سربراہ تھے۔ حضرت والد صاحبؒ کی اُن سے پہلے سفروں میں بھی ملاقات تھی، اور وہ خود حضرت والد صاحبؒ سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے، حضرت والد صاحبؒ شیخ عبدالملکؒ سے ملاقات کرکے نکلے، تو شیخ ابن بازؒ کا مکان بھی قریب تھا، اس لئے وہاں تشریف لے گئے۔ وہ چونکہ نابینا تھے، اس لئے شروع میں حضرت والد صاحبؒ کو نہ پہچانے، بعد میں جب حضرت والد صاحبؒ نے اپنا ثبت "الازدیاد السنی" انہیں پیش کیا، تو چونک کر فرمایا کہ ہم نے پہچانا نہیں تھا، اب کچھ دیر مزید بیٹھیں، پھر گفتگو کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور جب حضرت والد صاحبؒ نے ان سے اپنی یادداشت کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ اس کا ایک خلاصہ آپ امیر فیصلؒ کو بھی (جو اُس وقت مملکت کے وزیر اعظم تھے) ضرور بھیجیں۔ بعد میں وہ حضرت والد صاحبؒ کو اپنی گاڑی ہی میں حرم شریف لے گئے، اور نماز کے بعد مکتبۃ الحرم میں بھی لے گئے، اور اگلے دن جمعہ کے بعد اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی جسے حضرت والد صاحبؒ نے منظور فرمالیا۔ چنانچہ اگلے دن جمعہ کی نماز کے بعد ہم حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ان کے مکان پر گئے۔ اس ملاقات کا حال حضرت والد صاحبؒ نے اپنی یادداشتوں میں اس طرح تحریر فرمایا ہے:

> "جمعہ کے بعد حسب وعدہ شیخ عبدالعزیز بن باز کے مکان پر گئے۔ ان کی مجلس بڑی سادہ اور عالمانہ رہتی ہے، پہلے تو اپنے ایک لڑکے کو خود سبق پڑھا رہے تھے، اس سے فارغ ہوکر میرا رسالہ "الازدیاد السنی" اپنے سکریٹری سے سننا شروع کیا، اور جابجا کچھ وضاحت مجھ سے طلب کرتے رہے۔ آخر میں فرمایا کہ اپنی اسانید کی اجازت مجھے بھی

دے دیجیے۔میں نے عذرکیاکہ آپ خود بڑے عالم ہیں،میں اپنایہ مقام نہیں پاتا۔مگراصرارفرمایاکہ مجھےلکھ کر دے دیجیےتومیں نے وعدہ کیا۔محمد رفیع محمد تقی نے ان سے اجازت حدیث کی درخواست کی تو فرمایاکہ جب آپ یہ اجازت لے کرآؤگے توآپ کواجازت دوں گا۔اس کے بعدکھاناآ گیا۔بڑی سادگی سےسب اہلِ مجلس یہاں تک کہ ان کی گاڑی کاڈرائیوربھی ایک ہی دسترخوان پرجمع ہوکرکھانے میں شریک ہوئے۔پُرلطف مجلس اور پُرلطف دعوت تھی۔فارغ ہوکرواپسی کی اجازت طلب کی توچائے کے لیےٹھہرنے کوفرمایا۔چائے کے بعدان سے رخصت ہوئے۔اپنی گاڑی واپسی کے لیےسورتی ہوٹل تک بھیجی۔"

بعد میں حضرت والدصاحبؒ نے مدینہ منورہ پہنچ کرانہیں اجازت حدیث دیدی،اوراجازت نامہ لکھ کر دیاجس کےشروع میں حضرت والدصاحبؒ نےصحاح ستہ کےمؤلفین اورامام مالکؒ تک اپنی اسانیدذکرفرمائی ہیں،اوراُس کےآخرمیں تحریرفرمایاہےکہ:

"ولمّا رزقنی الله تعالی زیارة المدینة المنورة فی محرم سنة 1384وزرت الشیخ العلامة عبدالعزیز ابن باز، نائب رئیس الجامعة بها ,سألنی مع ماهو فیه من مقام رفیع فی العلم والفضل أن أجیز له روایة الحدیث بجمیع ما یجوز لی روایته، فأجزته بالأسانید المذکورة رجاء حصول برکته أطال الله بقاء ه فی نشر العلم والاقتفاء بسنن المصطفی صلّی الله علیه وسلّم فی صحّة وعافیة".

حضرت والدصاحبؒ کےاس اجازت نامے کی تصویرحضرت شیخ عبدالعزیزبن بازرحمۃ اللہ علیہ کی بعض سوانح میں شائع بھی ہوچکی ہے۔**سلسلة مؤلفات ورسائل سماحة الشّیخ عبدالعزیزبن باز رحمه الله رقم 52** کےتحت ایک مجموعہ ان کے دوشاگردوں عبدالعزیزبن ابراہیم بن قاسم اورمحمدزیادبن عمرالتکلۃ نے اس عنوان سے شائع کیاہے:**"مجموع فیه ترجمة سماحة الشیخ عبدالعزیزبن عبدالله بن بازرحمه الله تعالی (1330_1420)وترجمة العلامة المحدث عبدالحقّ بن عبدالواحد**

الهاشميّ،(1302_1392)وتحقيق "الثبت الوجيز "وهو إجازة العلامة الهاشميّ لسماحة الشيخ عبدالعزيزبن باز مع ملحق إجازته للشيخين حمادبن محمد الأنصاريّ ,وإسماعيل بن محمد الأنصاريّ ,وإجازة الشيخ المفتى محمد شفيع العثمانيّ لسماحة الشّيخ رحم الله الجميع .

یہ کتاب شیخ عبدالعزیز بن سلیمان المقر ن کے خرچ پر "دارأصالة الحاضر "نے شائع کی ہے، اور اُس میں حضرت والد صاحبؒ کے مختصر حالات زندگی بھی میرے اور بھائی صاحب مدظلہم کے حوالے سے مذکور ہیں۔

انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو بھی اجازت عطا فرمائی۔ شیخ ابن باز رحمۃ اللہ علیہ کی فرمائش پر حضرت والد صاحبؒ نے ایک دوسرا خط امیر فیصل کے نام لکھا، اور اُسے رجسٹری کے ذریعے اُن تک بھیجا۔ یہ خط عربی زبان میں تھا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکاتیب کے مجموعے میں شائع ہو رہا ہے۔ یہاں اس کا اردو ترجمہ نقل کرتا ہوں جو عزیز مکرم مولانا شاکر جکھورا صاحب نے کیا ہے۔

شاہ فیصلؒ کے نام خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بخدمت عالی مرتبت وزیر اعظم فیصل حفظہ اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتا ہوں جس نے آنجناب عالی مرتبت کو اسلام اور مسلمانوں کی ابدی امانت کا امین بنایا ہے، اور جس نے آنجناب کو حرمین شریفین کے علاقہ کا پاسبان بنایا ہے۔

عالی مرتبت! آپ جیسے حضرات پر اسلام اور مسلمانوں پر آپڑنے والی آزمائشیں، اور ذلت اور (اس کی وجہ سے) غیرتمند مسلمانوں کا کرب واضطراب مخفی نہیں ہوسکتے۔

ہم نے اور پاکستان میں ہمارے مشائخ نے ایک طویل عرصہ مسلمانوں کی اس انتہائی خطرناک بیماری، جو ان کے جسم اور روح تک سرایت کرگئی ہے، کے اسباب پر غور کیا تو جس قدر گہرائی سے سوچا اتنا ہی ہمارا یقین

بڑھا کہ:

ظہور اسلام کے زمانے سے عیسائیوں کا وطیرہ رہا ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور انہیں زمین سے نیست و نابود کرنے کے مواقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی مدد فرمائی اور دشمن طاقتوں کو تنہا شکست دی، اور انہیں ذلیل کیا۔ جب وہ اپنی صلیبی جنگوں اور مشنری دعوتی سرگرمیوں میں ناکام و نامراد لوٹے، تو انہوں نے آپس میں غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی کامیابی کا راز دو باتوں میں ہے:

۱) ان کا اتحاد کہ وہ بایں طور ایک جسم کے مانند ہیں کہ جب اس کے کسی عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو تمام جسم کو بخار اور بے خوابی ہوتی ہے۔

۲) اپنی کتاب (قرآن کریم) اور اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا پختہ علم۔

لہٰذا مسلمانوں کے اتحاد کو ختم کرنے اور ان کی قوت کو بکھیرنے میں انہوں اپنی کوششیں صرف کیں۔ اور مسلمانوں میں قومیت کے جذبات کو ابھارا اور وطنیت کے ان بتوں میں روح پھونکی جنہیں خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے پاؤں تلے روندا تھا۔

یہیں سے پھر آپس کا مقدس اسلامی رشتہ کمزور پڑا اور جو حلقے مشرق و مغرب کے مسلمانوں کو جمع کئے ہوئے تھے وہ کھل گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی تلواریں خود اپنے بھائیوں کے خلاف سونتی گئیں، اور آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگے، جس سے اسلام کی مضبوط چٹان کنکریوں میں بکھر گئی۔

دوسرے انہوں نے مسلمانوں کی سوچ کو قرآن وسنت کی شاہراہ سے دور کرنے کی بھی سازش کی۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں میں ایک ایسے نئے نظام تعلیم و تربیت کو رواج دیا اور اس میں ایسی چیزیں شامل کیں جو ان کی سوچ کو شریعت کی بے وقعتی اور کفر و الحاد اور اباحیت کی طرف لے جائیں، اور ان کے اعمال کو بے حیائی اور بد اطواری کی راہ پر گامزن کرائیں۔ مسلمانوں نے ان علوم کو موجودہ دور میں معاشی سہولت اور عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق فنی مہارت کے پیش نظر حاصل کیا۔ تاہم وہ اُس سست زہر کو نہ بھانپ سکے جسے اجنبیوں نے اس نظام میں چھپا رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ قرآن وسنت اور اپنی تابناک تاریخ سے بالکل بے گانہ ہوگئے، اور اس قسم کی درسگاہوں کے فاضل کیلئے محض لفظ "مسلمان" جو اپنی حقیقت اور روح سے عاری ہو رہ گیا، (اس

لئے) کہ وہ اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں غیروں کے ایسے نامناسب طور طریقوں کو اپنائے ہوئے ہے جنہیں ہمارے دین کا مزاج سلیم کسی طرح قبول نہیں کرتا۔

ان باتوں سے ہمارا مقصد ان جدید فنون کی ضرورت کا انکار نہیں، کیونکہ ہمارا یقین ہے کہ ان فنون کو حاصل کرنا ہی نہیں بلکہ ان میں اعلیٰ مہارت پیدا کرنا کسی بھی مسلمان ملک کے لئے جو اس زمانہ میں امن وامان سے رہنا چاہتا ہو، ناگزیر ہے۔ بلکہ ہمارا مقصود صرف یہ ہے کہ اجانب سے ان فنون کے حصول میں اُن لوگوں کی بے حیائی، بداطواری اور ادیان کے ساتھ مذاق سے پرہیز کرتے ہوئے ان کی سازش میں نہ آئیں، اور مسلمان اپنی کتاب وسنت کی تعلیمات کو پوری ہوشمندی کے ساتھ تھامے رکھے۔

تاہم انتہائی افسوسناک بات یہ ہے کہ ہمارے نوجوان طبقے کا معاملہ اس کے برعکس ہے، چنانچہ انہوں نے ان لوگوں سے ہر قسم کی برائیاں تو لیں، اور فحاشی، تھیٹروں، موسیقی، بے پردگی اور اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فساد عقیدہ، اور کتاب وسنت سے اعراض کو تو اپنالیا، لیکن جو فنون ضروری تھے انہیں تو اتنا بھی حاصل نہیں کیا جو ان کے ملک اور معاشرے کے لئے کافی ہوں، اس کے باوجود وہ اس بات پر خوش ہیں کہ انہیں ترقی حاصل ہوگئی ہے، اور اس پر کہ یہ فضول باتیں ان کی کامیابی کا ذریعہ ہیں، حالانکہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے کہ ان باتوں نے انہیں اپنے سیاسی اور اجتماعی مقاصد میں کمزوری اور ذلت کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

یہ ہے مسلم اقوام کا وہ ناسور جو مصر میں پیدا ہو کر تمام عالم اسلام میں پھیل گیا، یہاں تک کہ اب حرمین شریفین کے دروازے تک پہنچ گیا ہے، اور اس کے درج ذیل اثرات مرتب ہوئے:

۱۔ گانوں کی آواز یہاں کی ہر گاڑی، قہوہ خانے اور ہوٹل سے سنائی دے رہی ہے، اور عموماً مسلمان اس میں منہمک نظر آتے ہیں۔

۲۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی بیشتر کتابوں کی دکانوں میں فحش تصاویر اور معاشقوں پر مشتمل کتابوں کا وجود جو نوجوانوں کو بے حیائی کی راہ پر لے جارہی ہیں، اور جو عام طور سے یورپ یا کسی اور فرنگی ملک سے درآمد ہوتی ہیں۔ اور یہ (مصیبت) وہ ہے جو نوجوانوں کو گمراہی کی راہ پر اور اسلام اور اس کے طریقوں سے سب سے زیادہ دور لے جارہی ہے۔ اگر یہ سیلاب برابر رواں رہا تو ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ دیار مقدسہ میں وہ تمام

(معاشرتی) بیماریاں پھیل جائیں گی جنہوں نے یورپ اور بے حیائی کی اشاعت میں اس کے نقش قدم پر چلنے والے ہر ملک کی معاشرتی بنیادوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔

یہاں تک کہ خود ان کے اہل فکر رہنما آج اس بارے میں دردمند ہیں اور انہیں اس مصیبت سے خلاصی کا کوئی راستہ نہیں ملتا۔

۳۔ اسی طرح مکہ، منیٰ اور مدینہ کے اکثر بازاروں میں مجسموں کا وجود جنہیں کھلونوں کا نام دیا جارہا ہے، حالانکہ وہ دراصل بڑے بُت ہیں۔ اور لوگ بطور تبرک واعزاز یہاں سے لئے جانے والے سامان کے ساتھ ان بتوں کو بھی اپنے وطن لے جاتے ہیں، حالانکہ ان کا بنانا اور استعمال احادیث متواترہ اور اجماع سے حرام ہے۔

۴۔ اہل عرب کے سادہ اور خوبصورت طرز زندگی کو ترک کرنے اور اپنے تمام اطوار زندگی، کھانے پینے اور لباس میں غیر مسلم اجنبیوں کے طور طریقوں کو اپنانے کے پروپیگنڈوں کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جانا (اور انہیں اپنا لینا)۔

۵۔ یہ خرابیاں تو اپنی جگہ، تاہم وہ اس بات کا پتہ بھی دیتی ہیں کہ (یہاں کے لوگ) کس قدر مغربی افکار سے متأثر ہیں، اور وہ یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ان کے باطن اغیار کے غلام بنے ہوئے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی محبت سے محروم ہیں۔

لہٰذا عالی مرتبت! اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو صلاح عطا فرمائے۔ روئے زمین پر اب، ہمارے علم میں، آپ کے اس مقدس ملک کے علاوہ کوئی ایسا اسلامی ملک نہیں جس نے اپنی بنیاد قرآن وسنت کی اتباع پر رکھی ہو، اور جس نے اس کو اپنی حکومت وسیاست کا معتمد بنایا ہو۔ اور آپ ہی کا ملک ہے جس سے خیر کے چشمے پھوٹے، اور اسی میں مسلمان امن اور عزت پاتے ہیں، اور وہ اسی کو اپنا مرکز مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے ہیں کہ فرنگی اور الحاد کے اثرات ہنوز اپنی انتہا کو نہیں پہنچے، بلکہ وہ تو ابھی شروع ہی ہوئے ہیں، پس جناب عالی مرتبت سے امید کی جاتی ہے کہ قبل اس کے کہ وہ اپنے عروج کو پہنچے اس سیلاب کو روکیں، اور اس مقدس ملک کو اس عظیم مصیبت سے پاک کرنے کے لئے کھڑے ہوں، جیسا کہ آپ کے معزز اسلاف شرک اور بدعتوں کے مٹانے کے لئے کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اس ملک کو ان خرابیوں سے پاک کیا۔ اللہ تعالیٰ بندے کی مدد میں رہتے ہیں جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا رہتا ہے اور جب

وہ اللہ کی شریعت اور اسلام کے مرکز کی مدد میں لگا ہو تو کیا کہنا؟۔

ہمارے نزدیک ان خرابیوں سے نجات صرف درج ذیل امور میں ہے:

۱) قرآن کریم کو کما حقہ (درج ذیل طریقوں سے) تھامے رکھنا:

تلاوت کے ذریعہ: کہ کوئی بچہ یا بچی ایسی نہ رہے جو قرآن کی تلاوت بمع تجوید وآداب نہ کرسکتی ہو۔

اس کو سیکھنے کے ذریعہ: یہاں تک کہ کسی رسمی (تعلیمی) ادارے میں کوئی ایسا طالب علم باقی نہ رہے جسے مکمل قرآن کریم کی تفسیر اور سنت اور حدیث کی ضروری مقدار نہ آتی ہو۔

اور اس پر عمل کے ذریعہ: کہ مبلغین دین کی طرف دعوت دیں، اسی طرح امر بالمعروف اس کے محکمہ کی طرف سے بجالایا جائے، نیز محکمہ قضاء وعدل سے صادر ہونے والے فیصلوں کے ذریعہ (کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق دیئے جائیں)۔

۲۔ دین صحیح کے مبلغین کو پورے ملک میں پھیلایا جائے۔

۳۔ امر بالمعروف کے محکمے کے دائرہ اختیار کو وسیع کیا جائے۔

۴۔ (یہ تو طے ہے کہ) ہمیں جدید فنون اور ہنر سیکھنے سے اور طلبہ کو ان کی عملی تربیت دینے سے کوئی چارہ نہیں، لیکن ان کی تربیت اس طریقے سے ہونی چاہئے کہ طلبہ ان فنون وہنر کی روح اور کنہ تک پہنچ جائیں، اور وہ تعلیم دینے والوں کے کفر والحاد اور فاسد نظریات سے متاثر نہ ہوں۔ اور یہ اس طرح ممکن نہیں کہ ہم اپنے نوجوانوں کو غیر مسلم ممالک میں بھیجیں۔ کیونکہ نوجوانوں کے ذہن بہت جلد وہاں کے دیکھے ہوئے فاسد نظریات اور بُرے اعمال قبول کرلیتے ہیں۔ اسلامی ملکوں کا یہ بار بار کا تجربہ رہا ہے کہ اکثر طلبہ اپنے اوقات کو کھیل کود اور عیاشی میں صرف کرتے ہیں۔ اور اپنی تعلیم اور اس میں محنت کرنے کیلئے بہت کم وقت پاتے ہیں جو ان فنون میں مہارت پیدا کرنے کیلئے ناکافی ہے۔

لہٰذا ہماری رائے میں سلامتی اور فائدہ اسی میں زیادہ ہے کہ ہم اپنے ہی ملک میں ایسے فنی ادارے قائم کریں اور ان میں ماہرین کو ان کے شایان شان تنخواہوں کے ساتھ بلائیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ ہم صرف ان ماہرین کا انتخاب کریں جو اپنے فن میں لگے ہوئے ہوں، اور اپنے مذہب کی طرف دعوت سے تعرض نہ کرتے ہوں۔

یہ معاملہ، گو مسلسل کاوش کا متقاضی ہے، تاہم آپ جیسے عالی ہمت حضرات کے لئے ان شاء اللہ تعالیٰ کوئی

مشکل نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگتے ہیں اور اسی پر ہمارا بھروسہ ہے۔ ان اداروں سے پھر ایسے افراد تیار ہوں گے جو علوم میں نمایاں معلومات کے حامل ہوں گے اور فاسد نظریات اور بے حیائی کے اعمال کی گندگی سے پاک ہوں گے۔ ایسے افراد سے ان شاء اللہ مملکت کی تعمیر اور اس کے ستونوں کی تقویت میں زیادہ فائدہ پہنچے گا۔

۵۔ آلات موسیقی، تھیٹروں اور فحش اخبار اور رسالوں پر پابندی جو ہمارے نوجوانوں کو بے حیائی اور عریانی کی راہ پر برابر لے جا رہے ہیں، جیسا کہ حکومت نے۔اللہ تعالیٰ اسے جزاء خیر عطا فرمائے۔ اہل بدعت کی کتابوں پر پابندی لگائی ہے۔

۶۔ کسی خاتون کو حرمین میں بغیر برقعہ اور حجاب کے داخلے کی اجازت نہ دی جائے جیسا کہ حکومت عراق کی طرف سے کربلا اور نجف میں کسی عورت کو بغیر برقعہ کے جانے پر پابندی عائد ہے، جبکہ ہم یہاں اللہ کے حرم میں یہ دیکھتے ہیں کہ ایسی خواتین پھرتی ہیں جن کا لباس نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے، اور وہ اپنی زیب و زینت کی نمائش کرتی پھرتی ہیں، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

عالی مرتبت! یہ ہیں وہ تمنائیں جو مسلمانان مشرق و مغرب کے تصورات میں برابر رہتی ہیں، اور انہیں پورے کرنے کی امید آں عالی مرتبت کے سوا کسی سے نہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ ان تمناؤں کو آپ کی کاوشوں کے ذریعہ حقیقت بنا دیں۔ اور اس پر ان شاء اللہ آپ کو عظیم اجر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ آپ کو خیر کی کنجی اور شر کے دروازے بند کرنے والا بنائیں، اور ہماری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ خیریت سے رہیں۔

والسلام مع فائق الاحترام

بندہ محمد شفیع

مفتیٔ پاکستان

صدر دارالعلوم کراچی

یہ خط امیر فیصل کو پہنچا، اور اُن کی طرف سے اُس خط کا جواب مکہ مکرمہ میں شاکر سکندر صاحب مرحوم کے پتے پر اُس وقت پہنچا جب ہم لوگ مدینہ منورہ میں تھے۔ حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ اُس وقت مکہ مکرمہ میں موجود تھے، اور انہوں نے ایک دستی خط کے ذریعے حضرت والد صاحبؒ کو بتایا کہ یہ جواب (غالباً معلم شاکر سکندر صاحب کی طرف سے) مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا ہے، لیکن مدینہ منورہ کے قیام کے دوران ہمیں

وہ خط نہیں ملا تھا۔ جب ہم جدہ پہنچے تو حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس کی نقل وصول کرنے کے لئے امیر فیصلؒ کے دفتر پہنچے، تو وہاں اچانک وزیر خارجہ کی گاڑیاں آ گئیں، ان کی جگہ بنانے کے لئے ایک فوجی گاڑی کو پیچھے ہٹا کر ڈرائیور نے دیوار سے لگایا، تو وہاں مولاناؒ کھڑے تھے، وہ گاڑی اور دیوار کے درمیان دب گئے، اور شور کرنے پر گاڑی ہٹائی، تو وہ کافی زخمی ہو چکے تھے۔ پاکستانی سفارت خانے کی معرفت ایک ہسپتال میں کئی روز زیر علاج رہنا پڑا، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہڈی سلامت تھی، اس لئے چند دن علاج کے بعد صحت ہوگئی، لیکن اس حادثے کی وجہ سے تمام تر توجہ اُس کی طرف ہوگئی، اور ہماری روانگی کا وقت آ گیا۔ اس لئے امیر فیصل کے جواب کی کوئی نقل نہ مل سکی۔

مزید ملاقاتیں

مکہ مکرمہ کے قیام کے دوران اور بھی قابل ذکر ملاقاتیں ہوئیں۔ شیخ رشید فارسی مکہ مکرمہ کے بڑے علم دوست بزرگ تھے۔ انہوں نے مدرسہ صولتیہ میں پاک و ہند کے علماء کے اعزاز میں ظہرانہ دیا جس میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ امیر تبلیغی جماعت اور مدرسہ صولتیہ کے مہتمم مولانا محمد سلیم صاحبؒ بھی تشریف فرما تھے۔ حضرت والد صاحبؒ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ:

> "کھانے کے بعد حضرت شیخ الحدیثؒ نے ایک مشورہ طلب کیا کہ آج مولوی محمد سعید صاحب امیر جماعت تبلیغ مکہ مکرمہ حیات الصحابہ کی جلد ثانی لے کر مفتی اکبر محمد ابن ابراہیم صاحب کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے شکایت کے لہجہ میں کہا کہ مولانا محمد یوسف صاحب اتنے عرصہ سے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں، مگر ہم سے ملاقات کا ارادہ نہیں فرمایا۔ مولانا سعید نے کچھ علالت طبع اور کثرت مشاغل کا عذر بیان کیا، مگر اب مشورہ طلب بات یہ تھی کہ اس وقت ملاقات کرنا مناسب ہے یا نہیں۔ مولانا سلیم صاحب کی رائے ہوئی کہ اب مناسب نہیں۔ پہلے ہوتا تو مناسب تھا۔ مگر شیخ الحدیث اور احقر کی رائے یہ ہوئی کہ ان حضرات سے ملاقات ہونا ہی چاہیے، پہلے ہوتی تو زیادہ بہتر تھا اب بھی مضائقہ نہیں۔ اس لیے طے یہ ہوا کہ عصر کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ احقر بھی جائے۔ ١٠ بجے مولانا سعید صاحب مولانا یوسف صاحب کو لے کر سورتی ہوٹل ہماری جائے قیام پر پہنچ گئے۔ میں اور مولوی نور احمد صاحب ساتھ ہوئے۔ مفتی اکبر کے

مکان پر پہنچے تو ان کے بھائی عبدالملک ابن ابراہیم بھی یہیں موجود تھے۔میں نے مولانا محمد یوسف صاحب اور جماعت تبلیغ کا تعارف کرایا، پھر مولانا محمد یوسف صاحب نے اپنی دعوت اور طریق دعوت کے متعلق کچھ تفصیل بتلائی۔مفتی اکبراور عبدالملک صاحب خوش ہوئے اور دعاء دیتے رہے۔قبیل مغرب ان سے رخصت ہوکر حرم شریف پہنچے۔"

مدینہ منورہ میں

۴رمحرم ۱۳۸۴ھ کو حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ مدینہ منورہ حاضر ہونے کی سعادت ملی ۔ یہاں بھی حرم شریف کی حاضری کے علاوہ حضرت والد صاحبؒ نے علماء اور ذمہ دار حضرات سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھا ۔ چنانچہ جامعہ مدینہ منورہ کے اصول تفسیر کے استاذ شیخ سلیم بن سالم بن سرحان شُرّاب جو فلسطین کے باشندے تھے، حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات کیلئے جائے قیام پر تشریف لائے ۔ان سے ملاقات کا ذکر حضرت والد صاحبؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔

"ان حضرات سے اس بات پر تفصیلی گفتگو کی کہ یہاں کے عام علماء کا رخ صرف فروعی مسائل اور اجتہادی اختلاف کی طرف دیکھتا ہوں ،اور اجماعی منکرات بلکہ کفر والحاد کا جو سیلاب اس ملک کو سب طرف سے گھیر چکا ہے، اور حرمین کے اندر داخل ہو چکا ہے، اس کی طرف التفات نہیں ۔مسائل اجتہادیہ میں کسی جانب کو ترجیح تو دی جاسکتی ہے مگر جانب مخالف کو باطل یا منکر نہیں کیا جاسکتا جس کا ازالہ واجب ہو اور غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ حضرات جس چیز کو علمی جہاد اور دینی خدمت سمجھ کر اپنی پوری توانائی اس میں خرچ کر رہے ہیں وہ یہی مفروغ عنہا مسائل اور غیر منکر پر انکار کی فہرست میں داخل ہیں اور جن معاملات میں وہ عنداللہ وعندالخلق مسؤل ہیں ان کی طرف ادنی التفات نہیں۔مسجد نبوی کے سامنے یورپ سے درآمد کیے ہوئے مجسمات اور تماثیل کا بازار لگا ہوا ہے اس کے اوپر ہی ہیئۃ الامر بالمعروف کا دفتر ہے مگر ان کو یہ کام منکر نظر نہیں آتا بلکہ ائمہ مجتہدین کے اختلافی مسائل اور مقلدین کے اعمال کو منکر سمجھنے اور اسی کے ازالہ میں لگے ہوئے (ہیں)۔

غضب یہ ہے کہ مسجد نبوی (میں) ننگی ساقوں والی عورتیں بے تکلف پھرتی ہیں کیا یہ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذاء کا سبب نہیں مگر یہاں کے علماء قبر کے سامنے کسی کے نزدیک کھڑے ہوجانے کو جتنا منکر سمجھتے ہیں اور اس کے لیے پولیس کے انتظامات کرتے ہیں بقیع میں عورتوں کے داخلہ کے لیے پولیس استعمال کرتے ہیں ان کو اس طرف التفات نہیں ہوتا کہ پولیس کا استعمال ان سے زیادہ اس میں ہونا چاہیے کہ مجمع علیہ منکرات سے حرم شریف کو بچایا جائے۔ کسی عورت کو بغیر پورے برقعہ کے حرم میں داخلہ کی اجازت نہ دی جائے، مگر آپ حضرات کو توحنفی شافعی کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ادھر دھیان کیسے ہو۔ شیخ سلیم ماشاء اللہ سلیم ہی ہیں پوری گرم جوشی سے میری باتوں کو تسلیم کیا، اور اس کے مطابق کوشش کا وعدہ فرمایا۔ اسی مجلس میں شیخ عبدالکریم مدنی بھی تشریف لے آئے تھے۔ مغرب تک مجلس رہی۔"

عاشوراء کے دن جامعہ مدینہ منورہ کے ایک اور مؤثر استاذ شیخ عطیہ سے ملاقات کا تذکرہ حضرت والد صاحبؒ نے اس طرح فرمایا ہے۔

"آج رباطِ بخاری میں قاری عباس صاحب نے دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا بعد ظہر کھانے سے فراغت کے بعد اصطفا منزل میں آرام کیا۔ عصر سے عشاء تک حرم شریف میں رہے۔ یہاں شیخ عطیہ استاد و ناظم تعلیم جامعہ مدینہ ملاقات کے لیے صفہ کے قریب حصیات[1] پر میرے پاس تشریف لائے، فروعی مسائل پر پوری توانائی صرف کرنا اور اصول و مہمات سے صرفِ نظر کرنا جو یہاں کے حضرات میں مشاہدہ ہوتا تھا اس کا ذکر موصوف سے بھی آیا، اور حرمین کے منکرات کا تفصیلی ذکر ہوا۔ شیخ عطیہ شیخ الجامعہ ہیں شیخ ابن باز صاحب کے خاص معتمد اور امتحانات وتعلیمات کے ناظم بھی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت اچھے عالم ہیں ہر علم وفن میں دستگاہ ہے، اور مہماتِ اسلام کی طرف اعتناء بھی۔ موصوف نے بڑی گرم جوشی سے موافقت فرمائی اور فرمایا کہ اس طرح کے مذاکرات کا سلسلہ مسلسل ہوتا رہے تو ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا۔ مفتی اکبر اور امیر فیصل کو

---

(۱) اس وقت مسجد نبوی کی موجودہ توسیع نہیں ہوئی تھی، اور صفہ کے نیچے کی طرف کنکریوں کا صحن تھا، انہی کو "حصیات" کہا گیا ہے۔

جومذکرات احقر نے دیے تھے ان کو بھی پڑھا، بہت پسندیدگی اورضرورت کا اظہار فرمایا۔احکام القرآن مصنفہ احقر بزبان عربی کے چنداجزاء مستقلہ جو مستقل رسالوں کی صورت میں میرے ساتھ تھے، ان کاذکرآ گیاتوان کے دیکھنے کے لیے اشتیاق کا اظہارکیا،اس کے مطابق صبح کو یہ رسائل ان کے پاس بھیج دیے۔انہوں نے شیخ الجامعہ سے اس کا تذکرہ کیاتوانہوں نے بھی فرمایا کہ مفتیٔ پاکستان اگراجازت دیں،توہم اس کی طباعت کاانتظام یہاں کردیں۔میرے پیش نظر پہلے سے یہ تھا کہ یہ عربی زبان کے رسائل پاکستان کے لیے اتنے مفید نہیں جتنے یہاں ،اس لیے وعدہ کیا کہ میں اُن پر نظر ثانی کرکے بھیج دوں گا۔"

حضرت والد صاحبؒ کے ایک ہم سبق مولانا مغیث الدین صاحب بجنوری ملاقات کے لیےتشریف لائے ۔مختلف مسائل پر گفتگو رہی ۔نیز شیخ عطیہ نے ناشتے پر مدعو کیا جہاں مولانا ناظم ندوی صاحبؒ بھی مدعو تھے ۔اُسی دن نماز عشاء کے بعد معلوم ہوا کہ جامعہ کے سب سے بڑے عالم استاذ التفسیر شیخ محمد امین شنقیطی (مؤلف اضواء القرآن)حضرت والد صاحبؒ سے ملاقات کے لیے جائے قیام پرتشریف لائے۔یہ وہی بزرگ ہیں جن کی تفسیر "اضواء القرآن" اب شائع ہوکر اہل علم میں بہت مقبول ہوچکی ہے، اُس وقت اُس تفسیر کی صرف پہلی جلد شائع ہوئی تھی ، وہی اُنہوں نے حضرت والد صاحبؒ کو پیش کی ، اوردیرتک تفسیر القرآن بالقرآن کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے ۔مفتیٔ اکبراورامیر فیصل کو جو یادداشتیں حضرت والد صاحبؒ نے بھیجی تھیں،اُن کا ذکر آیا،توبڑی قوت سے اُن کی تائید فرمائی،اوردیرتک اسی پر گفتگو رہی کہ موجودہ دور کے بہت سے علماء کوصرف فروعی اختلافات کی اہمیت نے مہمات اسلام سے غافل کررکھا ہے۔موصوف نے بھی اس سلسلہ کی اپنی بعض مساعی کا ذکر کیا کہ امیر فیصل جب جامعہ میں آئے توتفسیر قرآن کے ضمن میں یہی اموران کے گوش گزار کیے گئے تھے۔

جامعہ کے ایک اوراستاذ شیخ عبدالقادر صاحب استاذ بعدمغرب حرم شریف میں حضرت والد صاحبؒ کے پاس تشریف لائے۔آپ سے سال گزشتہ کی ملاقات تھی ۔شیخ عبدالعزیز بن صالح رحمہ اللہ امام حرم مدنی ورئیس القضاۃ سے گزشتہ سال آپ ہی نے حضرت والد صاحبؒ کی ملاقات کرائی تھی۔مولانا نوراحمد صاحبؒ امام حرم شیخ عبدالعزیز صالحؒ کے پاس گئے اورمفتیٔ اکبراورامیر فیصل کودیئے ہوئے مذکرات ان کوسنائے شیخ نے ان کو

سنا،مجلس میں اور بھی بہت سے علما وفضلاء موجود تھے۔سب نے تجاویز سے نہ صرف اتفاق کیا بلکہ ان کی ضرورت کا اظہار فرمایا۔

۱۵رمحرم کو بعد عصر مدینہ منورہ سے روانگی تھی ۔عصر کے متصل شیخ عطیہ تشریف لائے ،اور حضرت والد صاحبؒ کے رسائل جو احکام القرآن کا حصہ ہیں، ساتھ لائے اور فرمایا کہ ان میں سے چار کا میں مکمل مطالعہ کر چکا ہوں، بہت مفید پایا۔بعض مواقع میں کچھ مشورے بھی دیے۔

رخصت سے کچھ قبل جب کہ ہم سب سامان اور بستر ے باندھ چکے تھے اچانک شیخ الجامعہ عبدالعزیز بن باز بھی رخصتی ملاقات کے لیے ہمارے کمرہ میں تشریف لے آئے۔استاذ عطیہ ساتھ تھے۔یہاں اس وقت بیٹھنے کے لیے کوئی بوریہ بھی نہ تھا۔فوراً ایک بندھا ہوا بستر کھول کر شیخ کو اس پر بٹھایا۔ان کی سادگی اور مسافرنوازی کا گہرا اثر دل پر ہوا۔اور بیٹھ کر جو کلمہ فرمایا وہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے،فرمایا کہ یہ دنیا ساری ہی نزول وارتحال کا نام ہے ، پھر بہت دعائیں دے کر رخصت چاہی۔ہم بھی فوراروانگی کی فکر میں تھے،ان کو رخصت کر کے رخصتی سلام کے لیے حرم شریف میں چلے گئے اور کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو ٹیکسی تیار تھی۔روانگی کے وقت حضرت والد صاحبؒ یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

تَلَفَّتُّ نحو الحيّ حتى وجدتني وجعت من الإصغاء ليتا وأخدعا

یعنی "میں اپنے قبیلے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھتا رہا، یہاں تک کہ میری گردن کی رگیں دکھنے لگیں۔"

مدینہ منورہ سے واپسی پر جدہ میں قیام کیا ، اُسی میں حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ کے ہسپتال میں داخل ہونے کا واقعہ پیش آیا جو اوپر لکھ چکا ہوں ۔ جب ان کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا،تو حضرت والد صاحبؒ اور ہم دونوں بھائی عمرے کے لئے گئے ، دو راتیں وہاں قیام کیا ، اور پھر جدہ واپس آئے ۔حضرت مولانا نور احمد صاحبؒ اُس وقت تک الحمد للہ سفر کے قابل ہو چکے تھے ۔ چنانچہ ۲۰رمحرم ۱۳۸۴ھ کو حج کے اس مبارک سفر سے واپسی ہوئی ۔ اللہ تعالیٰ نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے علاوہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی معیت میں بیشمار فوائد عطا فرمائے ۔

حضرت والد صاحبؒ نے اس سفر میں جو کوششیں فرمائیں ، اُن کے بعض نتائج بفضلہٖ تعالیٰ آنکھوں سے نظر آئے ۔ مثلاً یہ کہ اُس وقت یہ منظر عام تھا کہ حرم شریف سے نکلتے ہی دوکانوں پر گانے بجانے کا سلسلہ رہتا تھا ، جانداروں کے مجسمے فروخت کے لئے رکھے نظر آتے تھے ، الحمد للہ ، اب یہ تکلیف دہ مناظر

اب نظر نہیں آتے ۔اسی طرح حرم شریف میں بعض مغرب زدہ خواتین کھلی پنڈلیوں کے ساتھ دکھائی دیتی تھیں ،اور حضرت والد صاحبؒ نے اپنے خطوط میں ان باتوں کو بطور خاص ذکر فرمایا تھا۔ چنانچہ غالبًا اس کے بعد ہیئۃ الأمر بالمعروف نے ان باتوں کا نوٹس لے کر ان پر عملی کارروائی کی ۔فروعی اختلافات پر ضرورت سے زیادہ زور دینے میں بھی وقتی طور پر کچھ کمی محسوس ہوئی ۔سعودی علماء کرام کے متوجہ کرنے سے حضرت والد صاحبؒ کے رسالے ''وحدت امت '' کا عربی ترجمہ مولانا صہیب صاحب نے کیا جس کا نام بندے کی تجویز پر''أخلاف أم شقاق ؟''رکھا گیا،اور بعد میں اُسے بڑے پیمانے پر وہاں تقسیم کیا گیا۔افسوس ہے کہ بعد میں کچھ انتہا پسند حضرات نے ان کوششوں کو مزید آگے بڑھنے نہ دیا،اور ابھی اس سلسلے میں اور کام کی ضرورت باقی ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ـــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اٹھائیسویں قسط)

تدریس

حج کے یہ واقعات ۱۹۶۴ء کے ہیں۔ اُس وقت دارالعلوم میں میرے سپرد ایک تو تدریس تھی، دوسرے فتویٰ نویسی کی مشق بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیرِ نگرانی جاری تھی۔ تیسرے میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایماء سے اپنے طور پر انگریزی اور کچھ عصری مضامین پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا تھا۔ ان تینوں کاموں کا کچھ خلاصہ یہاں پیش کرتا ہوں۔

دارالعلوم میں میری تدریس بالکل ابتدا سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ آگے بڑھتی رہی، اور سلم العلوم اور میبذی کے سوا درس نظامی کی تمام کتابیں پڑھانے کی نوبت آئی۔ ہمارے استاذِ مکرم حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے تدریس کا یہ طریقہ سیکھا تھا کہ پہلے طالب علم سے عبارت پڑھواتے، اور اگر پڑھنے میں کوئی غلطی ہوتی، تو اس کی اصلاح فرماتے، اور غلطی کی وجہ خود طالب علم ہی سے نکلوانے کی کوشش کرتے۔ پھر جو عبارت پڑھی گئی ہے، کچھ دیر کے لئے کتاب سے ہٹ کر اُس کا خلاصہ طلبہ کو براہِ راست مخاطب کر کے سمجھاتے تھے، جب یہ اطمینان ہو جاتا کہ طلبہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں، تو دوبارہ کتاب کی طرف لوٹ کر عبارت کا ترجمہ کرتے، اور جو مفہوم سمجھایا تھا، اُس پر عبارت کو منطبق فرماتے تھے۔ میں نے تدریس کے دوران اسی طریقے کی اتباع کی، اور اُس کا بہت فائدہ محسوس کیا۔ حضرت استاذ رحمہ اللہ تعالیٰ کی ہمیں یہ بھی تلقین تھی کہ جب درس سے پہلے کتاب کا مطالعہ کرو، تو اُس وقت ہی خود سمجھنے کے ساتھ یہ بھی سوچا کرو کہ یہ مضمون طلبہ کو آسان انداز میں کس ترتیب سے اور کس طرح سمجھانا ہے کہ طالب علم کے ذہن پر کم سے کم بوجھ پڑے۔ چنانچہ میرا معمول یہ رہا کہ جس علم کی بھی کوئی کتاب پڑھانی ہوتی، اُس کی عربی شروح، بلکہ دوسری

خارجی کتابوں کا بھی مطالعہ کرتا، لیکن طلبہ کے سامنے صرف اتنی بات عرض کرتا جسے وہ آسانی سے ہضم کرسکیں۔

ہمارے طرز تعلیم اور کالجوں یونی ورسٹیوں کے طرز تعلیم میں یہ بڑا فرق ہے کہ وہاں کتاب پڑھانے سے زیادہ جو علم پڑھایا جارہا ہے، اس کی اہم باتوں کو لیکچروں کی مدد سے سمجھایا جاتا ہے، لیکن عام طور پر کوئی کتاب باقاعدہ نہیں پڑھائی جاتی۔ اس سے اُس علم کے بنیادی مسائل تو طالب علم سمجھ لیتا ہے، لیکن چونکہ کسی خاص کتاب کے ساتھ مناسبت نہیں ہوتی، اس لئے اگر خود اپنے مطالعے سے کچھ سمجھنا چاہے، تو عموماً اس کی عادت نہیں پڑتی۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں کسی بھی علم کی کسی کلاس کی کتاب کو اُس علم کے سمجھانے کے لئے بنیاد بنایا جاتا ہے، اور طالب علم کو کتاب سے وابستہ کردیا جاتا ہے جس سے اُسے خود براہ راست کتابوں کے مطالعے اور اس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی عادت پڑتی ہے۔ لیکن بعض اوقات کتاب حل کرنے کی کوشش میں اتنا مبالغہ کیا جاتا ہے کہ کتاب کی تعبیرات اصل بن جاتی ہیں، اور علم پیچھے رہ جاتا ہے۔ نیز بعض اوقات کتاب کو اس طرح پڑھایا جاتا ہے کہ مصنف کے خلاف اٹھنے والے ہر اعتراض کا جواب دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، اور مصنف سے کوئی غلطی ہوئی ہو، تو اس کی بھی تاویل کرنا ضروری سمجھ لیا جاتا ہے۔

افراط و تفریط کے درمیان معتدل راستہ یہ ہے کہ اصل میں مقصود علم سکھانا ہو، اور ساتھ ساتھ کتاب سے طالب علم کی اتنی مناسبت پیدا کردی جائے کہ وہ اس علم کی کتابوں کا خود مطالعہ کرنا چاہے، تو اُسے دشواری نہ ہو۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے استاذ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کا طرز تدریس یہی تھا کہ وہ صرف کتاب نہیں، بلکہ کتاب کے ساتھ علم پڑھایا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہم نے جو کتابیں پڑھیں، ان میں ان کا بھی یہی طریقہ دیکھا، اور اُس پر خود بھی عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے لئے صرف زیرِ درس کتاب کے بجائے اُس علم کی دوسری کتابوں سے بھی مدد لینی پڑتی تھی۔

تفسیر کی تدریس

دارالعلوم میں تیسرے درجے سے ہر سال ترجمۂ قرآن کریم کا ایک سبق ہوتا تھا۔ اُس کے تمام حصے مختلف سالوں میں پڑھانے کی نوبت آئی، اور تفسیر جلالین بھی پڑھائی، لیکن مجھے یہ احساس تھا کہ تفسیر قرآن کریم کا کوئی زیادہ معیاری درس بھی ہونا چاہئے۔ اس کے لئے میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے

یہ درخواست کی کہ دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے طرز پر دورۂ تفسیر بھی شروع کیا جائے، اور اُس کے لئے یہ تجویز دی کہ تفسیر کی کوئی مفصل کتاب پڑھانا تو ایک سال میں ممکن نہیں ہے لیکن یہ کیا جاسکتا ہے کہ جس طرح دورۂ حدیث میں استاذ اور طالب علم کے سامنے متن حدیث کی کوئی کتاب ہوتی ہے، اور استاذ اُس کی مختلف شروح کا مطالعہ کرکے اہم مباحث کا خلاصہ تقریر کی صورت میں بیان کرتا ہے، اسی طرح متن قرآن کریم طلبہ اور اساتذہ کے سامنے ہو، اور استاذ مختلف تفاسیر کا خود مطالعہ کرکے اہم تفسیری مباحث تقریر کی صورت میں بیان کرے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس تجویز کو پسند فرمایا، اور قرآن کریم کے دس دس پارے تین مختلف اساتذہ پر تقسیم کرکے انہیں اسی طرح پڑھانے کا حکم دیا۔ میرے پاس سورۂ شعراء سے آخر تک کا حصہ آیا، اور میں نے اس کو بڑی دلچسپی سے اس طرح پڑھایا کہ اہم تفاسیر، تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری، تفسیر قرطبی اور بالخصوص امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر کبیر کا مطالعہ کرکے اہم تفسیری مباحث کا خلاصہ طلبہ کے سامنے پیش کرتا تھا۔ اس دوران تفسیر کبیر کا تقریباً باستیعاب مطالعہ کرنے کا موقع ملا، اور اندازہ ہوا کہ اُس کے بارے میں جو کسی نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ: "فیہ کلّ شیء إلاّ التفسیر" (یعنی اس میں تفسیر کے سوا سب کچھ ہے) وہ اس تفسیر پر کتنا بڑا ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے جس انضباط کے ساتھ تفسیری مسائل کو مرتب انداز میں پیش کیا ہے، اس کی کوئی نظیر کسی اور تفسیر میں موجود نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے کلامی مسائل کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان فرمایا ہے، لیکن یہ سب کچھ وہ تفسیر کی وضاحت کے بعد کرتے ہیں اور ان کے زمانے میں اس کی ضرورت بھی تھی، لیکن اس کی وجہ سے ان کی تفسیری قدر وقیمت کو کسی طرح کم نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر نظمِ قرآن کریم اور آیات کریمہ کے باہمی ربط پر ان کا کلام عام طور سے بڑا اطمینان بخش ہوتا ہے۔ بہرحال! اُس سال تفسیر کے اس درس سے مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ بعض طلبہ نے میری یہ تقریر ضبط بھی کی۔ خاص طور پر مولانا محمد اسحاق جہلمی نے (جو اس وقت دارالعلوم میں دورۂ حدیث کے استاذ ہیں) اُسے بڑے اہتمام سے ضبط کیا۔

حدیث کی تدریس

اس طرح ہوتے ہوتے ہماری تدریس مشکوۃ شریف تک پہنچ گئی۔ اور اس کے بعد دورۂ حدیث کا بھی کوئی سبق ملنے لگا۔ جہاں تک یاد ہے، سب سے پہلے ابن ماجہ کا درس میرے سپرد ہوا۔ اُس وقت ادارہ تحقیقات اسلامی کے سربراہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب تھے، اور ان کے منفرد نظریات کا بڑا شور تھا۔ "سنت"

کے بارے میں ان کے کچھ عجیب وغریب نظریات تھے جن کا آخری نتیجہ احادیث پر عدم اعتماد کی صورت میں نکلتا تھا۔ میں نے ابن ماجہ کا سبق شروع کرنے سے پہلے ایک مفصل مقدمۃ العلم طلبہ کے سامنے بیان کیا جس میں علم حدیث کی بنیادی معلومات کے ساتھ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے نظریہ سنتِ جاریہ پر تفصیل سے گفتگو کی، اور اُسے منضبط بھی کرلیا۔ یہ بحث اب میرے اردو مقالات میں شائع ہورہی ہے۔ اس کے بعد مختلف سالوں میں سنن نسائی، طحاوی اور شمائل ترمذی پڑھانے کی نوبت آئی۔ اسی دوران موطأ امام مالکؒ کا درس میرے حصے میں آیا۔ مجھے اُس وقت یہ احساس ہوا کہ چار امہات کتب (بخاری، ترمذی، مسلم اور ابوداود) کے سوا باقی تمام کتابوں میں جو جزوی طور پر پڑھائی جاتی ہیں، کتاب الطہارۃ اور کتاب الصلوۃ ہی کا تکرار ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے جب موطأ امام مالکؒ مجھے پڑھانے کو ملی، تو میں نے سوچا کہ اسے ابتدا سے پڑھانے کے بجائے کتاب البیوع سے پڑھانا میرے اور طلبہ کے لئے زیادہ مفید ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس کی "کتاب البیوع" شروع کرادی۔ اس وقت مجھے اس کی مشکلات کا اندازہ نہیں تھا لیکن جوں جوں درس آگے بڑھا، اس کی مشکلات کا اندازہ ہوا، اور بعض مقامات پر تو دانتوں پسینہ آگیا۔ درحقیقت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی فقہی اصطلاحات ان کی اپنی خصوصیت ہیں، اور بعض اوقات ان کو سمجھنے کے لئے مطالعے میں کئی کئی گھنٹے صرف ہوجاتے تھے، اور موطأ کی جتنی شروح مہیا تھیں، ان سب کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اس کا فائدہ مجھے یہ ہوا کہ مالکی فقہ کا اسلوب کچھ نہ کچھ دسترس میں آگیا۔

ہمارے دورۂ حدیث میں پڑھنے کے وقت سے صحیح بخاریؒ کا درس حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی دیا کرتے تھے۔ اور ترمذی کا درس حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا۔ یہ دونوں بزرگ یکے بعد دیگرے دارالعلوم سے چلے گئے، تو صحیح بخاریؒ کا درس حضرت والد صاحب قدس سرہ نے اپنے ذمے لے لیا، اور جامع ترمذی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منتقل ہوگئی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع میں ہمارے لسبیلہ ہاؤس کے مکان ہی میں مقیم تھے، اور ہفتے میں دو چار مرتبہ دارالعلوم شرافی تشریف لاتے تھے، لیکن جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں، ۴ اپریل ۱۹۶۳ء مطابق ۹ ذیقعدہ ۱۳۸۲ھ سے انہوں نے اپنے شہر کے کاموں کو سمیٹ کر صحیح بخاریؒ کے درس کی خاطر دارالعلوم ہی میں رہائش کا فیصلہ فرمالیا تھا۔ لسبیلہ کے مکان میں ہمارے دونوں بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب (رحمہ اللہ تعالیٰ اور جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم مقیم رہے) والدین کے دارالعلوم میں منتقل ہونے کی وجہ سے ہمیں بھی یہ سہولت ہوگئی تھی کہ ابتک ہم والدین سے دور دارالعلوم میں قیام پر مجبور تھے۔ اب الحمد للہ

والدین کے سائے میں گھر کی سہولتیں میسر آ گئیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کی ہمہ وقت صحبت اور خدمت سے جو محرومی تھی، وہ دور ہوئی، اور اب حضرتؒ کی براہ راست تربیت میسر آ گئی، اور ان کے کاموں کو بھی سمجھنے کا موقع ملا۔

لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ کی مصروفیات اتنی مختلف انداز کی تھیں کہ اس کے لئے آپ کو لمبے لمبے سفر بھی کرنے پڑتے تھے، اور بکثرت شہر کی آمدورفت بھی رکھنی پڑتی تھی، اس لئے آخر کار صحیح بخاریؒ کا درس نبھانا آپ کے لئے مشکل ہوگیا، اور اب آپ نے یہ درس حضرت مولانا سحبان محمود صاحبؒ کی طرف منتقل کرنے کا فیصلہ فرمالیا جو اُس وقت تک جامع ترمذیؒ پڑھایا کرتے تھے۔ چونکہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد دارالعلوم کی نظامت تعلیمات بھی تھی، اس لئے وہ صحیح بخاریؒ کے درس کے ساتھ ترمذی کا درس جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ سوال پیدا ہوا کہ ترمذی کا درس جو دورۂ حدیث میں بڑا اہم سمجھا جاتا ہے، وہ کس کے سپرد کیا جائے؟ اس موقع پر حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب قدس سرہ کو تجویز دی کہ اب یہ سبق تقی کو منتقل کر دیا جائے۔ مجھے اپنی بے بضاعتی اور نااہلی کا احساس تھا، اس لئے شروع میں تأمل ہوا، لیکن بڑوں کے حکم کی وجہ سے میں نے یہ سوچا کہ جب اپنی طلب کے بغیر بڑے کوئی کام سونپ دیں تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ان شاء اللہ توفیق بھی ملے گی۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کا نام لیکر یہ درس شروع کرادیا، اور پھر تقریباً بیس سال یہ سبق میرے پاس رہا۔ شروع میں اس درس کے مطالعے میں مجھے تقریباً تین چار گھنٹے لگ جاتے تھے۔ میرا حافظہ کمزور تھا، اس لئے میں مطالعے کے دوران یادداشتیں تیار کرتا، اور درس سے پہلے ان پر ایک نظر ڈال لیتا تھا۔ درس کی تقریر میں نے پہلے سال املاء کرائی، لیکن بعد میں املاء کا طریقہ چھوڑ دیا، اور ایران کے ایک طالب علم مولوی عطاء اللہ صاحب نے جو تقریر ضبط کی تھی، وہ کئی سال میں نے اپنے سامنے رکھی، اور ہر سال اُس میں حذف واضافہ کرتا رہا۔ حاشیے پر اکثر اپنے مآخذ کے حوالے بھی لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ جس سال میرے بھانجے مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ [1] (جو ماشاء اللہ اب خود جامع ترمذی کے مقبول استاذ ہیں) دورۂ حدیث سے فارغ

---

(۱) جس وقت یہ تحریر لکھی گئی تھی، اس وقت مولانا رشید اشرف صاحب بقید حیات تھے، اور جامع ترمذی کا درس دیتے تھے لیکن افسوس ہے کہ آج جب یہ تحریر شائع ہورہی ہے، وہ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یکم جنوری ۲۰۱۹ء کو ان کی وفات ہمارے لئے اور ان کے ہزاروں جاں نثار ساتھیوں کے لئے بہت بڑا سانحہ تھی اور ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر آتا ہے کہ: ع: خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

ہوئے، اور انہوں نے میری تقریر ترمذی کو تحقیق وتخریج کے ساتھ مرتب کرنے کا ارادہ ظاہر کیا، تو میں نے اپنی یادداشتیں بھی انہیں دیدیں، اور پھر انہوں نے ماشاء اللہ اتنی قابلیت اور تحقیق ونکتہ رسی کے ساتھ اُسے مرتب کیا اور اُس میں اپنی طرف سے گراں قدر اضافے بھی کئے کہ وہ بفضلہ تعالیٰ "درس ترمذی" کے نام سے شائع ہوئی، اور ترمذی کے اساتذہ اور طلبہ کے لئے ایک مأخذ بن گئی۔ افسوس ہے کہ مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ کے سر بہت سی انتظامی ذمہ داریاں آگئیں، جن کی وجہ سے وہ اپنا کام تین جلدوں میں کتاب الطلاق تک پہنچا سکے۔ ادھر طلبہ کا اصرار تھا کہ باقی ماندہ تقریر بھی جلدی طبع ہو۔ ان کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے مولانا عبداللہ میمن صاحب سلمہ نے (جو اس وقت دار العلوم کی شاخ بیت المکرم کے ناظم ہیں) باقی ابواب کی تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے محفوظ کرلی، اور یہ خیال ظاہر کیا کہ اُسے جوں کی توں کسی مزید تحقیق وتخریج کے بغیر شائع کردیا جائے، اور مولانا رشید اشرف صاحب کو جب موقع ملے، وہ ان ابواب پر بھی اپنا تحقیقی کام جاری رکھیں۔ میں نے اس تجویز کو اس طرح منظور کرلیا کہ یہ حصہ "درس ترمذی" کے بجائے "تقریر ترمذی" کے نام سے شائع ہوجائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کتاب الطلاق سے آگے کتاب البیوع وغیرہ کے ابواب تقریر ترمذی کے نام سے شائع ہوگئے جو الحمد للہ طلبہ کی ضرورت پوری کررہے ہیں، لیکن ان پر ابھی اُس طرح کا کام باقی تھا جیسا مولانا رشید اشرف صاحب سلمہ نے "درس ترمذی" پر کیا تھا۔ چنانچہ دار العلوم کے ایک اور فاضل ومحقق مولانا ابوبکر احسان صاحب سلمہ نے جو مردان میں ایک بڑے مدرسے اور مرکز تحقیق کے سربراہ ہیں، بذات خود بڑی قابلیت اور تحقیق سے یہ کام شروع کیا، اور اب وہ مکمل ہوکر شائع ہونے والا ہے۔

تقریباً بیس سال میں جامع ترمذی ہی پڑھاتا رہا اور صحیح بخاریؒ ہمارے محبوب استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہوتی تھی۔

۲۰۰۸ء میں عید الاضحیٰ کے بعد حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر ان کے فقہی مذاکرے میں شرکت کے لئے میں ہندوستان روانہ ہوا۔ مذاکرہ بہار کے دار الحکومت پٹنہ میں ہونا تھا، جس کے بعد میرا ارادہ لکھنو، دیوبند، تھانہ بھون وغیرہ حاضر ہونے کا تھا، اور پھر دہلی سے میری سیٹ لندن کے لئے بک تھی کیونکہ مجھے وہاں ایک اجتماع میں شرکت کرنی تھی۔ میں دہلی سے ہوتا ہوا پٹنہ پہنچا، اور مذاکرے میں شریک ہوا، لیکن دوسرے ہی دن مجھے وہاں بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کا فون پہنچا، اور انہوں نے یہ جانکاہ خبر دی کہ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہ وفات پاگئے ہیں۔ اس صدمے نے

مجھے ہلا دیا۔ اور میں اپنا باقی تمام سفر ملتوی کر کے افتاں خیزاں واپس کراچی پہنچا۔ حضرتؒ کی نہ آخری زیارت مقدر میں تھی، اور نہ جنازے اور تدفین میں شرکت۔ پورا دارالعلوم سوگوار تھا۔ حضرتؒ کی وفات سے کئی جہتوں میں زبردست خلا پیدا ہوا، اور خاص طور سے صحیح بخاریؒ کے درس کا معاملہ بہت اہم تھا۔ حضرت بھائی صاحب دامت برکاتہم نے حکم فرمایا کہ اب صحیح بخاریؒ کا درس تمہیں دینا ہوگا۔ دوسرے اساتذہ بھی اسی تجویز پر متفق تھے۔ میں ایک عالمِ حیرت میں تھا۔ کہاں صحیح بخاریؒ اور کہاں میں؟ اس تجویز پر عمل کرنا ایک جسارت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن بڑوں کا حکم تھا، اس لئے اپنی نااہلی کے احساس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر یہ ذمہ داری لی، اور اس سال میں نے اپنی دوسری مصروفیات اور اسفار کو کم کر کے زیادہ توجہ صحیح بخاریؒ کے درس کو دی، اور اُس کے لئے تین چار گھنٹے روزانہ مطالعہ کا معمول بنایا جس میں بخاری کی بیشتر شروح مطالعے میں رہتیں، لیکن متعدد تجربات کے بعد میں نے مطالعے کی اصل بنیاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی "لامع الدراری" اور کتاب الصلوٰۃ کی ابتدا تک حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر بخاری، یعنی "فضل الباری" کو بنایا۔

چند سال صحیح بخاریؒ کی دونوں جلدیں پڑھانے کی نوبت آئی۔ اس دوران مولانا انور حسین صاحب نے جو چند سال پہلے دارالعلوم سے فارغ ہوئے تھے، میری تقریر بخاری کو ٹیپ کر کے اُسے قلم بند کرنا بھی شروع کر دیا جو بعد میں " انعام الباری "کے نام سے انہوں نے شائع کی، اور اب تک اُس کی گیارہ جلدیں شائع ہوئی ہیں۔ چند سال بعد میں نے بخاری شریف کی جلد ثانی اپنے لائق وفائق بھتیجے مولانا محمود اشرف عثمانی صاحب کے سپرد کر دی جسے انہوں نے بڑی قابلیت اور افادیت کے ساتھ پڑھایا۔ پھر انہیں دل کا شدید دورہ ہوا، جس کے نتیجے میں ایک سال وہ تدریس سے بالکل قاصر رہے، تو دوبارہ دونوں جلدوں کی خدمت کی توفیق ہوئی۔ پھر چند سال جلد ثانی کا بیشتر حصہ انہوں نے پڑھایا، اور کچھ حصہ میں نے۔ الحمد للہ اب کئی سال سے ایک بار پھر جلد ثانی مکمل طور پر وہی پڑھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی صحت عمر اور علم وعمل میں برکت عطا فرمائیں، اور ان کے فیوض کو جاری وساری رکھیں۔ آمین۔
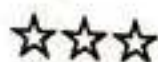
☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ـــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(انیتسویں قسط)

فتویٰ کی تربیت

شروع میں تدریس کے دو گھنٹوں کے علاوہ باقی وقت فتویٰ کی تربیت حاصل کرنے میں صرف ہوتا تھا جس کے لئے "درمختار" کا مقدمہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خود پڑھایا، اور "امدادالفتاویٰ" کے بغور مطالعے کی تاکید فرمائی۔ اور اس کا طریقہ یہ بتایا کہ پہلے سوال پڑھنے کے بعد خود سوچنا چاہئے کہ اگر یہ سوال مجھ سے کیا جائے، تو میں اس کا کیا جواب دوں گا؟ اگر کوئی جواب سمجھ میں آجائے تو پھر حضرتؒ کا جواب پڑھکر دیکھیں کہ میرے جواب میں اور حضرتؒ کے جواب میں کیا فرق ہے؟ نیز حضرتؒ نے اپنے جواب میں جو فقہی عبارتیں نقل فرمائی ہیں، اُن سے یہ جواب کس طرح نکل رہا ہے؟ اگر وجہِ استدلال ان عبارتوں کو پڑھکر واضح ہوجائے تو خیر، ورنہ جس کتاب کا حوالہ جواب میں دیا گیا ہے، اُس کی طرف رجوع کرکے اس کے سیاق وسباق کو دیکھا جائے۔ پھر اس بات پر بھی نظر رکھی جائے کہ حضرتؒ نے جواب دینے کے لئے کیا اسلوب اختیار فرمایا ہے؟ حضرت والد صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ محض فقہی کتابوں کی جزئیات یاد کرلینے سے فتویٰ کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی، بلکہ فتویٰ کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو کسی ماہر اور صاحب بصیرت مفتی کی صحبت میں رہ کر اور اس کی نگرانی میں مدت تک کام کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ ہر علم وفن کا حال یہ ہے کہ اُس کے منضبط قواعد واصول ایک حد تک تو کام دیتے ہیں، لیکن واقعات پر ان کو منطبق کرنے کے لئے کوئی دو اور دو چار قسم کا لگا بندھا اصول نہیں بتایا جاسکتا۔ وہاں انسان کا وہ ذوق اور ملکہ ہی کام دیتا ہے جو ماہرین کی صحبت اور تربیت کے نتیجے میں انسان کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اگر کسی نے فقہ کی کتابیں ازبر یاد کرلی ہوں، لیکن کسی ماہر فقیہ اور مفتی کی صحبت میں رہکر فتویٰ کی تربیت نہ لی ہو، اُس کے لئے

فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔

نیز دارالعلوم دیوبند سے استعفاء دینے کے بعد بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ کے پاس بہت سے استفتاء آیا کرتے تھے۔ان فتووں کی نقل کا کوئی باقاعدہ انتظام تو نہیں تھا، لیکن خاص خاص فتووں کی نقل حضرت والد صاحبؒ نے متفرق طور پر محفوظ رکھی ہوئی تھی۔ان فتاویٰ کو مرتب کرنے کا کام بھی حضرت والد صاحب قدس سرہ نے مجھ سے شروع کرایا۔مقصد یہ تھا کہ ان کے فتویٰ کے مزاج ومذاق سے فی الجملہ آگاہی ہوتی رہے۔اس کے علاوہ روزانہ ہمیں کوئی نہ کوئی استفتاء دیدیا جاتا کہ ہم کتابوں کی مدد سے ان کا جواب لکھیں۔یہ جواب لکھنے کے بعد روزانہ تو حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھایا جاتا، لیکن ہفتے میں تین دن حضرت والد صاحب قدس سرہ بذاتِ خود شہر سے دارالعلوم تشریف لاتے، اور بہت سے سوالات کے جواب خود ملاحظہ فرما کر ان کی تصحیح فرماتے تھے۔اسی زمانے میں ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم تشریف لائے، تو عصر کی نماز پڑھائی، اور اُس کی پہلی یا تیسری رکعت میں سجدے کے بعد سیدھے کھڑے ہونے کے بجائے چند لمحوں کے لئے بھول کر بیٹھ گئے، لیکن فوراً ہی یاد آنے پر کھڑے ہوگئے، اور چونکہ چند لمحوں کے لئے بیٹھے تھے، اس لئے سجدۂ سہو نہیں کیا۔حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے نماز کے بعد حضرت والد صاحبؒ سے فرمایا کہ ایسی صورت میں سجدۂ سہو کرنا چاہئے تھا۔حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ سجدۂ سہو اُس وقت واجب ہوتا جب میں تین تسبیحات کی مقدار بیٹھا ہوتا۔چونکہ اتنی دیر نہیں بیٹھا تھا، اس لئے سجدۂ سہو واجب نہیں تھا۔حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے امداد الفتاویٰ میں مطلق بیٹھنے پر سجدۂ سہو کرنے کو فرمایا ہے، چاہے وہ کتنا کم ہو۔حضرت والد صاحبؒ نے امداد الفتاویٰ منگوا کر دیکھا، تو اُس میں ایک سائل نے منیۃ المصلی کے حوالے سے مسئلہ وہی لکھا تھا جو حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ نے بیان فرمایا، لیکن ساتھ ہی کچھ دوسری کتابوں سے اس کے خلاف بھی نقل کیا تھا۔اس کے جواب میں حضرت حکیم الامتؒ نے تحریر فرمایا تھا کہ:

> "مجھ کو بھی مدت سے تردد ہے، مگر عمل اس پر ہے کہ بجرد جلوس سجدۂ سہو کرتا ہوں، لا لأنه ترک السنة، بل لتاخیر القیام۔اور ایک تسبیح کی قدر تو عادۃً جلوس ہو ہی جاتا ہے۔اس میں ذرا غور کیجئے۔"

اس طرح امداد الفتاویٰ سے حضرت مفتی رشید احمد صاحبؒ کی تائید ہوئی، لیکن چونکہ حضرت تھانویؒ نے تردد کا بھی اظہار فرمایا تھا، اس لئے دونوں بزرگوں نے چاہا کہ اس مسئلے کی قدرے مفصل تحقیق ہو جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ دونوں بزرگوں نے اس کی تحقیق کے لئے مجھے مأمور فرمایا۔ اس حکم کی تعمیل میں میں نے ایک تحریر لکھی جس میں راجح اسی کو قرار دیا گیا کہ تین تسبیحات سے کم تاخیر میں سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا، بلکہ جتنی مقدار شافعی مسلک میں جلسۂ استراحت کی ہوتی ہے، اس میں بھی سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا۔ یہ تحریر میں نے دونوں بزرگوں کو دکھائی، اور پھر دونوں نے اس کی تصدیق فرمائی، بلکہ حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تائید میں کچھ مزید عبارتوں کی نشاں دہی فرمائی جو میں نے اُس تحریر میں شامل کیں۔ یہ تحریر یکم محرم ۱۳۸۰ھ کو لکھی گئی تھی، اور حضرت والد صاحبؒ نے امداد الفتاویٰ کی اگلی طباعت میں اُسے مذکورہ بالا مقام پر ایک حاشیہ کے طور پر شائع بھی فرما دیا۔ اس حاشیے کے شروع میں حضرت والد صاحبؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"اس مقام کی تحقیق پر ایک حاشیہ برخوردار مولوی محمد تقی سلمہ نے لکھا ہے جو میرے نزدیک صحیح ہے۔ " (امداد الفتاویٰ ج ۱ ص: ۳۵۲ سوال ۴۴۵)

اسی زمانے میں حضرت مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہمارے دیسی کوّے کے بارے میں ایک استفتاء آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ کسی مفتی صاحب کا ایک مفصل جواب بھی تھا جس میں انہوں نے اس کی حرمت پر دلائل دیئے تھے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے اس کی تحقیق کے لئے مجھے مأمور فرمایا، اور میں نے اُس کا مفصل جواب لکھا جو جماعت تہجد کے فتوے کے بعد میرا دوسرا مفصل فتویٰ تھا جو ایک رسالے کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ فتویٰ ۴/ربیع الاول ۱۳۸۰ھ کو لکھا گیا تھا، اور اب احسن الفتاویٰ ج:۷ ص:۱۴۱ پر شائع بھی ہوا ہے۔ اس زمانے کے کچھ فتاویٰ اب میرے "فتاویٰ عثمانی" میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ آخر میں ہمیں ایک تحقیقی مقالہ لکھنے کے لئے دیا گیا جس کا موضوع خود حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "بیع الحقوق" تجویز فرمایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ہمارے دور میں بہت سے حقوق کی بیع کا رواج ہو گیا ہے، مثلاً حقوق اشاعت، امپورٹ لائسنس، گڈول وغیرہ۔ ان کے بارے میں تحقیق کی جائے کہ ان کی خرید و فروخت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ اگرچہ حقوق اشاعت کے بارے میں حضرت والد صاحب قدس سرہ کا ایک رسالہ "ثمرات التقطیف فی حقوق التالیف" کے نام سے پہلے سے لکھا ہوا تھا (اور اب "جواہر الفقہ" میں شامل ہے) لیکن حضرت والد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ زمانے کے نئے مسائل کے بارے میں ہمیشہ غور وفکر اور نظر ثانی کا عمل جاری رکھتے تھے، اس لئے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس موضوع پر مزید تحقیق کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ ہم کئی طالب علموں نے اس موضوع پر مقالے لکھے۔ لکھنے کو تو میں نے بھی لکھ لیا، لیکن دل اُس پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، اور خود حضرت والد صاحبؒ نے بھی اس پر مزید تحقیق جاری رکھنے کا عندیہ دیا۔ افسوس ہے کہ حضرت والد صاحبؒ کی حیات میں اس کام کو آگے بڑھانے کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ جب مجمع الفقہ الاسلامی جدہ میں یہ موضوع زیر بحث آیا، تو میں نے اس پر مفصل مقالہ لکھا جو " بیع الحقوق " کے نام سے میری کتاب " **بحوث فی قضایا فقهیة معاصرة** " میں شائع ہوا ہے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ٹیلی فون پر بھی بہت سے مسائل پوچھے جاتے تھے۔ شروع میں ہمیں ان کی تاکید یہ تھی کہ ہم سائل سے خود سوال سُن کر حضرت والد صاحبؒ کو نہ پہنچایا کریں، بلکہ خود سائل سے براہ راست بات کرایا کریں، تاکہ سوال سمجھنے میں کوئی غلطی نہ رہ جائے، پھر جب رفتہ رفتہ فتویٰ کی تربیت کو ایک عرصہ گزر گیا، تو اس بات کی اجازت دیدی کہ سائل سے سوال سُن کر حضرت والد صاحبؒ سے نقل کردیں، اور والد صاحبؒ کا جواب اُن کو پہنچادیں۔ اس کے کچھ عرصے کے بعد اس کی بھی اجازت مل گئی کہ اگر کوئی آسان اور غیر مشتبہ سوال ہو، تو اس کا جواب خود بھی دیدیا کریں۔

تخصص فی الفتویٰ کی مدت تو اس طرح پوری ہوگئی، لیکن اس کے بعد بھی فتویٰ نویسی کا سلسلہ مستقل جاری رہا، اور بفضلہٖ تعالیٰ آج تک جاری ہے، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں کوئی فتویٰ انہیں دکھائے بغیر جاری نہیں کیا گیا۔ آپ کی وفات کے بعد عموماً اپنے استاذ گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب اور کبھی حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب قدس سرہما کو دکھا کر فتویٰ جاری کیا جاتا تھا۔ ان حضرات کی وفات کے بعد ڈرڈر کر صرف اپنے دستخط سے بھی فتاویٰ جاری کرنے شروع کئے، پھر جو طلبہ تخصص میں فتویٰ کی مشق کرتے تھے، ان کے فتاویٰ پر نظر ثانی کا سلسلہ بھی شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔ ان فتاویٰ میں بسا اوقات ان کی لکھی ہوئی عبارت کو بھی یکسر بدلنا پڑتا تھا، اور مسائل کی تصحیح بھی کرنی پڑتی تھی، یہاں تک کہ وہ ایک بالکل نیا فتویٰ ہوجاتا تھا، لیکن وہ اسی طالب علم کے نام سے ہماری تصدیق کے ساتھ جاری ہوتا۔

اب میرے خود لکھے ہوئے فتاویٰ کو عزیزم مولانا زبیر حق نواز صاحب سلمہ نے چار جلدوں میں

"فتاویٰ عثمانی" کے نام سے مرتب کردیا ہے جو چھپ چکی ہیں، اور وہ پانچویں جلد پر کام کررہے ہیں۔

فتویٰ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے، اور اُس میں غلطی کا ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے، اور بعض اہل علم کی طرف سے بعض اوقات بندہ کے فتاویٰ اور دوسری تحریروں کے بارے میں کچھ سوالات یا تجویزیں آتی رہتی ہیں، الحمد للہ تعالیٰ میں ان پر غور کرتا ہوں، اور جہاں اپنی کوئی غلطی سامنے آجاتی ہے، اس سے رجوع کرلیتا ہوں، یا اپنی عبارت میں تبدیلی کرلیتا ہوں، اور جہاں اشکال صحیح معلوم نہیں ہوتا، وہاں اس کی وضاحت کردیتا ہوں۔ اس غرض کے لئے ماہنامہ البلاغ میں ایک سلسلہ جاری کیا ہوا ہے جو پہلے "غلطی ہائے مضامین" کے نام سے شائع ہوتا تھا، اور اب "اصلاح وایضاح" کے نام سے شائع ہوتا ہے۔ میں اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے کہ بفضلہ تعالیٰ بندے کے فتاویٰ اور تحریریں اہل علم کی نظر سے گذرتی رہتی ہیں، اور اس طرح میں ان کی آراء سے مستفید ہوتا رہتا ہوں۔

انگریزی کی تعلیم

دارالعلوم میں تدریس کے دوران مجھے یہ شوق بھی تھا کہ میں نے انگریزی پڑھنے کا بھائی ولی رازی صاحب مدظلہم سے جو سلسلہ شروع کیا تھا، وہ کسی نہ کسی طرح جاری رہے۔ گرامر کی بالکل ابتدائی اور بنیادی باتیں تو انہوں نے پڑھادی تھیں، لیکن میرے پاس انگریزی کا ذخیرۂ الفاظ (vocabulary) بہت کم تھا۔ چنانچہ میں نے ساتویں جماعت کا ایک ریڈر لیکر اُسے پڑھنا شروع کردیا۔ پڑھانے والا کوئی میسر نہ آیا، تو مولانا محمد اسحاق جہلمی صاحب سلمہ جو اُس وقت درجۂ ثانیہ میں پڑھتے تھے، اور ان کی ایک آدھ کتاب میں بھی پڑھاتا تھا، وہ چونکہ میٹرک کئے ہوئے تھے، اس لئے وہ ریڈر میں ان سے پڑھنے لگا، اور کچھ دنوں میں اس قابل ہوگیا کہ کسی نہ کسی طرح عبارت پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہوگئی۔ انگریزی الفاظ زبان پر چڑھتے نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ میرے بڑے بھائی جناب مولانا محمد ولی رازی صاحب مدظلہم کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ اس کے لئے انہوں نے مجھے یہ نصیحت کی تھی کہ انگریزی عبارت بلند آواز سے پڑھا کرو، چاہے اس کے لئے کتنا اٹکنا پڑے۔ چنانچہ میں نے اس نصیحت پر عمل کیا تو الفاظ زبان پر چڑھنے لگے، اور پھر رفتہ رفتہ پڑھنے میں روانی آگئی۔

الحمد للہ! انگریزی پڑھنے کے شوق میں کبھی یہ خواہش دور دور دل میں پیدا نہیں ہوئی کہ اس کے ذریعے کوئی اچھی ملازمت حاصل کی جائے، یا اُسے دنیوی مفادات کا ذریعہ بنایا جائے۔ البتہ اصل داعیہ یہ تھا کہ اس

زبان کے ذریعے ایک طرف مغربی افکار وخیالات سے باخبر ہوسکوں، اور دوسری طرف دین کا پیغام ان حلقوں تک ان کی ذہنیت سمجھ کر پہنچا سکوں جو انگریزی ماحول ہی میں پلے بڑھے ہیں، اور روایتی دینی حلقوں تک ان کی پہنچ نہیں ہے۔

دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد میرا ارادہ یہ تھا کہ پرائیویٹ طور پر میٹرک سے شروع کر کے ایم اے تک پہنچوں۔ لیکن تدریس اور افتاء کی معروفیات کے ساتھ میٹرک کے تمام مضامین کا امتحان دینا مشکل تھا۔ اُس زمانے میں پنجاب یونی ورسٹی کے تحت السنہ شرقیہ (مشرقی زبانوں) کی ڈگریوں کا انتظام تھا۔ اردو کے لئے بالترتیب تین ڈگریاں ادیب، ادیب عالم اور ادیب فاضل کی تھیں، فارسی کے لئے منشی، منشی عالم اور منشی فاضل اور عربی کیلئے مولوی، مولوی عالم اور مولوی فاضل کے امتحانات ہوا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے ان امتحانات کی تیاری کرانے کے لئے جیکب لائن میں ایک ادارہ "ادارۂ شرقیہ" کے نام سے قائم کیا ہوا تھا، اور وہ ہمیں اس کی ترغیب بھی دیتے رہتے تھے۔

جو کوئی شخص ان امتحانات میں سے کوئی پاس کئے ہوئے ہوتا، اُسے یہ سہولت مل جاتی تھی کہ وہ صرف انگریزی میں امتحان دیکر میٹرک اور ایف اے کی سند لے سکتا تھا۔ دارالعلوم کی تعلیم کے بعد میرے لئے مولوی فاضل (جسے بعد میں فاضل عربی کہنے لگے تھے) کا امتحان دینا کچھ مشکل نہیں تھا۔ اس لئے میں نے پرائیویٹ امیدوار کے طور پر اس امتحان کے لئے اپنے آپ کو رجسٹر کرالیا، اور آسانی سے اُس کا امتحان دیا جس میں مجھے پوری یونی ورسٹی میں پہلی پوزیشن بھی ملی۔

اس کے بعد میں نے میٹرک کی تیاری شروع کی۔ اس وقت کوئی باقاعدہ استاد میسر نہیں تھے۔ میٹرک کی نصابی کتابیں میں نے خرید لی تھیں، اور کبھی کسی سے، کبھی کسی سے انہیں پڑھتا رہا۔ عربی صرف ونحو سے چونکہ مجھے مناسبت تھی، اس لئے انگریزی گرامر میں مجھے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ بھائی محمد ولی رازی صاحب مدظلہم نے دو مہینے میں مجھے گرامر کی جو بنیادیں سکھا دی تھیں، ان کے بعد میں اس قابل ہوگیا تھا کہ انگریزی گرامر کی کتاب خود پڑھ کر اس کی مشق کرسکوں۔ چنانچہ اس دور میں میٹرک کے نصاب میں Wren and Martin کی جو کتاب مقبول عام سمجھی جاتی تھی، وہ میں نے خود پڑھنی شروع کردی، اور جہاں کوئی دشواری معلوم ہوتی، کسی سے پوچھ کر کام چلا لیتا تھا۔ لیکن انگریزی زبان کی لغات (vocabulary) میں مجھے

بہت کمزوری کا احساس رہتا تھا۔

چونکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اس بات کی ضرورت محسوس فرماتے تھے کہ کم از کم کچھ لوگ ایسے تیار ہوں جو اسلامی علوم میں مہارت کے ساتھ انگریزی زبان سے بھی واقف ہوں، اور اس زبان میں دین کی خدمت کر سکیں، اس لئے حضرت والد صاحب قدس سرہ نے دارالعلوم میں اختیاری مضمون کے طور پر انگریزی پڑھانے کے لئے ایک استاذ رکھ لیا تھا۔ یہ جناب ماسٹر محمد سلطان صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ انہیں انگریزی پڑھانے کا عمر بھر کا تجربہ تھا، اور ساتھ ہی ماشاء اللہ وہ اتنے عبادت گذار تھے کہ دوسروں کے لئے قابل رشک۔ جماعت میں وہ ہمیشہ صف اول میں نظر آتے تھے، اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ان کی جماعت تو کجا، کوئی ایک رکعت بھی کبھی چھوٹی ہو۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ان سے مختلف ریڈر پڑھے، اور لکھنے کی مشق کی۔ انہیں گرامر پڑھانے کا بھی بڑا وسیع تجربہ تھا۔ لیکن ان سے گرامر ترتیب کے ساتھ پڑھنے کے بجائے میں صرف ان مواقع پر ان سے رجوع کرتا جہاں مجھے کسی کی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ انگریزی گرامر میں ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ کا مضمون ایسا ہے جس کی نظیر عربی یا اردو فارسی میں موجود نہیں ہے، اور اس درجے کے طلبہ کو وہ خاصا مشکل بھی معلوم ہوتا ہے، لیکن چونکہ میں نے اس کا بنیادی اصول اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اس لئے مجھے اس میں کوئی مشکل محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ ماسٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پورے ایک صفحے کی بڑی لمبی عبارت مجھے ڈائریکٹ سے ان ڈائریکٹ میں تبدیل کرنے کے لئے دی، مجھے الحمدللہ اسے تبدیل کرنے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے، اور ماسٹر صاحبؒ اُسے دیکھ کر نہ صرف یہ کہ حیران رہ گئے، بلکہ یہ فرمایا کہ گرامر میں تمہیں کوئی شکست نہیں دے سکتا۔

میٹرک کا امتحان مجھے پنجاب یونیورسٹی سے دینا تھا، چنانچہ امتحان کے وقت میں لاہور چلا گیا اور اپنے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں قیام کیا۔ چونکہ میں نے تمام تر تیاری پرائیویٹ طور پر کی تھی، اس لئے مجھے کچھ خوف سا تھا کہ میں ان طلبہ کا مقابلہ کیسے کر سکوں گا جنہوں نے باقاعدہ اسکولوں میں پڑھا ہے۔ بھائی جان مجھے تسلی دیتے، اور فرماتے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ تم اچھی طرح کامیاب ہوگے۔ امتحان کا مرکز دیال سنگھ کالج میں مقرر ہوا، اور میں ڈرتے ڈرتے امتحان گاہ میں پہنچا جو طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ایک عمل یہ بتایا ہوا تھا کہ جب کبھی امتحان گاہ میں جاؤ تو پرچہ کھولنے

سے پہلے دائیں ہاتھ کی پانچ انگلیوں پر " کھیعص " اس طرح پڑھا کرو کہ پہلے چھوٹی انگلی پر کاف کہکر انگلی بند کرلو، پھر ہر حرف پر ایک ایک انگلی بند کرتے جاؤ یہاں تک کہ ص پر پوری انگلیاں بند ہوجائیں، اس کے بعد کہو : کُفِیتُ پھر " حمعسق " اس طرح پڑھو کہ حا کہکر چھوٹی انگلی کھولو، پھر ہر حرف پر ایک ایک انگلی کھولتے جاؤ، یہاں تک کہ جب ساری انگلیاں کھل جائیں تو کہو " : حُمِیتُ " چنانچہ میں اپنے سارے امتحانات میں یہ عمل کرتا آیا تھا، اور الحمد للہ ہمیشہ نمایاں طور پر کامیاب ہوا تھا۔ اس موقع پر بھی میں نے یہی عمل کیا، اور پرچہ کھولا تو اس کا کوئی سوال ایسا نہیں تھا جو مجھے مشکل لگا ہو۔ آخر میں اس میں ایک انگریزی مضمون لکھنے کو کہا گیا تھا۔ میں نے وہ مضمون بھی کئی صفحوں میں لکھا، اور دلچسپ انداز میں لکھا۔ جب نتیجہ آیا تو پتہ چلا کہ مجھے پورے بورڈ میں دوسری پوزیشن ملی ہے۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

اس کے بعد میں نے انٹر کی تیاری شروع کی۔ اس کی کتابیں نسبۃً اونچے معیار کی تھیں۔ اس مرتبہ بھی میں نے مختلف استادوں سے مدد لی۔ پہلے تو ہمارے دارالعلوم کے قریب جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی کی ایک فیکٹری تھی۔ اس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ایک بھائی جناب اقتدار احمد صاحب نے مہربانی سے مجھے پڑھانے کی پیشکش کی۔ میں مغرب کے بعد ان کی فیکٹری میں چلا جاتا۔ وہاں مچھروں کی بھر مار تھی، اور ہم دونوں پڑھائی کے دوران مچھروں سے مسلسل جنگ کرتے رہتے تھے۔ اقتدار صاحبؒ نے ان کے دفعیہ کے لئے سبز رنگ کے کئی کوائل کمرے میں لگالئے تھے جن سے مچھروں کی فوج کو تو کسی قدر شکست ہوئی، لیکن ان کوائلوں کے دھویں سے کمرہ بھرا رہتا، اور ان کی بدبو بھی خوب پھیلتی۔ دھویں کی کثرت سے میرے سر میں درد ہوجاتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ انہیں بہت جزائے خیر عطا فرمائیں، انہوں نے بڑی محبت سے کچھ دن پڑھایا۔ پھر کسی عذر کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ اور بعد میں نہ جانے کس طرح وہ کتاب پوری کی۔ ایک دوسری کتاب جو درحقیقت ایک قدیم ناول تھی، میں نے جناب ماسٹر سلطان صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھنی شروع کی جو خاصی مشکل تعبیرات پر مشتمل تھی۔ انہوں نے ماشاء اللہ بڑی توجہ سے پڑھائی۔ مگر مجھے اپنی تدریس اور فتویٰ کے کاموں کے بعد انگریزی کے لئے وقت کم ملتا تھا، اس لئے میں اس کتاب کو درساً پوری نہ کرسکا، اور آخر کار ذاتی مطالعے پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ یکم محرم ۱۳۸۳ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۹۶۳ء کو امتحان شروع ہوا، جوں توں کرکے امتحان دیدیا، اس میں پوزیشن تو کوئی نہ ملی لیکن نمبر اچھے خاصے (غالباً سیکنڈ ڈویژن کے)

آ گئے۔ امتحان میں کامیابی کی اطلاع مجھے میری ڈائری کے مطابق ۱۷/ اگست ۱۹۶۳ء مطابق ۲۶/ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ کو ملی۔

بی اے کا امتحان

بی اے کرنے کے لئے انگریزی کے ساتھ دو مزید مضمون لینے ضروری تھے۔ میں نے معاشیات (اکنامکس) اور علم سیاست (پولیٹیکل سائنس) کو اختیار کیا۔ پولیٹیکل سائنس تو میں نے محض معلومات میں اضافے کے لئے اختیار کی تھی، اور اُس کے لئے تو مجھے کسی استاذ کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی، کیونکہ اس کی نصابی کتابیں مطالعے سے بہ آسانی سمجھ میں آجاتی تھیں۔ البتہ معاشیات کے لئے کسی استاد کی رہنمائی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ اور معاشیات کا مضمون میں اس لئے پڑھنا چاہتا تھا کہ بدلتی ہوئی زندگی میں کسی بھی قوم کی کامیابی اور فتح یابی میں اُس کے نظام معیشت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی تھی، اور جس وقت کا میں ذکر کررہا ہوں، اُس وقت دنیا سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت کے متضاد نظاموں میں بٹی ہوئی تھی، اور دونوں نظریات میں مسلسل ٹھنڈی جنگ جاری تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام نے غریب اور امیر کے درمیان جو مہیب فاصلے پیدا کر رکھے تھے، اور ان سے جو خرابیاں پیدا ہوئی تھیں، ان کے ردعمل میں اشتراکیت کا غلغلہ پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا، اور سرمایہ داری کے نظام سے اکتائے ہوئے اسلامی ملکوں میں بھی اشتراکیت کی طرف رجحان بڑھ رہا تھا، بلکہ اشتراکیت کے معاشی نظام کو اسلام کے عین مطابق قرار دینے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ میں عمومی نعروں سے ہٹ کر ان دونوں نظاموں کی فلسفیانہ بنیادوں کو بھی سمجھنا چاہتا تھا، اور یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کون سا نظریہ اسلامی احکام سے کہاں مختلف ہے، اور اُسے کہاں غلطی لگی ہے۔

معاشیات کا علم چونکہ اب بہت آگے بڑھ چکا ہے، اور اُس کی بہت سی شاخیں ہوگئی ہیں، اس لئے صرف مطالعے کی بنیاد پر اُسے پڑھنا مشکل یا کم از کم ناقابل اعتبار ہوتا۔ چنانچہ مجھے کسی استاذ کی تلاش تھی جو اُس وقت دارالعلوم میں میسر نہیں تھا، اور نہ میرے لئے یہ بات قابل عمل تھی کہ میں شہر جاکر کسی تعلیمی ادارے میں پڑھوں، کیونکہ دارالعلوم میں میری تدریس، فتویٰ اور تصنیف کی خدمات جاری تھیں اور دارالعلوم سے شہر آنے جانے کیلئے گھنٹے درکار تھے۔ بالآخر میرے ایک دوست جناب حسن الزماں اختر صاحب جو حضرت مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ کے داماد تھے، اور اسٹیٹ بینک کے اسلامی ریسرچ کے شعبے کے سربراہ، وہ اس شرط پر مجھے معاشیات پڑھانے کے لئے تیار ہوگئے کہ میں انہیں ہدایہ اخیرین پڑھاؤں۔ اور طے یہ ہوا کہ ہفتے میں کچھ دن

شام کے وقت میں ان کے گھر جاؤں، اور کچھ دن وہ دار العلوم آئیں۔ اس طرح ان سے میں نے معاشیات پڑھنی شروع کی۔ سیموئیلسن کی کتاب جو بی اے کے نصاب میں داخل تھی، اُس میں مجھے بھی اور انہیں بھی ضرورت سے زیادہ تطویل نظر آئی۔ لہٰذا انہوں نے ایک اور کتاب کو بنیاد بنا کر پڑھانا شروع کیا جس میں اتنی تطویل نہیں تھی۔ جواباً میں انہیں ہدایہ پڑھاتا رہا جس میں بعد میں میرے بڑے بھائی اور انگریزی میں میرے پہلے استاذ جناب مولانا محمد ولی رازی صاحب بھی شریک ہوگئے۔ اختر صاحب جب کسی اجنبی سے میرا تعارف کراتے تو کہتے کہ: "یہ میرے استاد ہیں" اور جواباً میں ان کے بارے میں کہتا کہ: "یہ میرے استاد ہیں" سننے والا نہ صرف حیران ہوتا، بلکہ بعض اوقات ہماری سنجیدگی پر بھی شک کرتا، لیکن باتیں دونوں ہی درست تھیں۔

پڑھنے کو تو میں نے اختر صاحب سے معاشیات کی کتاب پڑھ لی، لیکن مجھے بہت سی باتوں میں یہ تشنگی رہ گئی تھی کہ میں نے جس مقصد سے اس موضوع کا انتخاب کیا تھا، اُس مقصد کے لحاظ سے میں کسی بامعنی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ چنانچہ میری تشنگی کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جو ان موضوعات پر کچھ تحقیقی کام کر چکا ہو، اور اُسے تدریس کا بھی تجربہ ہو۔

جماعت اسلامی کے معروف رہنما جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ سے میرے بڑے اچھے تعلقات تھے۔ وہ علمی اور تحقیقی ذہن کے بزرگ تھے، اور مجھ پر اُس وقت سے شفقت فرماتے تھے جب میں نیا نیا دورۂ حدیث سے فارغ ہوا تھا، اور تخصص میں پڑھنا شروع کیا تھا۔ اُس وقت میری عمر سترہ سال تھی، اور میں نے اپنی پہلی کتاب، "ضبط ولادت" پر لکھی تھی۔ پروفیسر صاحب موصوف نے اُس پر ایک جان دار مقدمہ بھی لکھا تھا۔ میں نے اُن سے اپنی اس الجھن کا ذکر کیا تو اُنہوں نے یہ مشفقانہ پیشکش کی کہ میرے پاس اپنی تدریس کے زمانے کی کچھ یادداشتیں موجود ہیں۔ ان کی مدد سے میں آپ کو کچھ اہم موضوعات پڑھا سکتا ہوں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ اس کام میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں نے ان کی پیشکش سے پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے پاس حاضر ہونا شروع کر دیا، اور غالباً ہفتہ عشرہ یا دو ہفتے ان کے تجربہ کارانہ لیکچروں سے خوب خوب مستفید ہوا۔ اس ہفتے دو ہفتے کی تعلیم نے معاشیات کے مضمون سے متعلق میرے ذہن کے بہت سے کانٹے نکال دیئے، اور ایک مربوط انداز میں اُس کے مباحث میری سمجھ میں آگئے، اور میں از خود معاشیات کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ پھر اسی کو بنیاد بنا کر میں نے دوسری کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔

اس سے پہلے سرمایہ داری اور اشتراکیت کے موضوعات پر محض صحافیانہ اور واعظانہ تبصرے تو بہت پڑھے تھے، لیکن دونوں نظریات کی فلسفیانہ بنیادوں سے خاطر خواہ آگاہی نہیں تھی۔ اب اس مطالعے کے نتیجے میں

دونوں نظریات کی فلسفیانہ بنیادیں سمجھ میں آگئیں، اور یہ بھی پتہ چل گیا کہ اسلامی احکام سے ان دونوں کا کہاں کہاں اختلاف ہے؟ چنانچہ اسی کے بعد میں نے تینوں نظاموں کے تقابل پر پہلے دارالعلوم میں درس دیا، پھر تکملہ فتح الملہم کی کتاب البیوع کے آغاز میں عربی میں یہ مضمون بیان کیا۔ اور پھر اپنی کتاب "اسلام اور جدید معیشت وتجارت" میں قدرے تفصیل کے ساتھ اس کی وضاحت کی۔

بہر حال! انگریزی کے ساتھ معاشیات اور سیاسیات کے مضامین کے ساتھ میں نے بی اے کرلیا۔ بی اے کے امتحان میں نمبر اتنے تو نہیں آئے جتنے میٹرک اور انٹر میں آئے تھے، لیکن الحمد للہ سیکنڈ ڈویژن میں کامیابی ہوگئی۔ اور مؤرخہ ۱۶/اپریل ۱۹۶۶ء کو مجھے بی او ایل (بیچلر آف اورینٹل لرننگ) کی ڈگری ملی جو بی اے ہی کے برابر تھی۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ـــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تیسویں قسط)

ایل ایل بی اور قانون کی تعلیم

بی اے کے بعد شروع میں خیال تھا کہ معاشیات ہی میں ایم اے کروں، لیکن اس کے لئے تنہا مطالعہ کافی نہیں تھا۔ دوسرے حقیقت یہ ہے کہ معاشیات میری ذاتی دلچسپی کا موضوع نہیں تھا۔ میں اُسے صرف مذکورہ بالا ضرورت ہی کی وجہ سے پڑھنا چاہتا تھا، اور تعارف کی وہ ضرورت بی اے میں بڑی حد تک پوری ہوگئی تھی۔ اب اس کی دوسری فنی بحثوں پر زیادہ وقت صرف کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف میں قانون کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا، تاکہ قانون کے میدان میں بھی اپنی بساط کی حد تک دین کی کوئی خدمت انجام دے سکوں۔

اس کے لئے مجھے ایل ایل بی کرنا تھا۔ لیکن ایل ایل بی میں دشواری یہ تھی کہ اُس کا امتحان پرائیویٹ طور پر نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس کے لئے کسی لاء کالج میں داخلہ ضروری تھا۔ کراچی میں اُس وقت دو لاء کالج تھے۔ ایک اردو لاء کالج جس میں ذریعۂ تعلیم اردو تھا، اور دوسرے ایس ایم لاء کالج جس میں تعلیم انگریزی میں ہوتی تھی۔ ایس ایم لاء کالج اپنے معیارِ تعلیم کے لحاظ سے بھی مشہور تھا، اور چونکہ قانون کی زبان انگریزی تھی، اس لئے قانون اور اصول قانون کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے مناسب یہی تھا کہ قانون کی تعلیم انگریزی ہی میں حاصل کی جائے۔ دوسری طرف دشواری یہ تھی کہ میرے لئے روزانہ دارالعلوم سے روزانہ ایس ایم لاء کالج جا کر پڑھنا اپنی دارالعلوم کی مصروفیات کے ساتھ تقریباً ناممکن تھا۔ اس دشواری کے حل کے لئے میں ایس ایم لاء کالج کے پرنسپل جناب عزیز اللہ شیخ صاحب سے جا کر ملا، وہ ایک قابل استاذ، وکیل اور اُس وقت نیشنل عوامی پارٹی سندھ کے غالباً صدر تھے۔ میں نے ان سے اپنی دشواری بیان کی۔ کہنے لگے کہ وکالت کرنی ہے تو باقاعدہ پڑھے بغیر کیسے کروگے؟ میں نے عرض کیا کہ اول تو میں قانون وکالت کرنے کے لئے پڑھنا نہیں چاہتا، نہ میرا

یہ ارادہ ہے کہ وکالت کروں، بلکہ میں ریسرچ کے مقصد سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ دوسرے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں نے دارالعلوم میں فقہ اچھی طرح پڑھنے کی کوشش کی ہے، اس لئے قانونی باتیں سمجھنے کے لئے مجھے استاد کی ضرورت کم ہوگی۔ کچھ اسی قسم کی باتیں میں نے پرنسپل صاحب سے کیں۔ کچھ دیر کی ملاقات میں وہ رام ہوگئے، اور انہوں نے کہا: " اچھا! آپ بس ضروری حد کالج آجایا کریں۔ ہم آپ کا نام اپنے کالج کی طرف سے امتحان کے لئے بھیج دیں گے۔ البتہ ہمارے فنکشنوں میں ضرور شریک ہوں"۔

داخلہ ہوجانے کے بعد میں نے قانون کی نصابی کتابیں اردو اور انگریزی دونوں میں خرید لیں، اور گھر پر ان کا تھوڑا تھوڑا مطالعہ کرتا رہا، اور پرنسپل صاحب کے فرمانے کے مطابق کبھی کبھی کالج چلا جاتا تھا۔ اگرچہ یونی ورسٹی کی طرف سے اس کی اجازت تھی کہ اردو کتابوں کے ذریعے تعلیم حاصل کی جائے، اور اردو ہی میں امتحان دیا جائے۔ چنانچہ اردو کالج میں قانون کی تعلیم اردو ہی میں ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ ابتک خود ہمارے قانون کی اصل زبان انگریزی ہے، اس لئے مجھے اردو میں قانون پڑھنا ایسا ہی معلوم ہوا جیسے کوئی فقہ کا عالم بننے کیلئے فقہی کتابیں عربی میں پڑھنے کے بجائے اُن کا اردو ترجمہ پڑھے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح وہ فقہ میں مہارت پیدا نہیں کرسکتا، اور نہ فقہ کے اصل مآخذ تک پہنچنے کی صلاحیت اُسے حاصل ہوسکتی ہے۔ دوسری طرف میرا مقصد صرف امتحان دینا اور ڈگری حاصل کرنا نہیں تھا، بلکہ میں واقعۃً قانون کی فہم حاصل کرنا چاہتا تھا، اور میری خواہش تھی کہ اس کے اصل مآخذ تک میری براہ راست رسائی ہو، اس لئے میں نے اصل انگریزی کتابوں ہی کے ذریعے نصاب پڑھا، البتہ جن کتابوں کے اردو ترجمے دستیاب تھے، وہ بھی سامنے رکھے، تاکہ جہاں ضرورت ہو، ان سے مدد لی جاسکے۔

عام طور سے لوگ گیس پیپرز خرید کر ان کی مدد سے تیاری کرتے ہیں، لیکن میں نے یہ راستہ کبھی اختیار نہیں کیا، کیونکہ مقصود امتحان پاس کرنا نہیں، بلکہ واقعۃً تعلیم حاصل کرنا تھا۔ میں کبھی کبھی کالج بھی چلا جاتا، اور وہاں کسی کلاس میں شریک بھی ہوجاتا، لیکن اصل کام مطالعے ہی کے ذریعے کرتا تھا۔ پرنسپل صاحب کے ایک شاگرد امیر الدین قریشی صاحب تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت فرمائے، انہوں نے کالج ہی کے احاطے میں قانون کی درسی کتابوں کی دوکان بھی کھولی ہوئی تھی۔ ان سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی، اللہ تعالیٰ انہیں بہت جزائے خیر عطا فرمائیں، وہ میرے رجسٹریشن وغیرہ کے کاموں میں بھی میری مدد کرتے تھے، اور مطالعے میں کہیں مشکل پیش آتی تو ان کے ذریعے کسی استاد سے وہ مشکل بھی حل ہوجاتی تھی۔

جب امتحان کا وقت قریب آیا، تو میں نے دارالعلوم سے تقریباً دو ہفتے کی چھٹی لے لی، اور صبح سے لیکر رات گئے تک کتابوں کے مطالعے میں منہمک رہتا، اور اہم کتابوں کے نوٹ ساتھ ساتھ تیار کرتا جاتا تھا۔ جیسا کہ میرا اندازہ تھا، فقہ کی تعلیم نے قانون کو سمجھنا بہت آسان کردیا تھا۔ اس لئے عموماً دشواری پیش نہیں آتی تھی، اور اگر کہیں پیش آتی، تو کالج کے کسی استاد سے حل ہوجاتی تھی۔

جب میں قانون کی کتابیں پڑھتا تھا، تو فقہ سے اُس کا تقابل کرکے قدم قدم پر اپنے فقہاء کرام کی عظمت کا احساس ہوتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ قانون کی وہ زبان جو اپنی جامعیت کے لئے آج مایۂ ناز سمجھی جاتی ہے، ہمارے فقہاء اسلام نے اس سے کہیں زیادہ دقت نظر اور باریک بینی سے فقہ کی کتابیں تالیف فرمائی ہیں۔ خاص طور پر فقہ کے جو معروف متون ہیں، اُنہوں نے جن مختصر الفاظ میں معانی کے دریا ایک کوزے میں سموئے ہیں، ان کی مثال کہیں اور ملنی مشکل ہے۔

اسی طرح قانون میں ایک مستقل موضوع "تعبیر قوانین" (Interpretation of Statutes) کا ہوتا ہے جس میں قانون کی تشریح کے طریقے بیان کئے جاتے ہیں۔ جب میں نے اس کی کتاب پڑھی تو محسوس ہوا کہ ہمارے فقہاء کرام نے اصول فقہ میں عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص، اقتضاء النص اور منطوق اور مفہوم کی بحثیں کرکے تشریح قانون کو جس طرح منضبط فرمادیا ہے، اُس کے آگے "تعبیر قانون" کی یہ کتابیں بچوں کا کھیل معلوم ہوتی ہیں۔

بہر کیف! امتحان کا دن آ گیا، اور میں اس احساس کمتری کے ساتھ امتحان گاہ میں پہنچا کہ میں نے باقاعدہ کلاسوں میں شرکت نہیں کی ہے، اور مطالعے ہی سے کام چلایا ہے، اس لئے میں کالج کے باقاعدہ طالب علموں کا مقابلہ نہیں کرسکوں گا۔ لیکن جب امتحان سے پہلے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملا، تو اندازہ ہوا کہ بہت سی باتیں جنہیں وہ بہت مشکل سمجھ رہے تھے، مجھے بالکل مشکل نہیں لگیں۔ امتحان کے پرچے آئے، تو مجھے ان کے حل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، یہاں تک کہ تمام پرچے پورے ہوگئے۔ جب نتیجہ آیا، تو میں نے دیکھا کہ میرا رول نمبر ان طلبہ کی فہرست میں درج ہے جن کا نتیجہ کسی کارروائی کے نامکمل ہونے کی وجہ سے روک لیا گیا ہے۔ میں کالج پہنچا، اور وجہ معلوم کی تو پتہ چلا کہ کوئی فیس میری نادانستگی میں ادا ہونے سے رہ گئی تھی۔ میں نے وہ فیس اپنے ساتھی امیرالدین قریشی صاحب کو دی، اور انہوں نے اطمینان دلایا کہ وہ فیس جمع کرکے یہ کمی پوری کردیں گے، اور ساتھ ہی انہوں نے چند دن بعد کی

تاریخ دی کہ اُس تاریخ میں میں کالج آ کر اپنا نتیجہ معلوم کرلوں۔ میں نے وہ دن خاصی بے چینی میں گذارے، اور آخر کار معینہ تاریخ اور وقت پر کالج پہنچا تو دیکھا کہ میرے وہ ساتھی کالج کے کچھ دوسرے افراد کے ساتھ میرے استقبال کے لئے کھڑے ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی مبارکباد دینی شروع کردی، میں سمجھا کہ وہ میری عام کامیابی پر مجھے مبارکباد دے رہے ہیں، لیکن تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے یونی ورسٹی میں دوسری، اور کالج میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔

یہ پہلے سال کی بات تھی۔ دوسرے سال بھی میں نے وہی طریقہ اختیار کیا جو پہلے سال کیا تھا۔ اور آخر کار ایل ایل بی کے دونوں سال الحمدللہ بخیر وخوبی پورے ہوگئے، اور آخر کار ۲۱ر جون ۱۹۶۹ء کو مجھے ایل ایل بی کی ڈگری بھی مل گئی۔

قانون کی تعلیم سے نہ میرا مقصد وکالت کرنا تھا، نہ کبھی عدالتوں میں کام کرنے کا دور دور کوئی ارادہ تھا۔ میں نے تو اس غرض سے ایل ایل بی کیا تھا کہ موجودہ قوانین کا تنقیدی جائزہ لیکر اسلامی قوانین کی تدوین وترتیب کی کوئی خدمت انجام دینے میں آسانی ہو۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایل ایل بی کرنے کے چند سال بعد ہی مجھے پہلے فیڈرل شریعت کورٹ اور پھر سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے جج کی حیثیت میں تقریباً اٹھارہ سال کام کرنے کا موقع ملا جس کی تفصیل ان شاء اللہ میں آگے ذکر کرونگا۔

اور اسی دوران یہ عجیب اتفاق بھی سامنے آیا کہ ایک رات میں سپریم کورٹ میں اگلے دن کے مقدمات کی فائلیں دیکھ رہا تھا، تو ایک فائل میں وکیل کا نام عزیز اللہ شیخ نظر آیا جس سے میں چونکا کہ یہ وہی عزیز اللہ شیخ تو نہیں ہیں جو میرے ایل ایل بی کرنے کے زمانے میں ایس ایم لاء کالج کے پرنسپل تھے۔ اگلے دن میں عدالت میں پہنچا، تو دیکھا کہ وہی اُس مقدمے میں بطور وکیل ہمارے سامنے پیش ہوئے، اور ان کے اسسٹنٹ کے طور پر امیر الدین قریشی صاحب، یعنی میرے وہ ساتھی بھی تھے جو ایل ایل بی کے امتحان کی انتظامی کارروائیوں میں میری مدد فرمایا کرتے تھے۔ مقدمے کے فیصلے کے بعد وہ دونوں میرے چیمبر میں تشریف بھی لائے، اور ان سے دلچسپ گفتگو بھی رہی۔ اور یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ اب وہ دونوں دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مکمل مغفرت فرمائیں۔ آمین۔

ایم اے کا امتحان

اب میں بی اے ایل ایل بی تو ہو چکا تھا، اور جن مضامین کو میں باقاعدہ پڑھنا چاہتا تھا، وہ ایک حد تک

مکمل ہو چکے تھے، اُدھر دارالعلوم کی تدریس میں میں دورۂ حدیث تک پہنچ چکا تھا۔ فتویٰ اور تصنیف کا کام اُس پر مستزاد تھا، اور میری شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس لئے کسی اور تعلیمی مہم جوئی کے لئے میرے پاس وقت نہیں تھا، البتہ لوگ کہتے تھے کہ جب اتنا کیا ہے، تو ایم اے بھی کرلو۔ چنانچہ میں نے دونوں تقاضوں کے درمیان تطبیق کے لئے یہ سوچا کہ کسی ایسے مضمون میں ایم اے کرلوں جس کے لئے زیادہ محنت اور مطالعے کی ضرورت نہ ہو۔ کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اسلامیات کرنا سب سے آسان کام تھا کہ اس کا کوئی خاص معیار ہی نہ تھا، لیکن وہاں ایم اے کرنے سے مجھے غیرت آئی، کیونکہ مجھے اس کا معیار معلوم تھا، اور میں خود ایم اے اسلامیات کے امتحانی پرچے دیکھتا رہا تھا۔ لہٰذا میں نے پنجاب یونی ورسٹی سے عربی زبان کے ایم اے میں پرائیویٹ داخلہ لینے کو ترجیح دی۔ الحمد للہ! دارالعلوم کی تعلیم کے نتیجے میں عربی زبان وادب میرے لئے بہت آسان تھے۔ اس لئے تیاری کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی، اور جتنی نئی کتابیں پڑھنی تھیں، مجھے خود انہیں پڑھنے کا شوق تھا۔ سارے سال تو مجھے نصابی کتابیں پڑھنے کا موقع کم ہی ملا، لیکن جب امتحان کا وقت آیا، تو اُس کے تمام پرچوں کے درمیان ایک ایک ہفتے کا وقفہ تھا جو میری تیاری کے لئے کافی تھا۔

چنانچہ امتحان کے زمانے میں دارالعلوم سے ڈیڑھ مہینے کی چھٹی لیکر میں لاہور میں اپنے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مقیم رہا، اور ہر آنے والے پرچے کی تیاری اُس سے پہلے والے ہفتے میں کرتا رہا۔ مجھے چونکہ عربی ادب سے پہلے ہی بڑا لگاؤ تھا، اس لئے یہ تیاری محض ایک کام کے بجائے تفریحی مطالعہ بن گئی۔ اسی زمانے میں "الکامل للمبرد" اور "المفضلیات" کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا، شوقی مصری کی شاعری پڑھی جو اپنے آپ کو ملک الشعراء کہلانے سے اس بنا پر ناراض ہوا کرتے تھے کہ اس لقب کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے بھی شعراء ہیں اور وہ ان کے بادشاہ ہیں، حالانکہ اُن کے سوا کوئی شاعر ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ طٰہٰ حسین، احمد امین [1] اور منفلوطی کے ادبی شہ پاروں سے لطف اندوز ہوا، اور امتحان کے بعد جب نتیجہ آیا تو پتہ چلا کہ میں نے یونی ورسٹی میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ **فالحمد للہ علی ذلک**۔ اور اس طرح مؤرخہ ۲/ مارچ ۱۹۷۲ء کو میری ڈگریوں میں ایم اے کا بھی اضافہ ہو گیا۔

اس کے بعد کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ پی ایچ ڈی بھی کرلوں، لیکن صرف امتحان دینے اور ڈگری لینے کے

۱۔ یہ تعریف صرف ادبی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے، ان کے نظریات ومعتقدات سے اس کا تعلق نہیں ہے۔ میں نے اپنے مضمون "تحریک تجدد اور اس کی فکری بنیادیں" میں ان پر تبصرہ کیا ہے۔

لئے کسی موضوع پر مقالہ لکھنا طبیعت پر بار تھا، کیونکہ اُس وقت تک متعدد تصنیفی کام ساتھ ساتھ جاری تھے، اور ان میں سے کوئی پی ایچ ڈی کا موضوع نہیں بن سکتا تھا، اور جو موضوعات تجویز کئے جارہے تھے، اور جس معیار کے مقالے پی ایچ ڈی میں لکھے جارہے تھے، ان سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہوئی، اور سوچ سوچ ہی میں وقت گذرتا گیا، اور میں نے پی ایچ ڈی کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دیا، یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ میں پی ایچ ڈی کا طالب علم بننے کے بجائے پی ایچ ڈی کا ممتحن بن گیا۔

تصنیف وتالیف

مضمون نگاری کا شوق مجھے بچپن سے تھا۔ جیسا کہ میں بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے عرض کرچکا ہوں، سب سے پہلے میں نے روزنامہ جنگ میں تین مراسلے لکھے تھے۔ سب سے پہلے مراسلے کا عنوان تھا: "صنف نازک اور شاعری" دوسرے مراسلے کا عنوان تھا: "مخلوط تعلیم" اور تیسرے کا عنوان: "نوٹوں پر تصویر"۔ میری عمر اُس وقت بارہ سال کی ہوگی۔ اس کے بعد جب میں ہدایہ اولین کے سال میں تھا، اپنے استاذ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سرپرستی میں طلبہ کے ایک تقریری مقابلے کے لئے میں نے ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا: "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے شارع تھے"۔ اور اس پر مجھے انعام بھی ملا تھا۔

پہلی تالیف

اس کے بعد جب ہم درجۂ تخصص میں فتویٰ کی تربیت لے رہے تھے، تو وہ جنرل ایوب خان صاحب مرحوم کے اقتدار کا ابتدائی دور تھا، اور انہوں نے جابجا اپنی تقریروں میں خاندانی منصوبہ بندی پر بہت زور دینا شروع کردیا تھا، اور اس کی تائید میں کچھ اہل قلم کے مضامین اور کتابیں بھی شائع ہورہی تھیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے اس موضوع پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میری پہلی باقاعدہ کتاب "ضبط ولادت" اُس وقت تیار ہوئی۔ میری عمر کا وہ سترہواں سال تھا، اور اس وقت ذہن پر یہ ناپختہ تأثر تھا کہ نوتعلیم یافتہ لوگوں کو دین کی بات سمجھانی ہو تو اُسے عقلی دلائل کے ذریعے سمجھانا زیادہ بہتر ہے۔ یہ حقیقت تو بعد میں ذہن نشین ہوئی کہ دین کی بات دین ہی کے نقطۂ نظر سے قبول کرنا ایک مسلمان کا شیوہ ہونا چاہئے۔ اس کی تائید کے طور پر اگر اُس کی عقلی حکمتوں کو بھی بیان کردیا جائے تو کچھ حرج نہیں، لیکن عقلی دلائل کو اولیت دیکر بات کرنا درست نہیں۔ بہر حال! اس کتاب میں میرا یہ کمسن ذہن جگہ جگہ نمایاں ہے۔ اور اسی وجہ سے میں نے اس کتاب میں اس

مسئلے کے شرعی پہلو سے زیادہ اُس کے عقلی اور معاشی پہلو پر زیادہ زور دیا، اوراس کی شرعی حیثیت کے بارے میں جو کچھ لکھنے کی کوشش کی، وہ خود مجھے ناکافی معلوم ہوا، اس لئے میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی کہ اس پر آپ براہ راست تحریر فرمائیں تو نہ صرف یہ کہ بدر جہا بہتر ہوگا، بلکہ اس موقع پر ضرورت اسی بات کی ہے کہ کسی بڑی اور مستند و معتمد شخصیت کی طرف سے شرعی حکم کی وضاحت ہو۔ چنانچہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ باب بنفس نفیس تحریر فرمایا، اور اس کی وجہ سے میری یہ ناپختہ تحریر بھی معتبر ہوگئی۔ یہ میری پہلی پہلی کتاب تھی، اس لئے اس کے شائع ہونے کا بھی بڑا شوق تھا۔ میرے مرحوم بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحبؒ نے اسے اپنے ادارے دارالاشاعت سے شائع کیا، اور اتنی کمسنی میں ایک مطبوعہ کتاب کا مؤلف ہونے پر میری ہمت افزائی بھی بہت ہوئی۔

تجارتی سود

اس کے بعد غالباً میری دوسری تالیف "تجارتی سود" تھی۔ اُس وقت بعض متجددین نے یہ بحث چھیڑی ہوئی تھی کہ بینکوں میں جس سود کا لین دین ہوتا ہے، وہ اُس "ربا" کی تعریف میں داخل نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی تردید میں "مسئلۂ سود" کے نام سے کتاب تحریر فرمائی تھی جس میں سود کی حرمت پر قرآن وسنت کے احکام تفصیل سے بیان فرمائے تھے، اور اس دعوے کی بھی تردید فرمائی تھی کہ تجارتی سود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود نہیں تھا۔ اس تالیف کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اُس وقت کے آڈیٹر جنرل جناب یعقوب شاہ صاحب مرحوم نے اس مسئلے کے بارے میں رابطہ کیا، اور اپنے اشکالات پیش کئے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے جوابات دیئے، اور مزید گفتگو کے لئے انہیں میرے حوالے کردیا۔ اپریل ۱۹۶۳ء میں میری اُن سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، اور خط وکتابت بھی ہوتی رہی، اور ان کے اشکالات کے دوران مجھے یہ اندازہ ہوا کہ تجارتی سود کے بارے میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے، چنانچہ میں نے خاص اسی موضوع پر یہ مقالہ لکھا، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے اپنی کتاب کے دوسرے حصے کے طور پر شامل فرمالیا۔

ہمارے عائلی مسائل

میری تیسری باقاعدہ تالیف "ہمارے عائلی مسائل" تھی۔ یہ جنرل محمد ایوب خان صاحب مرحوم کے

اقتدار کا ابتدائی دور تھا۔ انہوں نے "مسلم فیملی لاء" کے نام سے ایک آرڈیننس جاری کیا تھا جس میں کئی دفعات شریعت کے خلاف تھیں۔ خاص طور پر پوتے کی میراث، تعدد ازواج اور طلاق وعدت کے مسائل میں اجماع امت کے خلاف موقف اختیار کیا گیا تھا۔ اس کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جنرل ایوب صاحب کو ایک خط بھی لکھا تھا جس میں اس قانون کی غلطیاں قرآن وسنت کے دلائل کی روشنی میں بیان فرمائی تھیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خط "عائلی قوانین پر مختصر تبصرہ" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

جب علماء کرام کی طرف سے ان قوانین پر احتجاج ہوا، تو بعض حلقوں نے حکومتی موقف کے دفاع میں مقالے اور کتابیں لکھیں۔ انہی میں سے ایک کتاب "عورت کا عائلی مقام" کے نام سے شائع ہوئی، کتاب کے مصنف کے طور پر ایک خاتون کا نام لکھا ہوا تھا، اور مقدمے میں ان کا تعارف کراتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ وہ ایک معروف عالم دین کی اہلیہ اور برصغیر کے ایک مسلم عالم بزرگ کی بہو ہیں۔ تحقیق سے یہ اندازہ ہوا کہ جن خاتون کا نام لکھا ہوا ہے، درحقیقت وہ ایک گھریلو خاتون ہیں، اور اس کتاب کی تالیف ان کی اہلیت سے بالاتر ہے، اور درحقیقت یہ ان کے شوہر کی تالیف ہے جو ایک عبقری عالم کے صاحب زادے ہونے کے باوجود منکرین حدیث اور بعض متجددین عصر کے ہتھے چڑھ گئے تھے۔ انہوں نے کسی مصلحت سے یہ کتاب اپنے بجائے اپنی اہلیہ کے نام سے شائع کی ہے۔ اور چونکہ وہ واقعۃً ایک ذی علم آدمی ہیں، اس لئے ان کی کتاب عام آدمی کے لئے شدید مغالطے پیدا کرسکتی ہے۔ اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے حکم دیا کہ میں اس کا جواب لکھوں۔

میں اُس وقت نوجوان تھا، اور تازہ تازہ درس نظامی کی تکمیل کی تھی، ادب وانشاء کا بھی ذوق تھا، اس لئے میں نے اُس کا جواب اس انداز سے لکھا کہ علمی بحثوں کے ساتھ اُس میں طنز وتعریض کے نشتر پوری آزادی سے استعمال کئے، اور اپنا سارا زورِ کلام اس پر صرف کردیا۔ تقریباً دوسو صفحات کا یہ مسودہ تیار ہوا تو میں نے حسب معمول وہ پورا مسودہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا کچھ حصہ مجھ سے سنا، اور کچھ خود پڑھا، اور پھر مجھ سے فرمایا: "ماشاء اللہ تم نے جواب تو خوب لکھا ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ اس کے لکھنے کا مقصد کیا ہے؟ اگر مقصد یہ ہے کہ جو لوگ پہلے سے تمہارے ہم خیال ہیں، وہ اسے پڑھکر تمہاری تعریف کریں کہ واہ! کیسا دنداں شکن جواب دیا ہے! تو بیشک تمہاری یہ تحریر اس

مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے، لیکن اگر مقصد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل میں شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں، وہ اُسے پڑھکر راہ راست پر آجائیں، تو اس مقصد کے لحاظ سے تمہاری یہ تحریر بالکل مفید نہیں ہوگی، کیونکہ تم نے اس میں طنزوتعریض کے نشتر چلا کر ایسے لوگوں کے دل میں ایک ضد پیدا کردی ہے جس کے بعد ان کا دل صحیح بات سننے اور ماننے کے بجائے اپنے دفاع پر آمادہ ہوجائے گا"۔

پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں خود اپنا تجربہ تمہیں بتاتا ہوں۔ میں نے قادیانیوں کی تردید میں ختم نبوت کے نام سے جو کتاب لکھی، اس میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیرووں کے بارے میں سخت الفاظ استعمال کئے، اور بہت شوخ وشنگ تحریر لکھی۔ لیکن جب یہ کتاب پہلے پہل شائع ہوئی، تو میرے پاس ایک قادیانی کا خط آیا جس میں اُس نے لکھا تھا کہ آپ نے اس کتاب میں جو دلائل دیئے ہیں، ان سے میں بہت متأثر ہوا ہوں، لیکن جب آپ کے انداز تحریر کو دیکھتا ہوں تو میرے دل میں یہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے کہ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں، وہ طنزوتشنیع سے کام نہیں لیتے، اور نہ سخت الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کے بجائے ان کا انداز ناصحانہ ہوتا ہے [1]۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان صاحب نے اپنی دلی رکاوٹ کی جو وجہ بیان کی، وہ صحیح ہو یا غلط، میں نے اس کے بعد اپنے طرز تحریر میں یہ احتیاط برتنے کو ضروری سمجھا کہ بلاضرورت انداز بیان دلآزار نہ ہو۔ چنانچہ پھر میں نے اس نقطۂ نظر سے کتاب پر نظر ثانی کی، اور ایسے الفاظ کتاب سے نکال دیئے جن سے مخاطب کے دل میں ضد پیدا ہو۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بات تو بار بار ارشاد فرمائی کہ جب اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کو دعوت ایمان دینے کے لئے بھیج رہے تھے، اُس وقت ان کو یہ ہدایت عطا فرمائی تھی کہ :

قُوْلَا لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً

یعنی اس سے نرم بات کہنا

ا۔ بات تو یہ بڑی حد تک صحیح تھی، لیکن کاش! وہ صاحب خود مرزا غلام احمد قادیانی کے ان "پاکیزہ" اور "ناصحانہ" الفاظ پر بھی غور فرمالیتے جو انہوں نے اپنے مخالفین کے لئے استعمال کئے ہیں۔ شاید ان کی نظر سے وہ الفاظ نہیں گذرے، ورنہ وہ سب سے پہلے اس بات کو مرزا غلام احمد پر منطبق فرماتے۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ تمہارا مخالف فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہوسکتا، اور تم حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام سے بڑے مصلح نہیں ہوسکتے۔ جب ان کو فرعون تک سے نرم بات کہنے کا حکم دیا جارہا ہے، تو ہمارے لئے کب جائز ہوگا کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی خاطر اپنے مخالف کیلئے سخت الفاظ استعمال کریں۔

شاید اسی موقع پر یہ بات بھی ارشاد فرمائی تھی کہ ہمارے زمانے میں دو شاعر ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے شعر کے ذریعے دینی فکر پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے، اور شاعری کو بڑے اصلاحی پیغامات دینے کے لئے استعمال کیا ہے، ایک شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال صاحب اور دوسرے اکبر الہ آبادی۔ ان دونوں میں بھی اکبر الہ آبادی کی فکر اول الذکر کے مقابلے میں زیادہ متوازن اور صائب تھی، لیکن قوم کو جتنا فائدہ اقبال مرحوم کی شاعری سے پہنچا، اور جتنی دور تک ان کا پیغام عام ہوا، اتنا اکبر مرحوم کا نہیں ہوسکا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ تھی کہ اکبر مرحوم نے طنز کا طریقہ اختیار کیا جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کمزوروں کا ہتھیار ہے۔

بہر کیف! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرے مسودے کے طنز آمیز انداز کو دیکھ کر یہ ساری نصیحتیں اس انداز سے ارشاد فرمائیں کہ وہ اُسی وقت سے الحمد للہ دل میں پیوست ہوگئیں۔ اور اس کے بعد میں نے مسودے کو اس نقطۂ نظر سے کافی تبدیل کیا اور اس کے بعد وہ کتاب شائع ہوئی۔

یہ میری پہلی مستقل کتاب تھی۔ اس کے بعد سے آج تک مجھے کوئی ایسا زمانہ یاد نہیں جس میں کوئی نہ کوئی کتاب زیر تالیف نہ رہی ہو، بلکہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں کئی کئی کتابیں یا مضامین ساتھ چل رہے ہوتے ہیں۔

ماہانہ رسالوں میں بھی میں کبھی کبھی مضامین لکھا کرتا تھا۔ بڑے بھائی مولانا محمد ولی رازی مدظلہ نے ۱۹۶۱ء میں "فکرنو" کے نام سے ایک نیم ادبی ماہنامہ جاری کیا تھا۔ اُس میں کئی ماہ تک لکھتا رہا۔ ایک مضمون کا عنوان تھا "جوسب کے لئے رحمت ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم)" نیز اُس رسالے میں کتابوں پر تبصرے بھی میں نے لکھے۔ حضرت علامہ سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ماہنامہ بینات جاری فرمایا تھا۔ ان کے ایڈیٹر کی فرمائش پر میں نے ۱۹۶۳ء میں "قرآن کریم کے مضامین پر ایک نظر" کے عنوان سے مضمون لکھا تھا۔ یہ مضمون اب میری کتاب "علوم القرآن" کا حصہ بن چکا ہے۔

اظہارالحق کی تحقیق وتعلیق

جس سال میں دورۂ حدیث میں تھا، اُس سال پاکستان میں ایک مرتبہ پھر عیسائی مشنریوں کی سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں ۔ ملک کے مختلف حصوں میں ان کے جلسے منعقد ہورہے تھے ۔ ان میں سے ایک تین روزہ جلسہ دارالعلوم نانک واڑہ کے قریب لارنس روڈ (موجودہ نشتر روڈ) کے ایک میدان میں منعقد ہورہا تھا ۔ اس جلسے میں کچھ بظاہر اپاہج لوگوں کو لایا جاتا، اور لوگوں کے سامنے ان کو پیش کرکے ان پر بائبل پڑھی جاتی اور کہا جاتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کی معذوری دور کردی ہے ۔ ایک بڑے مجمع کے سامنے ان کی شفایابی کا مظاہرہ کیا جاتا، اور لوگوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنے کی دعوت دی جاتی، اور دکھایا جاتا کہ فلاں فلاں شخص نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا ہے ۔

اس جلسے کے پہلے دن میں اور بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم نے بھی اس جلسے میں گئے، اور خود جاکر یہ جعلی مظاہرہ دیکھا ۔ وہاں بہت سے عام مسلمان بھی موجود تھے، اور بظاہر اس مظاہرے سے متأثر ہورہے تھے ۔ ساتھ ساتھ عیسائی پادریوں کی تقریریں بھی جاری تھیں ۔ ہمیں یہ منظر دیکھ کر بہت صدمہ ہوا کہ لوگوں کو مرتد بنانے کی یہ کوشش کھلم کھلا ہورہی تھی ۔

نوجوانی کا گرم خون تھا، اور ہماری غیرت کو برملا للکارا جارہا تھا ۔ اس لئے ہم سے صبر نہ ہوسکا ۔ ہم نے مشورہ کیا کہ اس سلسلے کو روکنے کا کیا طریقہ اختیار کرنا چاہئے ۔ حکومت سے کوئی توقع نہیں تھی کہ وہ ایسے جلسوں کو روکے ۔ آخر میں طے ہوا کہ ایک مضمون لکھ کر چھاپا جائے، اور اُسے اسی جلسے میں تقسیم کیا جائے ۔ چنانچہ ہم نے ایک بڑا جذباتی مضمون لکھا جس میں مسلمانوں کو مخاطب ہوکر ان کی غیرت ایمانی یاد دلائی گئی تھی، اور ان سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی دینی حمیت کے تحت نہ صرف اس جلسے کا بائیکاٹ کریں، بلکہ ارتداد کی اس کھلی دعوت کو ناکام بنائیں ۔ مضمون تو لکھ لیا، لیکن اسے کسی پریس میں چھپوانا ایک مسئلہ تھا، کیونکہ عام پریسوں کے لئے اُسے چھاپنے پر آمادہ ہونا مشکل تھا ۔ یہ جذباتی مضمون ان کے لئے مشکلات پیدا کرسکتا تھا ۔

ان دنوں میرے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب مدظلہم محبوب پرنٹنگ پریس کے نام سے ایک پریس چلارہے تھے، انہوں نے فرمایا کہ بلا سے ہمیں کسی قانونی کارروائی کا سامنا کرنا پڑے، میں یہ مضمون اپنے پریس میں چھاپ دوں گا ۔ چنانچہ انہوں نے یہ مضمون چند گھنٹوں میں سینکڑوں کی تعداد میں اپنے پریس

میں چھاپ دیا۔اور پھر ہم تینوں اپنے ساتھ کچھ اور دوستوں کے ساتھ یہ ہینڈ بل لیکر شام کے وقت جلسہ گاہ میں پہنچے، اور وہاں انہیں تقسیم کیا۔اس دوران اخبارات میں بھی علماء اور مختلف دینی حلقوں کی طرف سے اس جلسے کے انعقاد کی اجازت دینے پر احتجاجی بیانات بھی غالباً شائع ہوئے تھے، اور بہت سے مسلمان نو جوان وہاں صورت حال کا جائزہ لینے کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔اُس ہینڈ بل کا وہاں تقسیم ہونا تھا کہ ان نو جوانوں کے دلوں میں ایک آگ سی لگ گئی، اور انہوں نے جلسے کے دوران احتجاج شروع کر دیا، اور کچھ لوگ اس احتجاج کے دوران اسٹیج کے بالکل قریب پہنچ گئے، اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ یہ تماشا بند کیا جائے، اور اگر کرنا ہے تو ہمارے علماء کے ساتھ دلیل اور برہان سے مناظرہ کیا جائے۔اسٹیج کی طرف بڑھتے ہوئے لوگوں کا جوش وخروش دیکھ کر اسٹیج پر بیٹھے یا کھڑے ہوئے پادریوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہ اسٹیج سے واپس روانہ ہوجائیں۔ان کے وہاں سے ہٹتے ہی جلسہ درہم برہم ہوگیا، اور پھر اچانک نہ جانے کس طرح اسٹیج کی بجلیاں بھی کٹ گئیں، اور اس کا سامان بھی بکھر گیا، اور آن کی آن میں اس میدان پر اندھیرا چھا گیا، اور لوگ تتر بتر ہوگئے۔

لیکن اس جلسے کے درہم برہم ہونے کے بعد عیسائیوں نے ہینڈ بل تقسیم کرنے والوں کے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرادی۔پولیس ہینڈ بل تیار کرنے والوں اور اُسے چھاپنے والوں کی تلاش میں رہی، اور آخر کار ہم تینوں بھائیوں تک پہنچ گئی۔ہم چند روز پولیس کی پوچھ گچھ کا سامنا کرتے رہے، لیکن اُس ہینڈ بل کی جذباتی زبان کے باوجود اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو قانون کی گرفت میں آسکے۔اس لئے ہمارے خلاف یہ مقدمہ کچھ روز میں رفع دفع ہوگیا۔

بہرحال! یہ تو ایک مثال تھی، اُس وقت ملک بھر میں عیسائیوں کی اس طرح کی سرگرمیاں شدت کے ساتھ جاری تھیں، اور ملک کے مختلف حصوں سے ارتداد کی خبریں آرہی تھیں۔اس لئے ضرورت تھی کہ کچھ لوگ اس فتنے کے مقابلے کے لئے تیار ہوں، اور دلیل وحجت کے میدان میں عیسائی مشنریوں کا مقابلہ کریں۔لیکن اُس وقت عیسائی مذہب اور اس کی تفصیلات سے واقفیت رکھنے والے لوگ بہت کم تھے جو یہ فریضہ ادا کرسکیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انگریز کے اقتدار کے ابتدائی دور میں عیسائی مشنریاں بڑی آب وتاب سے ہندوستان آئی تھیں، اور اُس وقت انہوں نے کہیں زیادہ قوت سے مسلمانوں سے مناظرے

شروع کئے تھے۔ اس موقع پر علماء کرام نے ان کی کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ کر کے اس فتنے کے مقابلے کے لئے اپنے آپ کو وقف کیا تھا۔ اس دور میں عیسائیت کی تردید میں بہت سے مناظرے ہوئے، اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یوں تو علماء کی ایک بڑی تعداد نے اس فتنے کا دلیل کے ذریعے ڈٹ کر مقابلہ کیا، لیکن اس موضوع پر حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمات سب سے زیادہ مؤثر اور نمایاں رہیں۔ انہوں نے مناظرے میں پادری فنڈر کو شکست فاش دی، اور متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ جامع کتاب "اظہار الحق" تھی۔ یہ کتاب انہوں نے عربی میں لکھی تھی، اور پھر اس کا انگریزی اور فرانسیسی میں ترجمہ بھی ہوا تھا۔ لیکن اس کا اردو ترجمہ ابھی تک نہیں ہو سکا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایماء پر دار العلوم کراچی کے اُس وقت کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کام کے لئے تیار ہوئے کہ وہ اس کا اردو ترجمہ کرا کر شائع کریں۔ چنانچہ انہوں نے ہمارے استاد گرامی حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو آمادہ کیا کہ وہ اس کا اردو ترجمہ کریں۔

چنانچہ جس سال ہم دورۂ حدیث کے بعد تخصص کر رہے تھے، اُس سال حضرت مولانا اکبر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دن رات اس ترجمے کے کام میں مصروف تھے۔ انہوں نے حیرت انگیز رفتار سے ترجمہ اس طرح مکمل کر لیا کہ کسی بھی قسم کی کوئی مددگار کتاب ان کے سامنے نہیں تھی۔ ترجمہ مکمل ہوا تو حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے محسوس فرمایا کہ اس سے استفادہ آسان بنانے کے لئے اس پر ابھی مزید کام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تم اس ترجمے کو ایڈٹ کرو، اس کے بعد اس کی اشاعت مفید ہوگی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجھے حکم فرمایا کہ اس پر کام کروں۔

عیسائی مذہب کے بارے میں کچھ عمومی معلومات تو بیشک تھیں، لیکن اس موضوع پر "اظہار الحق" جس پائے کی تحقیقی کتاب ہے، اس کو ایڈٹ کرنے کے لئے عمومی معلومات کی نہیں، تحقیقی مطالعے کی ضرورت تھی۔ استاذ مکرم حضرت مولانا اکبر علی صاحب قدس سرہ نے جو ترجمہ کیا تھا، وہ ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا آئینہ دار تھا، لیکن اُس کو عام فہم اور لوگوں کے لئے آسان بنانے کے لئے چند در چند کام ضروری معلوم ہوتے تھے۔ سب سے پہلی بات تو یہ تھی کہ اظہار الحق بائبل کے حوالوں سے بھری ہوئی ہے۔ بائبل وہ کتاب ہے جس کے مسلم ترجمے ہر زبان میں ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں

بائبل کے عربی ترجمے کے اقتباسات درج فرمائے ہیں۔ استاذ مکرم حضرت مولانا اکبر علی صاحب قدس سرہ نے ان عربی اقتباسات کا خود اردو ترجمہ فرمایا، شاید پیش نظر یہ تھا کہ ترجموں میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، اس لئے شاید موجودہ اردو ترجموں میں وہ بات نہ ہو جس سے حضرت مولاناؒ استدلال کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بات بڑی حد تک ٹھیک بھی تھی، لیکن اس میں یہ خطرہ بھی تھا کہ کوئی شخص کسی عبارت کے بارے میں یہ کہدے کہ اس کا ترجمہ صحیح نہیں ہوا۔ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ ان تمام عبارتوں کو بائبل کے مروجہ اردو ترجمے میں منتقل کروں، اور اگر کہیں مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی نقل کردہ عبارت موجودہ ترجمے سے مختلف ہو تو اس اختلاف کو حاشیے میں واضح کردوں۔

اس کے علاوہ بہت سے مقامات کا عیسائی مذہب کی اصطلاحات، ان کے بڑے بڑے مصنفین اور ان کی کتابوں کے تعارف کے بغیر عام آدمی کی سمجھ میں آنا مشکل تھا۔ اور بعض جگہوں پر تو اس تعارف کے بغیر شدید غلط فہمیاں پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ دوسری طرف ان مشکلات کو حل کرنے کیلئے مجھے نہ کتابیں میسر تھیں، نہ کسی ایسے شخص کی رہنمائی حاصل تھی جسے اس موضوع پر عبور ہو۔ مجھے جس کسی کے بارے میں معلوم ہوا کہ انکا عیسائیت پر مطالعہ اچھا ہے، میں ان کے پاس گیا، اور ان سے رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن بات کسی ایک نکتے کی نہیں تھی جو کسی سے حل کرلیا جائے، اور ہر شخص اپنے مسائل میں گرفتار تھا، اس لئے کوئی قابل ذکر مدد حاصل نہیں ہوسکی۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دیں محترم ابراہیم باوانی صاحب مرحوم کو کہ جب انہوں نے یہ سنا کہ میں اس موضوع پر کام کررہا ہوں، اور مجھے کتابوں کی ضرورت ہے تو وہ مجھے اپنا انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا پورا سیٹ دے گئے کہ وہ مجھے مختلف مواقع پر مدد دے سکے۔ یہ ۱۹۵۰ء کا ایڈیشن تھا، اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے مجھے بہت مدد ملی۔ اس کے علاوہ میں مختلف چرچوں کے کتب خانوں میں گیا، اور وہاں جو کوئی کتاب مجھے مددگار معلوم ہوئی، وہ خرید لایا۔ نیز کراچی میں لیاقت نیشنل لائبریری اور اسٹیٹ بنک کی لائبریری میں بعض کتابیں کارآمد تھیں۔ ان سے مدد لینے کے لئے مجھے خود ان لائبریریوں میں جانا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہوتا یہ تھا کہ میں رات کو عشاء کے بعد اپنے زیر تدریس اسباق کا مطالعہ کرنے کے بعد اظہار الحق کا کام کرتا تھا۔ کام کے دوران جو بات قابل تحقیق نظر آتی اور اپنے پاس موجود کتابوں سے حل نہ ہوتی، اسے میں نوٹ کرلیتا تھا، اور اگلے دن تین چار گھنٹے دارالعلوم میں پڑھانے اور ایک دو گھنٹے فتویٰ کا کام کرنے کے بعد عصر سے کچھ پہلے میں کورنگی کے ایریا کے بس اسٹاپ پر

پہنچتا، وہاں سے بس میں سوار ہوتا ،بکثرت بس بھری ہوئی ہوتی ،اور میں ڈنڈا پکڑ کر کھڑا رہتا ، بس مجھے ایمپریس مارکیٹ اتارتی ، وہاں عموماً جہانگیر پارک کی مسجد میں عصر پڑھتا ، اور پھر دوسری بس میں بیٹھ کر میں ویدر ٹاور پہنچتا جہاں اُس وقت لیاقت نیشنل لائبریری واقع تھی ۔ وہاں جا کر مطلوبہ کتاب نکلواتا ، اور اُس میں مطلوبہ مضمون تلاش کرتا۔ اُس وقت میں بی اے کررہا تھا، اس لئے انگریزی پر بھی عبور نہیں تھا ، اس لئے بکثرت کتاب کا مطلب سمجھنے کے لئے بکثرت ڈکشنری کی مدد لینی پڑتی تھی ۔ اس طرح کبھی گوہر مقصود ہاتھ آجاتا ، اور کبھی نہ آتا ۔ آخر کار واپس اُسی طرح پہلے صدر، اور پھر وہاں سے کورنگی کی بس میں ڈنڈا پکڑ کر دارالعلوم پہنچتا۔ بس اسٹاپ سے گھر تک تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ اندھیرے صحرا میں طے کرتا ہوا رات گئے گھر پہنچتا ، کیونکہ اُس وقت دارالعلوم کی چار دیواری نہیں تھی ، اور بس اسٹاپ سے دارالعلوم اور دارالعلوم میں گھر تک نہ کوئی آبادی تھی ، نہ کوئی روشنی۔ اللہ تعالیٰ میری والدہ ماجدہ پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے ، وہ میری راہ دیکھ رہی ہوتی تھیں ، میری واپسی پر وہ مجھے کھانا کھلاتیں ، اور ان کی خدمت میں چند لمحات گذار کر میں اپنی لکھنے کی میز پر پہنچ جاتا ، اور اگر اس سفر سے کچھ حاصل ہوا ہوتا ، تو اُسے کتاب میں جگہ دیدیتا ، اُس کے بعد اپنے زیر تدریس اسباق کا مطالعہ کر کے سوتا۔

ہفتے میں کم وبیش دو دن تو اس طرح گذرتے ، اور تین دن میں عصر کے قریب اُسی طرح بس میں لٹک کر حسن الزماں اختر صاحب سے کئے ہوئے معاہدے کے مطابق (جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں) ان کے پاس جاتا، ان سے معاشیات پڑھتا ، اور انہیں ہدایہ پڑھاتا ۔لہٰذا ہفتے کی بیشتر شامیں اُس زمانے میں شہر کی آمدورفت میں گذرتی تھیں ۔مشکل سے دو دن ایسے ملتے تھے جن کی شام میں گھر پر گذار سکوں۔

کبھی کبھی اظہارالحق کے کام کے دوران میری ہمت ہارنے لگتی ، جب یہ تصور کرتا کہ جتنا کام کیا ہے، اس سے زیادہ باقی ہے، تو میرا حوصلہ ٹوٹنے لگتا ۔لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس بے ہمتی کا مقابلہ کر کے کام جاری رکھتا ۔اور مجھے اپنی تقریباً تمام تالیفات میں یہی تجربہ ہوا کہ تالیف کے عین درمیان ایک مرحلہ ایسا ضرور آتا تھا کہ طبیعت اُس تالیف سے اُچاٹ ہو جاتی ، اور دل چاہتا کہ اُسے چھوڑ کر الگ ہو جاؤں ، لیکن پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال ہوتی ، اور میں سمجھتا کہ یہی آزمائش کا وقت ہے ، اور اپنے اوپر زبردستی کئے بغیر اس آزمائش سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ۔ چنانچہ اپنے اوپر زبردستی کر کے کام جاری رکھتا ، اور الحمد للہ ، پھر وہ کیفیت زائل ہو جاتی۔

جب کتاب کی تحقیق وتعلیق کا کام پورا ہوا، تو مجھے احساس ہوا کہ اس پر ایک مفصل مقدمے کی ضرورت ہے۔لیکن اس کے لئے مجھے مزید کتابوں کی ضرورت تھی۔ مجھے لاہور کے ایک سفر کے دوران پتہ چلا کہ لاہور کی پنجاب پبلک لائبریری میں عیسائیت کے موضوع پر کچھ اچھی کتابیں موجود ہیں، چنانچہ میں نے اسی غرض کے لئے لاہور کا سفر کیا، اور وہاں کچھ دن اس طرح گذارے کہ میں صبح سویرے لائبریری چلا جاتا، اور کتابوں کا مطالعہ کرکے اُن سے نوٹ تیار کرتا، اورطویل طویل اقتباسات نقل کرتا۔اس طرح ایک اچھی خاصی مفصل کاپی تیار ہوگئی۔ یہ کاپی لیکر میں واپس کراچی آیا، اور مقدمہ تحریر کیا جو "اظہارالحق" کی ابتدا میں بھی شائع ہوا، اور بعد میں "عیسائیت کیا ہے؟" کے نام سے الگ کتابی صورت میں بھی۔ پھر اس کا انگریزی ترجمہ میرے جنوبی افریقہ کے دوست شعیب عمر صاحب نے کیا، اور عربی ترجمہ جناب مولانا نورعالم امینی ندوی صاحب (زیدمجدہ) نے کیا، اور اُس پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پیش لفظ بھی تحریر فرمایا۔

اظہارالحق کے مصنف حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے حضرت مولانا محمد سلیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مکہ مکرمہ میں خود حضرت کیرانویؒ کے قائم کردہ مدرسہ صولتیہ کے مہتمم تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں اس پر کام کررہا ہوں، تو انہوں نے کراچی کے ایک اہل خیر تاجر کو اس کی طباعت وغیرہ کے اخراجات اٹھانے کی ترغیب دی۔اور انہوں نے مجھ سے اپنے اس ارادے کا اظہار فرمادیا۔یہ اہل خیر بزرگ دینی حلقوں میں کافی مشہور تھے۔ان کی نیکی اور بزرگی کے باوجود وہ ذرا زودرنج واقع ہوئے تھے، اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی شکایتیں کرنے لگتے تھے، اسی لئے مجھے اس بات میں کچھ تأمل تھا کہ ان سے اس سلسلے میں کوئی مالی امداد وصول کی جائے۔

اسی دوران میں نے اپنے کام کے تعارف اور لوگوں کی آراء معلوم کرنے کے لئے اپنے کام کا کچھ حصہ ماہنامہ فاران میں شائع کرادیا۔اس کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے اس پر شدت سے اعتراض کیا، اور یہ فرمایا کہ تم نے پہلے سے یہ حصہ شائع کرکے ہمارے کام کی قدر وقیمت گھٹادی ہے۔ یہ اعتراض انہوں نے ایسے لہجے اور ایسے الفاظ میں فرمایا جیسے طباعت کے اخراجات کی پیشکش کرکے انہوں نے یہ سارا کام اپنی ملکیت سمجھ لیا ہے، اور مجھ ناسمجھ کو یہ احساس بھی ہوا جیسے ان کے نزدیک میں یہ کام ان کے زیر ہدایت یا ان کے اجیر کے طور پر کررہا ہوں۔ میں نے ان کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہوئے اُنہیں اس وقت اس اشاعت کی مصلحت بتانے پر ہی اکتفا کیا، اور ان کے نامناسب انداز پر کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا، اس کے بعد بھی انہوں

نے کام کی رفتار کے بارے میں کچھ خیالات کا اظہاراس طرح فرمایا جیسے یہ سارا کام انکی نگرانی میں ہورہا ہے۔میں انہیں سکون سے جواب دیدیا کرتا، لیکن دل میں یہ طے کرلیا کہ اب ان سے کوئی مالی تعاون حاصل نہیں کرنا۔

اس کے کچھ عرصے کے بعد انہوں نے مجھے ایک ہزار روپے کا چیک بھیجا۔(اُس وقت کے ایک ہزار اپنی قوت خرید کے اعتبار سے شاید آج کے تقریباً ایک لاکھ کے برابر ہوں گے) اور یہ ظاہر فرمایا کہ وہ یہ چیک میری خدمت پر انعام کے طور پر بھیج رہے ہیں۔ان کے طرز عمل کی وجہ سے دل میں جو کوفت تھی، اس موقع پر میرے نفس نے مجھے اس پر آمادہ کیا کہ میں انہیں ایک خط میں ان کے نامناسب طرز عمل کی تفصیل بتا کر یہ لکھدوں کہ اس طرز عمل کی وجہ سے آپ کا یہ چیک میں واپس کررہا ہوں۔ایسا یاد پڑتا ہے کہ شاید میں نے ایسا خط لکھ بھی دیا تھا، اور پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود بھی ان کے اس طرز عمل کی وجہ سے ناخوش تھے، لیکن انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ تمہارا یہ انداز ان کے ساتھ قطع تعلق کا سا انداز ہے، اور تعلق توڑنا تو آسان کام ہے، کسی بھی وقت کیا جاسکتا ہے، لیکن تعلقات کو نبھانا اور تحمل کا مظاہرہ کرنا اصل مردانگی ہے۔اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے چیک واپس کرنے کو تو منظور فرمایا، لیکن میرے بجائے خود انہیں ایک خط لکھا جس میں چیک کی واپسی کا ذکر اس انداز سے فرمایا کہ اس میں ان کی پیشکش کا شکریہ بھی تھا، اور ساتھ ہی یہ ذکر بھی کہ یہ کام اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر شروع کیا گیا تھا، اور اُسی کے بھروسے پر جاری ہے، اور فی الحال چونکہ کام ابھی باقی ہے، اور طباعت کا مرحلہ آنے میں دیر ہے، اس لئے یہ چیک واپس کررہا ہوں۔اس طرح جو مقصد تھا کہ ان کا چیک واپس کردیا جائے ، وہ بھی حاصل ہوگیا، اور کسی قسم کی بدمزگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔اللہ تعالیٰ حضرت والد صاحب پر اپنی رحمتوں کی بارشیں برسائیں، وہ اس طرح قدم قدم پر خوش اخلاقی، تحمل اور بردباری کا درس دیا کرتے تھے۔

بہر کیف! الحمد للہ! تقریباً ساڑھے تین سال میں اظہار الحق کا یہ کام تکمیل کو پہنچا، اور وہ مکتبہ دارالعلوم کراچی سے "بائبل سے قرآن تک" کے نام سے شائع ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اُسے علمی حلقوں میں وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل ہوئی، اور یہ اطلاعات بھی ملیں کہ اس کے مطالعے سے بہت سے عیسائیوں کو مشرف بہ اسلام ہونے کی توفیق عطا ہوئی۔

جاری ہے..........

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دار العلوم کراچی

یادیں

(اکتیسویں قسط)

تقلید کی شرعی حیثیت

جناب ماہر القادری مرحوم ملک کے مشہور شاعر تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہیں دینی کتابوں کے مطالعے کا بھی خاص ذوق پیدا ہوگیا تھا۔ وہ ماہنامہ فاران کے نام سے ایک ادبی اور علمی رسالہ نکالتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ غالی قسم کے اہل حدیث حضرات کی ایک مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ وہاں جو صاحب تقریر فرما رہے تھے، انہوں نے کھلم کھلا تقلید کو شرک اور مذاہب اربعہ کے مقلدین کو کافر و مشرک قرار دیا۔ جناب ماہر القادری مرحوم کو اس پر سخت صدمہ ہوا، اور انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں تقلید کے موضوع پر ایک مضمون لکھوں۔ میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے تقلید کی جو حقیقت سمجھی ہوئی تھی، اس کے مطابق ایک مضمون "تقلید کیا ہے؟" کے نام سے عام فہم انداز میں لکھ دیا، اور وہ ماہنامہ فاران کے شمارے میں شائع ہوا۔ میں نے وہ مضمون اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے کے مطابق مثبت انداز میں لکھا تھا، اور اس میں کسی پر طنز و تشنیع سے مکمل طور پر پرہیز کیا تھا، اور کوئی بحث و مباحثہ چھیڑنا مقصود نہیں تھا۔ لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس پر پے در پے کئی تنقیدیں شائع ہوئیں۔ ان میں سے ایک تو "التحقیق فی جواب التقلید" کے نام سے کتابی صورت میں تھی، اور اس میں تقلید کو علی الاطلاق شرک قرار دیکر ناچیز کی تکفیر کی گئی تھی۔ ایک دوسری تنقید ہفت روزہ "الاعتصام" میں گیارہ قسطوں میں شائع ہوئی جس میں تشدد کا وہ پہلو نہیں تھا، بلکہ وہ بحیثیت مجموعی سنجیدہ علمی تحریر تھی۔ مضمون نگار کا نام بھی رسالے میں درج نہیں تھا، لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر فرمودہ تھا۔

چونکہ بحث و مباحثہ میرا مقصد ہی نہیں تھا، اس لئے میں نے جواب در جواب کی بھی کوشش نہیں کی۔ البتہ کچھ

عرصے کے بعد جب اس مضمون کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ ہوا تو میں نے اُس پر ازسرِ نو نظرِ ثانی کر کے متعدد مضامین کا اضافہ کیا، اور اس کے دوران میں نے ان حضرات کے دلائل پر بھی کسی کا نام لئے بغیر تبصرہ کیا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ یہ چھوٹی سی کتاب بہت پڑھی گئی، بہت سے حضرات نے مجھے خط لکھے کہ اس نے ان کے بہت سے شکوک وشبہات دور کئے ہیں۔ پھر اس کا انگریزی، عربی اور بنگلہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا۔

ماہنامہ البلاغ کی ادارت

۱۹۶۷ء میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم سے ایک ماہانہ رسالہ نکالنے کا فیصلہ فرمایا، اور اُس کا نام "البلاغ" تجویز فرمایا۔ اُس کے لئے ایک ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی صاحب اُس وقت دارالعلوم کے اشاعتی ادارے "مکتبہ دارالعلوم" کے ناظم تھے، اور شروع میں رائے یہ تھی کہ انہیں رسالے کا ایڈیٹر بنادیا جائے۔ میری عمر اُس وقت چوبیس سال تھی، اور میری نوعمری کی وجہ سے شروع میں البلاغ کی ادارت مجھے سونپنے کا خیال نہیں آیا، لیکن ایسا یاد پڑتا ہے کہ ہمارے اساتذہ میں سے کسی نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ تجویز پیش کی کہ مجھے اس کا ایڈیٹر بنادیا جائے، اور مولانا نعمانی کو اس کا ناظم۔ اس سے پہلے میرے کئی مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے، اور میں اپنی ہر تحریر شائع کرنے سے پہلے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھاتا تھا، بلکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب کسی اہم ملکی مسئلے پر اخبار میں کوئی بیان دینا ہوتا، تو اس کا ابتدائی مسودہ بھی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مجھ سے لکھوانے لگے تھے، اس لئے ان کی نظر میں میری نوعمری کے سوا اس تجویز پر عمل کرنے میں کوئی اور رکاوٹ نہیں تھی۔ چنانچہ بالآخر حضرتؒ نے اس تجویز کو منظور فرمالیا، اور محرم ۱۳۸۷ھ مطابق اپریل ۱۹۶۷ء کو "البلاغ" کا پہلا شمارہ میری ادارت میں شائع ہوا جو الحمد للہ پچپن سال سے تادمِ تحریر (۲۶ رشوال ۱۴۴۱ھ مطابق ۱۸ر جون ۲۰۲۰ء) جاری ہے۔

"البلاغ" کا اداریہ میں "ذکر وفکر" کے نام سے لکھتا تھا، اور الحمد للہ اُسے ہمیشہ قارئین کی پذیرائی حاصل ہوئی، اہل علم اور مشاہیر کی طرف سے ہمت افزا پیغامات موصول ہوئے، اور حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ نے تو اتنی ہمت افزائی فرمائی کہ اپنے ہفت روزہ "صدق" میں اُسے پاکستان کا سب

سے بہتر ماہنامہ قرار دیا" اور اُس کے مضامین اور اس ناچیز کے اداریوں کے اقتباسات بکثرت اپنے ہفت روزے میں شائع کیے۔

میرے ذہن میں اداریوں کے بارے میں تصور یہ تھا کہ وہ محض حالات حاضرہ پر تبصروں پر ہی مشتمل نہ ہوں، بلکہ اُن کے ذریعے اسلامی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اس طرح گفتگو ہو کہ موجودہ حالات کے تناظر میں اسلامی تعلیمات پر کس طرح عمل کیا جائے، اور ان تعلیمات پر خاص طور سے مغربی افکار سے متأثر لوگوں کو جو شکوک وشبہات ہیں، انہیں عام فہم انداز میں دور کرنے کی کوشش کی جائے، اس لئے ایک مدت تک اس نقطۂ نظر سے اداریے لکھنے کے نتیجے میں اسلام کی معاشرتی، معاشی، سیاسی اور انفرادی اور اجتماعی تعلیمات کا اچھا خاصا مجموعہ تیار ہوگیا۔ چنانچہ اداریوں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا خیال ہوا۔اس کے لئے مناسب نام تو "اسلام اور عصر حاضر" تھا، لیکن اس سے پہلے محب مکرم مولانا سمیع الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ "الحق" میں لکھے ہوئے اپنے اداریوں کا مجموعہ اس نام سے شائع کر چکے تھے۔اس لئے میں نے اس مجموعے کا نام "عصر حاضر میں اسلام" رکھا اور وہ مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہوا۔ بعد میں مکتبہ دارالعلوم کے اُس وقت کے ناظم مولانا فاروق القاسمی نے محسوس کیا کہ اب اس ضخیم مجموعے کے بجائے اُسے موضوعات کے لحاظ سے مختلف کتابچوں میں تقسیم کردیا جائے۔ چنانچہ بعد میں یہ اداریے نو مختلف کتابوں کی شکل میں شائع ہوئے۔" فرد کی اصلاح" "اصلاح معاشرہ" "ہمارا نظام تعلیم" " اسلام اور سیاست حاضرہ " "اسلام اور جدت پسندی" " ہمارا معاشی نظام" "نفاذ شریعت اور اُس کے مسائل"

۱۹۶۷ء میں صوبہ سرحد کا ایک سفر

اسی سال پاکستانی ائیر فورس کے ایک ونگ کمانڈر حضرت والد صاحبؒ کے پاس آئے، اور انہوں نے بتایا کہ ائیر فورس میں ایک مستقل شعبہ "اسلامی تعلیم" کے لئے قائم کرنا طے ہوا ہے جس کا مقصد فضائیہ کے افسران اور ملازمین کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانا ہے، تاکہ ان میں سچے مسلمانوں کی صفات پیدا ہوں۔ انہوں نے حضرت والد صاحبؒ سے اس معاملے میں دو درخواستیں کیں۔ ایک یہ کہ اس شعبے کا طریق کار مرتب کرنے میں تعاون فرمائیں، اور دوسرے یہ کہ ہمیں کوئی ایسا عالم دیں جو انگریزی سے بھی واقف ہو، اور اس شعبے کی نگرانی کر سکے۔ فی الحال اس کا درجہ اسکواڈرن لیڈر کا ہوگا، اُس کے بعد اُس میں مزید ترقی بھی ہو سکے

گی۔ساتھ ہی انہوں نے میرے بارے میں یہ فرمائش بھی کی کہ اس کام کے لئے آپ ان کو فارغ کردیں۔ ائیر فورس کا ہیڈ کوارٹر چونکہ پشاور میں تھا، اس لئے ضروری تھا کہ اس کام کے لئے قیام پشاور میں رہے، اور دارالعلوم کی خدمت ترک کی جائے، اور حضرت والد صاحبؒ نے بھی یہ فرمایا، اور خود میرا خیال بھی یہی تھا کہ میں دارالعلوم کے ذریعے جوٹوٹی پھوٹی خدمت کررہا ہوں، اُسے چھوڑ کر کہیں اور جانا میرے لئے مناسب نہیں ہے۔البتہ ایک تجویز یہ آئی کہ شعبے کی بنیاد رکھنے کے لئے کچھ عرصے کے لئے میں اس شعبے کی خدمت انجام دوں، اور جب وہ مناسب بنیادوں پر استوار ہو جائے، تو دوبارہ دارالعلوم واپس آجاؤں۔لیکن اس تجویز پر بھی عمل کرنے کے لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ ایک مرتبہ پشاور جا کر وہاں کے حالات اور کام کے امکانات کا جائزہ لیا جائے، پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ تم دونوں بھائی وہاں جا کر حالات کا جائزہ لو۔جب جانے کا وقت آیا تو مولانا حکیم سید مشرف حسین صاحب بھی (جو میرے بھانجے کم اور دوست زیادہ تھے) ساتھ چلنے کو تیار ہو گئے، اور اس طرح بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب عثمانی کی سرکردگی میں ہم ۱۱رستمبر ۱۹۶۷ء کو پشاور پہنچے۔وہاں جا کر ائیر فورس کے حالات کا جائزہ لیا۔متعلقہ حضرات سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، لیکن ہمیں احساس ہوا کہ اول تو یہ کام ایک آدھے سال میں مکمل ہونے والا نہیں ہے، دوسرے ایک مرتبہ ائیر فورس میں باقاعدہ شامل ہونے کے بعد ایک آدھے سال ہی میں اُس سے علیحدگی ضوابط کے لحاظ سے بھی مشکل ہوگی۔تیسرے میری عمر کے اُس وقت چوبیس سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے۔اس کم عمری میں ماحول پر اثر انداز ہونا بھی مشکل ہوگا۔اور چوتھی بات یہ تھی کہ ابتک میں والدین کے سائے اور بھائی بہنوں کی رفاقت سے کبھی دور نہیں ہوا تھا، اور اس ماحول میں تنہا رہائش اختیار کرنا مجھے بھاری معلوم ہورہا تھا۔ان سب وجوہ کی بنا پر بعد میں فیصلہ یہی ہوا کہ اس جگہ کے لئے کسی اور مناسب شخص کو تلاش کیا جائے جو بعد میں ڈاکٹر فدا محمد صاحب کی شکل میں مل بھی گیا۔

یہ معاملہ تو اس طرح طے ہوا، لیکن اس موقع پر ہم ایک نماز کے لئے مسجد مہابت خان پہنچے تو پتہ چلا کہ وہاں کی خطابت وامامت اور وہاں قائم مدرسہ اشرفیہ کا انتظام حضرت مولانا عبدالودود قریشی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد یوسف قریشی صاحب کے سپرد ہے۔(افسوس ہے کہ جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، اُس سے چند دن پہلے ہی اُن کی وفات کی خبر ملی ہے۔رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃ) نماز

کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی، تو وہ بڑی محبت سے پیش آئے، اور انہوں نے اپنی روایات کے مطابق مہمان نوازی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ انہی کی دعوت پر پہلی بار وہ کڑھائی گوشت کھانے کی نوبت آئی جو دراصل یہیں کی خصوصیت تھی، بعد میں لوگوں نے اس کے اصل طریقے میں نہ جانے کیا کیا تصرفات کرکے کس کس ملغوبے کا نام کڑھائی گوشت رکھ لیا ہے، لیکن اس اصل کڑھائی گوشت کی لذت آج تک بھولتی نہیں۔

انہوں نے ہی یہ پیشکش کی کہ آپ پشاور آئے ہیں، تو یہاں کی کچھ خاص جگہوں سے لطف اندوز ہوں۔ چنانچہ وہ ہمیں پہلے ورسک ڈیم لے گئے جو دریائے کابل پر بنا ہوا ہے۔ مئی کا مہینہ تھا، اور گرمی کے موسم میں ہم نے دریا میں نہانے کا لطف اٹھایا، پھر انہوں نے بتایا کہ ورسک دراصل علاقے کا نام ہے جو آزاد قبائل کے علاقے میں واقع ہے۔ اور کیا اچھا ہو کہ آپ ایک رات اس علاقے میں گذار کر قبائلی ثقافت اور روایات کو آنکھوں سے دیکھیں۔ چنانچہ ورسک کے علاقے میں وہ ہمیں ایک پہاڑ پر لے گئے جو آزاد علاقے میں واقع تھا، اور وہاں ان کے ایک دوست کا مکان، بلکہ چھوٹا سا قلعہ تھا۔ انہوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی سے ہمارا استقبال کیا، گرمی کے موسم میں شہر کی بجلیوں سے دور تارے بھروں آسمان کے نیچے پہاڑی پر رات گذارنے کا وہ منظر بھی بھولتا نہیں، اور ساتھ ہی یہ منظر بھی کہ رات کے کھانے کے بعد اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارے میزبان جنگی لباس میں رائفل لٹکائے ہوئے اس طرح تیار تھے جیسے وہ کسی محاذ جنگ پر جارہے ہوں۔ ہم نے حیرت سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اُنہیں کسی ضرورت سے باہر جانا ہے، اور ہم اپنے دشمنوں کی وجہ سے نہتے گھر سے نہیں نکل سکتے، پھر انہوں نے ہمیں اپنے قلعہ نما مکان سے جس میں گولیاں چلانے کے لئے سوراخ بھی نظر آتے تھے، کچھ فاصلے پر لے جاکر دکھایا کہ یہ ہمارا آبائی قبرستان ہے، اور اس میں بہت بڑی تعداد اُن لوگوں کی ہے کہ جو قبائلی جنگوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ پھر انہوں نے اس قبرستان کے پار کچھ دور ایک اور قلعہ نما مکان دکھا کر بتایا کہ یہ ہمارے چچازاد بھائیوں کا قلعہ ہے جن سے ہمارے خاندان کی دشمنی ہے۔ یہ باتیں سن کر جاہلی عرب کا نقشہ سامنے پھر گیا جس میں ان کی دشمنیاں عموماً اپنے چچازاد بھائیوں سے ہوا کرتی تھیں۔ ہم نے اپنے میزبانوں کو اس کے کچھ واقعات سنا کر اُن سے درخواست کی کہ الحمدللہ اسلام نے عرب کی ان دشمنیوں کو ختم کرکے لوگوں کو بھائی بھائی بنادیا تھا۔ آپ حضرات بھی کوشش کریں کہ یہ فضا اب ختم ہو، اور اسلام کے سائے تلے سب ایک ہوجائیں۔ یہ ۱۹۶۷ء یعنی اب سے ۵۳ سال پہلے

کی بات ہے۔ الحمدللہ اب اس صورت حال میں کافی بہتری آئی ہے۔

بہر کیف! یہ رات بڑی پرلطف گذری۔ پشاور سے فارغ ہونے کے بعد ہمارا خیال ہوا کہ یہاں سے اکوڑہ خٹک بہت قریب ہے جہاں شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوجائے، اور ان کے صاحبزادے جناب مولانا سمیع الحق صاحب (جن سے ابتدائی ملاقات کا دلچسپ واقعہ میں ۱۹۵۶ء کے واقعات میں ذکر کرچکا ہوں) اُن سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ چنانچہ ہم نے ایک دن رات اکوڑہ خٹک میں گذارے۔ یادگار سلف شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انتہائی شفقت کا معاملہ فرمایا، اور برادر ان محترم جناب مولانا سمیع الحق صاحب اور مولانا شیر علی شاہ صاحب[1] کے ساتھ بڑی دلچسپ علمی اور ادبی نشستیں رہیں۔ اکوڑہ خٹک حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے جہاد کا ایک اہم مرکز تھا جہاں بڑا زبردست معرکہ ہوا تھا۔ سکھوں کی وہ گڑھی جس پر یہ معرکہ برپا ہوا، وہ بھی دیکھی، اور شام کے وقت قریب بہتے ہوئے دریائے کابل میں کشتی رانی کا بھی لطف اٹھایا۔ میں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر "اے وادیٔ کشمیر" کے نام سے ایک نظم کہی تھی، ان حضرات نے وہ نظم سنانے کی فرمائش کی، چنانچہ میں نے تعمیل کی۔ اب تک میں نے اپنی کوئی نظم یا غزل کہیں چھپوائی نہیں تھی۔ مولانا سمیع الحق صاحب نے پہلی بار وہ اپنے ماہنامے "الحق" میں شائع کی، اور اداریتی نوٹ میں ان مجلسوں کا بڑی محبت سے ذکر کیا۔

پشاور اور اکوڑہ خٹک کا یہ سفر اتنا پرلطف رہا کہ اگلے سال مولانا سمیع الحق صاحبؒ کی فرمائش پر ہم نے اس علاقے کے ایک تفریحی سفر کا باقاعدہ پروگرام بنالیا۔ حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم اور میرے دوست جناب محمد کلیم صاحب بھی ساتھ ہوگئے۔ راولپنڈی میں مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایک رات گذاری، اور وہ بھی اس سفر میں ساتھ رہنے کے لئے تیار ہوگئے۔ نیز حضرت مولانا نافع گل صاحبؒ کے صاحبزادے مولانا عبداللہ کاکا خیلؒ بھی۔ اکوڑہ خٹک میں ایک دو روز پرکیف مجلسوں میں گذارنے کے بعد ہم نے مولانا عبداللہ کاکا خیل صاحب سے درخواست کی کہ ہمیں شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق کار حضرت

۱۔ یہ تحریر ۲۰۱۴ء کی لکھی ہوئی ہے جب یہ دونوں بزرگ بقید حیات تھے، افسوس ہے کہ اب جب کہ اس کی اشاعت ہورہی ہے، مولانا سمیع الحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوچکے ہیں، اور مولانا شیر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عزیر گل صاحب کی زیارت کا شوق ہے۔ان کا قیام مردان اور سوات کے درمیان ایک گاؤں سخاکوٹ میں تھا۔مولانا سمیع الحق صاحبؒ کے دوست جناب شفیق صاحب مرحوم بھی ساتھ ہوئے۔چنانچہ ہم سات افراد کا قافلہ سخاکوٹ پہنچا، یہ ایک نہایت سرسبز اور پُر فضا مقام تھا۔حضرت مولانا عزیر گل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت ہوئی، اگرچہ حضرتؒ کی مادری زبان پشتو تھی، لیکن حضرت شیخ الہندؒ کی صحبت کی وجہ سے وہ دیوبند اور سہارنپور کی ٹکسالی زبان بھی بڑی خوبی سے بولتے تھے۔حضرتؒ نے اپنی شفقتوں سے نہال فرمادیا۔ان کے بھائی اور مولانا عبداللہ کا خیلؒ کے والد حضرت مولانا نافع گل صاحبؒ بھی وہیں قیام فرماتھے۔دونوں بھائیوں کے درمیان قابل رشک محبت کے ساتھ ساتھ بڑی دلچسپ اور علمی انداز کی نوک جھونک بھی چلتی رہتی تھی۔غرض ان حضرات کی مجلسوں سے سب بڑے لطف اندوز ہوئے۔

اسی دوران یہ دلچسپ واقعہ پیش آیا کہ عشاء کی نماز کے لئے ہم نے قاری سعید الرحمٰنؒ کی دلکش تلاوت کی وجہ سے درخواست کی کہ وہ نماز پڑھائیں۔ہماری طرح وہ بھی مسافر تھے، اس لئے انہوں نے قصر کرتے ہوئے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا۔اتفاق سے ایک مقامی دیہاتی بھی نماز میں شریک ہوگیا تھا۔اُس نے امام کو سلام پھیرتے ہوئے دیکھا، تو اُس نے بھی سلام پھیر دیا۔مولانا سمیع الحقؒ نے اُسے اشارہ کیا کہ وہ کھڑے ہوکر نماز پوری کرے، مگر وہ نہ سمجھا، تو مولانا نے اُسے پشتو میں سمجھایا کہ امام مسافر ہیں، اس لئے انہوں نے دو رکعتیں پڑھائی ہیں، آپ چونکہ مقامی آدمی ہیں، اس لئے آپ پوری نماز پڑھیں۔اس کے جواب میں اُس دیہاتی نے پشتو میں جو کچھ کہا، سب لوگ اُس پر ہنس پڑے۔ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ کہہ رہا ہے کہ "کیا تم سفر میں آدھی روٹی کھاتے ہو؟ اگر نہیں، تو نماز کو آدھا کرنے کا کیا جواز ہے؟"

سخاکوٹ سے ہم سوات کے دروازے بٹ خیلہ پہنچے جہاں دوپہر کو علاقے کے ایک سردار نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔اس کھانے میں انہوں نے انواع واقسام کے پرندوں کا گوشت جمع کیا ہوا تھا، اور اسے پکایا بھی اتنی خوبی سے تھا کہ اُس کھانے کی لذت آج بھی یاد ہے۔اس کے بعد ہم بحرین سے ہوتے ہوئے کالام پہنچے، قدرتی نظاروں کی یہ حسین وادی ہم صحرا کے رہنے والوں کو مبہوت کرگئی۔ایک رات وہاں گذار کر واپس ہونے کا ارادہ کیا، تو معلوم ہوا کہ بارشوں کی وجہ سے راستے مخدوش ہیں، اور بس سروس بند ہوگئی ہے۔لیکن پھر ایک ٹرک جانے کے لئے تیار ہوگیا، اُس پر سوار ہوکر ہم کسی طرح منگورہ پہنچ گئے۔وہاں سے ہم

نے بالاکوٹ جانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، چنانچہ ایبٹ آباد سے ہوتے ہوئے بالاکوٹ کا سفر کیا جہاں حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر سلام عرض کرنے کی سعادت ملی ۔ یہ تمام علاقہ پہاڑوں اور سبزہ زاروں سے بھرا ہوا ہے، اور یہیں پر اُس معرکے کی یادگاریں، آج تک مجاہدین کے جذبے، ولولے اور شوق شہادت کی داستانیں سناتی ہیں ۔ یہاں سے ایبٹ آباد واپس آ کر ہم نتھیا گلی کے راستے مری پہنچے۔ ایبٹ آباد سے نتھیا گلی اور پھر مری تک کا پورا خطہ برف پوش پہاڑوں اور سبزہ وگل کے قدرتی مناظر سے مالا مال ہے، اور اسی سفر کے دوران میں نے اپنی نظم "مری کی شام " کہی تھی، جو بار بار اصرار کر کے سُنی گئی۔

اسلام آباد انٹرنیشنل کانفرنس ۱۹۶۸ء

یہ صدر محمد ایوب خان صاحب مرحوم کی حکومت کا زمانہ تھا۔ یوں تو ان کے دور میں پاکستان کے معاشی حالات پہلے سے بہتر ہوئے تھے، لیکن ایک طرف سیاسی جماعتیں ان کے دور کو آمریت کا دور قرار دیتی تھیں، دوسری طرف دینی حلقے اُن سے اس لئے ناخوش تھے کہ انہوں نے ادارۂ تحقیقات اسلامی کی سربراہی ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو سونپ دی تھی، جو میکگل یونی ورسٹی سے اسلامی علوم پر پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے، اور انہوں نے اسلام کو مغربی افکار کے مطابق گھڑنے کے لئے امت کے اجماعی مسلمات کو اپنی "ریسرچ" کا تختۂ مشق بنایا ہوا تھا، اور ان کے نت نئے افکار نے ملک بھر کے علمی حلقوں میں نئے مباحث کا دروازہ کھول دیا تھا۔ ان کی ان کاوشوں کو دینی حلقوں کی طرف سے " تحریف دین " قرار دیا جا رہا تھا۔ میں نے بھی البلاغ میں اداریے کے طور پر اُن کے متعدد افکار پر کئی سنجیدہ مضامین لکھے تھے، جو "علماء اور وقت کے تقاضے "، " تحقیق یا تحریف؟" "نئی تعبیر" وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوئے۔

اسی دوران ادارۂ تحقیقات اسلامی کی طرف سے ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرنے کا پروگرام بنایا گیا، جن میں وہ بیشتر موضوعات زیر بحث رکھے گئے جن میں پاکستان کے علماء ادارۂ تحقیقات اسلامی سے اختلاف رکھتے تھے۔ اس کانفرنس میں شیخ الازہر سمیت دنیائے اسلام کے بڑے نامور علماء کو دعوت دی گئی۔ عام طور سے خیال یہ تھا کہ اس کانفرنس سے ادارۂ تحقیقات اسلامی کا مقصد خاص طور پر عرب ملکوں کے علماء سے اپنے طرز فکر کی تائید حاصل کرنا ہے۔ حضرت والد صاحبؒ، حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کو بھی اس میں دعوت دی گئی تھی۔ ان حضرات کو شروع میں یہ تامل رہا کہ اس میں شرکت

مناسب ہے یا نہیں؟ لیکن آخر کار رائے یہی ہوئی کہ عالم اسلام کے مشہور علماء کرام تشریف لا رہے ہیں، اور اس میں فعال شرکت کر کے دلائل کے ساتھ اپنا موقف ظاہر کرنا چاہئے۔ کانفرنس کے موضوعات میں ''اسلام کا نظام تقسیم دولت'' ایک اہم موضوع تھا، جس میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت دونوں پر بحث ہو سکتی تھی، اور یہی دو نظام تھے جن سے متاثر ہو کر مغربی جدیدیت کے مبلغ اسلامی احکام میں تبدیلیوں کے خواہاں تھے۔ اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ موضوع مقالہ لکھنے کے لئے اختیار فرمالیا، اور مجھے کچھ زبانی ہدایات دیکر حکم دیا کہ اُس کا ابتدائی مسودہ میں تیار کروں۔ چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ مقالہ لکھنا شروع کیا۔ حضرت والد صاحبؒ کی دعائیں شامل حال تھیں۔ الحمد للہ! وہ تیار ہو گیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے اُس پر نظر ثانی فرمائی، اور بعض چیزوں کا اضافہ کیا۔ یہ کانفرنس ۱۰ر فروری ۱۹۶۸ء مطابق ۱۰ر ذیقعدہ ۱۳۸۷ھ کو راولپنڈی کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں منعقد ہو رہی تھی (جس کا نام اب پرل کانٹی نینٹل ہو گیا ہے) حضرت والد صاحبؒ مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ کانفرنس میں واقعی عالم اسلام کے نامور علماء موجود تھے جن میں مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین الحسینی، ازہر کے ریکٹر شیخ باقوری، لیبیا کے قاضی القضاۃ شیخ منصور المحجوب، مصر کے ڈاکٹر حب اللہ وغیرہ شامل تھے۔ ان سب سے ملاقات ہوئی، اور کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں حضرت والد صاحبؒ نے اپنا مقالہ پیش فرمایا جسے بہت سراہا گیا۔ اجتہاد کے موضوع پر علماء کرام نے بڑا معتدل اور متوازن نقطۂ نظر پیش کیا۔ البتہ بعض دوسرے پاکستانی حضرات کے مقالات مغربی جدیدیت کے آئینہ دار تھے۔ ان پر حضرت بنوریؒ اور حضرت مفتی محمود صاحبؒ نے تنقید فرمائی اس کانفرنس کی پوری روداد میں نے لکھی تھی جو البلاغ کے شمارے محرم الحرام ۱۳۸۸ھ جلد دوم ص ۳۱ سے ص ۴۲ میں شائع ہوئی۔

اسلام آباد شہر اُس وقت بننا شروع ہی ہوا تھا۔ جہاں آج وزارت خارجہ کا دفتر ہے، وہاں اسلام آباد کا واحد ہوٹل شہرزاد ہوا کرتا تھا۔ وزارت قانون کی طرف سے وہاں ایک شام عشائیہ دیا گیا، اور مندوبین کو نئے شہر کے مختلف مقامات کی سیر بھی کرائی گئی، اس کے علاوہ بھی مندوبین کے اعزاز میں کئی دعوتیں ہوئیں۔ ان میں سے بعض مواقع پر مفتیٔ اعظم فلسطینؒ کی تقریر ہوئی، تو اس کا اردو ترجمہ مجھ سے کرایا گیا۔ کانفرنس کے اختتام پر لیکن جب مندوبین کو ایک سیاحتی بس کے ذریعے لاہور لے جانے کا پروگرام بنایا گیا جس کے دوران وہ پاکستان کی خوبصورت زمین بھی دیکھ سکیں۔ حضرت والد صاحبؒ اپنے ضعف اور مصروفیات کی وجہ سے اس

پروگرام میں شرکت نہیں فرما رہے تھے، اور مجھے بھی ان کے ساتھ واپس جانا تھا، لیکن اس موقع پر غالباً مفتیٔ اعظم فلسطین ؒ نے حضرت والد صاحبؒ سے فرمایا کہ تقی کو ہمارے ساتھ بھیج دیں، تاکہ وہ ہماری ترجمانی کرسکے۔ حضرت والد صاحبؒ نے مجھے اجازت دیدی، اور میں ان حضرات کے ساتھ روانہ ہوگیا، اور راستے میں منگلا ڈیم سمیت کئی جگہ قیام ہوا۔ اور آخر میں گوجرانوالہ میں حضرت مولانا سرفراز خان صاحب صفدر رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے نصرۃ العلوم میں بھی ایک دعوت ہوئی، اور میں ترجمانی کے فرائض انجام دیتا رہا۔ آخرکار لاہور پہنچ کر اس سفر کا اختتام ہوا۔

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دار العلوم کراچی

یادیں

(بتیسویں قسط)

حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاحی تعلق اور بیعت

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتلقین اور تربیت کے اثر سے یہ خیال تو ہمیشہ دامنگیر رہا کہ تنہا حروف ونقوش کا کتابی علم انسان کی اصلاح کے لئے کافی نہیں ہوتا، اور جب تک انسان کسی مرشد سے اصلاح کا تعلق قائم نہ کرکے اس کی رہنمائی میں عملی تربیت حاصل نہ کرے، عادۃً اس کے اعمال واخلاق کی اصلاح نہیں ہوتی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بکثرت ہمیں اپنے بزرگوں سے تعلق کے واقعات سنایا کرتے تھے، اور ہمیں اہتمام کے ساتھ معاصر بزرگوں کی خدمت میں لے جاتے۔ چنانچہ بچپن ہی سے الحمد للہ تعالیٰ حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانیؒ، حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسریؒ، حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھول پوریؒ، حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ، حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب عارفیؒ، حضرت مولانا عبدالغفور صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا رسول خان صاحبؒ، حضرت بابا نجم احسن صاحبؒ اور نہ جانے کتنے اور بزرگوں کی زیارت اور ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا، جس کی وجہ سے بفضلہ تعالیٰ اللہ والوں کی صحبت کی اہمیت دل میں بیٹھی ہوئی تھی، اور بچپن ہی سے دل میں تھا کہ کسی شیخ سے باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم کرنا ضروری ہے۔ شروع میں دل کا بہت زیادہ میلان حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے یہ تاکید تھی کہ جب کبھی لاہور جانا ہو، تو حضرتؒ کی خدمت میں ضرور حاضری دو، چنانچہ الحمد للہ اس پر عمل بھی ہوتا تھا، مگر میری عمر اُس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ حضرتؒ سے اصلاحی تعلق یا بیعت کی درخواست کی ہمت نہیں ہوتی تھی، یہاں تک کہ میرے بچپن ہی میں حضرتؒ کی وفات ہوگئی، البتہ ۱۹۵۵ء میں

حضرتؒ کی شاگردی کا شرف اللہ تعالیٰ نے غیبی طور پر عطا فرمایا جس کا واقعہ پہلے لکھ چکا ہوں۔

دارالعلوم سے درس نظامی کی تکمیل کے بعد کسی بزرگ سے اصلاحی تعلق قائم کرنے کا خیال اور زیادہ اہمیت کے ساتھ دل میں پیدا ہوتا رہا۔ اُس وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہفتہ وار اصلاحی مجلس خود ہمارے گھر میں ہوا کرتی تھی۔ الحمد للہ تعالیٰ اُس مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر اس مجلس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے ملفوظات پڑھتے، یا کسی سے پڑھواتے، اور پھر ان کی تشریح فرمایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے استاذ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے جب میں نے اس مجلس میں شرکت کا ذکر کیا، تو انہوں نے فرمایا کہ حضرتؒ کی مجلس میں جب بیٹھو، تو اس تصور سے نہیں کہ وہ میرے والد ہیں، بلکہ اس تصور سے کہ وہ اللہ والے ہیں، تب فائدہ ہوگا۔ الحمد للہ پھر اسی نیت سے بیٹھنے کی توفیق ہوئی، اور اس مجلس کی بدولت اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت حکیم الامتؒ کے علوم وفیوض سے ایک طبعی لگاؤ پیدا ہوگیا۔ اس وقت جب اصلاحی تعلق قائم کرنے کا خیال آتا، تو دل بے ساختہ یہ کہتا کہ جب اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت **والد** صاحبؒ کی شکل میں خود ہمارا گھر ایک دریائے فیض بنا ہوا ہے، تو کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے؟ حضرت **والد** صاحبؒ سے صرف ایک باپ بیٹے ہی کا تعلق نہیں تھا، بلکہ الحمد للہ ان کی عقیدت سے بھی دل معمور تھا، اور ان کی ہر بات دل میں اترتی محسوس ہوتی تھی، اس لئے ایک مرتبہ میں نے ان سے بیعت کی درخواست پیش کردی۔ اس پر حضرت والد صاحبؒ نے یہ جواب دیا کہ اگر چہ ماضی میں ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ باپ نے بیٹے کو بیعت کیا ہے، لیکن نسبی تعلق کے ساتھ اس تعلق کا حق ادا کرنا مشکل ہوتا ہے، اور یہ نسبی تعلق افاضہ اور استفاضہ میں عموماً رکاوٹ بن جاتا ہے، اس لئے مناسب یہی ہے کہ کسی اور سے تعلق قائم کرو۔

حضرت ڈاکٹر عبد الحئی عارفی قدس اللہ تعالیٰ سرہ حضرت حکیم الامتؒ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے، اور حضرت والد صاحبؒ ان کے بارے میں اصغر گونڈوی مرحوم کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

خطِ ساغر میں رازِ حق و باطل دیکھنے والے
ابھی کچھ لوگ ہیں ساقی کی محفل دیکھنے والے

اور کبھی یہ شعر:

مجھے دیکھ آئینۂ یار ہوں میں
جلا کردۂ حسنِ دلدار ہوں میں

حضرت والد صاحبؒ اور حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے درمیان ملاقاتوں کا سلسلہ رہا کرتا تھا، اور ہمیں بھی حضرتؒ کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہتا تھا، لیکن ابھی تک باقاعدہ اصلاحی تعلق قائم کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ آخر کار حضرت والد صاحبؒ نے انہی سے اصلاحی تعلق قائم کرنے اور بیعت کا مشورہ دیا، اور ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۹۶۹ء میں ایک دن وہ برادر معظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم کو اور مجھے حضرتؒ کی خدمت میں لے گئے، اور حضرتؒ سے ہمیں بیعت کرنے کی فرمائش کردی۔ حضرتؒ نے حسب معمول محبت وشفقت کا معاملہ فرمایا، اور اگلے دن ہم دونوں کو تنہائی میں حاضر ہونے کی ہدایت دی۔ اگلے دن ہم دونوں حاضر ہوئے، اور بفضلہٖ تعالیٰ حضرتؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔

حضرتؒ کی ہفتہ وار مجلس جمعہ کے دن ہوا کرتی تھی۔ الحمدللہ تعالیٰ بیعت ہونے کے بعد اُس میں ہر ہفتے حاضر ہونے کی توفیق ہوتی رہی۔ بعد میں حضرت والاؒ نے خاص ہم لوگوں کے لئے پیر کے دن ایک اور مجلس شروع فرمادی۔ الحمدللہ تعالیٰ اس مجلس میں بھی سالہا سال پابندی سے حاضر ہونے کی توفیق ہوتی رہی۔ مجلس کے علاوہ بھی حسب موقع اور خاص طور پر کسی معاملے میں حضرتؒ کی ہدایات حاصل کرنے کے لئے حاضری ہوتی رہی۔ اور خط وکتابت کے ذریعے بھی بفضلہٖ تعالیٰ مستقل اپنے حالات کی اطلاع دینے اور حضرتؒ کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش جاری رہی۔

حضرتؒ کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سترہ سال اصلاحی تعلق قائم رکھنے کا شرف عطا فرمایا۔ جب ان سترہ سالوں پر نظر ڈالتا ہوں، تو حضرتؒ کی طرف سے بے انتہا الطاف وعنایات اور محبت وشفقت کا ایک عجیب منظر نظر آتا ہے۔ ہر حاضری کے موقع پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرتؒ کسی نہ کسی طرح اپنے شیخؒ سے حاصل کردہ فیوض ہمارے دل ودماغ میں انڈیل دینے کے لئے بیتاب ہیں۔ اس تمام عرصے میں اللہ تعالیٰ معاف فرمائیں، اپنی طرف سے تو غفلت ہی غفلت رہی، لیکن حضرتؒ کی شفقتوں نے زبردستی کچھ ایسی باتیں دل میں اتار دیں کہ الحمدللہ طریق کا صحیح مفہوم ذہن نشین ہوگیا۔ حضرتؒ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جو

خطوط لکھے، اور حضرتؒ کی طرف سے ان کے جو دلنشین جوابات موصول ہوئے وہ الحمد للہ تعالیٰ میرے پاس محفوظ ہیں، اور آج بھی میرے لئے مشعلِ راہ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند خطوط جو عمومی فائدے کے ہیں، ذیل میں درج کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ میں نے حضرتؒ کو لکھا :

"یہ خلش ذہن میں باقی ہے کہ جو کچھ کام ہم کر رہے ہیں، اُن میں یہ کیسے معلوم ہو کہ نیّت درست ہے یا نہیں، جبکہ مشاہدہ بھی ہے، اور نصوص بھی اس پر دلالت کرتی ہیں کہ بعض اوقات عمل صالح ہوتا ہے، لیکن نیّت فاسد ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے وہ عمل حبط ہو جاتا ہے، اسی لئے احادیث میں نیّت کے تحفظ کی تاکید آئی ہے۔ تو یہ تحفظ کا اہتمام کس طرح کیا جائے اپنی طرف سے یہ کہہ تو لیتے ہیں کہ ہماری نیّت درست ہے، لیکن خطرہ یہ رہتا ہے کہ یہ محض زبانی جمع خرچ تو نہیں۔ نیت جو قلب کا فعل ہے، محض زبان کے ذریعے الفاظ کہہ دینے سے تو ادا نہیں ہوگا۔ اور قلب کو ٹٹولا جائے، تو اس میں صحیح نیت کے ساتھ بعض اوقات کچھ دوسرے تصورات بھی شامل نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں نیت کی درستی کا اطمینان کیسے ہو سکتا ہے؟"

حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا: "جب یہ معلوم ہے کہ نیت ارادۂ قلب کو کہتے ہیں، تو اکثر ہمارے معمولات غیر شعوری طور پر اسی ارادۂ قلبی سے ہوتے رہتے ہیں۔ ہر وقت تجدید نیت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر عمل کے درمیان میں یہ خیال ہو کہ یہ عمل ریاکارانہ ہو رہا ہے، تو یہ محض وہم ہے، ابتدا میں یہ نیت نہ تھی۔ ہاں وہ عمل جو ابتدا ہی سے ریا کی نیت سے کیا جائے، وہ خالص ریا ہے۔ درمیان عمل میں پھر نیت بدلی نہیں جا سکتی، بلکہ اس عمل کو جاری رکھا جائے گا، بعد میں استغفار سے اس کا تدارک ہو جائے گا۔"

میں نے جو لکھا تھا کہ "اور قلب کو ٹٹولا جائے، تو اس میں صحیح نیت کے ساتھ بعض اوقات کچھ دوسرے تصورات بھی شامل نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں نیت کی درستی کا اطمینان کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے جواب میں حضرتؒ نے فرمایا" : نیت فعل اختیاری ہے، اور تصورات غیر اختیاری ہیں، اس لئے نہ قابل اعتبار ہیں، نہ قابل اعتناء۔ "

ایک اور خط میں بندہ نے حضرتؒ کو لکھا ": پچھلے دوشنبہ کو حضرت والا نے " کبر "اور" عجب "کے بارے میں جو بصیرت افروز تقریر فرمائی، اس کا دل پر اثر رہا، لیکن جب اپنے حالات پر اس کو منطبق کرنے کی

کوشش کرتا ہوں، تو خیال یہ ہوتا ہے کہ اپنے کسی بھی وصف کو یوں تو اپنا کوئی کمال نہیں سمجھتا، لیکن اللہ تعالیٰ کی عطائے محض کے طور پر بسا اوقات اپنے اندر بعض خوبیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ان پر ادائے شکر بھی کرتا ہوں، اور ان خوبیوں کے ادراک سے دل کو حظ اور سرور بھی معلوم ہوتا ہے۔ یہ کیسے پتہ چلے کہ یہ حظ اور سرور عُجب ہے یا نہیں؟ اگر یہ عجب ہے تو اس کا علاج کیا ہو، اور اگر عجب نہیں ہے، تو ایسے خیالات بکثرت آتے ہیں۔ کیا بے فکر رہوں کہ یہ خیالات عجب نہیں ہیں؟"

حظ وسرور کے بارے میں حضرتؒ نے جواب دیا: " یہ کیفیت عین ایمان اور علامت صدق ہے۔ " اور مذکورہ حالات میں "عجب " کے شبہے کے بارے میں فرمایا: "عجب کا شبہہ ہی علامت اخلاص ہے۔ اللہ تعالیٰ کیفیت اخلاص میں پیہم ترقی عطا فرمائیں۔ دل سے دعا کرتا ہوں۔"

جس زمانے میں بندہ سپریم کورٹ کی شریعت اپیلیٹ بنچ میں جج مقرر ہوا، اس وقت ایک خط میں حضرتؒ کو لکھا: " کچھ عرصے سے بطور خاص اپنے اندر یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ عوام کی ملامت کا دل میں کافی خوف پیدا ہو گیا ہے، بالخصوص اس بات کا بہت خوف محسوس ہوتا ہے کہ جب سے احقر کو حکومت کے بعض کاموں میں دخیل ہونے یا بعض سرکاری مناصب کی خدمت کا موقع ملا ہے، اُس وقت سے لوگ مجھے سرکاری درباری آدمی نہ سمجھنے لگیں۔ اگرچہ بار بار کے استخارے اور حضرتِ والا کے مشورے کے بعد فیما بینی وبین اللہ دل اس بات پر مطمئن ہے کہ ان شاء اللہ دینی مقاصد کے لئے یہ کام احقر کے لئے درست ہے، اور مجھے یہ کام ضرور کرنا چاہئے، لیکن لوگوں کی اس ملامت کا خوف اکثر وبیشتر دل پر مسلط رہتا ہے"۔

حضرتؒ نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا: " کیا کسی نے ابتک ایسا سمجھا بھی ہے، یا محض وہم اور وسوسہ ہے جو یقیناً حبِّ جاہ سے ناشی ہے۔ اس پر بھی ندامت اور استغفار واجب ہے۔ کیا اپنی ہستی کے ساتھ کسی دینی کمال وصفت کا انتساب متصور ہے جس کے زائل ہونے کا خوف ہے؟ اس اندیشے کا ازالہ استغفار ہے۔ یہ دعا بہت مجرب ہے: " اَللّٰھُمَّ اقْذِفْ فِیْ قَلْبِیْ رَجَاءَ کَ ، وَاقْطَعْ رَجَائِیْ عَمَّا سِوَاکَ ". ہر نماز کے بعد پڑھا کریں۔ تمام حالات مذکورہ کے پیش نظر دل سے دعا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام مکائد نفس سے محفوظ رکھیں، اور ہر مقام پر اپنے حفظ وامان میں عزت وعافیت کے ساتھ رکھیں، اور ہر حال میں آپ کی نصرت وحمایت فرمائیں۔ آمین"۔

اس کے بعد بندہ نے حضرتؒ کو لکھا: "جیسا کہ حضرت والا نے تصدیق فرمادی ہے کہ یہ خوف حُبّ جاہ سے ناشی ہے، اس لئے بڑی فکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے نجات عطا فرمادیں۔ حضرت اس کے لئے جو تدبیر تجویز فرمائیں گے، ان شاء اللہ اس کو اختیار کروں گا۔"

حضرتؒ نے جواب دیا: " حبّ جاہ کا وہم جس وقت ہو، فوراً استغفار کرلیں، اور اپنے کام میں مشغول رہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ مکائد نفس سے محفوظ و مامون رکھیں۔ آمین"

ایک اور خط میں بندہ نے مذکورہ بالا خیالات اور حُبّ جاہ کے بارے میں لکھا کہ اس کی زیادہ فکر ہوگئی ہے، تو حضرتؒ نے تحریر فرمایا: " کسی کی طرف توجہ ہی نہ کریں، نیت اپنے اختیار میں ہے، رجوع الی اللہ ہوجانے کے بعد مطمئن رہیں۔ حبّ جاہ کا احساس خود اس کا علاج ہے جس کا تدارک استغفار سے ہوجاتا ہے۔ "

ایک مرتبہ حرمین شریفین کی حاضری کے بعد میں نے حضرتؒ کو لکھا: "احقر کو روضۂ اقدس پر حاضری کے وقت ہمیشہ ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ سلام کے معروف کلمات عرض کرنے کے بعد نہ وہاں سے جلد ہٹنے کو دل چاہتا ہے، اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اور کیا عرض کروں؟ اکثر خاموش کھڑا رہتا ہوں، پھر کچھ دیر خاموشی کے بعد دوبارہ صلوۃ وسلام یا درود شریف عرض کرتا ہوں۔۔۔ اگر حضرتِ والا سلام عرض کرنے کا صحیح طریقہ ارشاد فرمادیں، تو آئندہ کے لئے یہ کشمکش رفع ہو۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ دیر تک کھڑا رہنا ادب کے مطابق ہے یا نہیں؟ "

حضرتؒ نے جواب میں تحریر فرمایا: " ادب محبت یہ ہے کہ جو بات ہو، مختصر ہو، روایات میں ہے کہ صحابۂ کرامؓ مواجہہ شریف میں بہت مختصر قیام کرتے تھے۔۔۔ صرف اس قدر سلام عرض کرتے تھے: **السلام علیک أیها النبیّ ورحمة الله وبرکاته**۔ پھر ہٹ جاتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں جبکہ حاضری کے مواقع بہت کم ملتے ہیں، اگر ادباً سلام عرض کرنے کے بعد کچھ دعائیں کرلی جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں، مگر بہت مختصر۔ میرا ذوق تو یہی ہے جو عرض کیا، لیکن قدم مبارک کی طرف جالی کے قریب قبلہ رُخ بیٹھ کر جس قدر عرض معروض کرے یا خاموش بیٹھا رہے، ہر حالت میں سعادت ہی سعادت ہے۔"

حرمین شریفین کی حاضری ہی کے متعلق میں نے حضرتؒ کو لکھا کہ: "اس مرتبہ چونکہ حرمین شریفین میں قیام بہت مختصر تھا، اس لئے احقر نے دونوں مقامات پر چند خاص حضرات کے سوا کسی کو اپنی آمد کی خبر نہیں کی،

تا کہ جو وقت ملے، حرمین شریفین ہی میں نصیب ہو جائے، اس کی بنا پر بعض حضرات کو شکایت بھی پیدا ہوئی، اور اندیشہ ہوا کہ اس طرح تعلقات کا حق تو تلف نہیں ہوا۔۔۔ایسے مواقع پر حضرتِ والا سے صحیح طرزِ عمل کی تلقین کی درخواست ہے۔"

حضرتؒ نے جواب دیا" : میرا ذوق تو یہی ہے کہ وہاں حاضری کی کسی کو اطلاع ہی نہ دی جائے، جس قدر بھی وقت ملے، حرمین شریفین کے اندر ہی رہا جائے۔البتہ یہ بھی ایک فطری امر ہے کہ احباب سے بر بناء تعلق بیگانہ وار بھی نہیں رہا جاتا، اس لئے نظم اوقات میں صرف خاص احباب کے لئے کوئی مختصر سا وقت مقرر کر لیا جائے، تا کہ انتشارِ فکر نہ رہے۔وہاں تعلقات کا حق ادا کرنے نہیں جاتے، اور نہ یہ حق کوئی حقِ واجب ہے۔"

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(تینتیسویں قسط)

میرا نکاح

میرے والدین میرے نکاح کے لئے کسی موزوں رشتے کی تلاش میں تھے، اور آخر کار اُن کی نظر انتخاب جناب شرافت حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی پر ٹھہری۔ جناب شرافت حسین صاحبؒ بنیادی طور پر ایک تاجر تھے، لیکن حضرت والد صاحبؒ اور شہر کے تمام بزرگوں سے ایسا نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے کہ اُن میں سے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ اُن کے ساتھ اُن کا تعلق زیادہ ہے۔ الہ آباد کے رہنے والے تھے، اور وہاں بھی حضرت حکیم الامۃ کے خلیفہ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ان کا خصوصی تعلق تھا۔ میری والدہ اُس وقت بہت علیل تھیں، اس لئے نکاح کا پیغام میری بڑی بہنوں کے ذریعے دلوایا۔ حضرت بابا نجم احسن صاحب حکیم الامۃ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہما کے درویش منش اور صاحب کشف خلیفہ تھے، اور میرے بچپن کے دوست جناب کلیم صاحب (جن کا تذکرہ میں اپنے بچپن کے حالات میں کر چکا ہوں) کے گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں رہتے تھے، اور وہیں سے ان کے فیض کا سلسلہ جاری رہتا تھا، مجھے بھی کثرت سے ان کی خدمت میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہتی تھی، اور وہ مجھ پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ اور میری غلطیوں پر مجھے باپ کی سی ڈانٹ سے متنبہ بھی فرمادیتے تھے۔ ان کو جب علم ہوا کہ میرا پیغام جناب شرافت صاحب کے گھر میں گیا ہے، بلکہ شاید میری ہونے والی خوشدامن صاحبہ نے اُن سے مشورہ بھی کیا، تو انہوں نے میرے علم میں لائے بغیر اُن کے نام ایک خط تحریر فرمایا جو عرصۂ دراز کے بعد میری خوشدامن صاحبہ نے مجھے دیا، جسے میں نے اپنے لئے فال نیک سمجھ کر اپنی مبشرات کی فائل میں رکھا ہوا ہے۔ اس خط کا مضمون یہ تھا:-

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں، الحمدللہ پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ۔ میرے لئے کوئی ایسے اسباب نہیں ہیں کہ غرض مندی کے سبب میں اپنے کو یا کسی کو دھوکا دوں۔ مجھے اتنا پسند آگیا ہے کہ یہ تمنا ہوتی ہے کہ کاش میرے ایسی لائق اور سعید اور ہونہار اولاد ہوتی۔ میں سچ کہتا ہوں میں نے عالم رؤیا میں بھی دیکھا ہے کہ غیب سے کوئی کہہ رہا ہے کہ "اللہ کو اس لڑکے سے کام لینا ہے۔" اس بشارت کے بعد مجھے کوئی شبہ نہیں رہا۔ ظاہری صورت میں یہ ہے کہ مادہ رُو نہیں ہے، داڑھی مونچھ نہیں منڈاتا، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل ہے۔ صحت بہت ہی اچھی ہے، بفضلہ تعالیٰ خوش پوشاک اور جامہ زیب بھی ہے، بہت ہی ہنس مکھ اور خوش مزاج، زبان اور قلم کا دھنی۔ عربی اردو تو گویا مادری زبان ہے۔ انگریزی میں گریجویٹ اور ایل ایل بی فائنل کا امتحان بھی دیا ہے۔ آجکل کے لڑکے عموماً عورتوں کی سی شکل بنائے ہوئے، ویسی ہی ہمت، ویسی ہی کمزور ذہنیت اور صحت رکھتے ہیں۔ مرد کے لئے اللہ نے حسن کی شان ہی اور رکھی ہے۔ پھر آجکل یہ بھی ہے کہ شادی کے آٹھویں دسویں دن ہی جوتی پیزار شروع ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کہ ایک دوسرے کے ساتھ رعایت نہیں کرتے۔ مرد عورت کو لونڈی سمجھتا ہے، اسی سے تنازع ہوتا ہے۔ عورت لونڈی نہیں، رفیقۂ حیات ہوتی ہے، ویسے ہی برتاؤ ہونا چاہئے۔

ہمارا نوجوان اچھا خاصا کما لینے والا بھی ہے، ہاں بے ایمانی سے نہیں کماتا، اور پھر ان شاء اللہ، اللہ فضل ہی کرے گا۔ اچھے سے اچھے برتاؤ اور اچھی سے اچھی قدردانی کی توقع ہے۔ میں ہر قسم کے نوجوانوں سے واقف ہوں۔ اس کے بعد سوچ سمجھ کے یہ رائے قائم کی ہے۔ محض چکنی چپڑی صورت کس کام کی؟ اگر آدمی میں انسانیت، محبت، اہلیت نہ ہو، اور اُسے عاقبت کی فکر نہ ہو، اور اُس کی ذہنیت صحیح طور پر اسلامی نہ ہو۔ ہرگز خطرہ نہ کرنا چاہئے کسی بُرے برتاؤ یا سختی یا تنگی کا۔ والسلام

بہر حال اس طرح ۱۷ ذوالحجہ ۱۳۸۸ھ مطابق ۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو مسجد باب الاسلام آرام باغ میں

میرا نکاح ہوا۔ یہ وہی مسجد ہے جس کے قریب میرے بچپن کے پانچ سال گذرے، اور جس کا تذکرہ میں پہلے کر چکا ہوں۔ حضرت والد صاحبؒ نے نکاح پڑھانے کے لئے حضرت علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے درخواست کی تھی۔ حضرتؒ نے یہ کرم فرمایا کہ اپنے ضعف کے باوجود ٹنڈو الہ یار سے تشریف لائے، اور نکاح پڑھاتے ہوئے مجھ سے عربی میں ایجاب وقبول کروایا۔ نکاح کی مجلس میں اُس وقت کے اکابر علماء وصلحاء تشریف فرما تھے جن میں میرے تمام اساتذہ کے علاوہ میرے شیخ حضرت عارفیؒ، حضرت علامہ محمد یوسف صاحب بنوریؒ، حضرت بابا نجم احسن صاحبؒ وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نکاح کے اگلے دن ایک ولیمہ دارالعلوم کورنگی میں کیا جس میں زیادہ تر دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ اور بعض قریبی رشتہ دار شریک ہوئے، اور شہر کے احباب اور دور کے عزیزوں کے لئے چونکہ دارالعلوم آنا مشکل تھا، اس لئے دوسرا ولیمہ شہر میں ہمارے مکان اشرف منزل میں، جہاں فرشی نشست پر کھانا کھلایا گیا۔ اُس وقت دہلی مسلم ہوٹل دہلوی کھانوں میں اختصاص رکھتا تھا، اور اُس کے مالکان نے جو میرے خسر صاحب کے پڑوسی تھے، بڑی محبت سے کھانے تیار کیے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان بزرگوں کی دعاؤں سے اس رشتے میں برکت عطا فرمائی، اور بفضلہ تعالیٰ میری اہلیہ آج تک رفاقت کا بہترین حق ادا کر رہی ہیں۔ جزاها الله تعالى خير الجزاء۔ البتہ مجھے معلوم نہیں کہ حضرت بابا صاحب قدس سرہ نے میرے بارے میں جن توقعات کا اظہار فرمایا تھا، میں اُن پر پورا اتر سکا یا نہیں۔

نکاح کے اگلے سال عاشورہ ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۳ر مارچ ۱۹۷۰ء کو اللہ تعالیٰ نے مجھے پہلے بیٹے سے نوازا، جن کا نام حضرت والد صاحبؒ نے "محمد عمران اشرف" تجویز فرمایا، اور حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُن کا تاریخی نام "فرخ تقی" رکھا۔

معارف القرآن کی تھوڑی سی خدمت

حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ اپنی عمر کے آخری سالوں کے دوران معارف القرآن کی تالیف میں شب وروز مصروف تھے۔ اگرچہ یہی زمانہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی بیماریوں اور ان کے ساتھ غیر معمولی ملکی اور اجتماعی مصروفیات کا تھا، لیکن وہ انہی مصروفیات کے عین درمیان معارف القرآن کی تالیف کے لئے حیرت انگیز طور پر وقت نکال لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران جب پورا شہر بلیک آؤٹ کی وجہ

سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا، اُس وقت بھی وہ کمرے کو اچھی طرح بند کرکے ایک چھوٹا سا ٹیبل لیمپ اس
طرح جلالیتے کہ روشنی باہر نہ جاسکے، اور پھر اپنے کام میں مشغول ہوجاتے۔ ہوائی حملوں کے سائرن بجتے
رہتے، بمبار طیاروں کی گھن گرج سنائی دیتی رہتی، اور اُن کا قلم چلتا رہتا۔

چونکہ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو طرح طرح کی بیماریاں لگی رہتی تھیں، اس لئے اُنہیں یہ فکر تھی کہ وہ
اپنی زندگی میں معارف القرآن کی تکمیل فرمالیں۔

چنانچہ انہوں نے ۱۹۷۲ء مطابق ۱۳۹۲ھ میں معارف القرآن سے متعلق دو کام میرے سپرد کئے:
ایک یہ کہ کچھ سورتوں کی تفسیر کا ابتدائی مسودہ مجھے لکھنے کا حکم دیا، اور دوسرے یہ فرمایا کہ معارف القرآن کی
ابتدا میں ایک مقدمے کی ضرورت ہے جس میں قرآن کریم سے متعلق کچھ عمومی معلومات لکھدی جائیں۔
دونوں کام اگرچہ مجھے اپنی بساط سے زیادہ معلوم ہوتے تھے، لیکن حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو میں
نے فال نیک بھی سمجھا، اور دل کو یوں سمجھالیا کہ جو کچھ لکھوں گا، آخر وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کو
پیش کرنا ہوگا، اور اس طرح میری غلطیاں درست ہوجائیں گی، اور تربیت بھی ہوگی۔ چنانچہ میں نے اپنے
اوقات کو اس طرح تقسیم کیا کہ دن کے اُن گھنٹوں میں جو تدریس سے خالی تھے، میں نے حضرت والد صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کے حکم کے مطابق سورۂ صافات کی تفسیر لکھنی شروع کردی، اور کوشش کی کہ حضرت والد صاحب
رحمۃ اللہ علیہ جن امور کو تفسیر میں مدنظر رکھتے ہیں، ان کو میں بھی پیش نظر رکھوں۔ سورۂ صافات پوری ہوئی، تو
حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سورۂ ص بھی شروع کردی، اور الحمد للہ اُس کی بھی تکمیل جلد ہوگئی
۔ اُس وقت تک حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سورۂ یٰس پوری کرچکے تھے۔ اُس موقع پر میں نے سورۂ
صافات اور سورۂ ص کا مسودہ حضرتؒ کو پیش کیا۔ حضرتؒ نے وہ پورا مسودہ ملاحظہ فرمایا، اور بعض مقامات پر
اصلاح بھی فرمائی۔ بعد میں سورۂ زخرف حضرت والد صاحبؒ نے میرے حوالے کی، اور الحمد للہ اس کی تفسیر
لکھنے کی بھی توفیق ملی، اور انہوں نے اُس پر بھی نظر ثانی فرمائی۔ یہ کام ماہ محرم ۱۳۹۲ھ (مارچ ۱۹۷۲ء) میں
شروع ہوا، اور ماہ رجب ۱۳۹۲ھ کے درمیان اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل ہوا۔ یہ تین سورتیں تو ایسی تھیں جن
کی تفسیر کا ابتدائی مسودہ مکمل طور پر حضرت والد صاحبؒ نے مجھے لکھنے کا حکم دیا تھا، اور پھر خود اُس پر نظر ثانی
فرمائی تھی۔ اور پھر میں نے ایک موقع پر جبکہ میں ان کی نظر کے سامنے نہیں تھا، لیکن ان کی باتیں دوسرے

کرے میں مجھے سُنائی دے رہی تھیں، اُنہوں نے کسی سے فرمایا کہ "الحمد للہ، میں تقی کو جو کام دیتا ہوں، اُس میں مجھے قلم لگانے کی بہت کم ضرورت پیش آتی ہے"۔ فالحمد للہ علی ذلک۔

ایسے موقع پر جب کسی بڑے کام کے دوران اپنے کسی چھوٹے سے کام لیا جاتا ہے، تو عام طور سے مصنفین اُس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے، کیونکہ درحقیقت یہ بڑے کی طرف سے ایک تربیت کا حصہ ہوتا ہے، اور فیض اُسی بڑے کا ہوتا ہے، لیکن حضرت والد صاحب قدس سرہ نے شاید احتیاط یا حوصلہ افزائی کے لئے میری اس معمولی خدمت کا بھی معارف القرآن کے مقدمے میں ذکر فرمایا، چنانچہ معارف القرآن کی تالیف کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح اُس کا ذکر فرمایا ہے:

> "درمیانی دو منزلیں سورہ شعراء سے سورہ حجرات تک باقی تھیں۔ اللہ کے نام پر ان کو بھی شروع کردیا، ان میں سورہ ص، صافات، زخرف تو برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ سے لکھوائی، اور خود اس پر نظر ثانی کر کے مکمل کیا، باقی سورتیں خود لکھنا شروع کیں، اور قرآن مجید کا تقریباً ڈیڑھ پارہ باقی رہ گیا تھا کہ ۲۴؍ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ ۸؍جون ۱۹۷۲ء کو اچانک مجھے قلب کا ایک شدید مرض پیش آیا۔۔۔۔ جب کچھ ہوش وحواس درست ہوئے تو باقی ماندہ تفسیر کا خیال ایک حسرت بن کر رہ گیا، برخوردار عزیزی مولوی محمد تقی سلمہ کو وصیت کردی کہ بقیہ کی تکمیل وہ کردیں، اس طرح قلب کا کچھ بوجھ ہلکا کیا"۔ (تمہید معارف القرآن ص ٦٦ ج ١)

جب اللہ تعالیٰ نے اس بیماری سے صحت عطا فرمائی، اور حضرت والد صاحبؒ نے سورۂ شوریٰ سے دوبارہ کام شروع فرمایا، تو اُس وقت بھی کئی سورتوں کی تفسیر لکھنے میں انہوں نے مجھے ساتھ لگائے رکھا، اور جزوی طور پر انہیں لکھنے میں اپنا حصہ لگانے کی سعادت بھی عطا فرمائی۔ اس کا تذکرہ بھی حضرت والد صاحبؒ نے سورۂ شوریٰ کی تفسیر میں ایک حاشیہ لکھ کر اس طرح فرمایا ہے:

> "تفسیر معارف القرآن کی صورت حال یہ ہے کہ جب یہ حادثہ مجھے پیش آیا تو میں معارف القرآن کو تقریباً آخر قرآن تک لکھ چکا تھا، ایک خاص سبب سے درمیانی چھٹی منزل رہ گئی تھی، اس کو لکھنے کا کام سورۂ شوریٰ کے اس مقام تک پہنچا تھا۔ آگے تقریباً

ڈیڑھ پارہ قرآن کریم کا سورہ حجرات تک لکھنا باقی تھا۔ اب حق تعالیٰ نے گویا دوبارہ زندگی عطا فرمائی اور معالج ڈاکٹروں نے کچھ لکھنے پڑھنے کی اجازت دی تو برخوردار مولوی محمد تقی کو ساتھ لگا کر بنام خدا آج پھر یہ کام شروع کیا ہے۔ واللہ المستعان!" (معارف القرآن ص۶۸۶ (حاشیہ) ج۷)

علوم القرآن

دوسرا کام یعنی معارف القرآن کا مقدمہ لکھنے کے لئے میں نے شام کا وقت گھر پر مقرر کیا ہوا تھا۔ جب میں نے یہ کام شروع کیا، تو مختلف ضروریات سامنے آتی چلی گئیں جن کے بارے میں مجھے خیال ہوا کہ ان موضوعات پر قدرے تفصیل اور تحقیق سے لکھنے کی ضرورت ہے۔ اور اس طرح یہ ایک مقدمے کے بجائے مستقل کتاب بنتی چلی گئی۔ مجھے سب سے زیادہ محنت اور ذہنی تردد "سبعۃ احرف" کی بحث میں ہوا۔ اس موضوع پر مجھے جو کچھ کہیں ملا، اُسے کھنگالنے اور ہضم کرنے کی کوشش کی، اور کئی مہینے کی محنت کے بعد اس باب کی تکمیل ہوئی، لیکن پھر بھی مجھے اپنی سمجھ پر بھروسہ نہیں تھا، اور تشفی نہیں ہو رہی تھی کہ میں صحیح سمجھ رہا ہوں۔

آخر میں نے یہ سوچا کہ اس وقت قراآت کے سب سے بڑے امام حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب پانی پتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دارالعلوم کی نانک واڑہ والی شاخ میں فیض رسانی فرمارہے ہیں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، اور درخواست کی کہ اس موضوع پر میں نے جو کچھ لکھا ہے، جب تک وہ آپ کی خدمت میں پیش کرکے اس کی تصدیق نہ کرلوں، مجھے اطمینان نہیں ہوگا۔ حضرتؒ چونکہ نابینا تھے، اور ان کے تمام تر علوم ان کے حافظے میں محفوظ تھے، اس لئے ان کی خدمت میں اپنی تحریر پیش کرنے کا مطلب یہ تھا کہ پوری تحریر انہیں سُنائی جائے۔ حضرتؒ نے بڑی شفقت سے فرمایا کہ میں ایک دن خود دارالعلوم شرافی آکر رات وہاں گذاروں گا، اُس وقت تم مجھے اپنی وہ تحریر سُنا دینا۔ چنانچہ حضرتؒ چند دنوں بعد وہاں تشریف لائے، رات کو وہیں قیام فرمایا، اور عشاء کی نماز کے بعد میں نے حضرتؒ کو پورا باب سُنایا۔ حضرتؒ بڑی توجہ سے سُنتے رہے، اور شاید کسی کسی جگہ کچھ مشورے بھی عطا فرمائے، لیکن جو موقف اُس تحریر میں اختیار کیا گیا تھا، اُس کی مکمل تائید فرمائی۔ قراآت کے امام حضرت علامہ جزری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی کتاب "النشر" میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ میں "سبعۃ احرف" کی تشریح پر بیس سال کے غور و فکر کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا ہوں، اور میری

دانست میں حضرت مولانا قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اس دور کے علامہ جزری تھے۔ان کی تصدیق کے بعد الحمدللہ مجھے اس باب پر اطمینان ہوا، اور میں نے اُسے کتاب کا حصہ بنادیا۔

اس کے علاوہ مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قرآن کریم کے بارے میں غیر مسلم مستشرقین نے علمی تحقیق کے نام پر جوشکوک وشبہات پیدا کیے ہیں، ان پر بھی اس مقدمے میں بحث کی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنی مقدور کے مطابق ان مستشرقین کی کتابوں کو جمع کر کے اُن پر تفصیلی بحث کی، اور ان شکوک وشبہات کے بے بنیاد ہونے کو ثابت کیا۔

تفسیر قرآن کریم میں مختلف حلقوں کی طرف سے جو غلط اور گمراہانہ رویے ہمارے دور میں رواج پارہے ہیں، ان کی حقیقت واضح کرنے کے لئے صحیح اصول تفسیر بیان کرنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ اُس کا مستقل حصہ رکھا، اور اس سمت میں جو گمراہیاں پائی جاتی ہیں، ان کی بنیادی وجوہ کو تفصیل سے بیان کیا اور اُس میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی "الانتباہات المفیدۃ" کو بنیاد بنایا۔

میں نے اس مقدمے کی تحریر کے لئے شام کو مغرب کے بعد کا وقت مقرر کیا ہوا تھا۔اور حتی الامکان کوشش کرتا تھا کہ وہ وقت اسی کام میں خرچ ہو۔ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میرے بڑے محبوب بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو لاہور میں رہتے تھے، اور سال بھر میں ایک آدھ مرتبہ والدین اور بہن بھائیوں سے ملنے کے لئے کراچی آیا کرتے تھے، اور دوتین ہفتے یا مہینہ کراچی میں گذارتے تھے۔ مغرب کے بعد وہ حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے۔حضرت والد صاحبؒ سے ان کی گفتگو بڑی دلچسپ اور معلومات آفریں ہوا کرتی تھی۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اور وہ بکثرت حضرت والد صاحبؒ سے علمی سوالات کرتے تھے، نیز وہ بہترین شاعر تھے، اس لئے کبھی کبھی شعروسخن کا موضوع چھڑ جاتا تھا۔ مجھے ان باتوں سے بھی دلچسپی تھی، اور بھائی جان کے ساتھ جتنا وقت مل جائے، وہ بھی میرے لئے غنیمت تھا۔ اس لئے میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس مجلس میں شریک ہوں۔ دوسری طرف یہ میرا علوم القرآن کی تالیف کا وقت تھا، اس لئے اگر اس مجلس میں شریک ہوں، تو تالیف کے اس کام کا ناغہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کو بھی دل گوارا نہیں کرتا تھا۔ اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ میں اپنے مسودے کے کاغذات اور جو بحث لکھ رہا ہوں، اُس سے متعلق کتاب ساتھ لے کر ان دونوں بزرگوں کے اتنے قریب بیٹھ جاتا تھا کہ ان کی بات بھی سُنائی دیتی رہے، اور

جتنا موقع ملے، میں مسودے میں بھی کچھ اضافہ کرسکوں۔ بھائی جان نے کچھ دیر مجھے آدھا تیتر آدھا بٹیر کا مظاہرہ کرتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے فرمایا: یہ تم کیا کرتے ہو کہ نہ پورے طور پر ہماری گفتگو میں شریک ہو اور نہ پوری طرح کام کررہے ہو۔ کسی ایک بات کا انتخاب کرلو۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ سن کر فرمایا: "جو کام کرنے والا ہوتا ہے، اُس کا یہی طریقہ ہوتا ہے، مشغول آدمی کو کئی کئی کام ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ اس لئے اس کا طریقہ ٹھیک ہے۔" حضرت والد صاحبؒ سے ہمت افزائی کے یہ کلمات سن کر بڑا اطمینان ہوا، اور کشمکش سے نجات ملی۔

خلاصہ یہ کہ میری یہ تحریر ہوتے ہوتے مقدمے سے بڑھ کر ایک مستقل کتاب بن گئی۔ جب میں نے یہ حضرت والد صاحبؒ کو پیش کی، تو انہوں نے اُسے پسند تو بہت فرمایا، لیکن ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اسے معارف القرآن کے ساتھ شامل کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک مستقل علمی اور تحقیقی کتاب ہے، اور اسے اسی حیثیت سے شائع ہونا چاہئے۔ اس کا نام بھی "علوم القرآن" حضرت والد صاحبؒ کے ایماء پر رکھا گیا، اور اس پر حضرتؒ نے ایک انتہائی حوصلہ افزا مقدمہ تحریر فرمایا جو ان کی غایت تواضع اور اپنے ایک نالائق بیٹے کی غیر معمولی ہمت افزائی پر مبنی تھا۔ اُس میں جو الفاظ انہوں نے تحریر فرمائے، میں اُنہیں یہاں نقل کرنے کی ہمت نہیں پاتا۔ پھر انہوں نے مجھے حکم دیا کہ "اب تم اس کا ایک ایسا عام فہم اور مختصر خلاصہ لکھو جو عوام کے لئے فائدہ مند ہو، اور تفسیر قرآن کے عام قاری اور تلاوت کرنے والوں کے لئے کارآمد ہو" اُس خلاصے کے مضامین کا تعین بھی کم وبیش حضرتؒ ہی نے کیا، اور اس طرح میں نے یہ خلاصہ بھی حضرتؒ کی ہدایات کی روشنی میں تیار کیا، پھر اُسے حضرتؒ نے معارف القرآن کے مقدمے کے طور پر شائع فرمایا۔

نئے دستور کے لئے اسلام آباد کا سفر

اسی زمانے (۱۹۷۲ء) میں ملک کی قومی اسمبلی ایک نئے دستوری مسودے پر غور کررہی تھی۔ ۱۹۵۶ء کا دستور جنرل محمد ایوب خان صاحب نے منسوخ کردیا تھا، اور ۱۹۶۲ء میں انہوں نے ایک نیا دستور نافذ کیا تھا جس پر سیاسی جماعتوں کو اعتراضات تھے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد یہ نیا دستور بننا تھا، اور پیپلز پارٹی کی حکومت ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم کی سربراہی میں ایک مسودہ قومی اسمبلی میں پیش کرچکی تھی۔ اس لئے ملک میں ایک مرتبہ پھر یہ بحث چھڑ گئی تھی کہ ہمارا دستور کیسا ہونا چاہئے۔ سیکولر حلقے تو اُسے

لادینی دستور بنانے کی کوشش ہمیشہ کرتے رہے، لیکن اس مرتبہ اُس پر یہ اضافہ ہوگیا تھا کہ پیپلز پارٹی جو سوشلزم کا نام لے کر برسر اقتدار آئی تھی، اُس کے بارے میں مفروضہ یہی تھا کہ وہ ملک کو ایک سوشلسٹ ریاست بنانے کے لئے دستور میں سوشلزم کو کسی نہ کسی طریقے سے داخل کرے گی۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس نئے دستور کو صحیح سمت میں مرتب کرنے کے لئے علمی اور عملی کوششیں کی جائیں۔ عملی سیاست سے تو میں کنارہ کش تھا، لیکن علمی طور پر البلاغ کے اداریوں میں ان مسائل پر مفصل تحریریں لکھتا رہتا تھا۔ چنانچہ محرم اور صفر ۱۳۹۱ھ (مطابق مارچ اور اپریل ۱۹۷۱ء) میں میں نے "اسلامی دستور کا مفہوم" اور "دستور کی اسلامی دفعات" کے نام سے دو اداریے لکھے، پہلے مضمون میں قرآن وسنت سے ایک اسلامی ریاست کی دستوری بنیادوں کو واضح کیا، اور یہ مضمون درحقیقت حضرت والد صاحبؒ کے رسالے "دستور قرآنی" پر مبنی اور اُس سے مأخوذ تھا جس میں حالات کی مناسبت سے بعض چیزوں کا اضافہ کیا گیا تھا، اور دوسرے مضمون میں یہ بتایا گیا تھا کہ ان دستوری بنیادوں کو موجودہ دستور کی دفعات میں کس طرح سمویا جائے جس سے اُن کے مقاصد موجودہ ماحول میں حاصل ہوں۔ ان دونوں مضمونوں کی کاپیاں ارکان اسمبلی کو بھی بھیجی گئیں، تا کہ وہ ان پر غور کرسکیں۔

دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک کے بانی ومہتمم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ قومی اسمبلی کے رکن تھے۔ ان کے لائق وفائق صاحبزادے مولانا سمیع الحق صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ [1] سے اپنی پہلی ملاقات کا حال میں ۱۹۵۵ء کے دورے کے سلسلے میں پیچھے لکھ چکا ہوں۔ اُس کے بعد البلاغ اور الحق کے ذریعے اُن سے دوستی کا تعلق بڑھتا رہا، کبھی کبھی کسی خاص مناسبت سے ملاقاتیں بھی ہوجاتی تھیں، بلکہ ملاقات کی خاطر مواقع پیدا بھی کرلئے جاتے تھے۔ انہوں نے اس موقع کو بھی ایسا ہی سمجھا جو ملاقات کا ایک بہانہ بن سکتا تھا، اس لئے غالباً انہوں نے اپنے والد ماجد قدس سرہ سے کہا ہوگا کہ وہ مسودۂ دستور میں ترمیمات مرتب کرنے کے کام میں شرکت کے لئے تقی کو بلالیں، چنانچہ انہوں نے مجھے حضرتؒ کا یہ پیغام پہنچایا، اور میں حضرت والد صاحبؒ سے اجازت لیکر اسلام آباد روانہ ہوگیا، وہاں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام کیا، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی نورانی شخصیت کے کمالات کا اسی عرصے میں کچھ اندازہ

(۱)۔ یہ تحریر ۲۰۱۴ء کی لکھی ہوئی ہے جب مولانا سمیع الحق صاحبؒ بقید حیات تھے، افسوس ہے کہ اب جب کہ اس کی اشاعت ہورہی ہے، مولانا صاحب رحمۃ اللہ علیہ شہادت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوچکے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

ہوا۔ ان کمالات کے باوجود ان کی تواضع کے عجیب عجیب واقعات سامنے آئے۔ اسلام آباد پہنچنے کے بعد اگلے دن میں مولانا سمیع الحق صاحب کے ساتھ اسمبلی ہال کی گیلری میں پہنچا تو حضرتؒ اسمبلی ہال میں اپنی نشست پر تشریف فرما تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ باہر تشریف لے آئے۔ ان کو نشست سے اٹھتے دیکھا تو ہم بھی نیچے اتر کر اسمبلی ہال کے دروازے تک پہنچ گئے۔ میں نے مؤدبانہ سلام عرض کیا تو حضرتؒ نے انتہائی معصومیت سے فرمایا:" حضرت! آپ نے بڑی شفقت فرمائی۔ "میں ان کی اولاد کی طرح تھا، اس لئے یہ سُن کر پانی پانی ہوگیا، لیکن اس فرشتہ صفت انسان کو اندازہ ہی نہیں ہوا کہ وہ کس ذرۂ بے مقدار سے مخاطب ہیں، اور ان کا علم وعمل ہر لحاظ سے کیا مقام ہے؟ وہ اپنے آپ کو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے، اور یہی تواضع کا اعلیٰ ترین مقام ہے جو اپنے والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ چند ہی گنی چُنی شخصیات میں نظر آیا، اور شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان میں سرِ فہرست تھے۔ بہر حال! جناب مولانا سمیع الحق صاحبؒ کی معیت میں چند دن گزارنے کا موقع ملا جو کام کے علاوہ بہت سی خوشگوار یادیں چھوڑ گیا۔ ہم دونوں نے مل کر مسودۂ دستور کا جائزہ لیا، اور جہاں جہاں اسلامی نقطۂ نظر سے ترمیم کی ضرورت تھی، وہاں حضرت شیخ مولانا عبدالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی میں ترمیمات مرتب کیں جو ان کی طرف سے اسمبلی میں داخل کی گئیں، جن میں سے کچھ منظور ہوئیں، اور کچھ نہیں۔

پیپلز پارٹی سوشلزم کا نام لے کر برسر اقتدار آئی تھی، اس لئے اس کی طرف سے مسودے میں "سوشلزم" کا لفظ تجویز کیا گیا تھا، اور اس بات کا خطرہ تھا کہ اس طرح ملک کو ایک سوشلسٹ ریاست قرار دینے کا دروازہ کھل جائے۔ اس وقت اسمبلی میں دینی حلقوں کے نمائندوں کی تعداد پیپلز پارٹی کے مقابلے میں بہت کم تھی، لیکن الحمد للہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ، حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحبؒ، جناب پروفیسر عبد الغفور صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ جیسے حضرات کی کوششوں اور ملک کی بھاری اکثریت کے دباؤ سے یہ تجویز انہیں واپس لینی پڑی، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بحیثیت مجموعی ایسا دستور تیار ہوگیا جس پر اُس وقت تمام جماعتوں نے اتفاق کیا، اور اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے وہ بسا غنیمت تھا۔

جاری ہے......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ـــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چونتیسویں قسط)

حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق

جماعت اسلامی اور مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معتدل موقف اور اپنے طرز عمل کے بارے میں تجربات میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ تقریباً ۱۹۶۹ء میں ان کی نئی کتاب "خلافت وملوکیت" منظر عام پر آئی، تو اُس پر چاروں طرف سے اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن خود مجھے اُس کتاب کے مطالعے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اسی زمانے میں میرے بڑے بھائی جان جناب محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کراچی تشریف لائے، تو انہوں نے مجھ سے ذکر کیا کہ انہوں نے یہ کتاب پڑھی ہے، اور اُس وقت سے وہ اضطراب میں ہیں، کیونکہ اُس میں حضرت عثمانؓ، حضرت معاویہؓ اور بعض دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اس انداز سے تنقید کی گئی ہے جو تنقیص اور توہین کے زمرے میں آتی ہے۔ بھائی جان مرحوم کا جماعت اسلامی کے مختلف حضرات، بلکہ خود مولانا مودودیؒ سے ملنا جلنا رہتا تھا، اور ان سے اختلافات کے باوجود اُن کا رویہ ان کے خلاف اتنا تشدد آمیز کبھی نہ تھا، لیکن اس بار وہ بہت متاثر تھے کہ اب صحابہؓ کے بارے میں ان کا طرز عمل حدود سے بہت متجاوز ہو رہا ہے۔ اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ اس پر علمی انداز میں تبصرہ لکھنے کی سخت ضرورت ہے۔ وہ اپنے ساتھ "خلافت وملوکیت" نامی کتاب بھی لیکر آئے تھے۔ وہ کتاب انہوں نے مجھے دی کہ میں اس کا مطالعہ کر کے دیکھوں۔ چنانچہ اُس رات میں نے اس کا مطالعہ کیا، تو واقعی کتاب میں بعض صحابہ، اور خاص طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں اتنی جارحیت نظر آئی کہ دل کو شدید صدمہ پہنچا، اور اگلے ہی دن میں نے ان کتابوں کی مراجعت شروع کر دی جن کی بنیاد پر ان پر یہ الزامات لگائے گئے تھے۔ کتابوں کا مطالعہ کرنے پر پتہ چلا کہ بعض جگہ تو حوالے بھی غلط تھے، اور بعض جگہ

چھوٹی سی بات کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا دیا گیا تھا۔ چنانچہ میں نے ان اعتراضات کی حقیقت واضح کرنے کیلئے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ماہنامہ البلاغ میں قسط وار شائع ہوا۔ابھی اُس کی چند قسطیں ہی شائع ہوئی تھیں کہ مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالے "ترجمان القرآن "میں مولانا کے معاون خصوصی جناب ملک غلام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کا تند و تیز جواب شروع فرمادیا۔ میرا مضمون مکمل ہوا، تو اُس کے بعد بھی ترجمان القرآن میں میرے مضامین کی تردید اور مولانا مودودیؒ کے دفاع کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔

چونکہ طبیعت بحث ومباحثے سے ہمیشہ دور رہی ہے، اس لئے جواب الجواب لکھنے کی طرف شروع میں دل مائل نہیں تھا، لیکن متعدد احباب نے توجہ دلائی کہ جناب ملک صاحب کے جوابی مضمون سے کچھ نئی غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، اس لئے کم از کم ایک مرتبہ اس کا جواب آنا چاہئے۔ آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ بحث کا سلسلہ مدت تک جاری رکھنے کے بجائے البلاغ کے ایک ہی شمارے میں جناب ملک صاحب کے مضمون پر تبصرہ کردیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور البلاغ کا ایک شمارہ (ذوالحجہ ۱۳۹۰ھ) اسی تبصرے کے لئے خاص کرکے شائع کیا گیا، اور اُس میں یہ واضح کردیا گیا کہ یہ اس موضوع پر میری آخری تحریر ہوگی، اور اب جواب الجواب کا سلسلہ نہیں ہوگا۔ اہل علم دونوں مضامین کا مقابلہ کرکے خود فیصلہ کرسکتے ہیں۔ پھر دونوں مضامین کا مجموعہ "حضرت معاویہؓ اور تاریخی حقائق "کے نام سے شائع ہوا۔ اور اہل فکر ونظر نے نہ جانے کتنے خطوط میں مجھے لکھا کہ اس کتاب کو پڑھکر دل سے شکوک وشبہات کے بہت سے کانٹے نکل گئے۔ خود جماعت اسلامی کے بعض منصف مزاج حضرات نے بھی اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔ بھائی جان مرحوم چونکہ میرے اس سارے مقالے کے اصل محرک تھے، اس لئے وہ اس بحث کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھتے تھے۔ اس شمارے کی اشاعت پر انہوں نے خصوصی مسرت کا اظہار کرکے ہمت افزائی فرمائی۔

بعد میں جناب ملک صاحب مرحوم نے اس کا بھی جواب دیا، اور ان کا جواب "خلافت وملوکیت پر تبصروں کا جائزہ "کے نام سے شائع ہوا۔ میں پہلے ہی عرض کرچکا تھا کہ یہ اس موضوع پر میری آخری تحریر ہوگی، اس لئے میں نے اس سلسلے کو مزید دراز کرنے کے بجائے انصاف پسند قارئین پر چھوڑ دیا۔

لیکن ایک عرصے کے بعد ایک اور صاحب نے ان کی اس کتاب کا جواب لکھ کر مجھے بھیجا جو بعد میں

"حضرت معاویہؓ اور تاریخی روایات" کے نام سے شائع ہوا۔

یہ وہ دور تھا جب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم کی پیپلز پارٹی آندھی طوفان کی طرح ملک پر چھا رہی تھی، اور ملک میں سوشلزم کی تحریک اپنے شباب پر تھی، اور اتفاق سے بعض علماء کرام بھی اس خیال سے اس کے ساتھ ہوگئے تھے کہ سوشلزم کا نعرہ غریبوں کی حمایت میں ہے، اور اس کی مخالفت کرنے سے اسلام کے بارے میں غلط تاثر جائے گا۔ دوسری طرف اکابر علماء کرام جن میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی داخل تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ سوشلزم اسی کمیونزم کی ابتدائی شکل ہے جس نے روسی اور چینی ترکستان میں مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، اور دینی شعائر کا نام ہی مٹا دیا، اس لئے وقت کے چلے ہوئے نعروں کے بجائے ہمیں اسلام کے معاشی احکام کی وضاحت کر کے اس کے نفاذ کا مطالبہ کرنا چاہئے اور سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام دونوں کی مخالفت کرنی چاہئے۔

اس ماحول میں جبکہ علماء کا یہ اختلاف کسی قدر سامنے آ گیا تھا، ایک دن مجلس تحفظ ختم نبوت کے ممتاز رہنما حضرت مولانا محمد علی جالندھری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے مجلس کے دفتر میں طلب فرمایا جو اُس وقت مولوی مسافر خانہ کے علاقے میں واقع تھا۔ میں حاضر ہوا، تو انہوں نے اس موضوع پر کافی تفصیلی بات کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ہم نے آزادئ ہند کے سلسلے میں نیشنلسٹ لوگوں کا ساتھ دیا، اور ان کے ساتھ جیلیں کاٹیں، یہ نیشنلسٹ لوگ ساتھ ساتھ سوشلسٹ نظریات کے بھی حامی تھے۔ ان کی باتوں سے یہ لگتا تھا کہ ان کو اصل پرخاش اُس زمیندارانہ جاگیردارانہ نظام سے ہے جس نے غریب کسانوں پر ظلم توڑے ہیں، اس سلسلے میں انہوں نے کئی دلدوز واقعات بھی سُنائے، اور فرمایا کہ ان حقائق کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، اور علماء کو ان لوگوں کے مسائل پر غور کر کے ان کا کوئی حل شریعت کی روشنی میں نکالنا چاہئے۔ اس وقت سوشلزم کے سلسلے میں علماء کے اختلاف کی جو فضا بن رہی ہے، اُس کو ختم کرنے کے لئے بھی مجھے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دونوں طرف کے ذی علم حضرات ان مسائل پر غور کرنے کے لئے کوئی مجلس منعقد کریں، اور اُن میں غریبوں کے یہ مسائل زیر بحث لا کر اُن کا شرعی حل تلاش کریں، تاکہ سوشلزم کی نری مخالفت کے بجائے ایک متبادل حل لوگوں کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ اپنے والد ماجد کے پاس جا کر اُن تک میری یہ بات پہنچائیں، اور اُن سے کہیں کہ وہ ایسی مجلس منعقد فرمائیں۔ دوسری طرف میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب

رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی فرمائش کروں گا۔

ان کی یہ دردمندانہ تجویز نہایت معقول تھی، اس لئے جب میں نے حضرت والد صاحبؒ سے اس کا ذکر کیا، تو انہوں نے اُس کا خیر مقدم فرمایا۔ فقہی مسائل پر غور کرنے کے لئے حضرت والد صاحبؒ نے پہلے ہی حضرت بنوری قدس سرہ کے ساتھ مل کر "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" قائم فرمائی ہوئی تھی، آپ نے فرمایا کہ اُسی کا اجلاس بلا لیا جائے، اور اُس میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کو بھی دعوت دی جائے۔ البتہ چونکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت بستر علالت پر تھے، اس لئے فرمایا کہ میری طرف سے تم دونوں بھائی (یعنی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم اور میں) مجلس میں شریک ہوں، اور مجھے مجلس کی روداد بتا کر مشورے لیتے رہیں۔ چنانچہ حضرت بنوری قدس سرہ نے اپنے مدرسے میں یہ اجتماع منعقد فرمایا جس میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی، نیز حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحبؒ کو بھی مدعو فرمایا، اور حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی صاحبؒ کو بھی شریک فرمایا۔

یہ اجتماع کئی دن جاری رہا۔ ہم دونوں بھائی روزانہ صبح کو حضرت بنوری رحمۃ اللہ عایہ کے مدرسے میں چلے جاتے، سارے دن مسائل پر بحث ہوتی رہتی۔ حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تفصیلی ملاقاتوں کا یہ پہلا موقع تھا جس میں ایک طرف اُن کے فقہی مقام کا کچھ اندازہ ہوا، اور دوسری طرف اُن کے دلنشین انداز بیان اور خوش خلقی کا بھی عملی تجربہ ہوا۔ اگرچہ اُس وقت سیاسی فضا ایسی تھی کہ اُن پر یہ الزام لگ رہے تھے کہ وہ سوشلسٹ عناصر کے ساتھ سیاسی اتحاد کر کے سوشلزم کی فی الجملہ حمایت کر رہے ہیں، اور انہیں معلوم تھا کہ اس معاملے میں ہمیں بھی اُن کے طرز عمل پر طالب علمانہ اشکال ہے، لیکن نہ اس کا ہماری نیازمندی پر کوئی اثر تھا، اور نہ ان کے انداز و ادا اور خوش اخلاقی پر۔ وہ بڑی شفقت و محبت کا معاملہ کرتے ہوئے فقہی مذاکرے میں کھلے دل کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے، اور اس قسم کی گفتگو میں سوال و جواب کا جو سلسلہ ہوا کرتا ہے، وہ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ چلتا رہا، البتہ ہمارے استاذ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بحث و مباحثہ میں قدرے شدت بھی پیدا ہوئی، لیکن آخر کار ایک مسودے پر اتفاق ہو گیا، جو ریکارڈ پر لانے کی خاطر میں یہاں نقل کرتا ہوں:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

تمہید

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے۔ وہ عقائد، عبادات، سیاست، معیشت، معاشرت، اخلاق، غرض زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اپنے مستقل اصول وفروع رکھتا ہے جو دنیا کے ہر مذہب وملّت اور نظام زندگی سے ممتاز اور فائق ہیں۔ لہذا وہ کسی بھی مرحلے پر اس بات کو گوارا نہیں کرتا کہ اس کا کسی دوسرے مذہب یا نظام زندگی کے ساتھ لفظی یا معنوی التباس اور تشبّہ پیدا کیا جائے۔ چنانچہ معیشت کے معاملات میں بھی اسلام کا نظام دنیا کے ہر نظام معیشت سے خواہ وہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت اور اشتمالیت بالکل الگ ہے۔

لہٰذا اس مجلس کے نزدیک یہ بات قابل تحقیق نہیں ہے کہ سرمایہ داری یا سوشلزم اسلام کے مطابق ہے یا نہیں، بلکہ یہ بات مجلس کے نزدیک طے شدہ ہے کہ اسلام دونوں کا مخالف ہے، اگر کسی فرعی مسئلہ میں کوئی اتفاقی اتحاد ہوجائے تو اس کی وجہ سے نہ اس نظام کو اسلام کے مطابق کہا جاسکتا ہے اور نہ اس معمولی یا جزوی ترمیم کے ذریعہ اسے (اسلامی) کہا جاسکتا ہے۔

اس کے بجائے زیر تحقیق یہ ہے کہ موجودہ دور میں انسان کے لئے جو معاشی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں ان کا حل اسلامی نظام کی روشنی میں کیا ہے اور وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت سے کس طرح ممتاز ہے۔ اس مقصد کے لئے مندرجہ ذیل باتیں اصولی طور پر پیش نظر رکھی جائیں گی:

اصول موضوعہ اور طریقہ کار

ا۔ اسلام کا معاشی نظام جیسا وہ ہے، جدید ترتیب اور تدوین کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

۲۔ اس ترتیب وتدوین میں اس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اس کو نافذ کرنے کی وہ عملی صورتیں بھی پیش کی جائیں جن میں موجودہ معاشی مشکلات کا صحیح اور قابل عمل حل بھی ہو، اور ان کی وجہ سے اسلام کے احکام میں ذرہ بھر تحریف وترمیم بھی نہ ہو اور نہ کسی دوسرے معاشی نظریہ کا اثر قبول کیا جائے۔

۳۔ اس بات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کی نوے (۹۰) فیصد آبادی فقر وافلاس اور دوسری

معاشی مشکلات کا [کی؟] شکار ہے اور ان مشکلات کو حل کرنا ضروری ہے۔

لہٰذا ان کے حل کے لئے مذہب حنفی کو متن قرار دیتے ہوئے تمام مذاہب اربعہ کا مطالعہ کیا جائے گا اور ضرورت کے مواقع پر جس مذہب میں بھی حل میسر آئے گا اس کو اختیار کیا جائے گا، لیکن:

۴۔ مذاہب اربعہ سے خروج ہرگز نہ کیا جائیگا۔

۵۔ یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ یہ مجلس کسی مسئلہ کا جو حل پیش کرے گی وہ اس صورت میں قابل عمل اور لائق افتاء سمجھا جائے گا جب کہ صحیح اسلامی حکومت قائم ہو جس کے تمام قوانین واحکام اسلامی شریعت کے مطابق ہوں۔

۶۔ اس موضوع پر ایک کتاب مرتب کی جائے گی جس کے شروع میں ایک بسیط مقدمہ ہوگا جس میں اسلام کے قرون اولی (کی) معاشی زندگی کو پیش کیا جائے گا اور باقی کتاب موجودہ فن معاشیات کی ترتیب پر مرتب کی جائے گی۔

۷۔ یہ سارا کام اعلیٰ دینی سطح پر ہوگا۔ اس کا کسی بھی جماعت سے کوئی تعلق نہ ہوگا، نہ اسے کسی جماعت کی طرف منسوب کیا جائے گا۔

۸۔ اس کام کی تکمیل کے بعد اسے ہر فرقہ کے علماء کے سامنے پیش کر دیا جائے گا، اور اس کے بعد اسے اسلامی معاشی نظام کے طور پر شائع کیا جائے گا۔

اراضی کے مسائل

۱۔ اگر اسلامی حکومت کسی شخص کو موات زمین احیاء کے لئے دے اور وہ خود اپنی محنت یا اپنے اجیر خاص کے ذریعہ اس کا احیاء کرے تو وہ خود اس کا مالک ہو جائے گا۔ (لأن من أحيا أرضا ميتة فهي له)

۲۔ جو موات زمینیں سابق حکومتوں نے لوگوں کو دی ہیں اور وہ اب تک آباد نہیں کی گئیں، اگر دینے کے وقت سے تین سال نہیں گذرے ہیں تو تین سال کی مدت کے ختم ہونے تک ان کے آباد کرنے کا انتظار کیا جائے گا، اور اگر زمین لینے کی تاریخ سے تین سال گزر گئے ہیں تو ان سے واپس لے کر ان لوگوں کو دیدی جائیں گی جن (کے) پاس زمینیں نہیں ہیں۔ (لما في الدر المختار: ومن حجّر أرضا ثم أهملها ثلاث سنين رفعت إلى غيره وقبلها هو أحق بها وإن لم يملكها ..الخ) (شامی ص ۲۷۸ ج ۵)

۳۔ ایسی اسلامی حکومت جس میں اسلامی نظام حکومت دیانتدار افراد کے ہاتھ میں ہو اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ جو اراضی موات حکومت پاکستان یا انگریز حکومت نے کسی کو بھی دیں مگر لینے والے نے ان کا احیاء نہ خود کیا نہ مزدوروں اور ملازمین سے کرایا بلکہ عقد مزارعت کے طور پر مزارعین کو احیاء کے لئے دے دیں اور مزارعین ہی نے ان کا احیاء کیا، ایسی تمام اراضی کو احیاء کرنے والے مزارعین کی ملکیت قرار دیدے، اور جو مزارعین وفات پا چکے ان کے ورثاء کو مالک قرار دیدے۔ (لأن المعطى له لم يملك الأرض بمجرد التحجير فلم تنعقد المزارعة وصار المزارع هو المالك لأنه هو الّذى احيى الأرض.وأما إذن الإمام فليس بشرط عند الصاحبين، وأما عند أبى حنيفة فالإذن اللاحق يقوم مقام السابق، فإذا أجازت الحكومة ذلك وقع الملك للمزارع باتفاقهم)۔

۴۔ جو اراضی موات احیاء سے پہلے کسی کو مدت معلومہ کے لئے کرایہ پر دی گئیں تا کہ کرایہ پر لینے والا زمین کا احیاء بھی کرے اور کاشت بھی اور سالانہ کرایہ آمر کو ادا کرے ایسی زمین کو جب کرایہ دار قابل برداشت بنالے گا تو وہ خود مالک ہو جائے گا اور کسی قسم کا کرایہ اس پر واجب نہیں ہوگا، بلکہ جو رقم آمر نے وصول کرلی ہوگی وہ واپس کرنی ہوگی ۔ (لما ذكرنا أن المأذون له لا يملك الأرض قبل الإحياء فلم تنعقد الإجارة لعدم الملك وصارت الأرض لمن احياها).

۵۔ اگر موات زمینیں آباد کرنے کے لئے کسی سے یہ معاملہ کیا کہ وہ اس زمین کا احیاء کرے اور اُجیر مشترک کے طور پر اس ٹھیکہ کی اجرت بھی مقرر کردی تو یہ احیاء اجیر کی طرف سے سمجھا جائے گا اور اسی کو زمین کا مالک قرار دیا جائے گا اور اس نے آمر سے جو معاوضہ لیا ہوگا وہ واپس کردیا جائے گا۔ (لما فى الدر المختار :استأجره ليصيد له أو يحتطب له فإن وقت لذلك وقت وإلا لا .ولو لم يوقت وعين الحطب فسد .وفى رد المحتار ــــ قوله جاز لأنه أجير وحد وشرطه - بيان الوقت قوله : وإلا لا ــــ اى الصيد والحطب للعامل .شامی ص۵۹ ج۵)

۶۔ اگر کسی مسلمان حکومت نے کسی مسلمان یا ذمی کی آباد زمین کو غصب کیا اور کسی کو بطور جاگیر دیدیا تو زمینیں ان کے مالکوں کو واپس کی جائیں گی (لأنه غصب ولا استيلاء لمسلم على مسلم)

۷۔ انگریزی حکومت نے جو مملوک اور آباد جاگیریں سیاسی رشوت یا ملک وملت سے غداری کے صلہ میں

اگروہ مسلمانوں کی آباد زمینیں چھین کردی ہوں تو اسلامی مسلمانوں کودی ہیں ان کی تین صورتیں ہیں (الف) اگروہ مسلمانوں کی آباد زمینیں چھین کر دی ہوں تو اسلامی حکومت ان جاگیرداروں سے لےکر سابقہ مالکان کو یا اگر ان (کے) ورثاء معلوم ہوں تو ان کے ورثاء کو دے دے گی۔ اگر مالک یا اس کے ورثاء معلوم نہ ہوں تو حکومت ان کو اپنی تحویل میں لےکر پاکستان کے بے زمین لوگوں پر تقسیم کرے گی۔

(ب) اگروہ آباد زمینیں غیر مسلموں کی تھیں اور ان سے چھین کر جاگیرداروں کو رشوت یا غداری کے صلہ میں دی گئیں تو اب ان کو جاگیرداروں سے واپس لےکر بطور مال فئی زمین سے محروم لوگوں کو دے دی جائیں گی۔ (ج) اگروہ زمینیں بنجر (موات) تھیں تو احیاء موات کے احکام جاری ہوں گے جو اوپر گزر چکے ہیں۔

۸۔ اسلامی حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ پیداوار کی نصف سے زائد مثلاً دو تہائی مزارع کا حصہ مقرر کردے۔

۹۔ ٹھیکہ (اجارہ) کی صورت میں بھی ٹھیکہ کی رقم کے لئے ایسی حد کی تعیین کردے جس سے ٹھیکہ دار کی محنت کا مناسب صلہ اس (کو) مل جائے۔

۱۰۔ عقد مزارعت ایک مجتہد فیہ مسئلہ (ہے)۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ عقد فاسد ہے۔ صاحبین مزارعت کو عقد صحیح قرار دیتے ہیں۔ جمہور امت کا تعامل بھی یہی ہے، لیکن ایک صحیح اسلامی حکومت اگر یہ محسوس کرتی ہے کہ زمیندار اور کاشتکار کا تعلق کسی بھی طرح ایسے صحیح اسلامی طریقہ پر قائم نہیں ہوتا جو شروط فاسدہ اور زمینداروں کے ظالمانہ طریقہ کار سے آزاد (ہو) تو وہ ضرورت کے وقت یہ حکم جاری کرسکتی ہے کہ زمینوں کو مزارعت کے بجائے اجارہ ارض کے طریقہ پر کاشت کیا جائے۔

۱۱۔ زمینوں اور کارخانوں کی ملکیت پر کوئی تحدید عائد کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یا لفظ (ضبط؟) ملکیت بالعوض کسی مرحلہ پر جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر ابھی غور کیا جارہا ہے۔

۱۲۔ آئندہ احیاء موات کی اجازت صرف ان لوگوں کو دی جائے جن کے پاس زمینیں نہیں ہیں۔

رہن کے مسائل

جس مرہون زمین میں مرتہن نے انتفاع بالمرہون کی شرط لگائی ہو یا "المعروف کالمشروط" کے طور پر اس سے انتفاع کررہا ہو وہ رہن فاسد ہے، للہٰذا زمین مرہون کو راہن کی طرف بلاتوقف لوٹایا جائے گا

اور زمین پر جتنے عرصہ مرتہن قابض رہا ہے اس کی اجرت مثل مرتہن پر واجب ہوگی اور اجرت مثل کو زر رہن (قرض) میں محسوب کیا جائے گا اور اگر اس کی مقدار زر رہن سے بڑھ گئی ہے تو وہ بھی راہن پر لوٹائی جائے گی۔(لأن ذلک لیس برھن، وإنما ھو إجارة فاسدة فیجب أجر المثل لما فی رد المحتار : قال فی التتارخانیة ما نصه: ولو استقرض دراھم وسلّم حماره إلی المقرض یستعمله إلی شھرین حتی یوفیه دینه أو داره یسکنھا فھو بمنزلة الإجارة الفاسدة، إن استعمله فعلیه أجر مثله ولا یکون رھنا۔۔۔الخ)

۱۲۔اگر مرتہن نے زمین مرہون راہن کو مزارعت پر دے دی تو یہ رہن باطل ہوگیا، لہٰذا ساری پیداوار راہن کی ہوگی۔اور پیداوار کا جو حصہ اس نئے مرتہن کو ادا کیا وہ قرض میں محسوب ہوگا، البتہ اگر بیج مرتہن نے دیا ہو تو اتنا ہی بیج یا اگر مرتہن راضی ہو تو اس کی قیمت راہن ادا کرے گا۔

تجارت کے مسائل

۱۔سود کی تمام اقسام کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے گا اور بینکوں کا کاروبار شرکت مضاربت کے اصول پر قائم کیا جائے گا اور قیام پاکستان سے لے کر اب تک بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور دوسرے نجی، سرکاری یا نیم سرکاری تجارتی اداروں نے جتنا سود وصول کیا ہے اسے ضبط کر کے غریبوں پر تقسیم کیا جائے گا۔

۲۔قمار اور سٹہ کی جتنی صورتیں رائج ہیں مثلاً بیمہ وغیرہ ان سب کو ممنوع قرار دیا جائے گا اور ان کے ذریعہ جو آمدنی اب تک ہوئی ہے اسے ضبط کر کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

۳۔تجارت کو آزاد کیا جائے گا یعنی درآمد برآمد پر چند افراد کی اجارہ داری کو ختم کیا جائے گا۔

۴۔غیر مسلم ممالک کے بینکوں میں پاکستان کے سرمایہ داروں کو سرمایہ جمع کرانا ممنوع قرار دیا جائے گا اور موجودہ جمع شدہ رقم کو کسی نہ کسی طرح ملک میں واپس منتقل کرنے کا انتظام کیا جائے گا۔

۵۔شراب اور دیگر اشیاء محرمہ اور سامان تعیش کی درآمد بالکل ممنوع قرار دی جائے گی۔

۶۔تمام اشیاء صرف میں احتکار (ذخیرہ اندوزی) کو قابل تعزیر جرم قرار دیا جائے گا، اور اگر کوئی شخص اس کا ارتکاب کرے تو اشیاء محتکرہ کی بیع پر اس کو مجبور کیا جائے گا۔(آخذا بقول أبی یوسفؒ فی أن الاحتکار فی کل ما أضر للعامة حبسه ۔الھدایة ص۴۷۴ج۴)

کارخانوں کے مسائل

۱۔ کارخانوں کے ملازمین کی ایسی اجرتیں اسلامی حکومت مقرر کرسکتی ہے جو ایک طرف ان کی نوعیتِ کار کے لحاظ سے ان کی محنت کا مناسب صلہ بھی ہوں اور دوسری طرف ان کو معاشی طور پر خود کفیل ہونے اور آگے بڑھنے میں مدد بھی دیں۔

۲۔ کارخانہ داروں کا ایسا اتحاد جس سے مفادِ عامہ کو نقصان پہنچتا ہو، مثلاً کارٹیل، مرجر، سِنڈیکیٹ وغیرہ کی طرح کی اجارہ داریاں اسلامی حکومت ان کو ممنوع قرار دے گی۔ (لما فی الهداية : ولا يجبر القاضي الناس على قاسم واحد ، معناه: لا يجبرهم على أن يستأجروه ، لأنه لا جبر على العقود، ولأنه لو تعين لتحكم بالزيادة على أجر مثله، ولا يترك القسام يشتركون ، كيلا تصير الأجرة غالية بتواكلهم ، وعند عدم الشركة يتبادر كل منهم إليه خيفة الفوت ، فيرخص الأجر. الهداية ص ۴۱۵ ، ومثله في البدائع ص ۱۹ ج .والعالمگيريه)

اس مسودے کے بارے میں اصولاً یہ طے ہوا تھا کہ یہ ابھی اپنی ابتدائی شکل میں ہے، اور اسے دوسرے علماء کرام وغیرہ کے سامنے کسی بڑی مجلس میں پیش کیا جائے گا، اور مشورے کے بعد اتفاق رائے سے شائع کیا جائے گا، اور اسے کسی بھی سیاسی جماعت کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ یہ مسودہ فوراً ہی ماہنامہ "الحق" کے شمارے ربیع الاول ۱۳۸۹ھ میں جمعیت علماء اسلام کی مجلس کی طرف منسوب ہو کر شائع ہو گیا جس پر حضرت بنوری قدس سرہ نے ماہنامہ بینات کے شمارہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۹ھ میں برہمی کا اظہار فرمایا۔ اس کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر جانبین میں غلط فہمیاں پیدا ہوئیں، اور یہ کام اجتماعی سطح پر آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بجائے حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ نے بینات کی سات قسطوں میں اسلام کے معاشی نظام پر ایک فاضلانہ مضمون تحریر فرمایا، نیز حضرت والد صاحب قدس سرہ کے زیر ہدایت میں نے ایک "معاشی خاکہ" ترتیب دیا جو بعد میں ۱۱۸ علماء کی تصدیق سے "اسلامی نظام میں معاشی اصلاحات کیا ہونگی؟" کے نام سے شائع ہوا جو حضرت والد صاحبؒ کی کتاب "جواہر الفقہ" میں بھی شائع ہو گیا ہے۔

چونکہ اُس وقت اس مسودے کو شائع نہ کرنا اس لئے طے ہوا تھا کہ یہ ابھی ابتدائی شکل میں ہے، اور اس پر ابھی مزید غور ہوگا، اور بعض تجاویز میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے، اس لئے مجھے یہاں اُسے شائع کرنے میں تأمل تھا، لیکن چونکہ وہ ایک مرتبہ "الحق" میں شائع ہو چکا تھا، نیز اُس کے بارے میں ایک مرحلے پر یہ غلط فہمی بھی

ہوگئی تھی کہ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذکورہ بالا مقالے کو اس مجلس کی کارروائی سمجھ لیا گیا تھا، جس کی وضاحت میری درخواست پر ماہنامہ "بینات" کے شمارہ ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ ہجری میں شائع ہوئی، اس لئے ریکارڈ کی درستی کے لئے اسے یہاں نقل کرنا میں نے نامناسب نہیں سمجھا، لیکن یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہئے کہ وہ ایک ورکنگ پیپر کی طرح محض ایک ابتدائی خاکہ تھا جس پر مزید کام ہونا تھا، اس لئے اُس میں جو جزوی تجاویز پیش کی گئی ہیں، اُن میں سے ہر ایک کو حتمی طور پر مجلس کا فیصلہ قرار دینا مناسب نہیں ہوگا۔

جاری ہے............

☆☆☆

رعایا کے لئے اپنے دروازے کھلے رکھنا

حضرت عمرو بن مرہ رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اگر کوئی حاکم اپنی رعایا کے حاجتمندوں، محتاجوں اور مسکینوں کے لئے اپنے دروازے بند کردیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی حاجات، ضروریات اور فقر کو دور کرنے سے پہلے آسمانوں کے دروازے بند کردیتا ہے۔ اس پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس وقت ایک شخص کو لوگوں کی ضروریات معلوم کرنے کے لئے مقرر کردیا۔ (جامع ترمذی)

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(پینتیسویں قسط)

حضرت والد صاحبؒ کا پہلا دورۂ قلب

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ادھیڑ عمر ہی سے مختلف عوارض لگے ہوئے تھے۔ جسمانی قویٰ بھی کچھ زیادہ مضبوط نہیں تھے، لیکن وہ اپنی روحانی اور ایمانی قوت وہمت سے مسلسل ایسے کاموں میں مصروف رہتے تھے جو ہم جوانوں کے لئے بھی قابلِ رشک تھے۔ بیماریوں اور عوارض کے درمیان بھی ان کے تصنیفی اور دعوتی کام جاری رہتے تھے۔ جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں، وہ دارالعلوم کی مؤثر نگرانی کے لئے لسبیلہ ہاؤس کے اپنے آرام دہ مکان کو چھوڑ کر دارالعلوم کورنگی میں کھپریل کے بنے ہوئے کمروں میں منتقل ہوگئے تھے جن میں کمرے کے ساتھ مروجہ متصل غسل خانہ بھی نہیں تھا، اور ملاقات کا کمرہ بھی خواب گاہ سے فاصلے پر الگ تھا۔ اسی مکان میں انہوں نے کئی سال گذارے، اور چونکہ دارالعلوم اور ملک وملت کے اجتماعی کاموں کے لئے شہر سے رابطہ بھی ضروری تھا، اس لئے دوسرے تیسرے دن شہر کا سفر بھی کرنا پڑتا تھا۔ اس طرح مصروفیات کا ایک طوفان تھا جس میں اُن کے شب وروز گذر رہے تھے۔

ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ جون ۱۹۷۲ء کو انہیں سینے میں شدید درد محسوس ہوا۔ شروع میں اُس کے بارے میں یہ خیال رہا کہ ریاحی انداز کا درد ہوگا، چونکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ شروع سے یونانی طریق علاج کے عادی تھے، اس لئے میں فوراً حکیم نصیر الدین نظامی صاحب مرحوم کے نظامی دواخانہ پہنچا۔ انہوں نے سرکہ ادرک اور کچھ دوائیں تجویز کیں، مگر ان سے کچھ افاقہ نہ ہوا، تو ایک اور حکیم یامین صاحب کا علاج کیا، لیکن درد بڑھتا گیا۔ آخر کار حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک دوست ڈاکٹر صغیر الدین ہاشمی صاحب مرحوم کو بلایا گیا۔ انہوں نے دیکھتے ہی حملۂ قلب کا شبہ ظاہر کیا، اور ہم سے کہا کہ انہیں فوراً امراضِ قلب کے ہسپتال

لے جانا ضروری ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہسپتال میں داخل ہونے سے ہمیشہ متوحش ہوتے تھے، اور انہیں اُس پر راضی کرنا بہت مشکل تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب مرحوم نے انہیں نہ صرف راضی کیا، بلکہ اسٹریچر پر لیجانے کے لئے خود آگے بڑھکر انہیں اٹھالیا۔ ہسپتال پہنچنے پر تصدیق ہوگئی کہ دل کا حملہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر شوکت علی سید مرحوم نے ہمیں بتایا کہ واضح "ہارٹ اٹیک" ہے، لیکن درمیانہ درجے کا ہے۔ چوبیس گھنٹے خطرے کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے نکال لیا تو خطرہ ان شاء اللہ کم ہوجائے گا، لیکن ہر قسم کی حرکت سخت مضر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا، وہ چوبیس گھنٹے گذر گئے، حالت نسبۃً بہتر ہوتی گئی۔ ڈاکٹر سید اسلم صاحب ان کے خصوصی معالج رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں کہ انہوں نے بڑی محبت سے علاج کیا۔ پھر کئی ہفتے انہیں ہسپتال، میں رہنا پڑا۔ ہم بھائی اوقات تقسیم کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہتے تھے۔ لاہور سے ہمارے بھائی جان بھی آگئے تھے، اور انہوں نے خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

اتفاق سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمرے کے سامنے والے کمرے میں مشہور شیعہ عالم جناب رشید ترابی صاحب بھی دل کے دورے کی وجہ سے مقیم تھے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کبھی کبھی ان کو کوئی تحفہ بھیج دیتے تھے۔ گرمی کا موسم تھا، اور کولروں کا اتنا رواج نہیں ہوا تھا، اس لئے جناب ترابی صاحب کے کمرے میں برف کی سلیں رکھی رہتی تھیں، اور وہ وقتاً فوقتاً ٹھنڈا پانی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں پیغام دیا کہ "جناب ترابی صاحب! آپ نے یہاں بھی سبیل لگادی ہے!"

ڈاکٹر صاحبان نے یہ کہدیا تھا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اب اپنی تمام مصروفیات پر نظر ثانی کر کے تھکنے سے ہر قیمت پر بچنا پڑے گا۔ ہسپتال سے گھر جانے کے بعد بھی کم از کم چھ ہفتے بستر پر رہنا ہوگا، اور ملاقاتوں پر پابندی لگانی ضروری ہے۔ جو احتیاطیں انہوں نے بتائی تھیں، وہ موجودہ گھر پر رہکر نہیں ہوسکتی تھیں۔ اس لئے گھر کا نقشہ تبدیل کر کے دو نئے کمرے تیز رفتاری کے ساتھ اس طرح بنائے گئے کہ بوقت ضرورت ملاقاتی ان کی خواب گاہ ہی میں آکر ملاقات کرسکیں۔ اور اسی خواب گاہ کے متصل جو پہلا کمرہ ملاقاتیوں کے لئے تھا، اُسے میرا دفتر بنا دیا گیا، تاکہ جو بھی ملنے آئے، وہ پہلے میرے دفتر میں آئے، اور میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے مطابق اُس سے بات کرسکوں، اور بہت ضروری ہو، تو ملانے

کے لئے لے جاؤں۔ دوسری طرف ہماری والدۂ ماجدہ بھی سخت علیل تھیں، اور ان کی علالت کے تقاضے بھی مختلف تھے، اس لئے انہیں برابر کے دوسرے کمرے میں رکھنا ضروری تھا۔ جبتک ان کمروں کی تعمیر ہوئی، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پہلے ہسپتال میں، اور پھر لسبیلہ ہاؤس میں ہمارے دو بڑے بھائیوں کے مکان پر مقیم رہے، اور کمروں کی تکمیل کے بعد دارالعلوم منتقل ہوئے۔ اس کے بعد ان کی مصروفیات اسی کمرے تک محدود ہو گئیں، لیکن وہ یہیں چارپائی پر ہی اپنی تصنیف وتالیف، فتویٰ اور دارالعلوم کے انتظامی امور انجام دیتے رہے۔ ہفتہ وار اصلاحی مجلس بھی جو اتوار کو عصر کے بعد ہوا کرتی تھی، یہیں ہونے لگی۔ کچھ عرصے کے بعد شام کو عصر کے بعد باہر برآمدے میں بھی تشریف لے آتے تھے، اور فجر کے بعد گھر ہی میں کچھ چہل قدمی بھی فرمالیتے تھے۔ اسی کے ساتھ انہیں دل کی تکلیف کے ساتھ کچھ اور عوارض بھی چلتے رہے۔ جناب ڈاکٹر اسلم صاحب ان کے دل کے معائنے کے لئے وقتاً فوقتاً دارالعلوم آجایا کرتے تھے، اور دوسرے عوارض کے لئے جناب ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب بڑی محبت سے آکر ان کا علاج کیا کرتے تھے۔

ایک موقع پر انہیں جسم کے نچلے حصے میں نواسیر کا پھوڑا نکل آیا تھا، جس کی وجہ سے چارپائی پر بیٹھنا بھی مشکل ہو گیا، مختلف دوائیں آزمائی گئیں، لیکن کوئی خاص افاقہ نہ ہوا، آخر کار ڈاکٹر ہاشمی صاحب نے مشورہ دیا کہ اب آپریشن کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ البتہ آپریشن معمولی نوعیت کا ہوگا جس کے لئے بے ہوش کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، اور انہوں نے یہ انتظام بھی کرلیا کہ حضرت والد صاحبؒ کو ہسپتال جانا نہ پڑے۔ اور گھر ہی میں تمام انتظامات کرلئے۔ تکلیف ایسی تھی کہ حضرت والد صاحبؒ بادل ناخواستہ اس کے لئے تیار ہو گئے۔ گھر میں آپریشن کے لئے تیاری مکمل ہو گئی، اور ایک شام یہ طے ہوا کہ اگلی صبح دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آپریشن کریں گے۔ اس انتظام کے ساتھ ہم رات کو سو گئے۔

صبح فجر کے وقت جب میں حضرت والد صاحبؒ کے پاس پہنچا، تو وہ مسکرا رہے تھے۔ میرے تجسس پر انہوں نے فرمایا کہ میں نے رات عجیب خواب دیکھا کہ ہمارے گھر میں سردار عبدالرب نشتر مرحوم کے آنے کی اطلاع تھی، اچانک معلوم ہوا کہ ان کا پروگرام منسوخ ہو گیا۔ میں نے اس کی تعبیر یہ لی کہ ہمارے گھر میں (آپریشن کا) جو نشتر آنے والا تھا، وہ چلا گیا۔ چنانچہ صبح ہوتے ہوتے وہ پھوڑا اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پھوٹ گیا، اور سارا مواد نکل گیا۔ بظاہر اب آپریشن کی ضرورت نہیں رہی۔ یہ سن کر ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ

رہی، ہم نے ڈاکٹر صاحب کوفون پر یہ واقعہ بتایا۔ انہوں نے تصدیق کی کہ اب واقعی آپریشن کی ضرورت نہیں ہے، اوراس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے اس مسکین بندے کو نہ صرف آپریشن سے بچایا، بلکہ خواب کے ذریعے اس کی پیشگی اطلاع بھی دیدی۔ سبحانہ ما اعظم شانہ۔

بھائی جان کی وفات

۱۹۷۴ء میں حضرت والد صاحبؒ کو ایک شدید صدمہ ہمارے سب سے بڑے بھائی جناب محمد زکی کیفی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا پیش آیا۔ انہیں حج سے واپسی کے بعد اچانک دل کا شدید دورہ ہوا، اور چند گھنٹوں میں وہ اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ اس حادثے کی تفصیل میں بھائی جان پر اپنے مضمون میں لکھ چکا ہوں، اور وہ میری کتاب "نقوش رفتگاں" میں شامل ہے۔ بھائی جان کے انتقال کی جانگداز خبر انہیں اس حالت میں ملی کہ دل کی کمزوری کے علاوہ نواسیر کی تکلیف بھی تھی، اور ہاتھوں پر ہرپیز کے دانے نکلے ہوئے تھے۔ حکیم محمد سعید صاحب مرحوم عیادت کے لئے آئے، تو انہوں نے دیکھ کر فرمایا کہ "یہ حضرت مفتی صاحبؒ ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اس تکلیف کو برداشت کررہے ہیں، ورنہ ہرپیز کی اس نوعیت کی تکلیف ایسی ہوتی ہے جیسے جسم پر انگارے رکھ دیئے گئے ہوں۔" لیکن اپنے محبوب جوان بیٹے کی وفات پر ان کے صبر واستقلال کو کرامت کے سوا کسی اور لفظ سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ میں نے اپنے مرحوم بھائی کی وفات پر دو مرثیے لکھے تھے، جن میں سے ایک البلاغ میں شائع ہوا، دوسرا شائع نہیں ہوا وہ میں نے حضرت والد صاحبؒ کو تو نہیں، لیکن گھر والوں کو سنایا تھا۔ اُس کا ایک شعر یہ تھا کہ :

کیا خبر تھی ہمیں یہ زہر بھی پینا ہوگا
آپ دنیا میں نہ ہونگے، ہمیں جینا ہوگا

نہ جانے کس طرح حضرت والد صاحبؒ نے میرا یہ شعر سُن لیا۔ مجھ سے تو کچھ نہیں فرمایا، لیکن انہی دنوں جناب آغا شورش کاشمیری صاحب مرحوم حضرت والد صاحبؒ سے تعزیت کے لئے تشریف لائے، تو حضرتؒ نے فرمایا کہ ایک شعر تقی نے کہا ہے، اُس نے تو شاعری کی ہوگی، لیکن میری حالت کی صحیح تصویر کھینچ دی ہے، اور یہ فرماتے ہوئے آنکھ پُرنم اور آواز قدرے روہانسی ہوگئی۔

تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء

۱۹۷۴ء میں تحریک ختم نبوت شروع ہوئی۔ مسلمانوں کا یہ مطالبہ تو شروع سے چلا آتا تھا کہ قادیانی چونکہ اسلام کے بنیادی عقیدے ختم نبوت کے منکر اور مرزا غلام احمد قادیانی جیسے شخص کو نبی مانتے ہیں، اس لئے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہیں، اور انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے ۱۹۵۳ء میں ایک ملک گیر تحریک بھی چلی تھی جس میں ہزاروں مسلمانوں نے ناموس رسالت پر اپنی جانیں نچھاور کیں، لیکن افسوس ہے کہ کچھ سیاسی اسباب کے تحت اُس کے نتیجے میں خواجہ ناظم الدین مرحوم کی حکومت تو ختم ہوگئی، لیکن اس مطالبے پر عمل نہ ہوسکا۔

۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو یہ واقعہ پیش آیا کہ دریائے چناب کے کنارے قادیانیوں نے جو شہر " ربوہ " کے نام سے بسایا ہوا تھا، اُس وقت وہ صرف قادیانیوں ہی پر مشتمل تھا۔ ایک مرتبہ اُس کے ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلبہ کی ایک جماعت پر قادیانیوں نے حملہ کردیا، جس سے طلبہ کی جماعت کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ اس واقعے نے ملک بھر میں آگ لگادی، اور ایک مرتبہ پھر یہ مطالبہ پوری قوت سے اٹھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اُس وقت حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ " مجلس تحفظ ختم نبوت " کے امیر منتخب ہوئے تھے، اور اُن کی سربراہی میں ایک مرتبہ پھر یہ تحریک زور وشور سے شروع ہوئی۔ ملک کے گوشے گوشے میں اس مطالبے کے حق میں جلسوں جلوسوں کا سلسلہ شروع ہوا جس کے لئے حضرتؒ نے ملک کے طول وعرض کے دورے فرمائے، اور اپنی خداداد بصیرت سے تحریک کو پُر امن رکھتے ہوئے جوش وہوش میں توازن کا اعلیٰ نمونہ پیش کیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرووں کو آئینی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار دینا اُسی وقت ممکن تھا جب دستور پاکستان میں ترمیم کرکے ان کو غیر مسلم اقلیتوں میں شمار کیا جائے۔ چنانچہ اس غرض کے لئے الحمد للہ " مجلس ختم نبوت " کے علاوہ دینی سیاسی جماعتوں میں سے جمعیت علماء اسلام نے حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی قیادت میں، جمعیت علماء پاکستان نے حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحبؒ کی سربراہی میں، جماعت اسلامی نے میاں طفیل محمد صاحبؒ کی سربراہی میں اس کام کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، اور آخرکار اُس وقت کی جتنی مسلمان سیاسی جماعتیں اسمبلی میں موجود تھیں، ان کے ارکان نمائندوں کی طرف سے اس مطالبے کے حق میں تاریخی قرارداد پیش کی گئی جس

پر مندرجۂ ذیل ارکان اسمبلی کے دستخط تھے :

محرکین قرارداد

۱۔ دستخط مولوی مفتی محمود
۲۔ مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری
۳۔ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی
۴۔ پروفیسر غفور احمد
۵۔ مولانا سید محمد علی رضوی
۶۔ مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک)
۷۔ چوہدری ظہور الٰہی
۸۔ سردار شیر باز خان مزاری
۹۔ مولانا محمد ظفر احمد انصاری
۱۰۔ جناب عبدالحمید جتوئی
۱۱۔ صاحبزادہ احمد رضا خاں قصوری
۱۲۔ جناب محمود اعظم فاروقی
۱۳۔ مولانا صدر الشہید
۱۴۔ جناب عمر خان
۱۵۔ مخدوم نور محمد
۱۶۔ جناب غلام فاروق
۱۷۔ سردار مولا بخش سومرو
۱۸۔ سردار شوکت حیات خان
۱۹۔ حاجی علی احمد تالپور
۲۰۔ راؤ خورشید علی خان
۲۱۔ رئیس عطا محمد خان مری

نوٹ: بعد میں حسب ذیل ارکان نے بھی قرارداد پر دستخط کئے۔

۲۲۔ نوابزادہ میاں محمد ذاکر قریشی
۲۳۔ جناب غلام حسن خان دھاندلا
۲۴۔ جناب کرم بخش اعوان
۲۵۔ صاحبزادہ محمد نذیر سلطان
۲۶۔ مہر غلام حیدر بھروانہ
۲۷۔ میاں محمد ابراہیم برق
۲۸۔ صاحبزادہ صفی اللہ
۲۹۔ صاحبزادہ نعمت اللہ خان
۳۰۔ شنواری
۳۱۔ ملک جہانگیر خان
۳۲۔ جناب عبدالسبحان خان
۳۳۔ جناب اکبر خان مہمند
۳۴۔ میجر جنرل جمالدار
۳۵۔ حاجی صالح خاں
۳۶۔ جناب عبدالملک خاں
۳۷۔ خواجہ جمال محمد کوریجہ

یہ قرار داد محض ایک مطالبے کی حیثیت رکھتی تھی، اور اس پر عمل کے لئے ضروری تھا کہ دستوری ترمیم کا بل اسمبلی میں پیش ہو۔ چونکہ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کی اکثریت تھی، اور حکومت بھی اُسی کے ہاتھ میں تھی، اُس لئے اُس کی موافقت کے بغیر ایسا کوئی بل پیش ہونا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک طرف تمام مکاتب فکر کے علماء اور دانش وروں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے اُس متفقہ مطالبے کے حق میں رائے ہموار فرمائی، اور دوسری طرف مختلف رہنماؤں سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ چنانچہ اُس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم سے بھی ملاقات فرمائی۔ اُس میں میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب بھی اُن کے ساتھ تھے۔ انہوں نے بتایا کہ حضرتؒ نے بھٹو صاحب مرحوم سے اُن مختلف سازشوں کا ذکر کیا جو قادیانیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کی جاتی رہی ہیں، اسی ذیل میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ انہوں نے بہت سے مسلمان رہنماؤں کو شہید بھی کیا، یا ان کی شہادت کا سبب بنے۔ اس پر بھٹو صاحب مرحوم نے از راہ تفنن کہا کہ "تو مولانا! کیا آپ مجھے بھی شہید کرانا چاہتے ہیں؟" حضرتؒ نے اس کے جواب میں برجستہ فرمایا" : تو ہو جاؤ نا شہید، اللہ کے لئے"۔ بہر حال! حضرتؒ اس تحریک میں نصیحت اور احتجاج دونوں پہلوؤں کو ساتھ لیکر چلے، اور ملک بھر میں ان کی دعوت پر ایسے جلسے منعقد ہوتے رہے جسمیں سنی، شیعہ، اہل حدیث، بریلوی ہر کتب فکر کے علماء کامل اتحاد کے ساتھ اس مطالبے کی آواز بلند کر رہے تھے۔

جب یہ تحریک شروع ہوئی، تو حضرت والد صاحبؒ پر دل کا پہلا حملہ ہو چکا تھا، اور وہ بستر علالت پر تھے۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، میں نے اپنا دفتر بھی ان کی خواب گاہ سے متصل اس طرح بنالیا تھا کہ جو کوئی حضرت والد صاحبؒ سے ملنے آئے، اُسے پہلے مجھ سے ملنا ہوتا تھا، اور میں حضرت والد صاحبؒ کی صحت کی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ملاقات کا انتظام کرتا تھا۔ حضرت والد صاحبؒ کو بھی مجھے بلانے اور کوئی حکم دینے میں آسانی ہوتی تھی، گویا اس معاملے میں اُس وقت حضرت والد صاحبؒ کے سیکریٹری کے جیسے فرائض انجام دیتا تھا، اور اسباق کی تدریس سے فارغ ہو کر اپنے تمام کام بھی وہیں کرتا تھا۔ اس لئے اُن حالات میں میرا کراچی سے باہر کہیں جانا مجھ پر بھی اور حضرت والد صاحبؒ پر بھی بہت شاق ہوتا تھا۔ لیکن دوسری طرف میرے دل میں بھی یہ خواہش تھی کہ اگر تحفظ ختم نبوت کے اس مبارک مقصد میں میرا بھی کوئی حصہ

لگ جائے، تو میرے لئے سعادت ہوگی، اور حضرت والد صاحبؒ نے بھی مجھ سے فرمایا تھا کہ جہاں ضرورت ہو، تم بھی اس کام میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت سے گریز نہ کرنا، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بنوریؒ حضرت والد صاحبؒ سے ملنے کے لئے تشریف لائے، تو میں نے اُن سے درخواست کی کہ تحریک کے کسی کام میں آپ محسوس فرمائیں کہ میری کوئی خدمت کسی کام آسکتی ہے، تو مجھے ضرور اس کا موقع عنایت فرمائیں۔

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے کوئٹہ کا سفر فرمایا، تو مجھے ساتھ چلنے کا حکم دیا، اور مجھے حضرتؒ کی ہم رکابی کا شرف حاصل ہوا۔ وہاں حضرتؒ نے حضرت مولانا عبدالواحد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مطلع العلوم بروری روڈ کوئٹہ کے زیر اہتمام مدرسے ہی میں قیام فرمایا، اور دن کے وقت خان آف قلات سے ملاقات فرمائی جو اُس وقت بلوچستان کے گورنر تھے۔ اور اُسی رات ایک عظیم الشان جلسے سے خطاب فرمایا، اور اُس سے پہلے مجھے بھی مختصر تقریر کرنے کا موقع دیا جو ختم نبوت کے موضوع پر تھی۔ جب آخر میں حضرتؒ کے خطاب کا وقت آیا، تو جوش وخروش سے بھرے ہوئے جلسے میں لوگوں کو یہ توقع تھی کہ حضرتؒ اُسی سطح کی جوشیلی تقریر فرمائیں گے، لیکن حضرتؒ کا سارا زور اخلاص، للّٰہیت اور رجوع الی اللہ پر تھا، ان کا فرمانا تھا کہ تحریک خالص اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے ہونی چاہئے، اور یہ سیاسی سے زیادہ ایک دینی تحریک ہے جو اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتی۔ حضرتؒ مجھ پر جو غیر معمولی شفقت فرماتے تھے، اُس کی بنا پر بعض اوقات مجھے مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حضرتؒ کا اصرار تھا کہ رات کو میں اُنہی کے کمرے میں قیام کروں، اور اس غرض کے لئے انہوں نے میری چارپائی اپنے سامنے بچھوائی۔ حضرتؒ کے مقام بلند کی وجہ سے مجھے اس میں شرمندگی محسوس ہوتی تھی، اس لئے میں نے باہر کسی ساتھی کے ساتھ سونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن حضرتؒ نے مجھے اجازت نہیں دی، اور میں حضرتؒ کی چارپائی کے سامنے سمٹا لیٹا رہا فجر کے بعد حضرتؒ کے سامنے مقامی اخبارات لائے گئے جن میں جلی سرخیوں کے ساتھ حضرتؒ کی تقریروں اور ملاقاتوں کا ذکر تھا، آپ نے اُن اخبارات پر ایک سرسری نظر ڈالی، پھر کچھ اس طرح کی بات ارشاد فرمائی کہ اس قسم کی عوامی تحریکات بعض اوقات انسان کو شہرت اور جاہ کے فتنے میں مبتلا کردیتی ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے رہنا چاہئے۔

• کوئٹہ کے اس سفر کے کچھ عرصے بعد حضرتؒ کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ راولپنڈی تشریف لے گئے ہیں، اور جن حضرات نے اسمبلی میں قرارداد پیش کی ہے، اُن سے صلاح مشورے جاری ہیں۔ اُس وقت

ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم وزیراعظم پاکستان نے اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے پوری اسمبلی کو ایک تحقیقاتی کمیٹی بنادیا تھا، جسے عدالتی اختیارات دیئے گئے تھے، تاکہ وہ مرزا غلام احمد کے پیروؤں اور مسلمانوں دونوں کے بیانات سن کر اور ضروری تحقیقات کر کے کسی نتیجے تک پہنچ سکے۔

اسی دوران حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے ٹیلی فون کر کے فرمایا کہ مرزائیوں کے دونوں گروہوں نے اپنے اپنے مفصل محضرنامے اسمبلی کو پیش کر کے اُن میں اپنا موقف بیان کردیا ہے، قادیانی گروپ کا محضرنامہ کئی سو صفحات پر مشتمل ہے، اور لاہوری جماعت کا بھی کم وبیش اتنا ہی ہے۔ یہاں مشورے سے یہ بات طے ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے بھی اپنا موقف مفصل دلائل کے ساتھ پیش کیا جائے جس میں ان دونوں محضرناموں کا جواب بھی ہو۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ مسلمانوں کی طرف سے اس تحریر کو مرتب کرنے کے لئے تمہارا نام تجویز ہوا ہے، اس غرض کے لئے تمہیں کچھ دن کے لئے راولپنڈی آنا پڑے گا، کیونکہ جو علماء کرام اس موضوع کے ماہرین ہیں، وہ یہاں تشریف لاچکے ہیں، اور وہ بیان لکھنے میں تمہاری مدد کریں گے۔

میرے لئے اگرچہ یہ ایک عظیم سعادت تھی، لیکن دوہری آزمائش بھی تھی، ایک طرف تو پوری امت مسلمہ کی طرف سے انتہائی ذمہ دارانہ بیان ترتیب دینا بذات خود ایک مشکل کام تھا، اور دوسری طرف حضرت والد صاحبؒ کے بستر علالت پر ہونے کی وجہ سے غیر معین مدت کے لئے انہیں چھوڑ کر جانا طبعی طور سے مجھے بہت بھاری معلوم ہوتا تھا، لیکن جب میں نے حضرت والد صاحبؒ سے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے اس فون کا ذکر کیا، تو انہوں نے کام کی اہمیت کے پیش نظر مجھے فرمایا کہ تم ضرور چلے جاؤ۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، الحمد للہ میری طبیعت میں افاقہ ہے، اور میری دیکھ بھال کے لئے تمہارے بڑے بھائی، خاص طور پر حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب موجود ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کے فرمانے پر میں فوراً اس سفر کے لئے تیار ہوکر راولپنڈی روانہ ہوگیا۔ عام طور پر اُس زمانے میں جب راولپنڈی جانا ہوتا، تو حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری قدس سرہ کے صاحب زادے مولانا قاری سعیدالرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے جامعہ اسلامیہ کے ایک کمرے میں قیام ہوتا تھا۔ اُن سے برادرانہ بے تکلفی بھی تھی۔ میں راولپنڈی پہنچ کر سیدھا وہیں چلا گیا، اُس وقت حضرتؒ مدرسے سے متصل کامران ہوٹل میں قیام پذیر تھے۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، تو یہ معلوم کر کے مزید خوشی ہوئی کہ محبّ محترم جناب مولانا سمیع الحق صاحب بھی اس کام میں شریک

ہوں گے، اور اس غرض کے لئے حضرت مولانا حیات صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مرزا کی کتابوں کے تقریباً حافظ تھے، اور قادیان میں انہوں نے بڑے معرکے کے مناظرے کئے تھے، وہ بھی اپنے پورے مواد کے ساتھ وہاں تشریف لا چکے ہیں، اس کے علاوہ ملتان کی مجلس تحفظ ختم نبوت کے ناظم جناب مولانا عبدالرحیم اشعر صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتابوں کے خزانے سمیت وہاں موجود ہیں، اور یہ سب حضرات بیان لکھنے میں ہماری معاونت کے لئے موجود رہیں گے۔ دوسری طرف بیان کا جو سیاسی حصہ لکھنا تھا، اُس میں مدد دینے کے لئے حضرت مولانا تاج محمود صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد شریف جالندھری صاحبؒ بھی موجود تھے۔

اس موقع پر حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ ": میری تو شروع سے یہ خواہش تھی کہ بیان تم سے لکھوایا جائے، لیکن میں نے معاملہ مشورے پر چھوڑ دیا تھا، اور مجھے اس بات سے بہت خوشی ہوئی کہ جب مختلف نام زیر غور آئے، تو سب سے پہلے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب (قدس سرہ) نے تمہارا نام پیش کیا۔ میرا تو یہ منشأ پہلے سے تھا، اس لئے میں نے اس کی تائید کی، اور آخر کار فیصلہ اسی پر ہوا۔"

یہ کام انجام دینے کے لئے ایک وسیع جگہ کی ضرورت تھی، تاکہ پوری ٹیم یکجا رہکر کام کرے۔ پھر وہاں اُن ارکان اسمبلی کا اجتماع بھی ضروری تھا جن کی طرف سے یہ بیان داخل ہونا تھا، تاکہ وہ اُس پر غور کرسکیں۔ مجلس تحفظ ختم نبوت کے پاس مالی وسائل محدود بھی تھے، اور حضرت بنوریؒ انہیں احتیاط کے ساتھ خرچ کرنا چاہتے تھے، اس لئے کسی بڑے ہوٹل میں یہ کام مشکل تھا۔ البتہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب قدس سرہ کے متوسلین میں سے ایک مشہور بزرگ تاجر جناب بٹ صاحب مرحوم کے صاحب زادوں کا راولپنڈی کے مال روڈ کے قریب ایک ہوٹل (غالباً پارک ہوٹل کے نام سے) تھا۔ وہ ایک پرانا ہوٹل تھا، لیکن پرانے طرز کی بیرکوں کی سی شکل میں ایک وسیع رقبے پر مشتمل تھا، (اب وہ موجود نہیں رہا) اور اُس میں الگ الگ کمرے مناسب مقدار میں موجود تھے۔ ان حضرات نے اس ہوٹل کو خالی کرکے یہ پیشکش کی کہ آپ حضرات یہاں منتقل ہو جائیں۔ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اسے منظور فرمالیا، اور ہم سب اُس میں منتقل ہوگئے۔ ہوٹل اگرچہ بوسیدہ سی حالت میں تھا، لیکن اس کام کے لئے جس پُرسکون جگہ کی ضرورت تھی، اُسے پورا کرتا تھا۔ جب ہم پہلی رات وہاں منتقل ہوئے تو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے کوئٹہ کی طرح یہاں بھی میری چارپائی اپنے کمرے میں رکھوائی، اور حکم دیا کہ تم یہیں پر قیام کرو۔ میں نے پھر عذر کیا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ

لکھنے والوں کا تحفظ بھی ایک اہم ضرورت ہے، اس لئے تمہارے لئے یہی جگہ مناسب ہے جہاں تحفظ کا مناسب انتظام بھی ہے۔ ایک رات میں نے حکم کی تعمیل کی، لیکن پھر عرض کیا کہ مجھے رات کو دیر تک جاگنے کی عادت ہے، اس لئے مجھے رات کو بھی کام کرنا ہوگا، اور یہاں رہکر میں آزادی سے کام نہیں کرسکوں گا۔ اس پر حضرتؒ نے یہ اجازت دیدی کہ ان کے کمرے سے متصل ایک دوسرے کمرے میں منتقل ہوجاؤں۔

حضرتؒ نے یہ طے فرمایا کہ بیان کا مذہبی حصہ جس میں مرزا غلام احمد اور اُس کے پیرووں کے عقائد پر دینی اعتبار سے بحث کی جائے، وہ تم لکھو، اور انہوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مقاصد کو سیاسی اعتبار سے جو نقصانات پہنچائے ہیں، اور جس طرح سیاسی مقاصد میں اپنے آپ کو ملت مسلمہ سے الگ رکھا ہے، اُس کی تفصیل مولانا سمیع الحق صاحبؒ تحریر فرمائیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر کام شروع ہوا۔
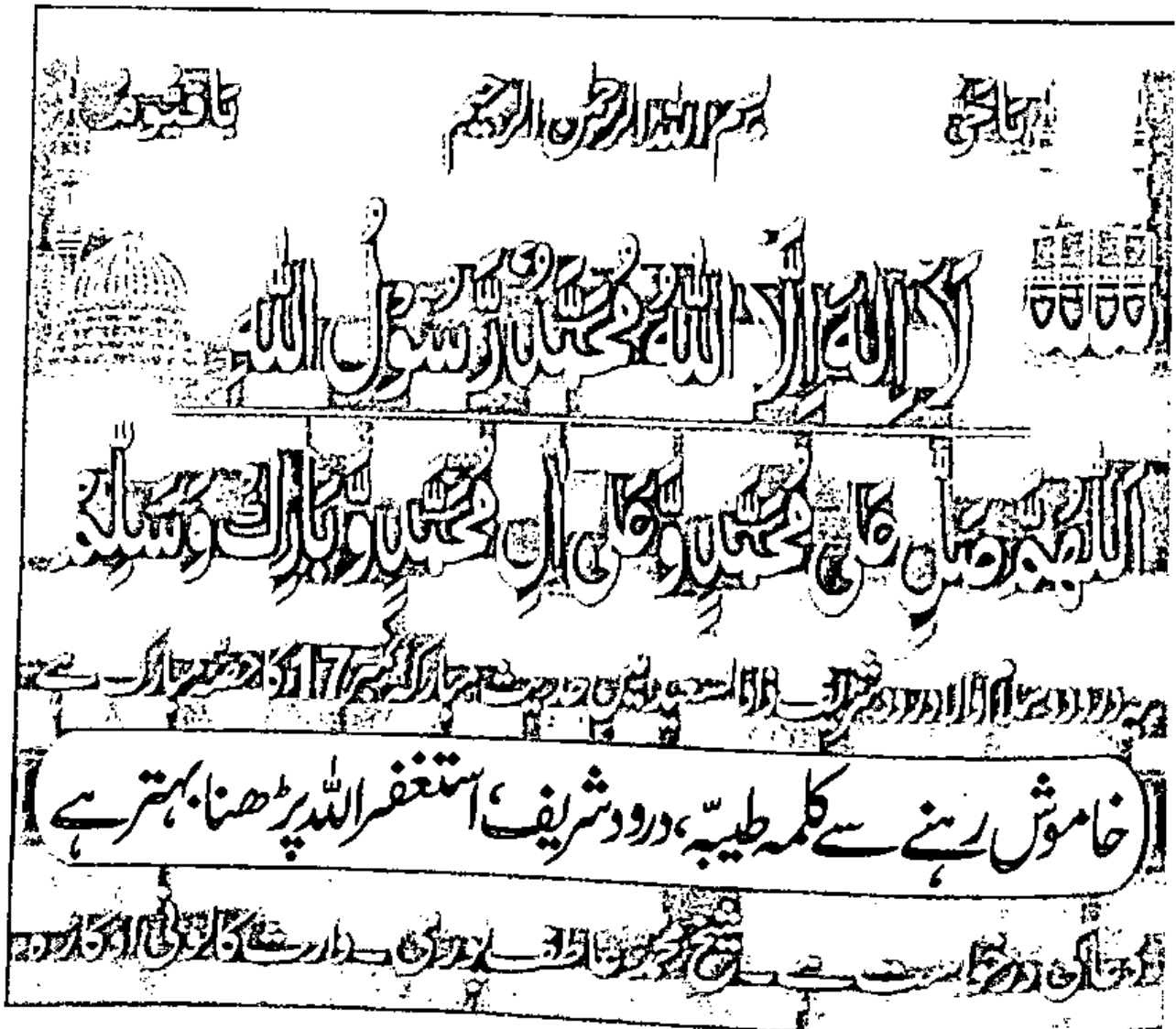
حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چھتیسویں قسط)

میرے سامنے ایک پہاڑ جیسی مشکل یہ تھی کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیرووں کے بارے میں مسلمانوں کی طرف سے اتنا کچھ لکھا جاچکا تھا کہ اُس سے الماریاں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے عقائد کے پہلو بھی بہت سے تھے۔ اس سارے مواد کو ایک بیان میں سمیٹنا آسان نہیں تھا۔ دوسرے ان میں سے ایسے مباحث کا انتخاب کرنا تھا جو سادہ اور عام فہم ہوں، اور ارکان اسمبلی کسی پیچیدگی میں الجھے بغیر ان کو سمجھ سکیں۔ تیسرے میں یہ ضروری سمجھتا تھا کہ مرزا غلام احمد یا اُن کے پیرووں کی طرف جو بات منسوب کی جائے، وہ پوری احتیاط کے ساتھ اُس کے صحیح سیاق وسباق کے ساتھ نقل کی جائے جس پر یہ انگلی نہ اٹھائی جاسکے کہ نقل کرنے والے نے کسی کی طرف کوئی غلط بات منسوب کی ہے، یا اُسے سیاق وسباق سے کاٹ کر نقل کیا ہے۔

چنانچہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کرکے اُسی کے بھروسے پر کام شروع کیا، لیکن پہلے یہ ضروری سمجھا کہ نبوت کے دعوے اور اُس کے نتائج پر مرزا غلام احمد کی جو عبارتیں پیش کی جاتی ہیں، وہ براہ راست خود پڑھوں۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا محمد حیات صاحب اور حضرت مولانا عبدالرحیم اشعر صاحب پر اپنی رحمت کی بارشیں برسائیں، انہوں نے اپنی پوری زندگی ختم نبوت کے عقیدے کے لئے وقف کی ہوئی تھی، ان کے پاس مرزا اور اُس کے متبعین کی اصل کتابوں کا پورا ذخیرہ موجود تھا، جو وہ اپنے صندوقوں میں بھر کر لائے ہوئے تھے، یہاں تک کہ قادیانیوں کے روزناموں "الفضل" "ریویو آف ریلیجنز" وغیرہ کے نہایت پرانے شماروں کے اصل نسخے ان کے پاس محفوظ تھے۔ جن پہلوؤں کو میرے نزدیک بیان میں واضح کرنا ضروری تھا، میں نے ان دونوں بزرگوں کی مدد سے ان اصل کتابوں کا خود بغور مطالعہ کیا، اور سینکڑوں صفحات نظر سے گزارے۔ اُس کے بعد اللہ تعالیٰ کے نام پر لکھنا شروع کیا۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت کچھ ایسی بنائی ہے کہ جب کسی موضوع پر کام

شروع کرتا ہوں، تو اُس کی ایک دُھن مجھ پر سوار ہوجاتی ہے، چنانچہ وہ دُھن ایسی سوار ہوئی کہ کھانے اور نماز کے علاوہ سارا وقت وہی کام دل ودماغ پر سوار رہتا تھا۔ محبّ محترم مولانا سمیع الحق صاحبؒ بھی دن رات اپنے کام میں لگے ہوئے تھے، البتہ ان کا قیام ہوٹل کے قریب ہی اپنے ایک دوست کے گھر میں تھا۔ اُدھر جن ارکانِ اسمبلی کی طرف سے یہ بیان جانا تھا، روزانہ شام کو عصر کے بعد وہ حضرات تشریف لاتے، اور دن بھر کی لکھی ہوئی تحریر سن کر اُس میں مشورے دیتے تھے، ان میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالحق صاحبؒ (اکوڑہ خٹک) حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالمصطفی ازہری صاحبؒ، حضرت مولانا ظفر احمد انصاری صاحبؒ، جناب پروفیسر عبدالغفور احمد صاحبؒ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ جو مشورے یا ہدایات اُن کی طرف سے ملتیں، (جو زیادہ نہیں تھیں)، ان کے مطابق مسودے میں تھوڑی بہت ترمیم بھی اُسی وقت کرلی جاتی تھی۔

اُدھر کسی وجہ سے یہ طے تھا کہ آئندہ دس دن کے اندر اندر یہ بیان ایک کتابی صورت میں اسمبلی میں داخل ہونا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ اس کی کتابت بھی ساتھ ساتھ ہوتی جائے (اُس وقت تک کمپیوٹر کی کمپوزنگ کا رواج نہیں ہوا تھا)۔ مشورہ ہوا کہ کتابت کس سے کرائی جائے۔ میں نے حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ اگر آپ حضرت سید نفیس شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) سے فرمائیں، تو امید ہے کہ وہ فوراً قبول فرمالیں گے۔ حضرت مفتی صاحبؒ نے فرمایا کہ "نفیس تو پھر نفیس ہی ہیں" اور پھر انہوں نے حضرت نفیس شاہ صاحبؒ کو فون کیا، تو وہ خوشی خوشی اپنی ٹیم کے ساتھ وہیں تشریف لے آئے، شام کو جتنا کچھ لکھا جاتا، ان کے رفقاء اس کی فوراً کتابت شروع کردیتے تھے۔

قادیانی گروپ کے جو لوگ جو مرزا غلام احمد کو صاف صاف نبی مانتے، اور نہ ماننے والوں کو کافر قرار دیتے ہیں، ان کے بارے میں تو ایک عام آدمی کے لئے بھی یہ بات واضح تھی کہ وہ اسلام کے دائرے میں نہیں ہوسکتے۔ لیکن لاہوری جماعت کے لوگ جو بظاہر مرزا کو نبی ماننے سے انکار کرتے ہیں، اور صرف ایک مذہبی پیشوا سمجھتے ہیں، ان کے بارے میں بہت سے لوگ اس شبہے کا شکار رہتے ہیں کہ انہیں کس بنا پر دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے۔ اس کے جواب میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے، اور صحیح بھی ہے، کہ مرزا کا کفر اُس کے دعوائے نبوت کی بنا پر ثابت اور واضح ہے، جو لوگ اُسے کسی بھی معنی میں اپنا پیشوا سمجھیں، وہ کیسے اسلام کے دائرے میں شمار ہوسکتے ہیں؟ اس کے علاوہ یہ بھی بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ لاہوری گروپ کے سربراہ محمد علی

لاہوری خود بھی ۱۹۱۴ء تک مرزا کو نبی کہتے اور مانتے رہے ہیں، نبوت سے براءت اُنہوں نے اُس وقت شروع کی جب نورالدین کی وفات کے بعد جانشینی کا مسئلہ کھڑا ہوا۔

یہ باتیں اپنی جگہ درست ہیں، لیکن میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ جب وہ مرزا کی ہر بات کی حقانیت کے قائل ہیں، تو یقیناً اُس کے اُن دعووں کو بھی برحق مانتے ہیں جن میں اُس نے اپنے نبی اور رسول ہونے کا دعویٰ کیا ہے، اس لئے ۱۹۱۴ء کے بعد بھی یقیناً وہ کسی نہ کسی معنیٰ میں اُس کے نبی ہونے کا ضرور اقرار کرتے ہیں۔ اگر ان کی ایسی تحریریں سامنے آئیں، تو لوگوں پر ان کے عقیدے کی حقیقت زیادہ واضح ہو سکے گی۔ چنانچہ میں نے ان کی ۱۹۱۴ء کے بعد کی تحریروں کا جائزہ لیا۔ ان کی کتاب "النبوة فی الاسلام" ۱۹۱۴ء کے بعد ہی کی تالیف ہے، میں نے تقریباً اُس پوری کتاب کا مطالعہ کیا، اور یہ حقیقت الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ وہ بعد میں بھی مرزا کو نبی مانتے رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی اس کتاب سے صریح عبارتیں جمع کر کے اُس بیان کا حصہ بنائیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ حقیقۃً اُن میں اور قادیانی گروپ میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔

میں اگرچہ دن رات بیان تیار کرنے میں مصروف تھا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ پورے ملک میں ختمِ نبوت کے مطالبات کی تائید میں پُر جوش جلسے ہو رہے تھے، راولپنڈی اور اس کے مضافات میں بھی تقریباً روزانہ کوئی بڑا جلسہ ہوتا تھا، جلسے کے منتظمین بکثرت ان جلسوں میں شرکت اور تقریر کرنے کی دعوت دیتے تھے، لیکن میں اپنے زیرِ قلم کام کی وجہ سے معذرت ہی کر لیتا تھا، ایک مرتبہ میں حضرت بنوری قدس سرہ کے پاس کھانے کی کسی نشست میں بیٹھا ہوا تھا، اس وقت ایک جلسے کے منتظمین نے حضرتؒ سے کہا کہ حضرت! آج کا جلسہ بہت اہم ہے، آپ تقی سے فرما دیں کہ وہ اس میں ضرور شریک ہو کر تقریر کرے، حضرتؒ نے جواب میں فرمایا: اللہ کے بندو! ہر شخص سے اس کے مناسب کام لیا کرو، تمہارے پاس مقرروں کی کچھ کمی ہے جو اس سے تقریر کا مطالبہ کر رہے ہو، اگر میں اسے تمہارے ساتھ جلسوں میں بھیجنا شروع کر دوں تو یہ کام کون کرے گا جس میں یہ مشغول ہے، اس کے بعد کسی نے جلسوں میں لے جانے کی فرمائش نہیں کی۔

محبِ محترم جناب مولانا سمیع الحق صاحب (اللہ تعالیٰ انہیں عافیت کے ساتھ سلامت رکھے)(۱) ہمیشہ سے بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ دن رات محنت کرنے کے باوجود اُن کی پُر بہار طبیعت اپنی جولانی

---

(۱) افسوس کہ آج جب یہ سطور چھپنے جا رہی ہیں، ان کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ لکھنا پڑ رہا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں شہادت سے سرخ رو کر کے اپنے پاس بلا لیا۔

پر رہتی تھی، جو میرے لئے ایک نعمت سے کم نہ تھی، جب دل و دماغ بہت تھک جاتا، تو ان کی صحبت میں چند لمحات بھی بڑے جانفزا ثابت ہوتے تھے۔ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا، شاید وسائل کی کمی اور احتیاط کے پیش نظر کئی روز تک مسلسل کھانے میں صبح وشام صرف دال پکتی رہی۔ اگرچہ کام کی اہمیت کے پیش نظر ان باتوں کی طرف دھیان ہی نہیں تھا، اور ہم ویسے بھی مدرسے کی زندگی میں اس قسم کے سادہ کھانے کے عادی بھی تھے لیکن ازراہِ مذاق ہم آپس میں روزانہ دال کھانے کی کیفیات کا تذکرہ کرتے رہتے تھے جب کئی دن اسی طرح گذر گئے، تو ایک روز میں نے کھانے کے منتظم سے پوچھا: " آج کیا کھانا ہے؟ " اُس نے جواب دیا: "دال! " میرے منہ سے گھبرائے ہوئے لہجے میں بے ساختہ نکلا: " آج بھی دال؟" مولانا سمیع الحق صاحب نے میرے اس جملے کو ظرافت کا ایک مستقل موضوع بنائے رکھا، اور مدت تک مزے لیکر اُس کا حوالہ دیکر مجھے چھیڑتے رہے۔ میں جواباً مولانا کو حضرتؒ کا ایک جملہ دہرا کر چھیڑا کرتا تھا جس کا قصہ یہ تھا کہ حضرت بنوریؒ نے مولانا سمیع الحقؒ کو ایک دن دوپہر کے کھانے کے وقت تربوز لانے کے لئے بازار بھیجا۔ وہ ایک اتنا بڑا تربوز لے آئے جسے ان کے لئے اٹھانا بھی مشکل ہورہا تھا۔ لیکن جب کھانا کھانے کے بعد اُسے کاٹا گیا، تو وہ اندر سے بالکل سفید نکلا۔ حضرت بنوریؒ کو اُسے دیکھ کر حیرت ہوئی۔ انہوں نے مولانا سمیع الحق صاحب سے فرمایا: "خدا کے بندے! اتنا بڑا تربوز اٹھا لائے، مگر یہ نہ دیکھا کہ وہ پکا بھی ہے، یا نہیں؟ بھلا اتنا بڑا تربوز لانے کی کیا ضرورت تھی؟" مولانا سمیع الحق صاحب کو حضرت بنوریؒ سے قابل رشک حد تک بے تکلفی تھی۔ انہوں نے جواب دیا: "حضرت! آپ نازک مزاج آدمی ہیں، مجھے یہ خطرہ تھا کہ کوئی چھوٹا تربوز لایا، تو آپ کو ناگوار ہوگا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ آپ کو نہ چھوٹا پسند ہے، نہ بڑا۔" حضرتؒ یہ سُن کر مسکرائے، اور بے بسی کے انداز میں فرمایا: " واقعی عقل بڑی عجیب چیز ہے۔"

بہر کیف! وہ بڑے یادگار دن تھے۔ حضرت بنوریؒ اور ان کے مشن کی وجہ سے وہاں علماء کرام اور اہل دانش کا بڑا خوبصورت گلدستہ جمع رہتا تھا۔ حضرت سید نفیس شاہ صاحبؒ کہنے کو ایک بڑے عظیم خطاط تھے، لیکن بڑے صاحب دل بزرگ تھے۔ وہاں کتابت اور اُس کی نگرانی کے علاوہ ان کی زبان پر طرح طرح کے علمی اور ادبی فوائد جاری رہتے تھے۔ ان کے ساتھ تقریباً دس روزہ صحبت ایک انتہائی شیریں اور خوشگوار تعلق میں تبدیل ہوگئی جو بفضلہٖ تعالیٰ ان کی وفات تک مسلسل جاری رہا۔

اس طرح دن رات ایک کرکے بیان کی تیاری، اُس پر نظر ثانی اور اُس کی کتابت ساتھ ساتھ ہورہی تھی،

لیکن وقت بالکل قریب آلگا تھا، اور ابھی کئی باتوں کی وضاحت باقی تھی۔ آخر ایک رات میں کھانے کے بعد لکھنے بیٹھا، تو وقت کا پتہ نہ چلا، اور ساری رات لکھتے لکھتے گزر گئی۔ صبح کی اذان کے وقت بارش ہو رہی تھی، اور میں آخری حصہ لکھ رہا تھا۔ اتنے میں برابر کے کمرے کا دروازہ کھلا، اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اندر تشریف لائے، اور پوچھا کہ کیا تم ابتک لکھ رہے ہو؟ میں نے عرض کیا کہ حضرت! وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، اور الحمد للہ اب میں ختم کے قریب ہوں۔ حضرتؒ نے دعائیں دیں، اور واپس کمرے میں تشریف لے گئے۔ بعد میں حضرت والد صاحبؒ کو فون کیا اور فرمایا کہ: "حضرت! مقدمۂ بہاول پور کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ جس طرح آپ اُس مقدمے کے موقع پر رات بھر بیان لکھتے رہے تھے، آج رات تقی میاں بھی ساری رات نہیں سوئے، اور لکھنے میں مصروف رہے۔" حضرت بنوریؒ نے بعد میں ماہنامہ بینات کے اداریے میں بھی حضرت والد صاحبؒ کی وفات پر جو شذرہ لکھا، اُس میں اس واقعے کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا ہے:

"(حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ) مقدمہ بہاول پور میں امام العصر شاہ صاحبؒ کے دست راست رہے، اور آپ ہی کے قلم سے حضرت شیخ رحمہ اللہ کی دقیق و عمیق تعبیرات سہل اردو میں مرتب ہوئیں جو مقدمۂ بہاول پور کے نام سے معروف ہے، اور فرمایا کہ ایک رات اسی کام میں ایسی گزری کہ عشاء کے بعد سے صبح تک اس کی تکمیل میں مشغول رہا[1]۔ اس طرح حضرت شیخ کی دعاؤں اور توجہات کے مرکز بنے رہے۔ ۱۹۷۴ء میں قادیانی مسئلہ کے سلسلے میں جو محاذ قائم ہوا تھا، اور حضرت شیخ (حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ) کے جوتوں کے صدقے میں حق تعالیٰ نے راقم الحروف سے کام لیا، اس کے لئے حضرت مفتی صاحب (حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے صاحب زادے عزیز گرامی برادرم مولانا تقی صاحب کو میں نے راولپنڈی میں بلایا تھا، مسئلۂ قادیانیت میں امت اسلامیہ کے موقف کی ترتیب و تالیف میں برادر موصوف نے ایک دفعہ پوری رات گزار دی، ایک لمحہ

(۱)۔۔ اس واقعے کی جو تفصیل میں نے خود حضرت والد صاحبؒ سے سنی، وہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء میں احمد پور شرقیہ بہاول پور کی ایک مسلمان عورت نے اپنے شوہر کے مرزائی ہوجانے کی وجہ سے بہاول پور کی عدالت میں نکاح فسخ کرنے کا دعوی دائر کیا تھا۔ سات سال تک یہ مقدمہ نچلی عدالتوں میں چل کر بالآخر بہاول پور کے دربار معلّی میں پہنچا اور ۱۹۳۳ء میں دربار معلّی نے عدالت میں یہ لکھ کر واپس کیا کہ اس مسئلے کی پوری تحقیق ضروری ہے۔ دونوں فریقوں کے علماء کی شہادتیں لی جائیں، پھر کوئی فیصلہ کیا جائے۔ قادیانی
اس موقع پر قادیان کے رہنماؤں نے بڑی رقم خرچ کر کے مقدمے کی پیروی میں قادیانی گواہوں اور وکلاء کا اہتمام کیا،=

کے لئے بھی آرام نہ کرسکے۔ میں نے حضرت مفتی صاحبؒ سے فون پر اور بعد میں زبانی یہ عرض کیا تھا کہ آپ کے مقدمۂ بہاول پور اور حضرت شیخؒ کی خدمت ومساعدت سے پوری مشابہت اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمادی جس سے حضرت مفتی صاحبؒ بہت خوش ہوگئے۔اس طرح اللہ تعالیٰ نے براور

= لیکن مسلمان مدعیہ بیچاری غریب تھی، اس کے بس میں نہیں تھا کہ علماء اسلام کو جمع کرکے ان کی شہادتیں پیش کرے، لیکن جامعہ بہاول پور کے شیخ الجامعہ مولانا محمد حسین صاحب نے ملک کے مشاہیر علماء کو خط لکھ کر دعوت دی۔ اس وقت امام العصر حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ کو دعوت دی گئی، حضرتؒ نے معاملے کی اہمیت کی بنا پر بہاول پور سفر کرنا طے کرلیا۔ اور اپنے ساتھ حضرت مولانا سید مرتضی حسن صاحب چاند پوریؒ کو بھی لیا، اور میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ساتھ چلنے کو فرمایا، اتفاق سے اس وقت میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیمار تھے، اور حضرت والد صاحبؒ کے سوا ان کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی جو ان کی دیکھ بھال کرسکے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب قدس سرہ نے والد صاحبؒ سے فرمایا کہ آپ ساتھ چلیں ہم آپ کے والد صاحبؒ کے لئے دعا کریں گے۔ ان شاء اللہ وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔

چنانچہ حضرت والد صاحبؒ حضرت شاہ صاحبؒ کے ساتھ بہاول پور تشریف لے گئے اور تقریباً پچیس روز بہاول پور میں قیام ہوا۔

اس دوران حضرت شاہ صاحبؒ کے حکم پر پہلا بیان عدالت میں حضرت والد صاحبؒ کا ہوا جو تین دن جاری رہا، اور دو دن بیان پر جرح ہوئی، یہ بیان ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو شائع ہوچکا ہے۔

اس کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان تین روز جاری رہا، بیان کیا تھا؟ علوم ومعارف کا ایک سمندر بہہ رہا تھا جس کے نتیجے میں عدالتی اہل کار بیان قلمبند کرنے سے عاجز ہوگئے۔ بعد میں جج صاحب کی طرف سے کہا گیا کہ ہم حضرت شاہ صاحبؒ کا بیان لکھ نہیں سکے، اس لئے فائل پر کچھ موجود نہیں ہے۔ آپ یہ بیان لکھ کر پیش کریں، اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ نے حضرت والد صاحبؒ کو حکم دیا کہ آپ یہ بیان لکھ کر پیش کریں۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ نے اس حکم کی تعمیل میں بیان لکھنا شروع کیا، حضرت والد صاحب قدس سرہ فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کی طرف سے بیان لکھنا میرے لئے بڑی آزمائش تھی، لیکن انہی کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے یہ کام کرایا۔ اسی دوران یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ ساری رات جاگ کر بیان لکھتے رہے۔ اذانِ فجر کے بعد برابر کے کمرے سے حضرت شاہ صاحبؒ تشریف لائے تو والد صاحبؒ کو لکھتے ہوئے پایا، حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ آخری سطریں لکھ رہا ہوں۔ اس پر حضرتؒ نے والد صاحبؒ کو ڈھیروں دعائیں دیں۔ بالآخر الحمد للہ تعالیٰ ۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو اس مقدمے کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا جو اس موضوع پر پہلا عدالتی فیصلہ تھا۔ حضرت بنوریؒ نے اس واقعے کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

موصوف کو اپنے والد محترم کا صحیح خلف الرشید بنایا، فطوبی له هذه السّعادة، وهنیئاً له بهذه الخلافة. (ماہنامہ بینات، منقول از مفتیٔ اعظم نمبر ماہنامہ البلاغ ج:۱ ص:۳۱)

جب بیان دو سو صفحات میں مکمل ہوگیا، اور کتاب کا نام رکھنے کا وقت آیا، تو لوگ مختلف جذباتی نام تجویز کر رہے تھے، لیکن حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے فرمایا کہ: "نام سنجیدہ علمی انداز کا ہونا چاہئے" پھر خود ہی اُس کا نام "ملت اسلامیہ کا موقف" تجویز فرمایا۔ لیکن پھر مجھ سے کہا کہ اصل بیان میں تو ضرورت اس بات کی تھی کہ انداز بیان سنجیدہ اور جذباتیت سے بالاتر ہو، تاکہ دلائل کا وزن برقرار رہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ موضوع چونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ناموس اور ختم نبوت کا ہے، اسلئے یہ ایک مسلمان کا جذباتی مسئلہ بھی ہے، لہٰذا آپ اس کے آخر میں ایک دو صفحے اس جذباتی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے ارکان اسمبلی سے ایک دردمندانہ اپیل کی شکل میں لکھیں، اور یہ اپیل کچھ جذباتی انداز کی بھی ہو، تو کچھ حرج نہیں ہے۔

چنانچہ حضرت مفتی صاحبؒ کے حکم کے مطابق میں نے بیان کے آخر میں دو صفحے اسی انداز کی اپیل کے طور پر لکھے۔

بہر حال! اس طوفانی رفتار سے یہ دو سو صفحات کی کتاب دس دن کے اندر اندر تالیف بھی کی گئی، اُس کی کتابت بھی ہوئی، چھپ بھی گئی، اور اُس کی بائنڈنگ بھی ہوگئی۔

چونکہ قادیانی گروپ کے سربراہ مرزا ناصر احمد اور لاہوری گروپ کے سربراہ صدرالدین صاحب بھی اسمبلی میں بیان دینے کے لئے پیش ہونے والے تھے، اور اُن پر جرح بھی ہونی تھی، اس لئے کتاب کی تالیف کے بعد یہ بھی تجویز ہوا کہ جرح میں پوچھے جانے والے سوالات بھی مرتب کئے جائیں۔ چنانچہ بعد میں کچھ وقت باہمی مشورے سے ان سوالات کی ترتیب میں بھی لگا۔ میں تو بعد میں کراچی واپس آ گیا تھا، لیکن ۵/ اگست سے ۲۸/ اگست تک وقفوں وقفوں سے مرزا ناصر اور صدرالدین صاحب کے بیانات اور اُن پر جرح کا سلسلہ جاری رہا، اُس وقت کے اٹارنی جنرل جناب یحییٰ بختیار صاحب کو جرح کرنی تھی۔ انہیں سوالات مرتب کرنے میں حضرت مولانا ظفر احمد انصاریؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے ان کی خوب خوب مدد فرمائی۔ اس جرح کی پوری تفصیل عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے "قومی اسمبلی میں قادیانی مسئلہ پر بحث کی مصدقہ رپورٹ" کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

ان دونوں کے بیانات اوران پر جرح کے بعد ۲۹/اور ۳۰/اگست کو حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وہ بیان پڑھکر سنایا جو ''ملت اسلامیہ کے موقف '' کے نام سے مرتب اور طبع ہوا تھا۔

آخرکار! اسمبلی کے دونوں ایوانوں نے ستمبر ۱۹۷۴ء میں دستور میں ترمیم کرکے مسلمانوں کا یہ دیرینہ مطالبہ پورا کردیا، اور مرزائیوں کے دونوں گروپس کو غیر مسلم اقلیت قرار دیدیا گیا۔ اس موقع پر مجھ سے حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ ہم لوگوں کو تقسیم ہند کے معاملے میں کچھ اختلاف رہا تھا، لیکن اس واقعے کے بعد پاکستان کی قدر معلوم ہوئی، کیونکہ یہ فیصلہ غیر منقسم ہندوستان میں ہونا ممکن نہیں تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(سینتیسویں قسط)

۱۹۷۵ء کا سفر عمرہ وافریقہ

اگلے سال حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً شعبان ۱۳۹۵ھ میں مجھے بلا کر فرمایا کہ افریقی ممالک میں قادیانیوں کی سرگرمیوں کی وجہ سے مجلس تحفظ ختم نبوت کی طرف سے یہ تجویز ہوئی ہے کہ قادیانی مسئلہ کی وضاحت کے لئے افریقی ممالک کا ایک سفر کیا جائے، تاکہ وہاں کے مسلمانوں کو ان کی حقیقت معلوم ہو سکے۔ اس سفر میں کسی ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اس موضوع کی واقفیت کے ساتھ انگریزی میں تقریر وتحریر کرسکتا ہو۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو۔ پہلے رمضان کے دوران عمرہ کریں گے، اور عید کے بعد ان شاء اللہ افریقہ روانہ ہو جائیں گے۔ رمضان المبارک میں عمرہ، حضرتؒ کی رفاقت اور اس مبارک مقصد کے لئے! میرے لئے اس سے بڑی سعادت کیا ہو سکتی تھی! صرف اشکال یہ ہو سکتا تھا کہ حضرت والد صاحبؒ دل کا دورہ پڑنے کے بعد سے بستر علالت پر تھے، اور میرے لئے اُن سے طویل جدائی بہت شاق تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی یہ انتظام فرمادیا کہ خود حضرت والد صاحبؒ کے پاس رابطۃ العالم الاسلامی کی طرف سے "مؤتمر رسالۃ المسجد" کے عنوان پر رمضان میں ایک کانفرنس کا دعوت نامہ آیا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ عام حالات میں کسی سفر کے متحمل نہیں تھے، اور اس حالت میں ان کا سفر کرنا بہت مشکل تھا، لیکن انہیں رمضان المبارک کے اس عمرے کے موقع کو چھوڑنا بھی گوارا نہیں تھا۔ ان کی علالت کی وجہ سے ان کے ساتھ ایک رفیقِ سفر کو بھی لانے کی دعوت دی گئی۔ حضرت والد صاحبؒ یوں تو اپنی علالت کی وجہ سے تمام سفر موقوف فرما چکے تھے، لیکن رمضان المبارک میں عمرے کے خیال سے آپ نے بھی جانے کا ارادہ فرمالیا، اور رفیقِ سفر کے طور پر برادر محترم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب کو ساتھ رکھنے کا ارادہ

کرلیا۔ اس طرح مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ کم از کم عمرے کی حد تک، یعنی عید تک، حضرت والد صاحبؒ کی رفاقت ان شاء اللہ تعالیٰ حاصل رہے گی۔ اُدھر ہمارے بڑے بھائی جناب محمد ولی رازی صاحب، حکیم مشرف حسین صاحبؒ اور میرے بچپن کے دوست جناب محمد کلیم صاحب بھی سفر میں ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ہم پانچ افراد کا قافلہ تیار ہوگیا، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے یہ بات طے ہوگئی کہ رمضان کے دوران میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ رہوں گا، اور ان کی واپسی کے بعد اُن کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا۔ اس طرح رمضان ۱۳۹۵ھ کی ۱۳ر تاریخ کو ہم سعودی ایئر لائن سے روانہ ہوئے۔ جہاز شام کے تقریباً پانچ بجے روانہ ہوا، اور نہ جانے اُس وقت ایئر لائنز کا نظام کیا تھا کہ جہاز کے اڑتے ہی جہاز کے میزبانوں نے کھانا پیش کردیا۔ ہمارا چونکہ روزہ تھا، اس لئے اُن سے معذرت کی، اور خیال یہ تھا کہ افطار کے وقت وہ کھانا دوبارہ پیش کریں گے، لیکن جب افطار کا وقت ہوا، تو جہاز دبئی اتر گیا، اور جہاز والوں نے چند کھجوریں دینے پر اکتفا کیا۔ دبئی کے ایئر پورٹ پر قیام مختصر تھا، وہاں سے روانہ ہوئے، تو جہاز والوں سے کھانے کے لئے عرض کیا، تو جواب یہ ملا کہ شام آپ کھانے سے انکار کرچکے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جہاز ریاض اترا، وہاں ایئر پورٹ میں داخل ہوئے، تو وہاں کچھ ایسی بدنظمی تھی کہ ہمیں کسی کرسی پر بیٹھنا بھی نصیب نہ ہوسکا، ایک کمرے والے دوسرے کمرے کی طرف اور دوسرے کمرے والے پہلے کی طرف جانے کا اشارہ کرتے رہے، ہم نے بمشکل حضرت والد صاحبؒ کو کہیں بٹھایا، اور خود ان کمروں کے درمیان چکر کاٹتے رہے، یہاں تک کہ جہاز دوبارہ روانہ ہونے کا وقت آگیا۔ دوبارہ جہاز میں بیٹھنے کے بعد بھی میزبانوں کی بے رخی برقرار رہی، یہاں تک کہ ہم جدہ اتر گئے۔ وہاں رابطۃ العالم الاسلامی کے نمائندوں نے استقبال کرکے ہمیں وی آئی پی روم میں بٹھادیا جو اُس وقت خالی پڑا تھا، سامان کے انتظار میں کافی وقت لگا، اور آخر میں پتہ چلا کہ حکیم مشرف صاحبؒ کا ایک سوٹ کیس نہیں آیا۔ شکایت درج کراکر جب مکہ مکرمہ پہنچے تو وہاں حرم شریف کے شمال مشرق میں باب العمرہ کے سامنے فندق مکہ میں قیام ہوا جو اُس وقت مکہ مکرمہ کا بہترین ہوٹل تھا، لیکن جب تک ہم اپنے کمروں تک پہنچے، اُس وقت دیکھا، تو سحری کا وقت ختم ہونے میں شاید دس پندرہ منٹ باقی تھے۔ جلدی سے بھاگ دوڑ کرکے ہوٹل کے مطعم میں پہنچے، تو وہاں کھانا ختم ہورہا تھا، بھوک اپنے شباب پر تھی، جلدی جلدی ڈبل روٹی، مکھن اور کسی بچی کھچی چیز سے سحری کی جو اُس وقت بہت غنیمت معلوم ہوئی، یہاں تک کہ وقت ختم ہوگیا، اذان کی دلکش آواز سنکر فوراً حرم کا رُخ کیا۔

ہوٹل اور حرم کے درمیان صرف ایک چھوٹی سی سڑک کا فاصلہ تھا، اس لئے اذان کے دوران ہی حرم پہنچ گئے۔ حضرت والد صاحبؒ کے بارے میں فکر یہ تھی کہ اتنے پُر مشقت سفر کے بعد ان کی کیا حالت ہوگی؟ اس لئے اُن سے گزارش کی تھی کہ وہ نماز کمرے ہی میں پڑھ کر آرام فرمالیں۔ ہم نے حرم شریف میں نماز ادا کی، تو دل کا تقاضا یہ ہوا کہ عمرہ فوراً کرلیا جائے، چنانچہ نماز کے بعد ہم نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عمرہ کیا۔ گرمی اپنے شباب پر تھی، اور سعی کے دوران ایسا معلوم ہورہا تھا کہ حلق بالکل خشک ہے۔ لیکن رمضان کے عمرے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔

عمرہ کرکے واپس آئے تو حضرت والد صاحبؒ عمرے کے لئے تیار تھے۔ میں، حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم اور کلیم صاحب انہیں عمرہ کرانے کے لئے لے گئے۔ بیماری کی حالت میں توقع یہ تھی کہ وہ پیدل طواف نہیں کرسکیں گے، چنانچہ ہم نے اصرار کیا کہ وہ سواری پر طواف کریں، لیکن وہ نہ مانے، اور پیدل طواف شروع کردیا، اور پیدل ہی مکمل کیا، البتہ سعی کے لئے کرسی استعمال فرمائی۔ واپس آئے تو جمعہ کا وقت قریب تھا۔ جمعہ حرم میں ادا کرکے کچھ آرام کیا۔ حرم میں افطار کرنے کا پہلا موقع تھا۔ حرم کی ترکی عمارت کے سامنے صحن میں کنکریوں کا فرش ہوتا تھا۔ وہیں ہم سب بیٹھ گئے۔ کولروں کا رواج نہیں ہوا تھا، مٹی کی چھوٹی چھوٹی صراحیوں میں زمزم بھر کر لائے، ان صراحیوں کی خاصیت یہ ہوتی تھی کہ موسم جتنا گرم اور خشک ہو، اور جتنی لُو چلتی ہو، صراحیوں میں پانی اتنا ہی ٹھنڈا ہوتا تھا۔ شدید گرمی کے عالم میں جب اذان ہوئی، اور توپ کی آواز آئی، تو ایسا لگا جیسے صراحیوں کے اس ٹھنڈے پانی نے جسم وجان میں نئی زندگی پھونک دی ہو۔

"مؤتمر رسالۃ المسجد" غزہ سے آگے ایک پرانے شاہی محل میں منعقد ہورہی تھی جس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ بانیٔ سعودی حکومت شاہ عبدالعزیز بن سعود رحمۃ اللہ علیہ کا محل تھا۔ دنیائے اسلام کے مختلف خطوں سے بڑے بڑے علماء اور خطباء اُس میں فصاحت وبلاغت کے جوہر دکھا رہے تھے۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے بھی ایک مقالہ پیش ہونا تھا لیکن وہ علالت کی وجہ سے اس مشقت کے متحمل نہیں تھے، انہوں نے مجھے حکم دیا کہ کچھ لکھ کر پیش کروں، چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ مقالہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عربی مقالات کے مجموعے میں شائع ہوچکا ہے۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد بھی چند روز مکہ مکرمہ میں قیام کی سعادت حاصل ہوئی، اور حضرت والد

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت میں یہ قیام بہت یادگار رہا۔ ان کی طبیعت میں نشیب و فراز آتے رہے، لیکن ان کے طواف کے شوق میں کمی نہیں آئی، اور روزانہ وہ کسی نہ کسی وقت ہم میں سے کسی کے ساتھ حرم شریف جاکر طواف فرماتے رہے۔

اُس کے بعد مدینہ منورہ حاضری ہوئی۔ وہاں اُس وقت سب سے اچھا ہوٹل حرم کے شمال مشرق میں فندق التیسیر ہوا کرتا تھا۔ (غالباً اب وہ حرم کے اندر شامل ہوگیا ہے) وہاں قیام رہا۔ رمضان کے عشرۂ اخیرہ کے ایام وہاں نصیب ہوئے۔ ۲۸ر رمضان کو وہاں سے جدہ واپس آئے۔ اور جدہ کے مطار قدیم کے قریب ایک ہوٹل "فندق الریاض" میں قیام ہوا۔ اگلا دن گذار کر رات گیارہ بجے یہاں سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کراچی کے لئے سیٹ بک تھی۔ حضرت مفتی محمد رفیع صاحب اور بڑے بھائی مولانا محمد ولی رازی صاحب کو ان کے ساتھ واپس جانا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش تھی کہ اس دوران ایک عمرہ اور کرلیں، لیکن مسلسل سفر کی وجہ سے بہت تھک چکے تھے، اس لئے ہم نے درخواست کی کہ اب یہاں آرام فرمائیں۔ مجھے چونکہ ابھی حجاز میں عید کے بعد تک رکنا تھا، اس لئے میں ان کے پاس ہوٹل میں ٹھہر گیا، اور باقی سب رفقاء عمرے کے لئے چلے گئے۔ رات کے وقت حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی آنکھ لگ گئی تھی جس سے طبیعت میں بفضلہ تعالیٰ افاقہ ہوا، اگلا سارا دن میں نے انہی کے پاس گذارا۔ یہاں تک کہ شام کو رفقاء عمرہ کرکے واپس آگئے، اور رات کو روانگی کا وقت آگیا۔ میری طبیعت پر اُس وقت حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ سے جدائی کا بہت اثر تھا، کیونکہ عید کے چند دن بعد مجھے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ افریقہ جانا تھا، اور اندازہ نہیں تھا کہ وہاں سے کب واپس آسکوں گا۔ ان کی علالت کی حالت میں اتنی طویل جدائی کا تصور پہاڑ معلوم ہو رہا تھا۔ میں انہیں پہنچانے کے لئے ہوائی اڈے تک گیا، یہاں تک کہ وہ حد آگئی جس سے آگے میں نہیں جاسکتا تھا۔ میرے چہرے پر اُداسی کے آثار تھے۔ حضرت والد صاحبؒ اپنے کسی عزیز یا دوست کو سفر کے لئے رخصت کرتے وقت آیۃ الکرسی پڑھ کر دم کیا کرتے تھے، اور وہ اپنی اولاد سے بہت محبت فرماتے تھے، لیکن اس کے اظہار کے لئے عادت لاڈ پیار کی نہیں تھی، مگر اُس وقت انہوں نے مجھے رخصت کرتے ہوئے دعا پڑھی، اور بیساختہ میری پیشانی پر پیار کیا جس کی حلاوت کبھی بھولتی نہیں ہے۔ پیار کرکے وہ اندر تشریف لے گئے، اور میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم اور میرے دوست کلیم صاحب کا ارادہ یہ تھا کہ وہ میرے ساتھ ایک دن مزید گذار کر عید یہاں کریں، اور عید ہی کی

شام کو واپس جائیں۔ چنانچہ ہم تینوں حضرت والد صاحبؒ کو رخصت کر کے رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے کے قریب مطار سے نکلے۔ ابتک ہمارا قیام ہوٹلوں میں تھا، لیکن آج کے بعد ہمیں مکہ مکرمہ پہنچ کر مدرسہ صولتیہ کے ایک حجرے میں ٹھہرنا تھا جس کی چابی کلیم صاحب کے پاس تھی۔ اُس رات چاند نہیں ہوا تھا، اس لئے اگلے دن روزہ تھا۔ ہم وہاں سے بسوں کے اُس اڈے پر پہنچے جہاں سے ویگنیں مکہ مکرمہ لیجاتی تھیں، اور ایک ویگن میں سوار ہوگئے، جب ویگن بحرہ نامی بستی کے اسٹاپ پر پہنچی جو مکہ مکرمہ کے تقریباً آدھے راستے پر ہے، تو اُس وقت اچانک کلیم صاحب کو دیکھا کہ وہ شدید گھبراہٹ اور بے چینی محسوس کر رہے ہیں۔ شروع میں وہ کچھ اس لئے نہیں بتا رہے تھے کہ شاید ہم انہیں الزام دیں، لیکن جب ہم نے اصرار کیا تو انہوں نے بتایا کہ جس حجرے میں جا کر ٹھہرنا ہے، اُس کی چابی وہ فندق الریاض جدہ میں چھوڑ آئے ہیں۔ ایک بجلی سی گری کہ اب مکہ مکرمہ پہنچ بھی گئے تو کمرہ میسر نہیں آسکے گا، اور رات کے وقت وہاں کے کسی منتظم کو جگانا بھی مناسب نہیں، اور یہ بھی یقین نہیں کہ ان کے پاس کوئی دوسری چابی ہوگی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ آدھا راستہ طے کرنے کے بعد ویگن سے اتریں، اور کسی اور ویگن سے واپس پہلے اڈے، اور پھر ہوٹل جا کر وہاں سے چابی لیں، پھر اڈے پر جا کر دوسری ویگن سے مکہ مکرمہ پہنچیں۔ چنانچہ ناچار ایسا ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ ہوٹل سے چابی مل گئی۔ اور ہم دوبارہ ویگن میں سوار ہو کر مکہ مکرمہ کے لئے روانہ ہوگئے۔ کئی راتوں سے ہماری نیند بہت کم ہو رہی تھی، ویگن چلی تو ہوا میں بھی کچھ ٹھنڈک آگئی تھی، ہوا کے جھونکوں نے تینوں کو گہری نیند سلا دیا۔ اور آنکھ اُس وقت کھلی جب ویگن حرم کے باب ابراہیم کے سامنے پہنچ چکی تھی، اور حرم سے اذان کی دلکش آواز بلند ہو رہی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ سحری کا وقت گذر گیا، خشک حلق میں پانی ڈالنے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔ اور اس طرح رمضان کا آخری روزہ شروع ہوگیا۔ ابتک جن ہوٹلوں میں قیام رہا، وہ سب ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ مگر اب مدرسہ صولتیہ کے ایک پرانے کمرے میں جس کا ایک حصہ اناج سے بھرا ہوا تھا، ہمارا قیام ہوا، اس میں پنکھا ضرور تھا، مگر دن میں گرم ہوا پھینکتا تھا۔ غرض وہ آخری روزہ وہاں رکھ کر حسب معمول حرم شریف میں پر کیف افطار کیا، اور اُس کے بعد حجرے میں آگئے۔ عشاء کے بعد کھانا حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ کی شفقتوں میں کھایا۔ اور پتہ چلا کہ عید کی نماز حرم میں پڑھنی ہے، تو رات کو تین بجے سے حرم جانا ہوگا۔

مکہ مکرمہ میں عید

چنانچہ تین بجے باہر نکلے تو سڑکوں پر جوق در جوق لوگوں کے قافلے حرم کا رخ کر رہے تھے، ہمیں الحمد للہ

صحن میں جگہ مل گئی، رات کا بقیہ حصہ گذرا، فجر کی نماز ہوئی، اور اُس کے بعد سے اشراق تک مکبرہ سے تکبیریں لاؤڈ اسپیکر پر کہی جاتی رہیں، حاضرین بھی تکبیر کہتے رہے۔ بلکہ ہمارے پیچھے کی صفوں میں بیٹھے ہوئے ایک عرب بزرگ نے کھڑے ہوکر اس طرح بلند آواز سے اجتماعی تکبیروں پر اعتراض کیا، اور کہا: "هذه بدعة شنيعة منكرة "یعنی یہ ایک بہت بری بدعت ہے۔ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے علم میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام سے عید کے موقع پر اس طرح بلند آواز سے اجتماعی تکبیریں ثابت نہیں ہیں۔ (حالانکہ بعض روایات سے اس کا ثبوت بھی ملتا ہے) بہرکیف! عید کی نماز بڑی شان وشوکت کے ساتھ ہوئی۔ نماز کے بعد مجمع چھٹنا شروع ہوا، اور ہم مدرسہ صولتیہ واپس آگئے۔ عصر کے بعد حکیم مشرف حسین صاحب مرحوم اور کلیم صاحب کو پاکستان واپسی کے لئے جدہ جانا تھا۔ میں انہیں پہنچانے کے لئے بس اسٹاپ تک گیا۔ وہ روانہ ہوگئے۔ میں سترہ دن ان حضرات کی بھرپور رفاقت کے بعد تنہا رہ گیا تھا، اس کا طبیعت پر اثر بھی تھا جسے حرم شریف حاضر ہوکر دور کیا۔ پھر مجھے یہ عجیب منظر نظر آیا کہ عید ہوتے ہی پورا شہر بالکل سنسان ہوگیا۔ سارے بازار، یہاں تک کہ ہوٹل اور قہوہ خانے جو رمضان میں چوبیس گھنٹے چہل پہل سے بھرپور نظر آتے رہتے تھے، مکمل طور پر بند اور خاموش تھے۔

عید کا دوسرا دن آیا، تو خیال آیا کہ آج پاکستان میں عید ہوگی۔ میں صبح کا وقت حرم شریف میں گذار کر مدرسہ صولتیہ کے حجرے میں واپس آیا، تو وہاں بھی میں اکیلا تھا۔ والدین اور بہن بھائیوں کے بغیر عید گذارنے کا یہ پہلا موقع تھا، اور حضرت والد صاحبؒ کی صحت کی وجہ سے تشویش بھی۔ ابھی تک ان کے بخیریت پہنچنے کی خبر بھی نہیں ملی تھی۔ ان باتوں کا طبیعت پر اثر تھا، اسی حالت میں جب میں حجرے میں تنہا تھا، اچانک حجرے سے باہر حضرت مولانا محمد سلیم صاحبؒ کے صاحب زادے مولانا محمد شمیم صاحبؒ کی آواز آئی: "بھائی تقی! کراچی سے فون ہے" اُس زمانے میں دوملکوں کے درمیان فون کرنا اتنا آسان نہیں تھا، میں خوشی اور تشویش کے ملے جلے جذبات کے ساتھ ان کے دفتر میں پہنچا، اور فون اٹھایا، تو دوسری طرف بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع صاحب تھے، اور انہوں نے حضرت والد صاحبؒ سے میری بات کرائی۔ معلوم ہوا کہ الحمدللہ وہ خیریت سے پہنچ گئے ہیں، اور بخیریت ہیں، اُس گفتگو کی مسرت اور حلاوت آج تک یاد ہے۔

حضرت مولانا محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ جن کے ساتھ مجھے افریقہ جانا تھا، ابھی مدینہ منورہ میں تھے، اور اطلاع یہ تھی کہ وہ شوال کی ۵/تاریخ تک یہاں تشریف لائیں گے، اُس کے بعد سفر شروع ہوگا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ عید کے بعد کے یہ پانچ دن مجھے یہیں گذارنے تھے۔ الحمدللہ، اُس وقت حرم شریف کا ہجوم ختم ہو چکا تھا، اس لئے اطمینان کے ساتھ طواف اور مقامات مقدسہ پر حاضری کے بہترین مواقع میسر آئے جس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کروں، کم ہے۔ البتہ حرم شریف کے باہر سناٹے کا وہی عالم پانچ دن تک رہا، اللہ تبارک وتعالیٰ حضرت مولانا محمد سلیم صاحب اور حضرت مولانا محمد شمیم صاحب کو جنت میں اعلیٰ درجات عطا فرمائیں، انہوں نے اپنی شفقتوں سے نہال کئے رکھا، یہاں تک کہ حضرت بنوریؒ تشریف لے آئے، ان کے ساتھ حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب مدظلہم بھی تھے، اور پھر ان کی پُر لطف رفاقت میں سفر شروع ہوا۔ پہلے ایک یا دو رات جدہ میں قیام رہا، اُس کے بعد ہم نیروبی کے لئے روانہ ہوگئے جو افریقہ کے سفر کی پہلی منزل تھی۔

نیروبی کا سفر

نیروبی کا موسم نہایت خوشگوار اور ٹھنڈا تھا۔ میں اس شہر میں پہلی بار آیا تھا، اور یہاں کے سرسبز مناظر اور دلکش موسم کا بھی پہلی بار تجربہ ہوا۔ چونکہ یہ شہر خط استوا کے بالکل قریب واقع ہے، اس لئے یہاں بارہ مہینے اوقات نماز ایک جیسے رہتے ہیں، اور اگرچہ استوائی ممالک میں قدرے گرمی ہوا کرتی ہے، لیکن سطح مرتفع پر ہونے کی وجہ سے یہاں عموماً خوشگوار ٹھنڈ رہتی ہے۔ یہاں حضرت بنوریؒ کے شاگرد مولانا مطیع الرسول صاحب نے رہائش کا انتظام ایک مقامی تاجر کے ایک پُرفضا بنگلے پر کیا ہوا تھا، جن کے بارے میں اتنی بات یاد رہ گئی ہے کہ انہیں آغا صاحب کہا جاتا تھا، اور غالباً وہ اصلاً افغانستان کے باشندے تھے۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اللہ تعالیٰ نے بارہا عطا فرمائی تھی، اور مجھ پر ان کی شفقتوں کا بلا استحقاق مظاہرہ ہمیشہ ہوتا تھا، لیکن حضرتؒ سے براہ راست کچھ پڑھ کر تلمذ کا شرف حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ میں نے اس سفر میں یہ شرف حاصل کرنے کے لئے مکہ مکرمہ سے اصول حدیث پر حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اپنے ساتھ رکھ لی تھی، تاکہ وہ حضرتؒ سے پڑھوں۔ چنانچہ حضرتؒ سے درخواست کی تو انہوں نے قبول فرمایا، اور فجر کے بعد پڑھنے کے لئے فرمایا، اور طریقہ یہ تجویز کیا کہ تم عبارت پڑھتے جاؤ، جہاں مجھے کچھ کہنا ہوگا، کہدونگا۔ چنانچہ نیروبی کے قیام میں فجر کے بعد یہ سلسلہ شروع ہوگیا۔ جناب ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب بھی ساتھ ہوتے تھے۔

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ بڑے شگفتہ مزاج بزرگ تھے، اور سیاحت کا بھی ذوق رکھتے تھے، اور میرے

شوق سیاحت کا بھی انہیں اندازہ تھا، اس لئے اسی قیام کے دوران وہ مولانا مطیع الرسول کی رہنمائی میں نیروبی کے کچھ سیاحتی مقامات پر بھی لے گئے۔ کھلے جانوروں کے باغ میں بن مانس کی پہلی بار اُسی وقت "زیارت" ہوئی۔ وہیں پر افریقہ کے ایک جنگلی قبیلے کی ایک عورت نظر آئی جس کے بارے میں مقامی حضرات نے بتایا کہ یہ جنگلی قبیلہ اصل میں آدم خور قبیلہ ہوتا ہے، لیکن جب ان کے لوگ شہر میں آجاتے ہیں، تو رفتہ رفتہ وہ متمدن ہونے لگتے ہیں۔ اسی قیام میں نیروبی شہر سے باہر نکل کر ہم ٹھیک خط استوا کی لکیر تک بھی گئے جو سرسبز پہاڑوں اور وادیوں سے گذرتی تھی۔

جمعہ کا دن آیا، تو نیروبی کی مرکزی مسجد میں حضرت بنوری قدس سرہ کا بیان تھا، اور پھر انگریزی میں میری تقریر ہوئی جو غالباً حضرتؒ ہی کے بیان کا خلاصہ تھی۔ اس کے بعد افریقہ کے مختلف علاقوں میں کام کرنے کے لئے پروگرام بنایا گیا۔ اس کے لئے نیروبی ہی سے افریقہ کے مزید مقامات کا ٹکٹ بنوانا تھا، چنانچہ مولانا مطیع الرسول صاحب کی معرفت ایک ٹریول ایجنسی سے تنزانیہ سے لیکر نائیجیریا تک مختلف ملکوں کے ٹکٹ بنوانے کی کارروائی شروع ہوگئی۔

حضرت والد صاحبؒ کی علالت کی وجہ سے مجھے ہر وقت ایک فکر لگی رہتی تھی، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ اسے محسوس فرماتے رہتے تھے، میری بھوک بھی اس فکر کی وجہ سے اُڑی ہوئی تھی، لیکن نیروبی کے خوشگوار موسم اور آب وہوا کا کچھ اثر یہ ہوا کہ ایک دوپہر کے کھانے پر میں نے رغبت سے کھانا کھایا، حضرت بنوریؒ نے بعد میں مجھ سے فرمایا کہ آج مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تم رغبت سے کھانا کھارہے ہو۔ حضرتؒ کی یہ بات سنکر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے ایک ادنیٰ خادم سے بیٹے کی طرح محبت فرماتے اور اُس کی ان باریک باتوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

ایک صبح ناشتے کے بعد اچانک پیغام ملا کہ مولانا مطیع الرسول صاحب کے دفتر میں کراچی سے میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی کا فون آیا تھا کہ انہیں فون کرلیا جائے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ حضرت والد صاحبؒ کے بارے میں کوئی خبر نہ ہو۔ میں گرتا پڑتا ایک ایسے دفتر پہنچا جہاں سے فون کیا جاسکتا تھا۔ الحمدللہ ٹرنک کال بک کرانے پر فون فوراً مل گیا۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ حضرت والد صاحبؒ کو دوبارہ دل کا حملہ ہوا ہے، اور انہیں اسی ہسپتال میں داخل کردیا گیا ہے جہاں وہ پہلے زیر علاج رہے تھے۔ اب میں بڑی کشمکش میں پڑگیا۔ ایک طرف دل کا یہ شدید تقاضا کہ کسی طرح جلد از جلد حضرت والد صاحبؒ کے پاس

پہنچوں، اور دوسری طرف جس کام کے لئے یہ سفر اختیار کیا تھا، اس کی ابھی بالکل شروعات تھیں، اور میں حضرت بنوری قدس سرہ سے پورے سفر میں ساتھ رہنے کا وعدہ کر چکا تھا، اس لئے اُن سے واپسی کی بات کرتے ہوئے بھی شرم آتی تھی۔ لیکن حضرتؒ کو پوری بات بتانا بھی ضروری تھا۔ انہیں حضرت والد صاحبؒ سے بڑی محبت تھی، اس لئے انہوں نے فون کی بات سنتے ہی فرمایا کہ تم جلد از جلد کراچی چلے جاؤ، اور کچھ اس مضمون کی بات ارشاد فرمائی کہ مجھے معلوم ہے کہ حضرت مفتی صاحب کو تم سے اور تمہیں اُن سے عشق ہے، اس لئے مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ تمہارے جانے سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑے گا، ان کی زندگی بڑی قیمتی ہے، اس لئے تم سفر بیچ میں چھوڑنے کی فکر نہ کرو۔ حضرتؒ کی یہ بات سنکر مجھے اطمینان ہوا، لیکن پتہ نہیں تھا کہ کراچی جانے کے لئے کوئی جہاز کب مل سکے گا، کیونکہ نیروبی سے روزانہ پروازیں نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم تھا کہ معلوم ہوا ایک جہاز آج شام ہی کو کراچی جا رہا ہے۔ الحمدللہ سیٹ بھی مل گئی۔ ایک بہت بڑا مرحلہ زرد بخار کے ٹیکے کا تھا۔ اس کے لئے بڑی لمبی کارروائی کرنی پڑتی تھی، ورنہ ایئرپورٹ پر قرنطینہ میں کئی دن گذارنے پڑتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مولانا مطیع الرسول صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائیں، انہوں نے سارے مراحل اپنے خصوصی تعلقات استعمال کر کے شام تک طے کرا دیئے، اور میں رات کے وقت کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔ راستے بھر دعائیں کرتے ہوئے کراچی پہنچا، اور سیدھا ہسپتال چلا گیا۔ حضرت والد صاحبؒ دیکھ کر باغ باغ ہوگئے۔ الحمدللہ وہ دل کے حملے سے نکل کر روبہ صحت تھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا میں جنت مل گئی۔ الحمدللہ اس مرتبہ نسبۃً کم دن انہیں ہسپتال میں رہنا پڑا، اور وہ جلد ہی گھر تشریف لے آئے۔ لیکن اب ان کی زندگی اپنے کمرے اور بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ اسی بستر علالت پر انہوں نے دارالعلوم کے انتظام سے لیکر فتویٰ نویسی، معارف القرآن کی تالیف اور دوسری تصنیفی مصروفیات کا سلسلہ جاری رکھا۔

جاری ہے.....

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اڑتیسویں قسط)

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر دل کا پہلا حملہ ربیع الثانی ۱۳۹۲ھ مطابق ۸ رجون ۱۹۷۲ء کو ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کی کمزوری بڑھتی چلی گئی، شروع میں انہیں تفسیر معارف القرآن کو مکمل کرنے کی آرزو تھی وہ بستر ہی پر رہ کر تفسیر لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ اتوار کی مجلس بھی وہیں ہو جاتی تھی، اور حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ان دنوں دارالعلوم کے ناظم اعلیٰ تھے، روزانہ ظہر سے پہلے کچھ دیر حضرتؒ کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر دارالعلوم کے اہم معاملات انہیں بتا کر ان کی رہنمائی لے لیا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دارالافتاء سنبھالا ہوا تھا، اور وہ بھی کبھی کبھی کسی فتوے کے بارے میں مشورہ کرنے کے لئے تشریف لے آتے تھے، اور میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے برابر والے کمرے میں دفتر بنا کر حضرتؒ کے بے نام سیکریٹری کے فرائض انجام دیتا رہتا تھا۔ حضرتؒ کو وقفے وقفے سے دل پر دباؤ کی سی کیفیت رہتی تھی جس کی اُداسی چہرہ مبارک پر صاف دیکھی جاسکتی تھی۔ ایسے مواقع پر کچھ گھریلو ٹوٹکے استعمال کر لئے جاتے تھے۔ حضرتؒ کروٹ سے لیٹ جاتے، اور میں یا بھائی رفیع صاحب مدظلہم ان کی ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف ہلکے ہلکے دباتے تو اُس سے انہیں قدرے سکون ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن یہ کیفیت بڑھتی چلی گئی، اور چہرے پر اداسی میں اضافہ ہوتا چلا گیا، یہاں تک کہ ایک دن فرمایا کہ اب میرے دل میں کوئی خواہش باقی نہیں رہی، یہاں تک کہ پہلے معارف القرآن کی تکمیل کی بھی جو خواہش تھی، اب وہ بھی نہیں ہے۔ جتنا اللہ تعالیٰ کرا دیں گے، میں اُس پر راضی ہوں، اور یہ آیت بھی بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ:

(مَا عِندَكُمْ يَنفَدُ وَمَا عِندَ اللَّهِ بَاقٍ) (النحل: ۹۶)

اس کے باوجود حضرتؒ نے تفسیر کا کام جاری رکھا ہوا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے وہ ۲۱ رشعبان ۱۳۹۲ھ میں مکمل ہوگیا۔ اتنی بڑی آٹھ جلدوں کی تفسیر کی طباعت کے لئے اس زمانے میں بڑے مالی وسائل درکار تھے جو شروع میں مہیا نہیں تھے، لیکن جنوبی افریقہ میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک معتقد جناب حاجی عبدالحی وراچھیہ رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی جلد کی طباعت کے اخراجات اپنے ذمے لئے تھے۔ پھر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ انتظام فرمایا تھا کہ پہلی جلد کی فروخت میرے بڑے بھائی حضرت محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے ان کے دارالاشاعت سے کروائی، اور فروخت کی پوری رقم اگلی جلدوں کی طباعت کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھی، اور اس سے دوسری جلد چھپوائی۔ شروع میں اس کے حساب وکتاب کا کام بھی خود ہی فرماتے رہے۔ بعد میں یہ کام مجھے سپرد فرما دیا تھا۔ جتنی رقم ایک جلد کی فروخت سے حاصل ہوتی، اس کا پورا حساب میں رکھتا تھا، اور اگلی جلد کی طباعت کا خرچ اسی آمدنی سے پورا کرتا تھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے آٹھوں جلدوں کی طباعت کا انتظام فرما دیا۔

معارف القرآن کی تکمیل کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ان پرانی تالیفات کو مرکز توجہ بنایا جو کسی وقت شروع کی تھیں، اور نامکمل رہ گئی تھیں، چنانچہ ۱۳۹۲ھ کے اختتام کے بعد سے ۱۳۹۵ھ کے عمرے کے سفر تک ایسی بہت سی تالیفات کو مکمل فرما لیا تھا۔

دل کا یہ دوسرا دورہ جو میرے سفر نیروبی کے دوران ہوا تھا اور جس کا پورا واقعہ میں نے اوپر لکھا ہے، اس کے بعد حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی صحت مزید گرتی چلی گئی۔ اب زیادہ تر انتظامی کام میرے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب مدظلہم، حضرت مولانا قاری رعایت اللہ صاحب اور حضرت مولانا سبحان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہما کے سپرد کردئے تھے، اور ان کے انداز سے یوں لگتا تھا جیسے وہ اب اللہ تعالیٰ کے حضور جانے کے لئے اس طرح تیار بیٹھے ہیں جیسے کوئی مسافر ٹرین آنے کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے۔ ساری زندگی تحریر وتصنیف میں گذری تھی، اور میری والدہ مرحومہ نے، جو بذات خود بیمار تھیں، انہیں ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے ہوئے دیکھا تھا، اور جب وہ انہیں قلم کے بغیر دیکھتیں، تو ایسا لگتا تھا جیسے ان کے دل پر چوٹ لگ رہی ہو، وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہتیں: "کچھ لکھ لو"، اور اس کے جواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر ایک اداس مسکراہٹ آجاتی۔ البتہ فتاویٰ پر نظر ثانی کا کام آخر تک جاری رکھا، نیز

اتوار کی مجلس بھی اس طرح جاری رکھی کہ حضرت مولانا مفتی عبدالرؤوف صاحب مدظلہم حضرت حکیم الامتؒ کے ملفوظات پڑھکر سُناتے تھے، اور حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہیں کہیں کچھ تشریح فرمادیتے تھے۔

وفات سے پہلے اتوار کو جو آخری مجلس ہوئی، اُس میں پہنچنے میں مجھے کچھ دیر ہوگئی، کمرہ اس وقت بھر چکا تھا، اور میں آخری صف میں کچھ جگہ بنا کر بیٹھنا چاہ رہا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے دیکھا، تو فرمایا: " یہاں میرے پاس چارپائی پر آجاؤ "۔ مجھے کچھ تردد ہونے لگا، تو فرمایا: " آجاؤ، پھر میں تمہیں ایک واقعہ سُناؤں گا "۔ تعمیلِ حکم کے لئے میں آگے بڑھکر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گیا۔ اُس وقت فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے ساتھ بھی یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں کچھ دیر سے پہنچا تھا، اور کسی پچھلی صف میں بیٹھنے لگا تھا، تو حضرتؒ نے مجھے اپنے قریب (شاید تخت یا چارپائی پر) بٹھانے کے لئے بلایا، مجھے تردد ہوا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ " آجاؤ، میں تمہیں ایک واقعہ سناؤنگا۔ چنانچہ میں نے حکم کی تعمیل کی اور حضرتؒ کے پاس جاکر بیٹھ گیا۔ اس پر حضرت نے یہ واقعہ سُنایا کہ شاہ جہاں کی وفات کے بعد مسئلہ یہ تھا کہ اس کے دو بیٹوں اورنگ زیب عالمگیر اور داراشکوہ میں سے کون اس کا جانشین بادشاہ بنے۔ اُس زمانے میں ایک بڑے صوفی بزرگ تھے (جن کا نام مجھے اب یاد نہیں آرہا) دونوں ان کی خدمت میں دعا کرانے گئے۔ پہلے داراشکوہ پہنچے تو بزرگ نے انہیں اپنے پاس تخت پر بیٹھنے کے لئے کہا، لیکن داراشکوہ نے عذر کردیا کہ میں آپ کے پاس بیٹھنے کے لائق نہیں ہوں۔ بعد میں اورنگ زیب عالمگیرؒ گئے، ان کو بھی بزرگ نے اپنے پاس تخت پر بیٹھنے کو کہا تو وہ کسی تامل کے بغیر ان کے پاس تخت پر جا بیٹھے۔ اس پر ان بزرگ نے کہا کہ ان دونوں نے خود ہی اپنے تخت پر بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ بعد میں ایسا ہی ہوا کہ تختِ شاہی اورنگ زیب عالمگیرؒ ہی کو ملا۔

بہر حال! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ انتظارِ وصال میں دن گذارتے رہے۔ ایک دن ایسا بھی ہوا کہ ایک صاحب بیمار پُرسی کے لئے آئے، اور انہوں نے شفاء کامل کی دعا کی۔ وہ چلے گئے تو بیساختہ آنسو آگئے، اور یہ شعر پڑھنے لگے:

وہ لوگ جو میرے لئے خواہاں ہیں شفا کے

وہ کوس رہے ہیں مجھے پردے میں دعا کے

اسی دوران رمضان آگیا، اور رمضان میں آپ کی طبیعت معمول سے زیادہ خراب رہی، بار بار دل پر

دباؤ ہوتا، اور اداسی مزید بڑھ جاتی۔ عید آئی، تو ایک روز فرمانے لگے:" میرا حال بھی عجیب ہے۔ رمضان المبارک میں کبھی دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ وقت تو قریب نظر آرہا ہے، میری وفات رمضان میں ہوجائے، تو اچھا ہو، لیکن میں یہ دعا بھی نہ کرسکا، کیونکہ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر میری وفات رمضان میں ہوئی، تو میرے گھر والوں اور احباب کو روزے کی حالت میں صدمے کے علاوہ تجہیز وتکفین کی مشقت اٹھانی پڑے گی، پھر یہ شعر پڑھا:

تمام عمر اسی احتیاط میں گذری
کہ آشیاں کسی شاخِ چمن پہ بار نہ ہو

آخر رمضان المبارک کے ٹھیک دس دن بعد وقتِ موعود آ پہنچا۔ صبح کو ایک فتویٰ لکھا، اور اُسکے فوراً بعد دل کا شدید دورہ ہوا، اور اسی رات جو ۱۱ر شوال ۱۳۹۶ھ کی رات تھی، اچانک بجلی کے جانے سے پورے ماحول پر اندھیرا چھا گیا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معالج ڈاکٹر اسلم صاحب نے ہسپتال لے جانے کا اصرار کیا، وہ شروع میں راضی نہ تھے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے اصرار پر راضی ہوگئے۔ ڈاکٹر صاحب ہمیں پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ حالت تشویشناک ہے، غرض اسی حالت میں ہسپتال لے جایا گیا، اور وہیں پر جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مجھے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں جب ان کی وفات کا تصور آتا تھا، تو ایسا لگتا تھا کہ میں اس صدمے کو برداشت نہیں کرسکوں گا۔ لیکن جب یہ وقت آگیا، تو ایسا معلوم ہوا کہ آنسو خشک ہوگئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم چار بھائیوں، تین بہنوں اور والدہ مرحومہ کو ہمت عطا فرمائی، اور زندگی کا یہ سب سے بڑا سانحہ بھی گذر گیا۔ رحمه الله تعالیٰ رحمةً واسعة واسكنه جنات النعيم في مقعد صدق۔

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں میں نے البلاغ کا مفتیٔ اعظم نمبر دو جلدوں میں شائع کیا جس میں حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہم نے "حیاتِ مفتیٔ اعظم" کے نام سے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مختصر سوانح لکھی، اور میں نے "میرے والد، میرے شیخ" کے عنوان سے ان کے مزاج ومذاق پر مفصل مضمون لکھا ہے، یہ دونوں کتابیں الگ بھی شائع ہوگئی ہیں۔ نیز اس نمبر میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس وقت کے مشاہیر اہل علم کے انتہائی مفید مضامین شامل ہیں۔

مکہ مکرمہ کی تعلیمی کانفرنس

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت کے زمانے کی بات ہے۔ اب مجھے صحیح سن تو یاد نہیں رہا، لیکن شاید ۱۹۷۳ء ہوگا۔ جب حج کا موسم قریب آیا، تو مجھے کہیں سے حج بدل کی پیشکش ہوئی۔ ۱۹۶۴ء کے حج کے بعد سے مجھے حرمین شریفین حاضر ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس لئے دل للچایا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں، لیکن حضرت والد صاحبؒ کی علالت کی وجہ سے انہیں اس حالت میں چھوڑ کر جانے پر بھی دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ کسی طرح حضرت والد صاحبؒ کو علم ہوگیا۔ انہوں نے بھی دبے لفظوں میں جانے کی اجازت دیدی، لیکن سوچنے کے بعد دل نے یہی فیصلہ کیا کہ الحمدللہ فریضۂ حج ادا ہو چکا ہے۔ اس وقت نفلی حج کے لئے جانا مناسب نہیں۔ چنانچہ میں نے نہ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ حضرت والد صاحبؒ نے کسی موقع پر پوچھا کہ حج کا کیا ہوا؟ تو میرے منہ سے نکلا کہ "اباجی! ہمارا حج عمرہ تو یہیں ہے" حضرت والد صاحبؒ یہ جملہ سُن کر بہت خوش ہوئے، دعائیں دیں، اور کچھ اس طرح کی بات ارشاد فرمائی کہ ان شاء اللہ تعالیٰ تمہیں حرمین شریفین کی بہت حاضریاں نصیب ہوں گی۔ حضرت والد صاحبؒ کی دعاؤں کا ہی اثر ہے کہ الحمدللہ اُس کے بعد سے کوئی سال ایسا نہیں گیا جس میں ایک سے زائد مرتبہ حاضری نصیب نہ ہوئی ہو، بلکہ اب تو سالہا سال سے ایسا ہورہا ہے کہ ہر تیسرے چوتھے مہینے حاضری ہو جاتی ہے۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصے کے بعد اول تو خود حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ رمضان کا عمرہ کرنے کا موقع ملا جس کی تفصیل پیچھے عرض کر چکا ہوں۔ پھر حضرت والد صاحبؒ کی وفات کے چند ہی مہینوں کے بعد کراچی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ عربی میرے پاس آئے، اور انہوں نے کہا کہ ہم جدہ کی جامعۃ الملک عبدالعزیز کے ساتھ مل کر مکہ مکرمہ میں "اسلامی تعلیم" کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس منعقد کررہے ہیں۔ اُس میں پاکستان کے دینی مدارس کے نظام اور نصاب کے موضوع پر آپ ایک مقالہ لکھیں، اور اُس مقالے کے ساتھ کانفرنس میں شریک ہوں۔ چنانچہ میں نے "منهج التعليم الديني في باكستان" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھ کر کانفرنس میں بھیج دیا، جواب الگ شائع ہو چکا ہے، اور اُس میں نئے حالات کے تحت ترمیم واضافہ کے بعد وہ میرے عربی مقالات کے مجموعے "مقالات العثمانی" کا حصہ بن چکا ہے۔

جب کانفرنس کا وقت آیا، تو میرے بچپن کے دوست جناب محمد کلیم صاحب (مجاز بیعت حضرت عارفی قدس سرہ) نے بھی میرے ساتھ عمرے پر جانے کا ارادہ کرلیا، اور اپنے خرچ پر اس پورے سفر میں ساتھ

رہے۔ کانفرنس ۱۲ ربیع الثانی ۱۳۹۷ھ مطابق ۳۱/ مارچ ۱۹۷۷ء کو شروع ہوئی تھی، اس وقت ملک میں ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم کے خلاف ایک زبردست تحریک چل رہی تھی، جس کی وجہ سے ملک بدامنی کا بھی شکار تھا۔ اس لئے مجھے حکومت پاکستان سے اجازت لینے میں دیر ہوگئی، اور میں کانفرنس شروع ہونے کے دو دن بعد روانہ ہوسکا۔ اس وقت مکہ مکرمہ کے مضافاتی علاقے "ام الجود" میں انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل بڑی شان وشوکت کے ساتھ نیا نیا بنا تھا۔ کانفرنس اُسی میں ہوئی تھی، اور قیام کا انتظام بھی اُسی میں تھا۔ چنانچہ ہم وہاں پہنچے۔ میرے لئے کمرہ وہیں پر بک تھا۔ لیکن حرم سے دور ہونے کی بنا پر مجھے وہاں ٹھہرنا بہت بھاری معلوم ہوا۔ اس لئے میں نے منتظمین سے درخواست کرکے اپنا قیام وہاں سے فندق مکہ میں منتقل کرلیا۔ یہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی طرح شاندار تو نہیں تھا، لیکن حرم کے باب العمرہ کے بالکل سامنے واقع تھا، اور ۱۹۷۷ء کے رمضان میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ ہم نے اُسی میں قیام کیا تھا۔ چنانچہ دل کی مراد بر آئی، اور حرم کا قرب نصیب ہوگیا۔

کانفرنس کے اوقات میں ہم انٹر کانٹی نینٹل جاتے، اور باقی اوقات میں حرم شریف سے فیضیاب ہوتے رہے۔ میں حضرت والد صاحبؒ کے خادم کے طور پر تو بین الاقوامی کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہا تھا، لیکن کسی بین الاقوامی کانفرنس میں بحیثیت مندوب شریک ہونے کا یہ پہلا موقع تھا۔ البتہ خوش قسمتی یہ تھی کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کے نمایاں مندوبین میں شامل تھے، اور کانفرنس کے دوران ان کی صحبت سے فیضیاب ہونے کے مواقع میسر آتے رہے، اور حضرتؒ کی شفقتوں نے نہال کئے رکھا۔

اگرچہ یہ کانفرنس اس لحاظ سے کامیاب رہی کہ اس میں چالیس ملکوں کے تین سو تیرہ نمائندوں نے بڑی سلامت فکر کے ساتھ اسلامی ملکوں کے نظام تعلیم کے بارے میں مفصل بنیادی اصول مرتب کئے۔ میں نے اس کانفرنس کی پوری تفصیل اور اس پر تبصرہ البلاغ کے جمادی الثانیہ ۱۳۹۷ھ کے اداریے میں لکھا ہے، اور شاید میرے مضامین کے کسی زیر ترتیب مجموعے میں بھی شامل ہوجائے۔

لیکن اسی موقع پر حضرتؒ مولانا سید ابوالحسن علی الندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ مجھ سے تنہائی میں فرمایا کہ اس قسم کی بہت سی کانفرنسوں میں شرکت کے بعد میرا تجربہ یہ ہے کہ ان میں شرکت کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا۔ کام تو وہی ہے جو آپ تنہائی میں بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ آپ اپنے تصنیفی کام کی طرف زیادہ متوجہ رہئے، اور بے فائدہ کانفرنسوں میں شریک ہونے کو کم سے کم ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ اس کے بعد میں نے سیاسی اور عمومی

انداز کی کانفرنسوں سے احتراز ہی کی کوشش کی، اور اس طرح کی بیشتر کانفرنسوں میں شرکت سے معذرت ہی کرتا رہا، اور اگر کہیں شریک ہوا، تو کسی مجبوری یا کسی اور فائدے کی توقع کی وجہ سے شریک ہوا۔ البتہ فقہی انداز کی مجلسوں میں شرکت کا بہت موقع ملا، کیونکہ وہ اجتماعی فقہی مسائل میں اہل علم کے باہم مشورے کی ایک مفید صورت ہوتی ہے، اور ان سے معلومات میں اضافے کے ساتھ بہت سے فقہی مسائل منقح ہوئے، اس کی تھوڑی سی تفصیل ان شاء اللہ تعالیٰ میں حسب موقع ذکر کروں گا۔

اسی موقع پر حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے یہ بھی پوچھا کہ اجتماعی فقہی مسائل میں میں نے آپ کے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے نقطۂ نظر میں اعتدال کے ساتھ توسع محسوس کیا ہے، فقہ حنفی کے ساتھ دوسرے مذاہب سے استفادے کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ میں نے عرض کیا کہ اجتماعی ضرورت کے مواقع پر وہ ائمۂ اربعہ میں سے کسی سے استفادے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، البتہ ائمۂ اربعہ سے باہر جانے سے احتراز فرماتے تھے۔ اس پر فرمایا کہ میرے خیال میں ائمۂ اربعہ کے دائرے میں ہماری ہر اجتماعی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ باہر جانے کی ضرورت ہی نہیں۔

اس سفر کی یہ بات بھی مجھے یاد ہے کہ حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت دارالعلوم سے رخصت لیکر ہجرت کی نیت سے حجاز آچکے تھے، اور اُس وقت مکہ مکرمہ میں اس طرح مقیم تھے کہ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ وہ مجھ سے ملنے کے لئے فندق مکہ آئے۔ میں نے ان سے تنہائی میں پوچھا کہ آپ کے خرچ کا کیا انتظام ہے؟ اس پر انہوں نے مسکرا کر فرمایا کہ "میرا خرچ ہی کیا ہے؟ سارے دن میں ایک ریال" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہجرت مدینہ کی خاطر کس طرح زندگی گذار رہے تھے۔ ہوٹل میں میرے کمرے کے سامنے چائے کا انتظام تھا، میں نے ان کی خاطر کے طور پر انہیں چائے کی پیشکش کی، تو انہوں نے فرمایا: " یہاں کے مہمان آپ ہیں، اس لئے یہ چائے آپ کے لئے تو جائز ہے، میرے لئے جائز نہیں"۔ میں نے عرض کیا کہ "یہ چائے اسی لئے رکھی ہے کہ جب چاہیں، استعمال کریں، اور اس کے بارے میں عرف یہ ہے کہ مہمان کا مہمان بھی مہمان ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے یہ پیش کی ہے، ورنہ جن چیزوں میں عُرف نہیں ہے، ان میں میں یہ تصرف نہیں کرتا"۔ اس پر فرمایا کہ "اس تفصیلی توجیہ میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ میں چائے نہیں پیوں گا تو نقصان ہی کیا ہے"؟ ان کے اس تقویٰ کا دل پر بہت اثر ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں۔ وہ مذاق مذاق میں بھی بڑے افادات ارشاد فرماتے رہتے تھے۔

مکہ مکرمہ کے بعد چند دن مدینہ منورہ میں بھی بڑی عافیت کے گذرے، اور اس کے بعد گھر واپسی ہوئی۔

اعلاء السنن کی تھوڑی سی خدمت

حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "اعلاء السنن" کے نام سے ایک عظیم تالیفی منصوبہ شروع فرمایا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد ان احادیث کو جمع کر کے ان کی مفصل شرح کرنا تھا جو حنفی مسلک کی بنیاد ہیں۔ ابتداء میں یہ کام حضرت مولانا احمد حسن سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے فرمایا تھا۔ بعد میں یہ کام حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد فرمایا، اور انہوں نے یہ عظیم الشان کتاب جس عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ مرتب فرمائی، اس کی نظیر اس دور میں ملنی مشکل ہے، لیکن یہ کارنامہ مسودے کی شکل میں تھا، اور پہلی بار حضرت مولانا شبیر علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے وسائل کی کمی کی وجہ سے اُسے معمولی کاغذ پر کتابت وطباعت کے معمولی معیار کے ساتھ شائع کر دیا تھا، تا کہ وہ محفوظ ہو کر اہل علم کے پاس پہنچ جائے، اور جب کبھی اُسے اچھے معیار پر شائع کرنے کی نوبت آئے، تو اُس سے کام لیا جا سکے۔

جب حضرت مولانا نور احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اعلاء السنن کو کمپوزنگ کر کے اپنے ادارۃ القرآن سے شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا، تو حضرت مولانا ظفر احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اُس کی جلد اول پر نظر ثانی فرمائی، جس کی تفصیل میں نے اعلاء السنن کے مقدمے میں بیان کی ہے۔ اس موقع پر مجھے خیال آیا کہ اعلاء السنن میں جن کتابوں کے حوالے آئے ہیں، ان کے ایڈیشن بدل چکے ہیں، اور اب لوگوں کو ان کے حوالوں کی تلاش میں دشواری پیش آسکتی ہے، اس لئے نئی طباعت کے وقت میں حاشیے میں نئے ایڈیشنوں اور متعلقہ ابواب کے حوالے دیدوں، تو قارئین کو آسانی ہوگی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے نام پر میں نے یہ کام شروع کر دیا۔ اس کے لئے کتابوں کی مراجعت کی ضرورت تھی، اس لئے میں نے یہ کام دار العلوم کے کتب خانے میں بیٹھ کر شروع کیا جو اُس وقت انتہائی خستہ حالت میں تھا۔ شروع میں صرف اتنی بات پیش نظر تھی کہ حوالے نئے دیدیئے جائیں، لیکن جب کام شروع کیا، تو کچھ اور پہلو بھی سامنے آئے، مثلاً جن فقہی مسائل پر حضرت عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے گفتگو کی تھی، ان میں فقہاء کے مختلف مذاہب کا تذکرہ جہاں اصل کتاب میں نہیں تھا، وہاں مذاہب کی تھوڑی سی تفصیل بھی ذکر کر دی، اور بعض جگہ احادیث کی تخریج بھی۔

حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ اُس وقت ریاض میں تھے۔ انہوں نے اس پر بہت خوشی

کا اظہار فرمایا۔ پھر میں نے جلد اول کے کچھ فرمے حضرتؒ کی خدمت میں بھیجے، حضرتؒ اس وقت بیمار تھے، لیکن اسی بیماری کے دوران (صفر ۱۳۹۶ھ میں) میرے خط کے جواب میں سات صفحات کا ایک خط ارسال فرمایا جس میں کتاب کے انداز طباعت کے بارے میں مفصل ہدایات بھی تھیں، اور اعلاء السنن کی تقریظ ان سات صفحات کے علاوہ چار صفحات پر مشتمل تھی جو اعلاء السنن کے شروع میں شائع ہو چکی ہے۔ اس تقریظ کے بارے میں اس خط میں حضرتؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا، اُس سے اُن کی تواضع کے مقام بلند کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس خط کا یہ حصہ میں یہاں نقل کرتا ہوں:

" اخی الأعزّ :ما أزال فی أعقاب المرض والحمد لله، وكاد يزول عنّی وقبل زواله خلفه زكام شديد، سد الخياشيم والأسماع، وذهب بالفكر والذهن إلى أعمق الأصقاع، وصرت فی اشدّ الخجل والحرج من تأخری بالكتابة إليكم، فكتبت والعينان تكفان، والذّهن كليل عليل -الكلماتِ الّتی ترونها صُحبة هذه الرّسالة، وارجو أن اكون قاربتُ المقام، ومَعذرةً من التّقصير والتّأخر، واستحلفكم بالله أن تكونوا على أتمّ الحرّية والاختيار فی إلغاء الكلمة، أو إثباتِها أو طیِّ ما شئتم منها، أو تعديلِ ما ترون تعديلَه فيها، فهی كلمةُ محبّ ولا ريب-، ولكنّه عليل كليل فعذرُه مقبول، وبضاعتُه مزجاة، ورحم الله امرء اً عرف حدّه ووقف عنده .فتصرّفوا فيها بما ترَون دون ما حرجٍ أو تلكؤ، والله ينفع بكم ويرعاكم.

وأما الملاحظات حول النهج فی الإخراج، فابعث بها إليكم مشاراً إليها على ذات الملازم الّتی اتحفتمونی بها، نظراً إلى أنّی الآن مريض، وإلى أنّ الإشارة المجرّدة دون الإشارة المعرّفة، الّتی قال فيها الإمام أبو حنيفة رضی الله عنه :هی أشهر طرق التّعريف .وآمل أن لا أتأخر فی إرسالها طويلا".

"میرے عزیز ترین بھائی! میں ابھی بیماری کے آخری مراحل میں ہوں، مرض الحمدللہ زائل ہونے کے قریب ہے، لیکن اس کے زوال سے پہلے شدید زکام نے اس کی جگہ لے لی ہے جو

ناک اور کانوں کو بند کر کے عقل اور ذہن کو کہیں دور لے گیا ہے، اور آپ کو خط لکھنے میں جو دیر ہوئی، اس پر سخت شرمندگی اور قلق کی حالت میں ہوں، اور اس خط کے ساتھ (تقریظ کے) جو کلمات آپ کو ملیں گے، وہ اس حالت میں لکھے ہیں کہ آنکھیں بہہ رہی ہیں، اور بیمار ذہن تھکا ہوا ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں قریب جگہ تک پہنچ گیا ہوں، اور جو کوتاہی اور تأخیر ہوئی، اس پر معذرت! اور میں آپ کو اللہ تعالیٰ کی قسم دیتا ہوں کہ آپ کو مکمل اختیار ہے کہ جس لفظ کو چاہیں، نکال دیں یا باقی رکھیں، یا جس حصے کو چاہیں، حذف کر دیں، یا اس میں جو ترمیم مناسب سمجھیں، کردیں، کیونکہ یہ اگرچہ بلاشبہہ یہ ایک محبت کرنے والے کے الفاظ ہیں، لیکن وہ کمزور اور بیمار ہے، اور اس کی پونجی کھوٹی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو اپنی حد کو پہچان کر وہیں رک جائے۔ لہٰذا اس (تقریظ) میں آپ جو چاہیں، کسی ہچکچاہٹ یا حرج کے بغیر جو چاہیں، تصرف کریں۔ اللہ آپ سے نفع پہنچائیں، اور آپ کی حفاظت کریں۔

جہاں تک کتاب کے طریق کار کے بارے میں میری آراء کا تعلق ہے، آپ نے جو فرمے بھیجے ہیں، میں نے انہی کے حاشیوں پر لکھ دی ہیں۔

اس کے بعد میں نے کتاب کے جو فرمے حضرتؒ کے پاس بھیجے تھے، حضرتؒ نے انہی فرموں کے مختلف مقامات پر اپنی آراء بھیج کر سرفراز فرمایا۔ اور ۶/ شوال ۱۳۹۶ھ کو میرے نام یہ خط لکھا:

بسم الله الرحمن الرحيم

إلى الأخ الكريم فضيلة الأستاذ الشيخ محمد تقى العثمانى الموهوب المحبوب حفظه الله تعالى ورعاه وأكرمه وأولاه

السّلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد، فارجو أن تكونوا بخير من الله ونعمة وعافية سابغة وارفة.

أبعث إليكم بالملازم التى نعِمتُ بالنّظر فيها، امتثالاً لأمركم الحبيب، وأشرتُ بعض الإشارات على خِطّتها المطبعيّة رجاء التحسين والتجميل، فوق الكَحَل الجميل، ولعلّ الإشارات بالقلم تفيد ما رغبتم بيانه، ولكم النظر الأسدّ

فی الإثبات والإلغاء لما تهجتموه، والذی أشرت إليه أظنّ أنه يلائم ذوقكم الرفيع، ونظركم البديع، ولكم تحياتی وشكری، وارفعوا تحياتی إلی سماحة السيد مولانا الوالد حفظه الله تعالی وأمدّه بالعافية والشفاء ، ولفعنا بصالح دعواته وأنفاسه العالية، وتحيّاتی أيضا إلی فضيلة الأخ العزيز محمد رفيع رفع الله مقامه وأتمّ عليه فضله وإنعامه، وإلی أنجالكم المحبوبين، أقرّ الله بهم العيون والقلوب، وأكرمنی بصالح دعواتكم جميعا، وأستودعكم الله، إلی لقاء حبيب قريب بإذن الله، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته .

الرياض الأربعاء ١٣٩٦\١٠\٦

عبد الفتاح أبو غدة

أرجو إرسال نسخة (إعلاء السنن) مع حامل هذه التحية، وشكراً.

جس تاریخ کو انہوں نے یہ خط لکھا، اُس کے صرف پانچ دن بعد یعنی ۱۱ر شوال کو حضرت والد صاحب قدس سرہ کی وفات ہوگئی، اور یہ مکتوب گرامی مجھے غالباً اس حادثے کے بعد ملا۔

اس طرح اعلاء السنن کی پہلی دو جلدوں پر حواشی کا کام الحمدللہ مکمل ہوگیا ، لیکن ماشاء اللہ جس رفتار سے اعلاء السنن کی جلدیں چھپ رہی تھیں ، میں اُس رفتار کا ساتھ نہ دے سکا ، اور پھر مناسب یہ معلوم ہوا کہ اس عظیم کتاب کی اشاعت کو میرے اس کام کی تکمیل کے انتظار میں روکنا مناسب نہیں ہے۔ اس لئے اگلی جلدیں میری تعلیقات کے بغیر ہی شائع ہوئیں ، اور الحمدللہ یہ عظیم کام مکمل ہوگیا۔ بہر حال ! دو جلدوں پر ہی سہی ، مجھے اس تاریخ ساز کتاب کی تھوڑی سی خدمت کی سعادت حاصل ہوگئی۔

جاری ہے.......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(انتالیسویں قسط)

تکملہ فتح الملہم کی تالیف

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان میں صحیح مسلم شریف کی شاہکار شرح "فتح الملہم" کے نام سے لکھی تھی جس نے نہ صرف ہندوستان، بلکہ عرب کے علماء سے بھی خراج تحسین حاصل کیا، اور اہل علم اُس کی قدر و قیمت سے بخوبی واقف ہیں۔ لیکن حضرت کی یہ شرح ابھی کتاب النکاح تک پہنچی تھی کہ حضرت کی سیاسی اور اجتماعی مصروفیات نے انہیں گھیر لیا، اور وہ اس کی تکمیل نہ فرماسکے، یہاں تک کہ ۱۹۴۹ء میں ان کا وصال ہوگیا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دلی خواہش تھی کہ اس کتاب کی تکمیل کی جائے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گوناگوں مصروفیات ایسی تھیں کہ خود اس کام کیلئے وقت نکالنا مشکل تھا۔ اس لئے انہوں نے متعدد علماء سے جو علم حدیث میں اختصاص رکھتے تھے، اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن وہ بھی بے حد مصروف تھے۔

آخرکار حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے وفات سے کچھ پہلے یہ ایماء ظاہر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر میں اس کام کا آغاز کردوں، اور مسودہ لکھ لکھ کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دکھاتا رہوں۔ اتنے بھاری کام کا پہلے میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا، لیکن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایماء اور اس یقین دہانی پر کہ وہ میرے مسودے کو پورا دیکھ کر جہاں ضرورت ہوگی، اصلاح فرمائیں گے، میں نے توکلاً علی اللہ صحیح مسلم کی کتاب الرضاع سے تکملہ کا کام شروع کردیا۔ پیش نظر یہ بھی تھا کہ اس طرح ان کے زیر سایہ میری

تربیت ہوگی۔ چنانچہ روزانہ جو کچھ لکھتا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کرتا، اور وہ اپنے افادات سے سرفراز فرماتے تھے۔

لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ابھی میں مسودے کے صرف اسّی صفحات ہی لکھ پایا تھا کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی علالت شدت اختیار کرگئی، اور بالآخر وہ وقت آ ہی گیا جس کے تصور ہی سے ہمیشہ دل بے چین رہا کرتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ۱۱ رشوال ۱۳۹۶ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ اس حادثے اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل نے مدت تک دل ودماغ ماؤف رکھا۔ فتح الملہم کی تکمیل کا کام میں نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی اس یقین دہانی پر شروع کیا تھا کہ وہ اس کی نگرانی فرمائیں گے، لیکن اب وہ سہارا چھوٹ چکا تھا۔ اس لئے ایک عرصے تک میں یہی سوچتا رہا کہ

آں قدح بشکست وآں ساقی نہ ماند

لیکن جب کچھ عرصے کے بعد ہوش ٹھکانے آنے شروع ہوئے، تو دل نے کہا کہ جو کام حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے چاؤ سے شروع فرمایا تھا، اُسے اپنی بساط کے مطابق مکمل ہی کرنا چاہئے۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک خدمت شروع کرنے کی توفیق بخشی ہے، تو اُنہی کے کرم سے یہ امید رکھنی چاہئے کہ وہ اس کی تکمیل بھی فرمادیں گے۔ ہم کیا اور ہمارا علم کیا؟ وہ اگر چاہیں تو ایک ناچیز ذرّے سے جو چاہیں کام لے لیں، جو کچھ ہوتا ہے، انہی کی توفیق سے ہوتا ہے، انہی سے توفیق مانگ کر کام شروع کرنا چاہئے۔ ان کی مشیت ہوگی تو وہ تکمیل کرادیں گے، اور مشیت نہیں ہے تو میری کیا مجال جو ایک لفظ بھی لکھ سکوں۔ اس خیال سے کچھ حوصلہ بندھا، اور میں نے استخارہ کرکے اس نیت سے کام ازسرنو شروع کردیا کہ میں خود اپنی معلومات کیلئے احادیث کی شروح کا مطالعہ کروں گا، اور حاصل مطالعہ کو تحریری شکل دیدوں گا۔

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کو علم ہوا کہ میں نے یہ کام شروع کیا ہوا ہے، تو انہوں نے مزید ہمت افزائی فرمائی، اور اُسی وقت اپنا یہ ارادہ بھی ظاہر فرمایا کہ وہ فتح الملہم کے مقدمے کو اپنی تحقیق وتعلیق کے ساتھ مرتب کرکے شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک خط میں مجھے تحریر فرمایا:

"بسم الله الرحمن الرحيم

إلى الأخ الأعز والحبيب المحبّ، زهرة العلم والعلماء، وعيد أهل النّبل والفضلاء، فضيلة الشيخ محمد تقى العثمانى حفظه الله ورعاه ونفع به

من أخيه ومحبه عبد الفتاح ابو غدة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد فأحمد الله إليكم، واصلى واسلّم على سيدنا محمد عبده ورسوله، وأرجو أن تكونوا أنتم وسائر الأهل والإخوة بخير حال وأنعم بال....

وآمل أن تحدثونى أيضا عن مشاريعكم العلمية، لقد حدثنى بعض محبيكم وهو الأخ محمد إلياس ظفر انكم تعزمون إتمام (فتح الملهم) لمولانا شبير أحمد العثمانى، وهذا فضل جسيم ومغنم عظيم .فأرجو أن يحقّقه الله على يديكم ، ويقرّ به العيون ويشرح به الصدور والقلوب.

وإذا كنتم تعتزمون هذا، فأنا أشارككم بلُبَينة صغيرة فى رفع هذا الصرّح الشامخ، والفضل الباذخ، وهو خدمة مقدمة (فتح الملهم) وتحقيقها وطبعها طبعاً رفيعاً وأنيقاً وخليقاً بأن يكون مقدمة لذاک الكتاب العظيم والشّرح الجسيم.

وقد توجهت إليها بالقراء ة والتنظيم منذ شهر تقريباً، مُراعياً فيما أقرأ منها النّشر والطبع فى هذه القراءة الأولى، وساقراهامرّةً ثانية للتّعليق والتخريج إن شاء الله تعالى، لتكون قرّة عين لى ولک، فدعواتكم لى بالتوفيق والعون من الله تعالى.

وفى أوّل المطبوعة التى كان آثرنى بها مولانا البنورى رحمه الله تعالى المطبوعة على حدة، ترجمةٌ لمولانا عاشق إلهى لمولانا شبير أحمد العثمانى، أراها قصيرةً عن طويل نجاده، ورفيع عماده، وشامخ أمجاده، فحبّذا لورفعتم لى ترجمته بقلمٍ أوفى جمعاً، واصفى نبعاً، وأحرق طبعاً، وأحسن صنعاً، وأنا لكم من الشّاكرين، وتكرّموا علىّ بنسخة ثانية للتى عندى احتياطاً عند الطبع إن شاء الله تعالى.

وإذا طبع شيء من الكتب الحديثة او الفقهية عندكم، فتكرموا بشراء

نسخة لی منه، لأشمّ ريّا الديار ولو بَعُدَ المزار، وتكاليفه من شرائه حتى إرساله إلىّ كلها علىّ، فتكرموا بذلک دون تردّد، ولكم الشكر الدائم والأجر الدائم إن شاء الله .وسلامي للأنجال بريرة ومحمد عمران، وباقي إخوتهما بارک الله فی الجميع وتحياتي للعلماء كافة عندكم وللطلبة البررة، وأستودعكم الله، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته .

اخوكم

عبد الفتاح أو غدة

۳/ ۱۳۹۸/۳ھ

عنوانی الرياض .كلية أصول الدين.

كتبت لكم هذه الرسالة والأخ محمد إلياس ظفر عندی، فحرّک شوقی وشدّ يدی إلى القلم فكتبت هذه الكلمات، ولكم تحياته .

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہایت عزیز بھائی ، ومحبوب ومحب، علم وعلماء کے پھول، اہلِ شرافت وفضل کی عید، فضیلۃ الشیخ محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ ورعاہ ونفع بہ

من جانب برادر محب عبدالفتاح ابوغدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد،

اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں، حضرت سیدنا محمد، اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول پر درود اور سلام بھیجتا ہوں، امید کرتا ہوں کہ آپ اور پورا خاندان اور بھائی بہترین حال میں ہوں گے۔

یہ بھی توقع رکھتا ہوں کہ آپ مجھے اپنے علمی منصوبوں کے بارے میں بتائیں، آپ کے ایک چاہنے والے، یعنی بھائی محمد الیاس ظفر صاحب نے مجھے بتایا ہے کہ آپ مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی فتح الملہم کو تکمیل کرنے کا عزم رکھتے ہیں، یہ زبردست فضیلت اور عظیم فائدے کا کام ہے۔

اور جب آپ کا یہ عزم ہے، تو اس بلند اور اونچی شان والے محل کی تعمیر کے لئے ایک چھوٹی سی اینٹ کے ذریعہ میں آپ کے ساتھ شریک ہوں گا، وہ یوں کہ فتح الملہم کے مقدمے، اس کی تحقیق، اور اس کی اعلیٰ طباعت کی خدمت جو اس عظیم کتاب اور زبردست شرح کی شایان شان ہو، پیش کروں گا۔

چنانچہ میں اپنی توجہ مقدمے کے مطالعے اور اسے ترتیب دینے پر تقریباً ایک ماہ سے صرف کررہا ہوں، اس پہلی مرتبہ کے مطالعے ہی میں اشاعت اور طباعت کا لحاظ رکھ رہا ہوں۔ اور دوسری مرتبہ کے مطالعے میں ان شاء اللہ تعالیٰ تعلیق وتخریج مدنظر رہے گی تاکہ یہ مقدمہ میری اور آپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ثابت ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق اور مدد کے لئے آپ کی دعاؤں کا خواستگار ہوں۔

مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جس مطبوعہ نسخے کا ایثار میرے حق میں فرمایا تھا، اس کے شروع میں مولانا عاشق الٰہی صاحب کے لکھے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کے حالات ہیں، میں اُسے ان کی بلند شان و شخصیت سے کچھ مختصر پاتا ہوں، کتنا اچھا ہو اگر آپ میرے لئے ان کے حالات ایسے قلم سے جمع فرمائیں جو زیادہ جامع، شفاف، گہرے جذبات اور بہتر انداز کا حامل ہو، میں آپ کا شکرگزار ہوں گا، اور میرے پاس موجود نسخہ کے علاوہ طباعت کے موقع پر احتیاطاً ایک دوسرا نسخہ عنایت فرمائیں گے ان شاء اللہ تعالیٰ۔

آپ کے ہاں حدیث یا فقہ کی کوئی نئی کتاب چھپے، تو مجھ پر یہ کرم فرمائیں کہ میرے لئے ایک نسخہ خرید لیجئے، تاکہ میں دیار کی خوشگوار ہوا تو پالوں، اگر زیارت دور کی بات ہو، خریدنے سے لے کر ارسال کرنے کے تمام اخراجات میرے ذمہ ہیں، لہٰذا یہ کرم میرے اوپر بغیر تردد کے فرمایئے، میں آپ کا ہمیشہ شکرگزار رہوں گا، اور آپ کے لئے ان شاء اللہ ہمیشہ اجر وثواب ہوگا۔ میرا سلام صاحبزادوں، بریرہ اور محمد عمران کو، اور ان کے باقی بھائی بہنوں کو، بارک اللہ فی الجمیع، اور تمام علماء اور صالح طلبہ کو میرا سلام، اللہ کے حوالے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کا بھائی

عبدالفتاح ابوغدہ

۱۳۹۸/۳/۳ھ

میرا پتہ: الریاض، کلیۃ أصول الدین

میں نے یہ خط آپ کو اُس وقت لکھا جب بھائی محمد الیاس میرے پاس ہیں، چنانچہ انہوں نے میرے جذبات ابھارے اور میرے ہاتھ کو قلم کی طرف بڑھایا، اور میں نے یہ کلمات لکھ دئے، آپ کو ان کی طرف سے بھی سلام۔

پھر ایک اور خط میں تحریر فرمایا:

بسم الله الرحمن الرحيم

إلى الأخ الأعزّ والحبيب المحب العلامة الموهوب مولانا الشيخ محمد تقى العثمانى حفظه الله ورعاه وأكرمه وأولاه ونفع به البلاد والعباد.

من محبه وراجى دعواته :عبد الفتاح أبو غدة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته، وبعد فاحمد الله إليكم، وأرجو أن تكونوا أنتم وسائر الأسرة الكريمة بخير من الله ونعمة .تلقيت رسالتكم اللطيفة الشريفة، فأحيَتْ من النفوس مواتَها، وردّت على الرّوح أقواتها، فلله أنتم، ولله أبوكم رحمه الله تعالى وأغدق عليه شآبيب رحمته ورضوانه، وأسكنه فسيح رحمته وجنانه.

سُررت بكتابكم جداً، وكَسَبنى نشاطاً ونشوةً وحيوية، وأعاد علىّ من العزم والجلد خيراً وإحساناً، فجزاكم الله عما كتبتم فأحييتم (ومن أحيى أرضا ميتة فهى له) كما هو نص الحديث الشريف.

وتلقّيت بعد الكتاب هديتكم الكريمة :الازدياد السنى على اليانع الجنىّ، ومقدمة فتح الملهم بشرح صحيح مسلم، فأكرمكم الله وأبقاكم لمحبيكم ملاذاً وموئلاً، ومنهلاً ومَعْلَماً .وسرّنى عزمكم على استكمال(فتح الملهم) فذلك الحقّ الّذى أشير إليه بمثل قوله تعالى (وعلى الوارث مثل ذلك)، فالحمد لله الّذى آتاكم، وأكرمكم وأولاكم، ونساله المزيد من فضله وكرمه للشيخ والمريد والطارف مثلى، ومثلكم التليد المجيد.

وقديماً قال أبو العباس المبرّد، وهو القائل المحق :ليس لِقِدم العهد يفضُل القائل، ولا لحِدثانه يُهتضم المصيب، ولكن يُعطى كلٌّ ما يَستحق .وتبعه ابن مالك، وما ابن مالك؟ خير من ذلك، فقال فيما هنالك، فى أوّل كتابه ((التسهيل)) ليُبصِر كلُّ عليل وكليل مقامَ

ذوی التأویل والتنزیل:وإذا کانت العلومُ مِنحاً إلهیة، ومواهب اختصاصیة، فغیرُ مستبعَد أن یُدّخر لبعض المتأخرین، ما عَسُر علی کثیر من المتقدّمین، نعوذ بالله من حَسَد یسُدّ باب الإنصاف، ویَصُدُّ عنه جمیل الأوصاف.

فأقرّ الله بکم وبآثارکم ومآثرکم العیون، وأفرح القلب المحزون بفقدِ إبراهیمه الجوهرِ المکنون .وآمل أن یسعدنی الله سبحانه بزیارة غیر بعیدة أعرّج فیها علی زیارة الشیخین والترحم علی صاحبی المرقدین بمشهد من القلب والعین، فتؤدّی العینُ حقَّها، وتَسْکُب الآماق وَسْقَها، ویبرُد ببرْد سَکْب الدّموع ظاهرُ القلب المفجوع .وإنّ لله ما أعطی، ولله ما أخذ، وکلّ شیء عنده بمقدار.

وآمل أن یُسعدنی الله باستکمال خدمة (مباحث فی علوم الحدیث) مقدمة فتح الملهم، فأکونَ کقائد المحمل الشریف إلی الحجّ المنیف، البرکات والرحمات إلیه وعلیه، وقائده یشدّ بمَقُوده إلیه، لعلَه یناله ممّا لدیه، ویَسعد بسعدیه، فدعواتکم بالإتمام والإکمال، والإنجاز والاحتمال، والله مجیب الداعین.

وبارک الله بالمولود حسّان إلی إخوته الأکارم الحسان، وسلامُ جمانة وسلمان، ولبابة وحسناء -من الباقیات -إلی إخوالهنّ وأخوالهن الصّالحات عمران وبریرة ومحمّد زبیر.

وتحیاتی واحتراماتی للأخ الأعز الأکبر مولانا الشیخ محمد رفیع، رفع الله قدره العالی، وأمکنه من تحقیق الأمانی الغوالی فی المعهد العتید المتلالی، لیُکمل الخلفُ ما رفعه السّلف، وتأتی اللّبِنة تلک فی موضعها، وختاماً أستودعکم الله،

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته . الریاض ۲۴/ ۴/ ۱۳۹۸ھ

راجی الدعاء عبد الفتاح أبو غدة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نہایت عزیز بھائی، محبوب ومحب، علامہ مولانا شیخ محمد تقی عثمانی صاحب، جسے اللہ تعالیٰ نے مواہب سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت اور دستگیری فرمائے، اور آپ کو عزت عطا فرمائے اور آپ پر احسان فرمائے، اور آپ سے ہر خاص وعام کو نفع پہنچائے۔

منجانب : آپ کا محب اور آپ کی دعاؤں کی امید رکھنے والا : عبد الفتاح ابوغدہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد،

اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں۔ اور امید رکھتا ہوں کہ آپ سب اور معزز خاندان اللہ کے فضل اور نعمتوں میں ہوں گے۔ آپ کا لطیف وشریف مکتوب موصول ہوا، اُس نے تو جان میں جان ڈالی، اور روح کو غذا بخشی، واہ رے آپ! اور واہ رے آپ کے والد! اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت ورضوان کی گھٹائیں نازل فرمائیں، اور اپنے جوار رحمت اور جنتوں میں جگہ عطا فرمائے۔

آپ کی کتاب سے بڑا دل خوش ہوا، اُس نے مجھے نشاط اور توانائی بخشی، اور میرے اندر عزم وقوت کو بہترین اور محسنانہ طریقے سے لوٹا دیا، پس اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے لکھے پر جزاء خیر عطا فرمائے، کہ اُس کے ذریعہ آپ نے زندہ کیا (اور جس نے کسی بنجر زمین کو زندہ کیا، تو وہ اس کی ہو جاتی ہے) جیسا حدیث شریف وارد ہوئی ہے۔

نیز آپ کا ہدیہ کریمہ موصول ہوا : الإزدياد السنيّ على اليانع الجنيّ اور فتح الملهم بشرح صحيح مسلم کا مقدمہ، اللہ آپ کو عزت دے، اور چاہنے والوں کے لئے آپ کو بطور ملجا وماویٰ اور منبع فیض ومشعل راہ سلامت رکھے۔ فتح الملہم کی تکمیل کے عزم نے دل خوش کیا، یہ وہ حق ہے جس کی طرف میں ارشاد باری تعالیٰ کے ذریعہ اشارہ دیا کرتا ہوں : (وعلى الوارث مثل ذلك) اور اسی طرح کا حق وارث پر بھی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے آپ کو یہ نعمت عطا کی، آپ کو عزت دی، آپ پر احسان فرمایا، اور اُس اللہ سے شیخ ومرید اور مجھ جیسے نو وارد کے واسطے، اور آپ جیسے قدیم عریق خاندانی شرافت رکھنے والے کے واسطے مزید فضل وکرم کی دعا کرتے ہیں۔

ابو العباس المبرّد نے بہت پہلے کہا ہے، اور برحق کہا ہے : صرف زمانے کی سبقت کی بناء پر کسی کہنے والے کو فضیلت نہیں دی جا سکتی ہے، اور نہ بعد میں آنے کی وجہ سے کسی صحیح کام کرنے والے کی ناقدری کی جاتی ہے، بلکہ ہر ایک کو وہ دیا جاتا ہے جس کا وہ مستحق ہے۔ اور ابن مالک نے بھی اسی قسم کی بات کہی ہے، وما ابن مالك؟ خير من ذلك . ابن مالک کیا زبردست چیز ہیں؟ ابن مالک ہر تصور سے بہتر ہیں، چنانچہ اس بارے میں اپنی کتاب تسہیل کے شروع میں لکھتے ہیں: ہر بیمار وکمزور شخص کو چاہئے کہ وہ اہلِ تفسیر کا مقام دیکھے (۱)، جب علوم خدائی عطیہ ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی خاص عطا، تو بعید نہیں ہے کہ بعد میں آنے والے کچھ لوگوں کیلئے وہ کچھ اٹھا کر

(۱) یہ دراصل ایک حدیث میں ایک بیوی کے اپنے شوہر کے بارے میں تعریفی کلمات بیان ہوئے ہیں۔ حضرت شیخ ؒ نے اس کی طرف تلمیح فرمائی ہے۔

رکھا گیا ہو جو بہت سے پہلے آنے والوں پر مشکل رہا۔ اللہ تعالیٰ سے ایسی حسد سے پناہ چاہتے ہیں جو انصاف کا دروازہ بند کردے، اور جمیل خصلتوں کو روک کر رکھے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ اور آپ کے آثار و مآثر کے ذریعہ آنکھوں کو ٹھنڈا فرمائے، اور جو دل اپنے موتی ابراہیم کو کھو بیٹھنے کی وجہ سے غمگین ہے، اسے خوشی عطا فرمائے۔ میں امید کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ مجھے عنقریب ایک زیارت کی سعادت عطا فرمائے، جس میں دونوں شیخین کی زیارت کروں اور دونوں مرقد والوں کیلئے دعاء رحمت دل اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ کروں، تاکہ آنکھ اپنا حق ادا کرے، اور چشم نم اپنے آنسو بہادے، اور دکھا دل آنسو بہا کر کچھ ٹھنڈک محسوس کرے۔ بے شک اللہ ہی کا ہے وہ جو اُس نے عطا کیا، اور اللہ ہی کا ہے وہ جو اُس نے لیا، ہر چیز کی ایک مقدار اس کے ہاں مقرر ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں کہ مجھے مباحث فی علوم الحدیث، یعنی فتح الملہم کے مقدمے کی خدمت مکمل کرنے کی سعادت عطا فرمائے، تاکہ میں اس شریف محمل کو حج بیت اللہ کی طرف اٹھانے والے کی طرح بنوں، برکتیں اور رحمتیں اس کے واسطے مقدر ہوں، اور لے جانے والا اپنی سواری کو تیز تیز لے جائے کہ ہوسکتا ہے کہ اُسے بھی وہ ملے جو اُس کے سواری کے پاس ہے، اور وہ بھی اس سعادت سے بہرہ ور ہو جو سواری کو حاصل ہے، لہٰذا تکمیل اور قبولیت کے لئے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ دعا کرنے والوں کی دعا قبول فرماتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نومولود حسّان اور ان کے معزز بھائیوں کو برکتیں عطا فرمائیں، اور جمانہ، سلمان، لبابہ اور حسناء۔ جو باقی رہ گئی ہیں، کی طرف سے ان کے نیک بھائی بہنوں، عمران، بریرہ اور محمد زبیر کو سلام۔

اور میرا سلام و اکرام نہایت عزیز بڑے بھائی، مولانا شیخ محمد رفیع، کو، اللہ تعالیٰ ان کی عالی قدر و منزلت کو اور بلند فرمائے، اور قدیم و عریق جگمگاتے ہوئے ادارے کے سلسلے میں ان کی بیش قیمت تمناؤں کو پورا فرمائے، تاکہ خلف اس عمارت کو پورا فرمائے جس کی بنیادیں سلف نے اٹھائیں، اور وہ خاص اینٹ اپنی جگہ لگ جائے، آخر میں، اللہ کے حوالے، والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

الریاض ۲۴/۴/ ۱۳۹۸ھ

دعاجو۔ عبد الفتاح ابوغدہ

جاری ہے.......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ——— جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چالیسویں قسط)

چونکہ تکملہ فتح الملہم کے کام کے لئے قدم قدم پر کتابیں دیکھنے کی ضرورت پڑتی تھی، اور پہلے سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ کس وقت کس کتاب کی ضرورت پڑے گی، اس لئے میں نے صبح سے دوپہر تک اسباق پڑھانے اور فتویٰ کا کام کرنے کے بعد ظہر کی نماز پڑھکر دو گھنٹے یومیہ اس کام کے لئے دارالعلوم کے کتب خانے میں جانا شروع کردیا۔ اُس وقت دارالعلوم کا کتب خانہ اُس بوسیدہ عمارت کے ایک تاریک سے کمرے میں واقع تھا جسے ہم پرانا بنگلہ کہتے تھے۔ کتابیں لکڑی کی بے ہنگم الماریوں میں ٹھونس ٹھونس کر رکھی ہوئی تھیں، اور ناظم کتب خانہ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک چھوٹی سی فرشی نشست کے سوا بیٹھنے کی کوئی باقاعدہ جگہ نہیں تھی۔ میں نے علم حدیث کی الماریوں کے درمیان زبردستی کرکے فرش پر ایک ایسی جگہ بنائی کہ میں ایک تپائی سامنے رکھ کر ننگے فرش پر بیٹھ سکوں۔ تپائی پر کتابیں اور میرے مسودے کا رجسٹر ہوتا، اور میں زمین پر بیٹھ کر مطالعہ بھی کرتا، اور لکھتا بھی جاتا۔

اگرچہ الحمدللہ گھر میں زمین پر بچھانے کے لئے گدے تکیے سب موجود تھے، لیکن اسے میری حماقت ہی کہا جاسکتا ہے کہ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ لاکر اس جگہ کو کچھ آرام دہ بنالوں۔ لیکن اللہ تعالیٰ حضرت مولانا عبدالحئی صاحب پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں، وہ اُس وقت ناظم کتب خانہ تھے۔ انہوں نے مجھے ننگے فرش پر کام کرتے دیکھا، تو ایک پرانی سی دری میرے نیچے بچھادی جس سے فرش کی سختی میں کمی آگئی۔ سامنے ایک بوسیدہ سی تپائی رکھی رہتی تھی جس کی سطح پر عمر رسیدگی کی وجہ سے جگہ جگہ جھریاں اور شکنیں پڑگئی تھیں۔ کتابوں کا ایک ڈھیر میں اُس پر رکھ لیتا تھا۔ اُس کے باوجود بار بار دوسری کتابوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی، جو میں

بکثرت تو خود ہی الماریوں میں سے اُٹھا لاتا، اور بوقت ضرورت مولانا عبد الحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے مدد لیتا، اور وہ خوشی خوشی میری ضرورت کی کتاب مجھے مہیا فرمادیا کرتے تھے۔

وہ کچھ ایسا زمانہ تھا کہ نہ زیادہ سفر پیش آتے تھے، نہ لوگوں سے زیادہ جان پہچان تھی، اس لئے ظہر کے بعد کے یہ دو گھنٹے بڑے سکون کے ساتھ اپنا یہ محبوب کام کرنے میں صرف ہوتے تھے، اگر اس وقت کوئی ملنے بھی آگیا، تو اُسی سادہ سی نشست پر اُس سے ملاقات بھی ہوجاتی تھی۔ ادھر میں نے اپنے ذہن میں یہ طے کررکھا تھا کہ میں یہ کام اپنے فائدے اور اپنے علم میں اضافے کے لئے کررہا ہوں، اس لئے مجھے کوئی جلدی نہیں تھی۔ جبتک متعلقہ مباحث پر مجھے اطمینان نہ ہوجاتا، میں آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اس لئے کام کی رفتار کچھ زیادہ تیز نہیں تھی۔ اُس وقت میرا دارالعلوم کے سوا کسی اور ادارے سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا، اور دارالعلوم میں تدریس، کچھ فتویٰ کی خدمت، ماہنامہ البلاغ کی ادارت اور تکملہ فتح الملہم کی تالیف کے سوا میرا کوئی اور کام نہیں تھا۔ اسی دوران البلاغ کا اداریہ یا کسی وقتی ضرورت کے تحت کوئی مضمون لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا۔ ملک میں سیاسی طوفان آتے جاتے رہے، مگر میں اپنے ان کاموں میں مگن رہا۔ اُس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ سکون وسرور کا یہ زمانہ زیادہ لمبا نہیں ہے، اور عنقریب مصروفیات کے متواتر سیلاب آنے والے ہیں۔

جنوبی افریقہ کا پہلا سفر

ابھی تکملہ فتح الملہم کی تالیف کتاب العتاق تک پہنچی تھی، کہ چودھویں صدی کے اختتام پر مجھے اور بڑے بھائی حضرت مولانا محمد رفیع صاحب عثمانی مدظلہم کو جنوبی افریقہ سے دعوت موصول ہوئی۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جنوبی افریقہ کے دورے پر جن حضرات نے مدعو کیا تھا، ان میں سے جناب عبدالحئی درلھیہ، جو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جاں نثار مرید تھے، وفات پا چکے تھے، البتہ ان کے رفیق جناب احمد لبر صاحب مرحوم حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تعلق کا پورا حق ادا کرتے تھے۔ انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو جنوبی افریقہ کے تبلیغی دورے کی دعوت دی۔ چنانچہ ہم ذوالحجہ ۱۴۰۰ھ مطابق نومبر ۱۹۷۹ء میں اس سفر پر روانہ ہوئے، اور ہم نے تقریباً ایک مہینہ جنوبی افریقہ میں گذارا، اور عمرہ ادا کرنے کی بھی توفیق ہوئی۔ اس سفر کا کچھ حال میں نے "البلاغ" میں لکھا جو "جہان دیدہ" میں بھی شامل ہے۔

اس سفر سے واپس ہوکر تکملۂ فتح الملہم کی تالیف کتاب البیوع سے شروع کی۔ بعد میں مصروفیات اور سفروں کی وجہ سے (جن کی کچھ تفصیل آگے آنے والی ہے) یہ کام کئی کئی مہینے بند رہا۔ دارالعلوم کا مذکورہ بالا

کتب خانہ بہت تنگ وتاریک تھا، اور اُس میں نہ مزید کتابوں کی گنجائش تھی، نہ طلباء اور اساتذہ کے بیٹھ کر مطالعہ کرنے کے لئے کوئی مناسب جگہ۔ کتب خانے کا جونقشہ جناب کرنل صاحب مرحوم نے تیار فرمایا، اُس کی لاگت کا تخمینہ اُس وقت شاید اٹھارہ لاکھ کا تھا، لیکن اس مد میں بمشکل چند ہزار روپے موجود تھے۔ حضرت والد صاحبؒ نے کتب خانے کے لئے ایک جگہ مخصوص فرما کر اللہ تعالیٰ کے نام پر اُس کی تعمیر شروع فرمادی، اور یہ فرمایا کہ جتنی رقم کا اللہ تعالیٰ انتظام فرمادیں، اُسی کے حساب سے تعمیر کرلی جائے۔ چنانچہ حضرت والد صاحبؒ کی حیات میں تھوڑی تھوڑی کر کے عمارت کی بنیادیں بھری گئی تھیں کہ حضرت والد صاحبؒ کی وفات کا سانحہ پیش آ گیا۔ اُس وقت بھی اس مد میں چند ہزار روپے موجود تھے، چنانچہ اسی کے مطابق تعمیر کی جاتی رہی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ رفتہ رفتہ یہ تعمیر ہوتی گئی۔ میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو اللہ تعالیٰ نے تعمیر کا خاص سلیقہ اور ذوق عطا فرمایا ہے جو دارالعلوم کی تعمیرات میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ مجھے تعمیرات کے کام سے کوئی خاص مناسبت نہیں ہے، البتہ اس میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے میں فجر کے بعد زیر تعمیر حصے میں ایک چکر لگاتا، اور اپنی مختصر سی تسبیحات کا معمول پورا کیا کرتا تھا۔ الحمد للہ یہ تعمیر مکمل ہوئی، تو میری خواہش تھی کہ اس میں کتابوں کی درجہ بندی اور ترتیب وتنسیق ایسی ہو کہ اُس کی مدد سے مطلوبہ کتاب نکالنا آسان ہو۔ جدید کتب خانوں میں کتابوں کی ترتیب کے لئے عام طور سے وہ نظام جاری تھا جو ڈی وی سسٹم کہلاتا ہے۔ میں نے اُس کا جائزہ لیا، تو اندازہ ہوا کہ اسلامی علوم کے لئے اس کی درجہ بندی اور نمبروں کا نظام بہت ناکافی ہے۔ لہٰذا میں نے کافی محنت اور وقت لگا کر اُس میں اسلامی علوم کی ضرورت کے لحاظ سے تبدیلیاں کیں، اور اس سلسلے میں لائبریری سائنس کے بعض ماہرین سے بھی مشورہ کیا، یہاں تک کہ ایک ایسا نظم تیار ہوگیا جو میری نظر میں اسلامی علوم کے کتب خانے کے لئے مناسب تھا۔ مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ وفات پاچکے تھے، ان کے بعد دارالعلوم کے فاضل مولانا ابوطاہر ارکانی سلمہ کو ہم نے لائبریری سائنس کی تربیت دلوائی، اور انہیں ناظم کتب خانہ مقرر کردیا۔ الحمد للہ انہوں نے کتابوں کی نئی درجہ بندی کے مطابق محنت سے کام کیا۔

نیا کتب خانہ تیار ہونے سے مجھے تکملہ فتح الملہم کے کام میں بھی آسانی ہوگئی۔ اب میری نشست اس نئے کتب خانے میں مقرر ہوگئی، اور بیٹھنے کا بھی مناسب انتظام ہوگیا، اور کتابیں رکھنے کا بھی۔ میں نے یہاں بیٹھ کر کام کرنے کے لئے وقت بھی تبدیل کرلیا، اور بعد ظہر کے بجائے صبح کے دو گھنٹے اس کام کے لئے مخصوص کرلئے۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ صبح کے جو دو گھنٹے میں نے اس کام کے لئے مقرر کئے تھے، دل یوں چاہتا تھا کہ اس میں کسی مداخلت کے بغیر میں یکسوئی سے کام کرتا رہوں۔ لیکن بکثرت ایسا ہوتا تھا کہ میں نے کتابوں کا مطالعہ کرکے کسی مسئلے میں ایک ذہن بنایا، اور ذہن کو مجتمع کرکے قلم اٹھایا کہ اتنے میں کوئی صاحب سلام کرکے میرے پاس آکر بیٹھ گئے، اور اپنی بات شروع کردی۔ مجھے اس صورتِ حال سے بڑی کوفت ہوتی تھی کہ اس سے خیالات کا سارا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا۔ جب اس قسم کے واقعات زیادہ ہوگئے، اور اس سے کام میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی، تو میں نے اپنے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ سے اپنی اس الجھن کا ذکر کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا " : یہ جو تم مسلم شریف کی شرح لکھ رہے ہو، یہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے لکھ رہے ہو، یا اپنا شوق پورا کرنے کے لئے؟ اگر اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہے تو وہ ہر حالت میں وقت کا تقاضا پورا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جب تک تم لکھ پڑھ رہے تھے، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ کی رضا اسی لکھنے پڑھنے میں تھی، اور جب کوئی مہمان آگیا تو اُس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اُس کا اکرام کیا جائے۔ اب ان شاء اللہ تعالیٰ رضائے الٰہی ان کی طرف متوجہ ہونے اور ان کی بات سننے میں ہوگی، اس لئے تمہارا کیا نقصان ہے؟ پہلے بھی اللہ تعالیٰ کی رضا کا کام کررہے تھے، اب بھی اللہ تعالیٰ کی رضا ہی کا کام کررہے ہو، البتہ اگر آنے والے صاحب اگر ضرورت سے زیادہ بیٹھ کر وقت ضائع کرنے لگیں، تو مناسب طریقے سے معذرت کرسکتے ہو۔ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات دل میں ایسی گھر کرگئی کہ اس نے علم ومعرفت کا ایک دروازہ کھول دیا، اور اس کے بعد الحمد للہ یہ تشویش بڑی حد تک رفع ہوگئی۔

تکملہ فتح الملہم کی تالیف کے دوران ہی مجھے اسلامی نظریاتی کونسل اور پھر وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ میں کام کرنے کا موقع ملا، (جس کی تفصیل آگے آنی والی ہے) اور اس کے لئے مجھے بار بار اسلام آباد میں لمبے لمبے عرصے تک قیام کرنا پڑا، تکملہ کا کام میں کبھی کبھی ساتھ ضرور رکھتا، لیکن فرائض منصبی کی وجہ سے اُس پر کام کرنے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ اس کے علاوہ یہی وہ زمانہ تھا کہ غیر سودی بینکاری کے سلسلے میں میری جدو جہد اپنے شباب پر تھی جس کے لئے متواتر اندرونی اور بیرونی سفروں کا طویل سلسلہ قائم تھا۔ نیز میں مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کا نائب صدر بن چکا تھا، اور اس کے لئے مستقل مقالات لکھنے پڑتے تھے۔

بہر حال! سفر پیش آتے رہے، وقتی تالیفی مصروفیات کا سلسلہ بھی جاری رہا جس کی وجہ سے تکملہ کے کام میں بڑے بڑے وقفے آتے رہے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم تھا کہ اُس نے اس ذرۂ ناچیز کو اس کی تکمیل کی

توفیق عطا فرمائی۔

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، میں نے اصلاً یہ کام ایک طالب علم کی حیثیت میں اپنے فائدے کے لئے شروع کیا تھا کہ مجھے احادیث کا صحیح مطلب سمجھ میں آئے، اور ان سے متعلق مباحث سے واقفیت حاصل ہو، اس لئے میں نے تالیف کی رفتار تیز کرنے پر کبھی زور نہیں دیا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ جو حدیث زیر مطالعہ ہے، اس کے دوسرے طرق جس کسی بھی کتاب میں میسر آ جائیں، اور جس طریق سے حدیث کا مفہوم یا اس کا پس منظر سمجھنے میں مدد ملتی ہو، میں شرح میں اُسے ضرور ذکر کروں۔ اس معاملے میں مجھے سب سے زیادہ مدد حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہما کی شروح بخاری سے ملی۔ میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ جو طرق انہوں نے ذکر فرمائے ہیں، میں اُن پر کچھ اضافہ کرسکوں، اس لئے متن حدیث کی بہت سی کتابوں میں وہ حدیث نکالتا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ بہت کم مواقع ایسے آئے جن میں ان بزرگوں کے بیان کئے ہوئے طرق اور شواہد پر کچھ اضافہ کیا جاسکے۔ جس وقت میں یہ کام کررہا تھا، اُس وقت نہ کمپیوٹر کا رواج ہوا تھا، نہ مکتبہ شاملہ اور جوامع الکلم جیسے پروگرام وجود میں آئے تھے، لیکن احادیث کی تلاش میں آسانی کے لئے "المعجم المفہرس"، "تحفۃ الأشراف" "جامع الاصول" اور "مجمع الزوائد" اور زوائد کی دوسری کتابیں موجود تھیں، لیکن ان بزرگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ انہوں نے اُس دور میں کس طرح ساری کتابیں براہ راست چھانی ہیں جب نہ مطبوعہ نسخے تھے، نہ جدید انداز کی فہرستیں تھیں۔

میں نے اپنی استطاعت کی حد تک حنفی فقہ کے وہ دلائل الحمد للہ پورے اعتماد اور استقصاء سے ذکر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ نکتہ بفضلہ تعالیٰ کبھی او جھل نہیں ہوا کہ یہ اجتہادی اختلاف ہے، کوئی حق و باطل کی جنگ نہیں ہے جس میں کسی ایک فریق کو جتوانے کا ہر حربہ آزمایا جائے، اور احادیث کی دوراز کار تاویلوں پر اصرار کیا جائے۔ حضرت والد صاحب قدس سرہ کا یہ جملہ میں نے حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحبؒ سے سُنا تھا کہ "خود حنفی بنو، تو بنو، لیکن حدیث کو حنفی بنانے کی کوشش نہ کرو۔" چنانچہ جہاں حنفی مسلک کی توجیہ میری سمجھ میں نہیں آئی، وہاں اپنی ناسمجھی کا کھل کر اعتراف کیا۔

یہ بھی قضاء الٰہی کا فیصلہ تھا کہ صحیح مسلم کا جو حصہ مجھے شرح لکھنے کے لئے ملا، وہ زیادہ تر عائلی، معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی معاملات پر مشتمل ہے، اور بکثرت شروح حدیث ان ابواب پر پہنچ کر اختصار پسند ہوجاتی ہیں۔ دوسری طرف یہی وہ ابواب ہیں جن میں عصر جدید نے نت نئے مسائل پیدا کردیئے ہیں۔ میں

نے کوشش کی کہ ان مسائل سے راہ فرار اختیار کرنے کے بجائے ان کی جتنی تحقیق و وضاحت اپنی بساط کی حد تک ممکن ہو، اُسے کتاب کا حصہ بناؤں۔ اس لئے کتاب میں بہت سے وہ مسائل زیر بحث آگئے ہیں جن سے پچھلی شروح حدیث خالی ہیں۔

اس تالیف کے دوران بلا مبالغہ سینکڑوں کتابوں کے مطالعے کی نوبت آئی، اور شروح حدیث بھی تقریباً تمام نظر سے گذریں، لیکن جس روز میں نے تکملہ کی آخری سطور لکھیں، تو یہ احساس دامنگیر تھا کہ حضرت والد صاحبؒ حیات ہوتے، تو آج ان کی خدمت میں مسودہ پیش کرکے دعائیں لیتا، لیکن الحمد للہ میرے اساتذہ اور بڑے بھائی موجود تھے۔ میں سب سے پہلے کتب خانے سے اتر کر اپنے محسن استاذ حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس لے گیا۔ انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں دیں، پھر اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو خوشخبری سنائی، ان کی دعائیں ملیں۔ اُس وقت میرے سب سے بڑے بھائی جناب محمد رضی عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حیات تھے۔ انہوں نے تکمیل کی خبر سُنی، تو مجھے پانچ سو روپے انعام دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ انعام حضرت والد صاحبؒ کی طرف سے ہے۔ مجھے اس انعام کی لذت آج تک یاد ہے۔ حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے فتح الباری کی تکمیل پر ایک دعوت کی تھی جس میں علمائے عصر مدعو تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں بھی اس خوشی کے موقع پر اپنے اساتذۂ کرام اور دوسرے علماء کی دعوت کروں، اور حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب اور دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ کی خواہش تھی کہ تکملہ کی تکمیل کے موقع پر دارالعلوم میں ایک جلسہ کیا جائے، چنانچہ مختصر پیمانے پر دعوت بھی ہوئی، اور میرے انتہائی محسن استاذ گرامی حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر صدارت دارالعلوم میں ایک تعارفی جلسہ بھی ہوا، اور محبت کرنے والوں کی دعائیں بھی نصیب ہوئیں۔ فالحمد لله تعالى حمداً كثيراً طيباً مباركاًفيه مباركا عليه كما يحبّ ربّنا ويرضى۔

جب کتاب چھپنے کا مرحلہ آیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے تکملہ فتح الملہم چھ جلدوں میں مکمل ہوا۔ شروع میں میں نے ذہن میں تکملہ کا نام "فتح المنعم" سوچا تھا، لیکن تردد تھا کہ یہ نیا نام رکھوں یا صرف "تکملہ فتح الملہم" کہوں۔ حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمہ اللہ تعالیٰ سے مشورہ کیا تو انہوں نے فرمایا چھوٹے ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے کام کو ایک نئے نام سے مستقل حیثیت دینے کے بجائے اصل مصنف حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ہی کا رکھا ہوا نام باقی رکھو، اور اپنے کام کو اسی کا ایک تکملہ قرار دیکر ایک بڑے کے ساتھ منتھی ہو جاؤ۔ مستقل بالذات ہونے سے کسی بزرگ کا تابع قرار پانا ہی چھوٹے کا اعزاز ہے۔ اور یہی

وہ بات تھی جس کا مفہوم میں نے حضرت والد صاحبؒ سے نہ جانے کتنی بار حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے سُنا تھا۔ چنانچہ اس پر شرح صدر ہوگیا کہ اس کا کوئی مستقل نام رکھنے کے بجائے اسے "تکملۃ فتح الملہم" ہی کا نام دیا جائے۔ اس موقع پر میں نے ضروری سمجھا کہ اصل "فتح الملہم" کو پہلے اور "تکملہ" کو اس کی آخری جلدوں کے طور پر شائع کیا جائے۔ "فتح الملہم" کو شائع کرتے ہوئے مجھے یہ خیال آیا کہ میں نے تکملہ میں تمام حدیثوں پر اپنے نمبر لگائے ہیں، جبکہ اصل فتح الملہم میں نمبر نہیں ہیں۔ دوسرے تکملہ میں بندے نے ہر حدیث کی کم از کم امہات ستہ اور مجمع الزوائد کی حد تک تخریج کا اہتمام کیا تھا جو شروع میں میں خود کرتا رہا، اور بعد میں مولانا عبداللہ میمن صاحب اور مولانا ابوطاہر صاحبان نے اس کی تکمیل کی۔ اصل فتح الملہم میں تخریج کا اہتمام نہیں تھا۔ اب دونوں حصوں میں یکسانیت پیدا کرنے کے لئے اسی انداز پر نمبر ڈالنے اور مختصر تخریج کا کام میں نے دارالعلوم کے ایک ہونہار فاضل استاذ مولانا نورالبشر صاحب کو سونپا (جواب ماشاء اللہ معہد عثمان بن عفانؓ کے نام سے ایک معیاری ادارہ چلا رہے ہیں)

انہوں نے ماشاء اللہ یہ کام بڑی محبت اور محنت سے سرانجام دیا، نیز میرے بڑے بھائی مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد رفیع صاحب نے صحیح مسلم کا سالہا سال درس دیا ہے، اس دوران انہوں نے متفرق مقامات پر قلم سے کچھ حواشی لکھے تھے۔ وہ حواشی بھی انہوں نے اصل میں شامل فرمادیئے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد "فتح الملہم مع تکملہ" بارہ جلدوں میں مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہوا جن میں سے چھ جلدیں حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کی اصل شرح ہے، اور باقی چھ جلدیں اس عاجز کی لکھی ہوئی ہیں۔

حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو جب معلوم ہوا، تو حضرتؒ بہت خوش ہوئے، اور میری ہمت افزائی کے لئے اس پر ایک مفصل تقریظ تحریر فرمائی۔ ان کے علاوہ مصر کے مشہور عالم شیخ یوسف القرضاوی مدظلہ، تونس کے مفتی شیخ مختار السلامی رحمہ اللہ تعالیٰ اور شیخ وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے بھی اس پر جاندار تقریظات لکھیں۔ میں نے اپنے محبوب بزرگ حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ایک خط میں اس پر کچھ لکھنے کی درخواست کی جس کے جواب میں پہلے تو انہوں نے یہ فرما کر معذرت کی کہ علم حدیث میرا میدان نہیں ہے۔ لیکن کچھ ہی دن کے بعد ایک خط میں فرمایا کہ چونکہ میں اوجز المسالک اور بذل المجہود پر مقدمے لکھ چکا ہوں، اس لئے صحیح مسلم کی شرح پر بھی لکھنے کا داعیہ پیدا ہوگیا ہے۔ پھر میرے استحقاق سے کہیں زیادہ تقریظ تحریر فرمائی۔

میری خواہش تھی کہ یہ مکمل کتاب کسی عرب ملک میں شائع ہو۔ متعدد عرب علماء جو میرے اچھے دوست

تھے، انہیں معلوم تھا کہ میں یہ شرح لکھ رہا ہوں۔ خاص طور پر علامہ شیخ وہبہ زحیلی رحمۃ اللہ علیہ جن کی معرکۃ الآراء کتاب "الفقہ الاسلامی وادلتہ" نے عالمگیر شہرت حاصل کی ہے، وہ مجھ سے وقتاً فوقتاً پوچھتے رہتے تھے کہ کام کہاں تک پہنچا؟ جب میں نے انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کام مکمل ہوگیا ہے، تو وہ بڑے خوش ہوئے، اور مجمع الفقہ الاسلامی کے ایک اجتماع میں جو جدہ میں منعقد ہورہا تھا، وہ شیخ محمد علی دولہ دمشقی رحمۃ اللہ علیہ کو میرے پاس لائے، اور بتایا کہ یہ دمشق کے مشہور ناشر ادارے "دارالقلم" کے مالک ہیں، اور بڑے علم دوست آدمی ہیں۔ یہ فتح الملہم کو اپنے ادارے سے شائع کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی علم دوستی سے بہت متاثر ہوا، اور ان سے وعدہ کرلیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اگلی ملاقات میں فتح الملہم کا مسودہ لیکر آؤں گا، اور آپ کو طباعت کے لئے دوں گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، لیکن میں نے جو مسودہ ان کے حوالے کیا، وہ کمپوزنگ اور دستی تحریروں کا مجموعہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس کی ترتیب وتہذیب پر ہمیں کافی کام کرنا پڑے گا۔ چنانچہ انہوں نے دمشق کے ایک مصحح عالم کو وہ مسودہ حوالے کیا (جہاں تک یاد ہے، ان کا نام شیخ علی تھا) انہوں نے اس مسودے پر بہت محنت کی، میں نے اپنے مراجع کے حوالے متن کے ساتھ ساتھ دیئے تھے۔ انہوں نے انہیں حواشی پر منتقل کیا، اور کہیں کہیں کسی حوالے کا اضافہ کیا۔ اس کام کی وجہ سے دارالقلم والے نسخے کی اشاعت میں کئی سال لگ گئے۔ لیکن جب وہ شائع ہوا، تو اس نے کتاب کو چار چاند لگا دیئے، اور اس کی وجہ سے اس کے قارئین کا حلقہ برصغیر سے نکل کر عرب ممالک تک پہنچ گیا۔

الحمد للہ تعالیٰ برصغیر میں مسلم شریف پڑھانے والے اساتذہ نے بطور خاص اُسے مطالعے میں رکھ کر بندے کی ہمت افزائی فرمائی، اور برصغیر کے باہر سے بھی پسندیدگی کے تأثرات موصول ہوئے۔ کچھ عرصے کے بعد ملائیشیا کی ایک پردہ نشین خاتون محترمہ زنیدہ بنت محمد مرزوقی نے ای میل کے ذریعے مجھے مطلع کیا کہ وہ تکملہ فتح الملہم کے منہج فقہی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔ انہوں نے خط وکتابت کے ذریعے مجھ سے رابطہ بھی رکھا، اور ملائیشیا کے ایک سفر کے موقع پر انہوں نے وہ مقالہ مجھے دیکر بتایا کہ انہیں اس پر ملائیشیا اسلامک یونی ورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل گئی ہے۔ ان کے مقالے کا نام ہے: "الشیخ محمد تقی العثمانی، منهجه وافكاره فی شرح احادیث المعاملات المالیّة فی کتابه " تکملة فتح الملهم بشرح صحیح الإمام مسلم". مقالہ عربی زبان میں ہے، اور چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ انہوں نے بہت دقت نظر سے کتاب کا جائزہ لیا ہے، اور اس کا ایک ایک حرف پڑھکر مختلف جہتوں سے اس پر تبصرہ کیا ہے جو بذات خود ایک عالمانہ کام ہے۔ جزاها الله تعالیٰ خیر الجزاء۔

اس کے بعد حال ہی میں پنجاب یونی ورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں ایک ہونہار طالبہ محترمہ ظل ہما نے ڈاکٹر محمد سعد صدیقی کی نگرانی میں فتح الملہم اور اس کے تکملے پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا ہے جس کا عنوان ہے": تکملہ فتح الملہم - منہج کا تحلیلی جائزہ" اور یہ ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ بھی بڑا قابل قدر مقالہ ہے جو اردو میں لکھا گیا ہے، اور اس میں تکملہ کے خصوصی امتیازات پر پورے شرح وبسط سے گفتگو کی گئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے کتاب کافی مقبول ہوئی، اور مختلف حلقوں سے معلوم ہوتا رہتا ہے کہ وہ علمی شخصیتوں کے مطالعے میں رہتی ہے۔ لیکن اصل دعا یہ ہے کہ اُس بارگاہ میں قبول ہو جائے جہاں کی قبولیت ہی اصل قبولیت ہے۔

جاری ہے.........

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ـــــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(اکتالیسویں قسط)

اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت

۱۹۷۷ء میں اُس وقت کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو صاحب مرحوم کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلی۔ شروع میں اس کی وجہ یہ تھی کہ ملک کے عام انتخابات میں ان کی پیپلز پارٹی نے بڑی اکثریت سے اسمبلی کی سیٹیں حاصل کر لی تھیں۔ اپوزیشن کا کہنا یہ تھا کہ انتخابات میں شدید دھاندلی ہوئی ہے، اس لئے ملک میں نئے انتخابات کرائے جائیں۔ اس موقف پر ملک کی نو سیاسی جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کیا، جس کا اصل مطالبہ یہی تھا کہ انتخابات دوبارہ کرائے جائیں۔ ان جماعتوں میں بڑی دینی سیاسی جماعتیں جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اسلامی بھی شامل تھیں۔ انہوں نے اس تحریک کو "نظام مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم" قائم کرنے کا عنوان دیا، اور ملک بھر میں بھٹو صاحب کی حکومت ختم کرنے کے لئے مظاہرے شروع ہوگئے۔ اور آخر کار اُس وقت کے چیف آف آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے بھٹو حکومت کا تختہ الٹ کر مارشل لاء نافذ کر دیا۔

اس تحریک میں جن حضرات نے جان و مال کی قربانیاں دی تھیں، شاید یہ ان کے اخلاص کی برکت تھی کہ مارشل لاء کے نتیجے میں جن جنرل صاحب نے اقتدار سنبھالا (یعنی جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم) وہ بذات خود نماز روزے کے پابند اور بحیثیت مجموعی دینی ذہن کے حامل تھے، اور جس تحریک کے نتیجے میں وہ برسر اقتدار آئے تھے، وہ "نظام مصطفی " کے نام پر چلی تھی۔ اس لئے انہوں نے برسر اقتدار آنے پر ملک میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کا عزم ظاہر کیا، اور باوجودیکہ سیاسی عناصر کو مارشل لاء کے خلاف ہونا چاہئے، اُس وقت

تمام دینی اور سیاسی جماعتوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔

اُس وقت کے دستور کے مطابق ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا واحد طریقہ یہ تھا کہ دستور کے تحت ایک ادارہ "اسلامی نظریاتی کونسل" کے نام سے قائم کرنا حکومت کی ذمہ داری تھی جو شرعی احکام کو قانونی حیثیت دینے کے لئے سفارشات مرتب کرے۔ ابتک اس ادارے کے قیام، اس کی ہیئت ترکیبی اور اُس کی سفارشات کو روبعمل لانے کے سلسلے میں حکومتیں طرح طرح کے لیت ولعل سے کام لیتی چلی آئی تھیں۔ اس کے بارے میں خود میں نے البلاغ میں متعدد اداریے لکھے تھے کہ اس ادارے کو مضبوط اور مؤثر بنانے کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ جنرل ضیاء الحق صاحب نے اس موقع پر یہ اعلان کیا کہ وہ اس ادارے کو ازسر نو تشکیل دیکر اس کی سفارشات پر عمل کرائیں گے۔ یہ اعلان اگرچہ ہمت افزا تھا، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس پر عمل کس درجے میں ہو سکے گا۔

اسی دوران مجھ سے حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ جنرل صاحب نے اُن سے مشورہ کیا تھا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کا رُکن کس کس کو بنایا جائے، اور انہوں نے میرا نام بھی مجوزہ ناموں میں شامل کرکے بھیج دیا ہے۔ دوسری طرف مولانا ظفر احمد انصاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی مجھ سے یہی بات فرمائی کہ انہوں نے بھی میرا نام رکنیت کے لئے تجویز فرمایا ہے۔

مجھے اپنی نااہلی کے علاوہ دو وجہ سے تأمل تھا۔ ایک یہ کہ مارشل لاء کی آئینی حیثیت کچھ نہیں ہوتی، اور خود جنرل صاحب کے اعلان کے مطابق وہ صرف نوے دن کے لئے اقتدار میں آئے ہیں جس کے بعد نئے انتخابات ہوں گے۔ اس مختصر مدت میں اسلامی نظریاتی کونسل کے ذریعے کوئی قابل ذکر پیش رفت مشکل معلوم ہوتی تھی، دوسرے ابھی یہ بھی واضح نہیں تھا کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پہلے کی طرح الماریوں کی زینت رہیں گی، یا ان پر عمل کا بھی کوئی اطمینان بخش راستہ ہوگا۔

لیکن ان دونوں بزرگوں نے جو جنرل صاحب سے تفصیلی ملاقاتیں کر چکے تھے، یہ امید ظاہر فرمائی کہ ان شاء اللہ اس مرتبہ سفارشات پر عمل ہوگا، اور اس مختصر مدت میں بھی اتنا کام کیا جاسکے گا جو آئندہ کے لئے بنیاد کا کام دے گا۔ ان بزرگوں نے نہ صرف یہ کہ یہ امید ظاہر فرمائی، بلکہ خود بھی اس کی رکنیت قبول فرمالی۔ اس سے مجھے حوصلہ ہوا کہ جو کچھ ہوگا، ان بزرگوں کی سرپرستی میں ہوگا۔

دوسری طرف مجھے اپنے ایک مقدس بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات یاد آئی۔ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے مجازین صحبت میں سے بڑے پائے کے بزرگ تھے، اور جاننے والے جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ انہیں رؤیائے صالحہ اور بعض اوقات کشف سے نوازتے رہتے ہیں۔ میرے دوست جناب محمد کلیم صاحب کے والد جناب محمد ایوب صاحب کی درخواست پر وہ اپنی آخر عمر میں انہی کے گھر کے ایک بیرونی کمرے میں مقیم تھے، اور وہیں بیٹھ کر آنے جانے والوں کو اپنے فیوض سے مستفید فرماتے رہتے تھے۔ میں وقتاً فوقتاً کلیم صاحب کے گھر جاتا رہتا تھا، اور حضرت بابا صاحب کی خدمت میں بھی حاضری دیتا تھا، وہ بھی مجھ پر بہت شفقت فرماتے تھے، اور اپنی گرانقدر نصیحتوں سے نوازتے رہتے تھے، چنانچہ تقریباً ہر بار حضرت کی کوئی نہ کوئی قیمتی بات گرہ میں باندھکر لوٹتا تھا۔

۱۹۷۱ء میں جب ذوالفقار علی بھٹو صاحب کی حکومت نئی نئی برسر اقتدار آئی، تو انہوں نے کلیم صاحب کے ذریعے مجھے پیغام بھیجا کہ میں اُن سے جا کر ملوں۔ یہ میری غفلت ہی تھی کہ میں کسی اور مصروفیت میں الجھ گیا، اور فوراً حضرت کی خدمت میں حاضری نہ دے سکا، اور دو تین دن گذرنے کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرتؒ نے پہلے تو اس بات پر محبت آمیز خفگی کا اظہار فرمایا کہ میں نے آنے میں اتنی دیر کی۔ میں نے معافی مانگی، تو اس پر حضرت نے فرمایا: " میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ تم اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھے ہو، اور وہ تمہیں کہہ رہے ہیں کہ اسلامی قانون لکھو۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت تم سے اسلامی قانون کے سلسلے میں کوئی کام لیں گے۔ ایسا موقع آئے تو تم انکار مت کرنا۔"

یہ وہ وقت تھا جب مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ملک میں پیپلز پارٹی کی حکومت کی وجہ سے دینی حلقوں کے دل ٹوٹے ہوئے تھے، اور دور دور تک ملک میں اسلامی قانون کی طرف پیش رفت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ میں نے حضرتؒ کے اس ارشاد کو ایک نیک فال سمجھ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، اور پھر بات آئی گئی ہوگئی۔ لیکن اس موقع پر جب اسلامی نظریاتی کونسل کی رکنیت کا سوال آیا تو مجھے حضرت بابا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات یاد آئی، اور خیال ہوا کہ شاید اس خواب کی تعبیر اسی شکل میں ہو کہ مجھے اس کونسل کے ذریعے اسلامی قانون کی کوئی خدمت کرنے کا موقع مل جائے۔

چنانچہ میں نے اپنے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ سے مشورے کے بعد اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ رکنیت قبول

کرلی، اور یہیں سے میری دارالعلوم سے باہر کی مصروفیات کا آغاز ہوا۔

چونکہ دستور کی رو سے اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین کے لئے ضروری تھا کہ وہ کسی اعلیٰ عدالت کا جج ہو، اس لئے وہ جناب جسٹس محمد افضل چیمہ کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی، اور میرے علاوہ اُس کے ارکان مندرجہ ذیل تھے:

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل

حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب نعیمی

حضرت پیر قمرالدین صاحب سیالوی

حضرت مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد

حضرت مولانا ظفر احمد صاحب انصاری

جناب اے کے بروہی صاحب ایڈوکیٹ

جناب خالد اسحاق صاحب ایڈوکیٹ

جناب جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین صاحب سابق جج سپریم کورٹ

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب ڈپٹی گورنر اسٹیٹ بینک آف پاکستان

کونسل کا پہلا افتتاحی اجلاس اسلام آباد میں تھا۔ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ تم میرے ساتھ ایک ہی جہاز میں چلنا۔ میرے لئے کونسل کی رکنیت میں کشش کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح حضرت بنوری قدس سرہ کی معیت بار بار نصیب ہوگی، اور ان کی رہنمائی میں کام کا موقع ملے گا۔ الحمدللہ ایسا ہی ہوا۔ میں نے اُسی جہاز میں سیٹ بک کرائی جس میں حضرت کو سفر کرنا تھا، اور پھر حضرتؒ کے ساتھ ہی اسلام آباد پہنچا، جناب مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق سکندر صاحب مد ظلہم بھی حضرت کی خدمت کے لئے حضرت کے ساتھ تھے۔ قیام کا انتظام گورنمنٹ ہوسٹل میں تھا، اور حضرتؒ کے کمرے کے قریب ہی مجھے کمرہ ملا۔

افتتاحی اجلاس میں جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم نے بھی شرکت کی اور اپنی تقریر میں اس

عزم کا اعادہ کیا کہ آپ حضرات جو سفارشات دیں گے، ان پر ان شاء اللہ تعالیٰ فوری طور سے عمل کیا جائے گا۔اور انہوں نے کونسل کے ارکان سے خاص طور پر یہ فرمائش کی کہ وہ ملک سے سودی نظام کو ختم کرنے کے لئے بینکاری کے نظام میں شرعی اصولوں کے مطابق اصلاحات تجویز کریں، اور اس کو اپنے کام میں اولیت دیں۔تقریر کے بعد ارکان نے اور بالخصوص حضرت بنوری قدس سرہ نے جنرل صاحب کے جذبات اور ان کی تقریر کو سراہا، اور فرمایا: " إِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ۔"

اس کے بعد کونسل کا پہلا اجلاس شروع ہوا، تو اس میں یہ بات زیر بحث آئی کہ کام کا آغاز کس طرح کرنا چاہئے۔بعض حضرات نے فرمایا کہ کونسل کا بنیادی کام قوانین کو شریعت کے سانچے میں ڈھالنا ہے، اس لئے کام کا آغاز بھی قوانین کے بارے میں سفارشات سے کرنا چاہئے۔ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے فرمایا کہ ملک میں معاشی اصلاحات کو اولیت دینی چاہئے۔بحث کے بعد باتفاق یہ طے پایا کہ دونوں سطحوں پر ایک ساتھ کام کرنے کے لئے دو پینل تشکیل دیئے جائیں۔ایک پینل قوانین پر کام کرے، اور دوسرا اسلام کی معاشی تعلیمات پر عمل کرنے کے لئے بینکاری کے نظام کو سود سے پاک کرنے اور زکوٰۃ کا نظام نافذ کرنے کے لئے سفارشات تیار کرے۔چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

قوانین کے سلسلے میں حضرت بنوری قدس سرہ نے فرمایا کہ شریعت کی شوکت حدود شرعیہ سے قائم ہوتی ہے، اس لئے حدود شرعیہ کے نفاذ کے لئے قوانین بنانے کو اولیت دی جائے۔اس پر سب کا اتفاق بھی ہوگیا۔کونسل کے جو ارکان مروجہ قوانین کے ماہر تھے، ان کی رائے یہ تھی کہ مروجہ قوانین کا ڈھانچہ برقرار رکھتے ہوئے اُن میں ایسی ترمیمات تجویز کردی جائیں، جو ان قوانین کو شریعت کے مطابق بناسکیں، کیونکہ اس طرح وکلاء اور ججوں کو قوانین کی تشریح اور تنفیذ میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔میں نے اس تجویز کی مخالفت کی، اور عرض کیا کہ اسلامی قوانین اور مروجہ انگریزی قوانین کے درمیان بنیادی تصورات کا اختلاف ہے، اس لئے موجودہ قوانین میں پیوندکاری کے عمل سے مقصود حاصل نہیں ہوگا، بلکہ اس سے شدید غلط فہمیاں پیدا ہوں گی، کیونکہ ان کا ڈھانچہ برقرار رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ابتک اُن قوانین کے تحت جو عدالتی فیصلے ہوئے ہیں، وہ اسلامی ترمیمات کے بعد بھی بطور نظیر استعمال کئے جائیں۔اس طرح اسلامی قوانین کے تصورات میں ایسا شدید خلط ملط واقع ہوگا جس سے شرعی احکام مسخ ہوکر رہ جائیں گے۔لہٰذا میری حتمی رائے یہ تھی کہ شریعت کے

بنیادی احکام کے لئے ازسرِنو قانون سازی ضروری ہے، موجودہ قوانین میں ترمیم سے کام نہیں چلے گا۔اس موضوع پر کافی ردوقدح ہوتی رہی۔آخرکار میں نے یہ محسوس کیا کہ اس بارے میں نظریاتی بحث کے بجائے عملی طور پر کوئی مسودہ تیار کرکے پیش کرنے سے صورت حال زیادہ واضح ہوسکے گی۔چنانچہ میں نے عرض کیا کہ اگر آپ حضرات چاہیں تو میں ورکنگ پیپر کے طور پر ایک مسودہ تیار کرکے پیش کردوں۔ میں چونکہ پوری کونسل میں سب سے کمسن تھا، (میری عمر اُس وقت شمسی حساب سے چونتیس سال تھی) اس لئے کسی نے اس پر نہ انکار کیا، نہ بہت زیادہ ہمت افزائی کی۔لیکن حضرت بنوری قدس سرہ نے پہلے ہی مجھ سے فرمایا ہوا تھا کہ تمہیں کونسل میں تسوید کا اہم کردار ادا کرنا ہے، اور خود مجھے ایک طرف یہ شوق تھا کہ اسلامی قوانین کی تسوید میں میرا قلم کام آئے، اور دوسری طرف میرا تجربہ یہ ہے کہ اجتماعی کاموں میں زیادہ تر بات اُسکی چلتی ہے جس کے ہاتھ میں قلم ہو۔ اس لئے میں نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔

لیکن ابھی کونسل کے دو اجلاس ہی ہوئے تھے کہ حضرت بنوری قدس سرہ پر، جن کی صحبت وسرپرستی میرا بہت بڑا سہارا تھی، اچانک دل کا شدید حملہ ہوا اور آخرکار وہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ (حضرت کی وفات کا مفصل واقعہ اور اپنے تاثرات میں حضرت کے تذکرے میں لکھ چکا ہوں)؛[1] اگرچہ میں حضرتؒ کے فرمانے پر کونسل میں آیا تھا، اور مجھے یہ توقع تھی کہ قدم قدم پر حضرتؒ کی سرپرستی مجھے حاصل رہے گی، لیکن اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد اسے نبھانا بھی ضروری تھا، اس لئے میں نے کام جاری رکھا، اور اپنے وعدے کے مطابق میں نے حدِ سرقہ کے قانون کا ایک مسودہ تیار کیا، اور اس کی نقلیں تمام ارکان میں تقسیم کردیں، تاکہ وہ اسے دیکھ کر آئیں۔اگلے دن (مؤرخہ ۵ جنوری ۱۹۷۸ء کو) میں نے اسے کونسل کے اجلاس میں پیش کردیا۔کونسل کے ایک بزرگ ممبر نے (جو کسی نوعمر مولوی کے کام کو قانونی کاوش قرار دینا نہیں چاہتے تھے) یہ تبصرہ فرمایا کہ:" آپ کے اس کام سے ان شاء اللہ ہم فائدہ اٹھائیں گے، لیکن معاف کیجئے اس کو مسودۂ قانون نہیں کہا جاسکتا"۔ میں نے عرض کیا کہ اس کو آپ مسودۂ قانون کہیں یا نہ کہیں، میں پہلے ہی یہ عرض کرچکا ہوں کہ اسے ایک ورکنگ پیپر کے طور پر دیکھئے، اور جہاں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس ہو، وہاں ترمیم کرلیجئے۔یہ بات سنتے ہی کونسل کے چیئرمین جناب جسٹس افضل چیمہ صاحب نے (جو اس وقت سپریم

۱۔ نقوشِ رفتگاں ص:۱

کورٹ کے سینئر ترین جج بھی تھے) فوراً مجھ سے کہا: " نہیں نہیں مولانا! میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے آپ کے مسودے کا مطالعہ کرکے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ اس سے اسلامی فقہ کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، اور دوسرے اس وجہ سے کہ آپ نے جس خالص قانونی اسلوب میں یہ مسودہ تیار کیا ہے، اور جن قانونی باریکیوں کا لحاظ رکھا ہے، اُس کی مجھے پہلے توقع نہیں تھی، اور اس سے ہمیں یہ امید بندھی ہے کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ہم اسلامی قوانین کو مدون کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔"

پھر انہوں نے دوسرے ارکان سے کہا کہ یہ یقیناً ایک مسودۂ قانون ہے، اور ہماری گفتگو کے لئے ایک بنیاد فراہم کرتا ہے، اس لئے اب ہم شق وار اس کو پڑھیں گے، اور اس پر جو حضرات کوئی اعتراض یا تجویز دینا چاہیں، بیشک وہ متعلقہ مقام پر اپنی تجویز پیش کردیں۔"

اس طرح اس مسودے کی بنیاد پر کئی دن بحث ہوتی رہی، اور بحث ومباحثہ کے نتیجے میں اس میں تبدیلیاں بھی ہوئیں، لیکن آخرکار وہ کونسل کی طرف سے متفقہ طور پر منظور ہوگیا، اور پھر کونسل کے چیئرمین اور ارکان نے مجھ سے فرمائش کی کہ دوسری حدود شرعیہ سے متعلق قوانین کے مسودات بھی میں تیار کروں۔ چنانچہ اس کے بعد حد حرابہ، حد زنا، حد قذف اور حد شرب خمر کے بارے میں بھی ابتدائی مسودات میں نے تیار کئے۔

آخرکار طویل بحث کے بعد وہ بھی منظور ہوئے۔ الحمد للہ اس سارے کام میں حضرت مفتی سیاح الدین کاکاخیل اور حضرت مفتی محمد حسین نعیمی رحمہما اللہ تعالیٰ نے جس محبت، تندہی اور اخلاص کے ساتھ میری مدد فرمائی، اور اپنے مشوروں سے نوازا، اور جس طرح قدم قدم پر میری ہمت افزائی فرمائی، وہ ان کی بڑائی کی دلیل تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں بہترین جزائے خیر عطا فرمائیں۔ آمین

دوسرے مسودات کی تیاری میں تو کوئی بڑا مسئلہ پیش نہیں آیا، لیکن جب حد رجم کی بات آئی، تو کونسل کے قانون داں ارکان کو بڑا تامل تھا جن میں جناب خالد اسحٰق صاحب، جناب جسٹس صلاح الدین صاحب اور خود جسٹس افضل چیمہ صاحب بھی داخل تھے، اور مولانا ظفر احمد انصاری صاحب بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی تدبر قرآن کی بنیاد پر متردد تھے۔ کونسل کے ارکان میں یہ بحث دیر تک چلتی رہی، اور شاید بعض ارکان کی خواہش پر سعودی عرب سے جناب ڈاکٹر معروف الدوالبی (سابق وزیر اعظم شام) کو بلایا گیا جو اُس وقت سعودی عرب کے شاہی مشیر تھے، اور عرب دنیا میں انہیں ایک محقق کے طور پر جانا جاتا تھا۔ ان کو دعوت

دینے کا مقصد یہ بتایا گیا کہ قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان کے تجربے سے فائدہ اٹھایا جائے، اور اس میں عرب ممالک کی نمائندگی بھی ہو سکے۔

انہوں نے اپنی طرف سے قوانین حدود کا مسودہ عربی زبان میں خود مرتب کر کے پیش کیا، اور ان کی شخصی اہمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا مرتب کیا ہوا اردو مسودہ کچھ عرصے کے لئے پیچھے چلا گیا، اور ان کے مسودے کو ورکنگ پیپر کے طور پر کونسل کے کئی اجلاسات میں بحث کے لئے منظور کر لیا گیا۔ لیکن دشواری یہ پیش آئی کہ کونسل کے جو ارکان عربی سے ناواقف تھے، ان کے لئے اُس پر بحث کرنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔ لہٰذا آخر کار یہ طے پایا کہ اُسے میرے مسودے کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے گا۔ اس طرح رفتہ رفتہ بنیاد میرے مسودے ہی پر پڑ گئی۔ جب حد رجم کا ذکر آیا تو انہوں نے یہ موقف اختیار فرمایا کہ رجم کو حد کے بجائے تعزیر کے طور پر اختیار کیا جائے۔ ڈاکٹر معروف دوالبی اگرچہ علم دین میں کوئی باقاعدہ اختصاص نہیں رکھتے تھے، لیکن شام کے سابق وزیر اعظم اور اس وقت سعودی عرب کے شاہی مشیر ہونے کی حیثیت سے انہیں ایک مقام حاصل تھا۔ اس لئے کونسل کے جو حضرات پہلے سے حد رجم کے خلاف تھے، انہیں ڈاکٹر معروف دوالبی کی صورت میں ایک سہارا مل گیا۔ چنانچہ اس موضوع پر کئی دن بحث جاری رہی۔ میرے علاوہ کونسل کے علماء ارکان، خاص طور پر حضرت مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل اور حضرت مولانا مفتی محمد حسین نعیمی رحمۃ اللہ علیہما نے اس بات پر زور دیا کہ جمہور امت کے خلاف اس رائے کو پاکستان کا قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب نے بھی اس کی تائید کی۔ جو حضرات اُسے حد کے طور پر تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے، ان کی تائید میں ڈاکٹر معروف دوالبی نے ایک مرحلے پر یہ کہا کہ رجم کی حد کی حیثیت سورۂ نور کی پہلی آیت نے منسوخ کر دی ہے۔ مجھے چونکہ اندازہ تھا کہ یہ دلیل پیش کی جائے گی، اس لئے میں اس کی تحقیق کر کے آیا تھا۔ چنانچہ اس بحث کے آخر میں میں نے تفصیلی گفتگو کی اجازت مانگی، اور تین نکات پر زور دیا۔ ایک یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رجم کے جتنے واقعات ہوئے ہیں، وہ سب کے سب سورۂ نور کی آیت کے نازل ہونے کے بعد کے ہیں، کیونکہ سورۂ نور ۵ ہجری میں نازل ہوئی، اور رجم کا سب سے پہلا واقعہ یہودیوں کے رجم کا ہے جس میں حضرت عبداللہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود موجود تھے، اور وہ ۸ ھ ہجری میں اسلام لائے تھے۔ لہٰذا اس کو منسوخ قرار دینا کسی طرح درست نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ رجم کی احادیث اخبار آحاد نہیں، بلکہ معنیً متواتر ہیں۔ تیسرے اگر یہ حکم منسوخ ہوتا، تو حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما اپنے اپنے عہد

خلافت میں رجم کی سزا پر عمل کر کے اُسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار نہ دیتے۔

ان تینوں باتوں کے دلائل کتابوں کے حوالوں کے ساتھ میں نے پیش کئے۔ آخر کار ارکان کی اکثریت نے ہمارے ساتھ اتفاق کیا، اور حدِ رجم کو قانون کا حصہ بنانے کا فیصلہ ہو گیا۔

اسی زمانے میں سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم حضرت شیخ عبدالعزیز بن باز رحمۃ اللہ علیہ کا ایک خط کونسل کے نام موصول ہوا جس میں انہوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار فرمایا تھا کہ ڈاکٹر معروف دوالبی نے رجم کو حد کے بجائے تعزیر قرار دینے کا موقف اختیار کیا ہے۔ انہوں نے اپنے خط میں واضح فرمایا تھا کہ ڈاکٹر معروف دوالبی اپنی ذاتی حیثیت میں وہاں آئے ہیں، اور وہ سعودی عرب کے علماء کی نمائندگی نہیں کرتے۔ علماء کا واضح موقف یہی ہے کہ رجم حد شرعی ہے، اور کونسل کو اسی کے مطابق قانون سازی کرنی چاہئے۔ اس خط نے کونسل میں ہمارے موقف کو بڑی تقویت پہنچائی۔ افسوس ہے کہ وہ خط تو میرے پاس محفوظ نہیں رہا، لیکن اُس کا جو جواب میں نے کونسل کی طرف سے بھیجا تھا، وہ محفوظ ہے۔ اس کا متن یہ تھا:

اسلام آباد ---فی ---ربیع الأول ۱۳۹۹ھ

إلی سماحة العلامة المحقق الشیخ عبد العزیز ابن عبد الله بن باز، الرئیس العام لإدارات البحوث العلمیة والإفتاء والإرشاد، حفظه الله تعالیٰ ورعاه.

السلام علیکم ورحمة الله وبرکاته، وبعد!

لقد استلمت بسرور کتابکم المؤرخ فی ۱۳/۳/۱۳۹۹ھ والذی احتوی علی تأییدکم لما ذهبت إلیه أکثریة مجلس الفکر الإسلامی من "وجوب حد الزانی بالجلد مائة جلدة إذا کان غیر محصن ورجمه إذا کان محصنا."

ویسرّنی أن أفیدکم فی هذا الصدد أن المشروع القانونیَ الّذی وصلکم لم یکن آخر ما شفع به المجلس، وإنما کان مشروعاً ابتدائیاً، ثم إننا قد وفّقنا لإعادة النظر فیه وجعله أشمل وأوضح وأوفق بالقرآن والسّنّة، فالمشروع الأخیر الذی أرسلناه إلی الحکومة، والذی وفّقت الحکومة بتنفیذه قد بتّ فی حد الزنا علی ما ذهب إلیه جمهور علماء المسلمین وعلی ما أیّدتموه من رجم الزانی المحصن حدّاً لا تعزیراً، فالقانون الذی وفق الله سعادة الرئیس الجنرال ضیاء الحق لتنفیذه یقوم علی أساس مذهب الجمهور من غیر أیّما

خلاف والحمد لله، وقد حتم المجلس بهذا الرأى خلال جلساته الأخيرة.

أما المشروع الأول الذى تشرّف بمطالعتكم إياه، فكان بعض أعضاء المجلس قد اختاروا فيه الرأى القائل بأنّ الرجم تعزير، وقد أيده معالى الدكتور معروف الدواليبى، لا لأنّهم ينكرون ثبوت الرجم بالسنة، وإنما فعلوا ذلک بالنظر إلى ظروف محلية خاصة، وهى أنه كانت هناک دعايات قوية وعنيفة فى أوساط بعض المثقفين ثقافة علمانية، والطلاب، والقضاة والمحامين وغيره ضد تطبيق أحكام الشريعة الإسلامية، وخاصة فى أحكام الحدود الّتى وصفها بعضهم بكلّ وقاحة بالأحكام الوحشيّة والرجعية، وإن علماء هذه البلاد وقادة الفكر من أهل الدين قد قاوموا هذه الأفكار الباطلة بكل عزيمة .ولقد كان لمعالى الدكتور معروف الدواليبى كبير الفضل فى هذا الصدد، فإنه قد ساعدنا فى هذه المهمة مساعدة مشكورة، وتولى خلال أشهرِ الحوار مع الفئات المختلفة بالحكمة والموعظة الحسنة مع شرح محاسن الشريعة الاسلامية بما فيها الحدود بأسلوب علمىّ جذّاب.

غير أن تلک الدعايات المسمومة ضد الشريعة الاسلامية فى الخارج والداخل قد جعلت النّاس يخشون من أن يكون نصيب هذه القوانين مثل نصيبها لدى الحكومتين الليبية والمصرية، حيث تراجعتا عن إعلان هذه القوانين بعد الانتهاء من صياغتها، وذلک تحت ضغط تلک الدعايات الخبيثة.

ففى هذا الجوّ اقترح بعض اعضاء المجلس وأيدهم معالى الدكتور الدواليبى بأن يبدى المجلس رأيين فى حق الرجم ليمكن للحكومة الأخذ بما هو أسهل فى تلک الظروف.

وكان كل ذلک فى مبدأ الأمر، وأما الآن فقد انقشعت السّحب والحمد لله، وقد استطاع سعادة الرئيس الجنرال ضياء الحق بفضل الله تعالىٰ أن يتغلب على العقبات، وأعلن بكل قوة وحزم تنفيذ الشريعة الإسلامية، وخاصةً الحدود منها، على أساس رجم المحصن حدّاً لا تعزيراً.

ولا بد لنا أن نشكر هنا المملكة العربية السعودية الشقيقة التى بعثت إلينا معالى الدكتور معروف الدواليبى، حفظه الله فإننا قد استفدنا بعلمه وتجار به وحكمته فى شتى

مراحل صعبة، ونعترف بكل إجلالٍ وتقدير ذلك الجهد الذى بذله لمساعدتنا فى هذه المهمة الجليلة.

ويجدر هنا بالذكر أنّ معالى الدكتور الدواليبى لم يقل قط إنه يمثل علماء المملكة السعودية، وإنما استفدنا من آراء ه الشخصية القيمة اعترافا بعلمه.

واخيرا نشكر فضيلتكم لما تفضلتم برايكم الثمين، فإنّه يدلّ على اهتمامكم البالغ نحو المجلس ونحو باكستان بما يجعلنا مفتخرين به شاكرين لله سبحانه.

كما نشكر فضيلتكم لإرسال سماحة الشيخ عبد الله بن حسن عضو هيئة كبار العلماء الذى يرافقنا فى المجلس منذ يومين ولا نزال نستفيد من علمه وعرفانه، ونرجو فضيلتكم مساعدتنا فى مهمتنا التى توليناها بكل ما أمكن، وإرشادنا إلى الصواب فى المستقبل أيضاء ولفضيلتكم الشكر والمنة.

والسلام عليكم ورحمة الله

ترجمہ

بسم الله الرحمن الرحيم

از اسلام آباد، ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

گرامی قدر علامہ محقق الشیخ عبدالعزیز ابن عبداللہ بن باز، الرئیس العام لا دارات البحوث العلمیۃ والا فتاء والا رشاد، حفظہ اللہ تعالیٰ ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آنجناب کا گرامی نامہ مؤرخہ ۳/۱۳/ ۱۳۹۹ھ مسرت کے ساتھ موصول ہوا، جو اسلامی نظریاتی کونسل کے اکثریتی موقف کے حق میں آپ کی تائید پر بھی مشتمل ہے، یعنی یہ موقف کہ زانی غیر محصن پر سو کوڑے کی حد لازم ہے، اور محصن پر رجم کی۔

مجھے آنجناب کو اس سلسلے میں مطلع کرنے پر بھی مسرت ہے کہ قانون کا جو مسودہ آنجناب تک پہنچا ہے، وہ

مجلس کی سفارشات کی آخری شکل نہیں ہے، بلکہ وہ ایک ابتدائی مسودہ ہے، جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہم نے اس پر نظرِ ثانی کر کے اسے زیادہ جامع، واضح اور قرآن وسنت سے زیادہ موافق بنایا، چنانچہ جو آخری مسودہ ہم نے حکومت کو بھیجا ہے، اور جسے حکومت کو نافذ کرنے کی توفیق ہوئی، اُس میں حتمی طور پر حدِّ زنا کے سلسلے میں وہ موقف اختیار کیا گیا جو جمہور علماء کا ہے، اور جس کی تائید آپ نے بھی فرمائی، یعنی زانی محصن کو سنگسار کرنا بطور حد ہے، تعزیر کے طور پر نہیں، غرضیکہ جس قانون کو نافذ کرنے کی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے عالی جناب صدر جنرل ضیاء الحق صاحب کو توفیق عطا فرمائی اس کی بنیاد بحمد للہ بغیر کسی ادنیٰ اختلاف کے جمہور کے مذہب پر ہے، کونسل نے اپنے آخری اجلاسات میں اسی کے مطابق حتمی موقف اختیار کیا۔

جہاں تک اُس پہلے مسودہ کا تعلق ہے جسے یہ شرف حاصل ہے کہ آپ کے مطالعے میں آیا ہے، اس مسودے میں کونسل کے بعض ارکان نے یہ رائے اختیار کی تھی کہ رجم ایک تعزیر ہے، اور اس موقف کی تائید ڈاکٹر معروف دوالیبی صاحب نے فرمائی، اس وجہ سے نہیں کہ یہ حضرات رجم کے ثبوت کو سنت سے نہیں مانتے ہیں، بلکہ انہوں نے یہ موقف کچھ خاص مقامی حالات کی بناء پر اختیار کیا، یعنی یہ کہ احکام شریعت کے نفاذ کے خلاف زبردست اور شدید پروپیگنڈا بعض ان حضرات میں پایا جاتا ہے جن کی تربیت سیکولر ثقافت کے ساتھ ہوئی ہے، نیز طلبہ، جج حضرات، وکلاء وغیرہ میں بھی پایا جاتا ہے؛ اور خاص طور پر احکامِ حدود کے بارے میں ان میں سے بعض لوگوں نے بڑی بے شرمی کے ساتھ یہ کہا کہ وہ وحشی اور رجعت پسند قوانین ہیں۔ اس ملک کے علماء اور متدین فکری رہنماؤں نے ان باطل افکار کا بڑے حوصلے کے ساتھ مقابلہ کیا، اور عالی جناب ڈاکٹر معروف دوالیبی کا اس سلسلے میں بڑا اعلیٰ کردار ہے، آپ نے ہماری اس مہم میں بڑی مدد فرمائی جس کے ہم ممنون ہیں، یہاں کچھ انہوں نے کچھ مہینوں تک مختلف گروہوں کے ساتھ حکمت اور موعظہ حسنہ، اور بیانِ محاسن شریعت بشمول احکام حدود کے ساتھ گفتگو کو اپنے ذمہ لیا تھا، اور یہ کام آپ نے ایک پُرکشش اور علمی اسلوب پر انجام دیا۔

البتہ شریعت کے خلاف ان اندرونی اور بیرونی زہریلے پروپیگنڈوں نے لوگوں کے اندر یہ اندیشہ پیدا کر دیا کہ ان قوانین کے حصے میں وہ نتیجہ نہ آئے جو لیبیا اور مصر کی حکومتوں کے ان جیسے قوانین کے حصے میں آیا تھا کہ مدوّن کرنے کے بعد بھی ان حکومتوں نے ان کو نافذ کرنے کے اعلان سے اسی قسم کے ناپاک پروپیگنڈوں کے دباؤ میں آکر پسپائی اختیار کی۔

اسی ماحول میں کونسل کے بعض اعضاء نے یہ تجویز پیش کی، اور عالی جناب ڈاکٹر دوالیبی صاحب نے ان

کی تائید فرمائی، کہ کونسل حکومت کے سامنے رجم کے سلسلے میں دونوں رائے پیش کردے، تا کہ حکومت کے لئے اس رائے کو لینے کا امکان رہے جو موجودہ حالات میں زیادہ آسان ہو۔

یہ تمام تر صورتِ حال ابتداء کی تھی، اب تو بحمد اللہ تمام بادل چھٹ گئے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے عالی جناب صدر جنرل ضیاء الحق صاحب تمام رکاوٹوں کو سر کرنے میں کامیاب ہوئے، اور آپ نے پوری قوت اور اعتماد کے ساتھ شریعت، اور خاص طور پر حدود کے نفاذ کا اعلان کیا، کہ رجم محض حد ہے تعزیر نہیں۔

اس موقع پر برادر ملک "المملكة العربية السعودية" کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے جس نے عالی جناب ڈاکٹر معروف دوالیبی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے پاس بھیجا، ہم نے ان کے علم، تجربے اور حکمت سے بڑے کٹھن مراحل میں استفادہ کیا، اور ہم پورے احترام اور قدر دانی کے ساتھ اس عظیم مہم میں ان کے تعاون کے معترف ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی مناسب ہے کہ عالی جناب ڈاکٹر دوالیبی صاحب نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا تھا کہ وہ المملكة السعودية کے علماء کی نمائندگی فرما رہے ہیں، بلکہ ہم نے ان کی قیمتی ذاتی آراء سے ان کے علم کے معترف ہو کر استفادہ کیا۔

آخر میں ہم آنجناب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی قیمتی رائے عنایت فرمائی، کیونکہ یہ کونسل اور پاکستان کے حق میں آپ کے بڑے اہتمام کی دلیل ہے، جو ہمارے لئے قابلِ فخر بھی ہے، اور اس پر ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر بھی ادا کرتے ہیں۔

اسی طرح ہم آنجناب کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے الشیخ عبد اللہ بن حسن، رکن ہیئت کبار العلماء، کو ہمارے پاس بھیجا، دو روز سے وہ کونسل میں ہماری رفاقت فرما رہے ہیں، اور ہم برابر ان کے علم وعرفان سے مستفید ہو رہے ہیں، آنجناب سے امید کرتے ہیں کہ ہم جس مہم کو لے کے چلے ہیں، اس میں ہر ممکن تعاون سے ہماری مدد فرماتے رہیں گے، اور درست بات کی طرف مستقبل میں بھی ہماری رہنمائی فرماتے رہیں گے، آنجناب کے ہم شکرگزار اور احسان مند رہیں گے۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔

جاری ہے........

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم

نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(بیالیسویں قسط)

اُس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کی تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم کی ذاتی دلچسپی کی وجہ سے کونسل کی سفارشات فوراً کابینہ میں اور کابینہ کی منظوری کے بعد تنفیذ کے لئے متعلقہ وزارتوں میں پہنچ جاتی تھیں۔ چنانچہ جب کونسل کی طرف سے مسودات اردو میں تیار ہوگئے، تو کابینہ نے ان کی اصولی منظوری دینے کے بعد انہیں وزارت قانون کو بھیج دیا، تاکہ وہ قانونی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیکر اُنہیں انگریزی میں منتقل کرے۔ ہماری رائے تو یہ تھی کہ ہمارے قانون کی زبان اُردو ہونی چاہئے، اور قانون کا ایسی زبان میں ہونا جو ملکی آبادی میں ایک فی ہزار افراد بھی نہ سمجھتے ہوں، سوائے ذہنی غلامی کے اور کچھ نہیں۔ لیکن مشکل یہ ظاہر کی گئی کہ ابتک چونکہ قانون کی زبان انگریزی رہی ہے، اس لئے قانون کی تشریحات میں عدالتوں کے فیصلوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، اور ہماری عدالتیں ان تشریحات کی عادی ہیں۔ فوری طور پر زبان کی تبدیلی سے عدالتیں مشکل میں پڑجائیں گی۔ اگرچہ یہ دلیل اتنی وزنی نہیں تھی، اور اس مشکل کا حل نکالا جاسکتا تھا، لیکن اس وقت اصل مسئلہ یہ تھا کہ قانون کو کسی طرح بدل کر شریعت کے مطابق بنایا جائے، اور اُس وقت زبان کے مسئلے پر اصرار کرنے سے اس مقصد ہی کے فوت ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے ہم نے بادل ناخواستہ ان قوانین کو انگریزی میں ڈھالنے پر آمادگی ظاہر کردی۔ البتہ یہ اندیشہ سب کو تھا کہ جب وزارت قانون ان کو انگریزی میں منتقل کرے گی، تو کہیں ان میں کوئی جوہری تبدیلی واقع نہ ہوجائے۔ وزارت قانون کے حضرات چونکہ شرعی اصطلاحات اور احکام سے نامانوس ہیں، اس لئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی غلطی کرسکتے ہیں۔ یہ مسئلہ کونسل میں زیر بحث آیا، تو یہ طے ہوا کہ ان قوانین کی ڈرافٹنگ (تسوید) میں وزارت قانون کونسل کو شریک رکھے، اور اس غرض کے لئے وزارت قانون کے ذمہ داروں اور کونسل کے بعض ارکان پر مشتمل ایک

کمیٹی بنائی جائے جو باہمی مشورے سے ڈرافٹنگ کا کام انجام دے۔ چونکہ قوانین کا ابتدائی اُردو مسودہ میں نے تیار کیا تھا، اور اس کمیٹی میں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو اسلامی فقہ کے ساتھ انگریزی اور اس کی قانونی زبان سے بھی واقف ہو، اس لئے تمام ارکان نے باتفاق مجھے یہ کام سونپا کہ میں وزارت قانون کے حضرات سے مل کر یہ فریضہ انجام دوں۔ یہ بات طے کرکے کونسل کا اجلاس تو برخاست ہوگیا، لیکن چونکہ مجھے یہ فریضہ سونپا گیا تھا، اس لئے مجھے اسلام آباد میں غیر معین مدت تک کے لئے رُکنا پڑا۔

وزارت قانون کے ایڈیشنل سیکریٹری جناب میر محمد علی صاحب اس وقت چیف ڈرافٹس مین تھے، جو اپنے کسی معاون کے ساتھ روزانہ میرے ساتھ تسوید کا کام کرنے کے لئے آجاتے تھے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کا دفتر اُس وقت مارگلہ روڈ پر ایک مختصر سے بنگلے میں واقع تھا۔ اُس وقت کونسل کے سیکریٹری جناب مظفر اشرف صاحب تھے۔ وہ بھی ہماری میٹنگ میں شریک رہتے، اور کبھی کبھی کونسل کے چیرمین جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب بھی ہمارے ساتھ شامل ہوجاتے تھے۔ محمد علی صاحب حیدرآباد دکن کے ایک خوش مزاج اور تجربہ کار افسر تھے، اور ان کے ساتھ بڑی اچھی ہم آہنگی ہوگئی تھی۔

جناب محمد علی صاحب کا طریقہ یہ تھا کہ کونسل کا منظور کردہ مسودہ (جو بنیادی طور پر میرا تیار کردہ تھا) اپنے سامنے رکھ کر اس کی ایک ایک دفعہ کو انگریزی کی قانونی زبان میں منتقل کرتے، اور مجھے سناتے۔ میں اُس پر فقہی نقطۂ نظر سے غور کرتا، اور جہاں الفاظ اور تعبیر میں مجھے کوئی اشکال ہوتا، وہ انہیں بتاتا، اور متبادل تعبیر بھی پیش کرتا تھا۔ بعض اوقات تعبیرات کے انتخاب میں ہمارے درمیان خوشگوار بحث بھی ہوجاتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائیں، شرعی قانون کی تشریح یا اُس کے لئے مناسب تعبیر اختیار کرنے میں وہ ہمیشہ میری بات کو نہ صرف وزن دیتے، بلکہ آخرکار اُس کو سراہتے بھی تھے، اور جس تعبیر پر میں اصرار کرتا، اُس سے تجاوز نہیں کرتے تھے، اور فقہاء کرام کی دقتِ نظر کا جگہ جگہ اعتراف کرتے جاتے تھے۔ البتہ قانون اور اُس کی تعبیرات کے بارے میں مجھے اُن سے بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا، اور ان کے ساتھ کام کرنے کے دوران میری معلومات میں بھی بڑا اضافہ ہوا۔

اُن میں اور مجھ میں ایک قدر مشترک یہ تھی کہ وہ بھی میری طرح پان کے شوقین تھے، اور انہوں نے ایک دن میرے ساتھ اس "ہم آہنگی" کی سزا بھی خوب اٹھائی۔ میں اپنے ساتھ ایک ڈبیہ میں پان لگا کر لے

جایا کرتا تھا، اور اس بات کا خیال رکھتا تھا کہ وقتاً فوقتاً ان کی خاطر بھی کرسکوں، چنانچہ جب بحث کرتے کرتے دیر گذر جاتی، تو میں پان کی ایک گلوری ان کی خدمت میں پیش کردیتا، جسے وہ خوشی خوشی قبول فرمالیتے تھے، اور چونکہ جانتے تھے کہ مجھے اس ہم ذوقی سے خوشی ہوتی ہے، اور میرے پان کے ذخیرے میں پہلے سے اُن کا طے شدہ حصہ موجود ہوتا ہے، اس لئے بعض مرتبہ چائے پینے کے بعد وہ بڑی محبت سے میری پان کی ڈبیہ خود ہی اٹھا لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ میں کسی وجہ سے اٹھ کر چند منٹ کے لئے کہیں چلا گیا، اور جب واپس آیا تو جناب محمد علی صاحب نے ہنستے ہوئے مجھ سے کہا کہ مولانا! آج تو مجھے آپ کے پان کی چوری کی پوری پوری سزا مل گئی، اور اس نے میرے منہ کے پرخچے اُڑا دیئے۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ میری ڈبیہ میں ایک لپٹا ہوا چاندی کا ورق صرف چونے کا رکھا ہوا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ اگر کسی وقت پان میں کڑواہٹ محسوس ہو، تو اُس میں سے تھوڑا سا چونا لیکر اُس کی تلافی کرلی جائے۔ معلوم ہوا کہ جناب محمد علی صاحب نے اُسے باقاعدہ گلوری سمجھ کر منہ میں رکھ لیا، اور اپنے کام میں محو ہوگئے، اور غلطی کا اندازہ انہیں اُس وقت ہوا جب چونا اپنا کام کرچکا تھا۔ نتیجہ یہ کہ شاید کئی دن تک ان کے منہ کا اندرونی حصہ زخمی جیسا رہا۔ اس واقعے کو وہ بعد میں مزے لےلیکر بیان فرمایا کرتے تھے۔

بہر حال! یہ مجلسیں ہفتوں اس طرح جاری رہیں کہ ہم صبح نو بجے کونسل کے دفتر آتے، اور ظہر تک مسلسل کام کرتے۔ پھر دوپہر کا کچھ وقفہ کرکے شام عصر سے لیکر عشاء تک، بلکہ بعض دنوں میں اس کے بعد بھی رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔

کونسل کے دوسرے ارکان تو چند روز کے اجتماع کے بعد اپنے اپنے گھر چلے جاتے تھے، لیکن اس کام کی وجہ سے مجھے کئی کئی ہفتے اسلام آباد میں رہنا پڑتا تھا۔ جب کسی مشورے کی ضرورت پیش آتی، تو میں مختلف علماء سے مشورے کیا کرتا تھا۔ خاص طور پر اُس زمانے میں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ بکثرت ہمارے محترم دوست مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مدرسے جامعہ اسلامیہ کشمیر روڈ راولپنڈی میں آکر مقیم رہا کرتے تھے۔ جب موقع ملتا، میں ان کے پاس چلا جاتا، اور مختلف فقہی مسائل میں اُن سے رہنمائی لیتا تھا۔

مجھے کراچی سے باہر تنہا رہنے کی عادت نہیں تھی، اس لئے اسلام آباد کا یہ طویل قیام مجھے بہت بھاری لگتا

تھا۔ دار العلوم میں میرے ذمے تدریس اور فتویٰ کے جو فرائض تھے، وہ بھی اسلام آباد کے قیام کی وجہ سے بُری طرح متاثر ہوتے تھے، اور مجھے ایک گوشے میں بیٹھ کر تصنیف وتالیف کے کام میں جو ذہنی اور روحانی سکون ملا کرتا تھا، میں یہاں اُس سے بھی محروم ہو جاتا تھا۔

شروع میں کونسل کے ارکان کے قیام کا انتظام گورنمنٹ ہاسٹل میں تھا، جو ارکان اسمبلی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان کا سرکاری رتبہ چونکہ ایک رکن اسمبلی کے برابر تھا، اس لئے اُنہیں بھی وہاں کرائے پر ٹھہرنے، اور اُس کے ریسٹورنٹ سے قیمۃً کھانا لینے کا استحقاق تھا۔ ایک تجارتی ریسٹ ہاؤس چودھری افضل صاحب مرحوم نے ایف 6-3 کے ایک بنگلے میں قائم کرر کھا تھا، جس کے کمرے کرائے پر مل جاتے تھے۔ کونسل کی انتظامیہ نے بعد میں ہمارے قیام کا انتظام اُس ریسٹ ہاؤس میں کر دیا تھا جسے چودھری افضل صاحب اکموڈیٹر کہتے تھے۔ اس میں قیام کا فائدہ یہ تھا کہ اس میں گھر کا سا ماحول مل جاتا تھا، چودھری صاحب بذاتِ خود دوست نواز آدمی تھے، اور ان سے گھریلو انداز کے تعلقات ہوگئے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں ایک باورچی بھی تھا جس سے اپنی مرضی کا کھانا پکوایا جا سکتا تھا، اور وہ سستا بھی پڑتا تھا۔ ہمیں کراچی اسلام آباد کے درمیان پی آئی اے کے اکانومی کلاس کا ایک فرد کا کرایہ سرکار کی طرف سے ملتا تھا، اور روزانہ کی رہائش اور کھانے کے اخراجات کے لئے اتنی رقم ملتی تھی جو ان دونوں کاموں کے لئے کافی ہو جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک اجلاس پر (جو اُس وقت عام طور پر ایک ہفتے کے لئے ہوتا تھا) ایک ہزار روپیہ اعزازیہ ملا کرتا تھا۔ اور اجلاس کے بعد مزید رہنا ہو، جیسے مجھے وزارت قانون کے ساتھ کام کے لئے مدتوں وہاں رکنا پڑتا تھا، تو اس دورانیہ میں کوئی اعزازیہ نہ میں نے کبھی طلب کیا، اور نہ حکومت نے خود سے دیا۔ البتہ روزانہ کی رہائش اور کھانے کے جو اخراجات مجھے ادا کرنے پڑتے تھے، وہ یومیہ الاؤنس کے طور پر مل جاتے تھے۔ ملتے کیا تھے؟ اس کا ایک طویل طریق کار تھا جس کے نتیجے میں اُسے ہم تک پہنچتے پہنچتے مہینے لگ جاتے تھے۔ چنانچہ شروع میں یہ سارے اخراجات ہمیں خود اپنی جیب سے کرنے ہوتے تھے، اور کئی کئی مہینے کے ٹکٹ خود خریدنے اور رہائش اور کھانے کے بل اپنی جیب سے ادا کرنے کے بعد پچھلے مہینوں کے واجبات ادا ہوتے تھے۔ اور جب یہ رقم سرخ فیتے کے چکر کاٹ کر ہم تک پہنچتی تھی، تو اُس وقت تک آگے کے کئی مہینوں کے اخراجات ہم کر چکے ہوتے تھے، اور اس طرح کونسل ہر وقت ہماری مقروض رہتی تھی۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ اخراجات ہمیں سفر سے پہلے یا اُس کے فوراً بعد مل گئے ہوں۔ البتہ چونکہ اس میں ایک ہزار روپیہ ماہانہ کا اعزازیہ بھی شامل

ہوجاتا تھا، اس لئے مآل کار کچھ بچت ہو جاتی تھی۔ اس بچت کے لئے میں نے اسلام آباد ہی کے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھلوالیا تھا۔ اس کی اصل وجہ رقم جمع کرانے اور نکالنے کی سہولت کے علاوہ یہ تھی کہ میں کونسل سے حاصل ہونے والی آمدنی کو اپنے عام نظام زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتا تھا، کیونکہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ عمل مجھے یاد تھا کہ کسی سرکاری محکمے میں اگر جانا ہوتا، تو خالص دینی ضرورت سے جاتے، اور جب کبھی اپنے مقصد سے انحراف نظر آنے لگتا، تو اُس سے بلا تاخیر استعفا دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اس لئے اپنے روز مرہ کے اخراجات کو اُسی معیار پر رکھتے تھے جو سرکاری آمدنی سے پہلے تھا۔ چنانچہ میں نے کونسل کی آمدنی کو جو اُس وقت کے لحاظ سے بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، اپنے نظام زندگی میں شامل نہیں کیا، بلکہ اس کو اپنے اسلام آباد کے اخراجات کی حد تک ہی محدود رکھا، کیونکہ اپنی رہائش اور کھانے کے علاوہ کبھی کوئی مہمان بھی میرے ساتھ آ کر مقیم ہوجاتا تھا، اور کبھی جمعرات جمعہ کی چھٹی ہوتی، تو میں دو دن کے لئے کبھی اکوڑہ خٹک اپنے دوست حضرت مولانا سمیع الحق صاحب کے پاس چلا جاتا، اور خشک مسائل سے تھکے ہوئے ذہن کو ان کی باغ و بہار شخصیت کی صحبت سے نئی تازگی میسر آجاتی، اور کبھی لاہور جا کر اپنی چھوٹی آپا کی شفقتوں کے سائے میں پہنچ جاتا، جن کا ذکر میں بار بار کر چکا ہوں ۔ وہ میری پسند کے کھانے کھلاتیں، مجھے اشعار سناتیں، میں اپنے کوئی نئے شعر سناتا، تو میری ہمت افزائی فرماتیں، میں انہیں بچپن کی یادیں دلاتا، اور دو دن ان کی محبت کے ٹھنڈے سائے میں گذارنے کے بعد تازہ دم واپس اسلام آباد آ جاتا تھا۔ جب ان سے ملے ہوئے بہت دن ہوجاتے، تو میں ٹیلی فون کر کے انہیں بلالینے کے لئے اپنی قیام گاہ کے ساتھ ایک کمرہ ان کے لئے بک کرالیتا تھا۔ وہ کبھی ہمارے بہنوئی مرحوم کے ساتھ اور کبھی اپنے کسی بیٹے کے ساتھ میرے پاس آ جاتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ میں سرکاری قیام گاہوں کے کھانے مجبوری ہی میں کھاتا ہوں، وہاں عموماً مرغوں کی ریل پیل رہتی تھی، جو میرے نزدیک ذبح کر کے کھانے سے زیادہ اذان دینے اور انڈے فراہم کرنے کے لئے موزوں تھے۔ اور بکرے کا گوشت بنانے کے لئے جو سلیقہ درکار ہوتا ہے، وہ کسی محبت سے پکانے والی ہمدرد ہی کو حاصل ہوتا ہے، پیشے کے لئے پکانے والے ہاتھ میں بسا اوقات وہ لذت نہیں ہوتی۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب خواتین کا اصل ہنر خانہ داری تھا، اور ان کی منصبی دلچسپیاں اسی حد تک محدود تھیں۔ اب جبکہ خاتون گھر سے نکل رہی ہے، تو لوگوں میں باہر کے کھانوں کا رجحان بڑھ گیا ہے۔

بہر حال! چھوٹی آپا کو معلوم تھا کہ میں اسلام آباد میں کھانا واجبی ہی سا کھاتا ہوں، اور مجھے ان کے

ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے اور خاص طور پر قیمے اور مونگرے کی ڈش اور ہری مرچوں کا اچار اور مسالے والے چاول بہت پسند ہیں، چنانچہ وہ یہ ڈشیں میرے لئے بنا کر لاتیں، اور کبھی خود نہ آسکتیں تو کسی آنے جانے والے کے ہاتھ بھیج دیا کرتی تھیں۔

بعد میں صوبہ سندھ سے تعلق رکھنے والے افسران کے لئے سندھ ہاؤس قائم ہوگیا جو اُس وقت کے لحاظ سے اسلام آباد کی سب سے خوبصورت، آرام دہ اور خوش منظر رہائش گاہ تھی، اور اُس کے چمن سے اسلام آباد کا نظارہ بڑا حسین تھا، لیکن کام سے فارغ ہونے کے بعد مجھے وہاں رہنا قید تنہائی معلوم ہوتا تھا، اور جب میرے کراچی واپس جانے کا وقت آتا، تو میری حالت کچھ ایسی ہوتی تھی جیسے کسی قیدی کو رہائی مل گئی ہو۔

حدود کے قوانین کے علاوہ کونسل نے ماہرین معاشیات کا ایک پینل بنایا تھا جس کے سپرد نظام زکوٰۃ اور معیشت کو سود سے نجات دلانے کے لئے تجاویز مرتب کرنا تھا، اس پینل کی سربراہی کونسل کے رکن جناب ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب مرحوم کر رہے تھے، جو اُس وقت اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے ڈپٹی گورنر بھی تھے، وہ بڑے دینی ذہن کے آدمی تھے، اور ان کے ساتھ بہت اچھی ہم آہنگی قائم ہوگئی تھی۔ انہوں نے اس پینل میں ممتاز ماہرین معاشیات کو شامل کیا ہوا تھا، اور اُس نے سب سے پہلی رپورٹ زکوٰۃ کے سلسلے میں کونسل کے سامنے پیش کی۔

ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب مرحوم کے دل میں یہ جذبہ تھا کہ ملک میں زکوٰۃ کا نظام اس طرح قائم ہو کہ وہ فقر و افلاس کا خاتمہ کر سکے۔ جذبہ بڑا قابل قدر تھا، لیکن ملک میں بدانتظامی اور مالی بدعنوانیوں کا جو حال ہم سالوں سے دیکھتے آرہے تھے، اُس کی وجہ سے ہمیں خطرہ یہ تھا کہ اگر حکومت کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے اور خرچ کرنے کا انتظام کیا جائے گا، تو ملک میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے پیش نظر اس کے ناکام ہونے اور لوگوں کی زکوٰۃ ضائع ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ دولت کی یہ جھیل سرکاری افسران کے ہاتھ میں آئے گی تو وہ نہ جانے اس کا کیا حشر بنائیں گے؟ میں نے کونسل میں ان خدشات کا اظہار کر کے یہ رائے ظاہر کی کہ زکوٰۃ کا نظام سرکاری سطح پر قائم کرنے میں جلدی نہ کی جائے، بلکہ پہلے سرکاری انتظامیہ کو بدعنوانیوں سے پاک کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ جب اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ زکوٰۃ جیسے اسلامی رکن کو صاف ستھرے انداز میں بر سر کار لایا جا سکے گا، تو اُس وقت یقیناً زکوٰۃ کا نظام اپنے صحیح نتائج ظاہر کر سکے گا۔ جب تک یہ اطمینان نہ ہو، لوگ اپنے طور پر مستحقین تلاش کر کے جو زکوٰۃ ادا کر رہے ہیں، اُسی میں عافیت ہے۔

میں نے یہ بات بار بار مختلف اسالیب میں کہی، اور کونسل کے علماء ارکان نے بھی اس کی تائید فرمائی، لیکن
ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب اور جسٹس افضل چیمہ صاحب کو اصرار تھا کہ اسلام کی معاشی تعلیمات کا یہ اہم رکن
سرکاری سطح پر جلد از جلد بروئے کار لانا چاہئے۔ ہمارے دلائل کے بارے میں انہیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ
ہمارا تعلق چونکہ ایک دینی مدرسے سے ہے، اس لئے شاید ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ اس وقت لوگ زکوۃ کا بڑا حصہ
جو دینی مدارس کو دے رہے ہیں، سرکاری انتظام کی وجہ سے مدارس کو زکوۃ نہیں مل سکے گی۔ اس لئے ایک موقع
پر جناب جسٹس افضل چیمہ صاحب مرحوم نے فرمایا کہ : مولانا! ہم زکوۃ کی جو اسکیم شروع کرنے جارہے
ہیں، اطمینان رکھئے کہ اُس میں دینی مدارس کے لئے بھی ایک وافر حصہ رکھا جائے گا۔
اس پر میں نے عرض کیا کہ ہمارے اعتراض کی وجہ یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہمیں دینی مدارس کو زکوۃ نہ ملنے کا
اندیشہ ہے۔ الحمد للہ، یہ دینی مدارس کسی سرکاری سرپرستی سے آزاد ہو کر اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر چل رہے ہیں،
اور اگر بالفرض حکومت نے زکوۃ وصول اور خرچ کرنے کا انتظام اپنے ذمے لیا تو ہم حکومت سے زکوۃ بھی نہیں
لیں گے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اُس نے جس طرح ابتک کسی مستقل ذریعۂ آمدنی کے بغیر ان
کی کفالت فرمائی ہے، وہ ان شاء اللہ آئندہ بھی کرے گا، نیز ہم اس بات کو بھی کسی طرح درست نہیں سمجھتے کہ
دینی مدارس ملکی سطح پر زکوۃ کا نظام قائم کرنے میں رکاوٹ بنیں، بشرطیکہ ہمیں اس بات کا اطمینان ہو کہ زکوۃ صحیح
طریقے پر وصول کر کے صحیح طریقے پر خرچ کی جائے گی۔ لیکن ہمیں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ موجودہ
حالات میں ایسا ہونا مشکل نظر آرہا ہے۔

لیکن کونسل کے اکثر ارکان اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ ہم اسکیم کو اس طرح بنائیں گے کہ اس میں
سرکاری افسران کا واسطہ کم سے کم آئے۔ چنانچہ زکوۃ کے لئے وفاقی اور صوبائی سطحوں پر ناظم اعلیٰ ایسے لوگوں کو
بنانا تجویز کیا گیا جو اچھی شہرت کے حامل ہوں، نیز ضلعی سطح پر زکوۃ کمیٹیوں کی تشکیل مسجدوں میں انتخاب کے
ذریعے تجویز کی گئی۔ زکوۃ کی رقوم کو عام سرکاری خزانے سے الگ رکھنے کی تجویز ہوئی، اور ان کی تقسیم عام
مسلمانوں پر مشتمل زکوۃ کمیٹیوں کے سپرد کرنا تجویز کیا گیا۔

جب ایک مرتبہ یہ تجویز کر لیا گیا، تو زکوۃ وصول کرنے اور خرچ کرنے کے مسائل زیر بحث آئے۔ ڈاکٹر
ضیاء الدین صاحب کے پینل نے یہ تجویز دی تھی کہ بینک اکاؤنٹس سے زکوۃ وصول کی جائے، اور چونکہ یہ

اندیشہ ہے کہ جس تاریخ میں اکاؤنٹس سے زکوٰۃ کاٹی جائے گی، لوگ زکوٰۃ سے بچنے کے لئے اُس سے ایک دن پہلے اپنی رقمیں نکال لیا کریں گے۔ لہٰذا طریق کار یہ اختیار کیا جائے کہ تاریخ زکوٰۃ پر جتنی رقم اکاؤنٹ میں موجود ہو، اُس سے زکوٰۃ کاٹنے کے بجائے سال بھر جو رقم موجود رہی ہے، اُسکے اوسط پر زکوٰۃ نکالی جائے۔

شرعی نقطۂ نظر سے بینک اکاؤنٹس سے زکوٰۃ نکالنے میں متعدد امور قابل غور تھے۔ پہلا مسئلہ تو یہی تھا کہ شرعاً حکومت کو اموال ظاہرہ سے زکوٰۃ وصول کرنے کا حق ہوتا ہے، اموال باطنہ سے نہیں۔ آیا بینک اکاؤنٹس کو اموال ظاہرہ میں شمار کیا جاسکتا ہے جن سے زکوٰۃ کی کٹوتی کی جائے؟ دوسرے شرعاً زکوٰۃ کے فرض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مقدار نصاب پر سال گذرنا۔ بینک اکاؤنٹ میں یہ کیسے معلوم ہوگا کہ یہ اکاؤنٹ ہولڈر کی اپنی ملکیت ہے، اور اُس کے صاحب نصاب بننے پر سال گذر چکا ہے۔ تیسرے یہ کہ اوسط پر زکوٰۃ وصول کرنے کا جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے، وہ کس حد تک قابل قبول ہے۔

ان میں سے پہلی بات (یعنی بینک اکاؤنٹس کے ساتھ اموال ظاہرہ کا معاملہ کرنا) اس کے بارے میں میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سن چکا تھا کہ موجودہ حالات میں انہیں اموال ظاہرہ میں شمار کرنا چاہیے۔ نیز حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی یہی رائے تھی۔ اس لئے اس میں کچھ زیادہ اشکال نہیں تھا۔ سال گذرنے اور صاحب نصاب نہ ہونے کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ جو شخص یہ اقرار نامہ داخل کرے کہ وہ صاحب نصاب نہیں ہے، یا اُس پر زکوٰۃ کسی وجہ سے واجب نہیں ہے، اُسے کٹوتی سے مستثنیٰ کردیا جائے گا۔ لیکن تیسرا مسئلہ کہ زکوٰۃ اکاؤنٹ کے سالانہ اوسط پر کاٹی جائے، شرعی اعتبار سے اس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے اُسے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ اس پر بڑی لمبی بحثیں ہوئیں۔ آخرکار اُس وقت کے وزیر خزانہ غلام اسحاق خان صاحب مرحوم نے ایک اجتماع بلایا جس میں اوسط کی بنیاد پر زکوٰۃ نکالنے کے لئے بڑے دلائل پیش کئے، لیکن آخرکار ہماری بات مان لی گئی، اور یہ مسئلہ اس طرح حل ہوگیا۔

بالآخر اس طرح دو قسم کے قوانین نفاذ کے لئے تیار ہوگئے۔ جسٹس صمدانی اُس وقت وزارت قانون کے سیکریٹری تھے۔ انہوں نے بھی بڑی اہمیت کے ساتھ ان قوانین پر نظر ثانی کی، اور اُس میں مجھے بھی شریک رکھا۔ میں قوانین کو آخری شکل دینے کے لئے مدت سے اسلام آباد کے سندھ ہاؤس میں مقیم تھا، جہاں ان قوانین کی نوک پلک درست کرنے کے لئے مشترک کاوشیں ہوتی رہیں۔ میں اجلاسات کے بعد بھی مسودات

پر نظر ڈالتا رہتا، اور ایک آدھی بار ایسا بھی ہوا کہ مجھے کسی لفظ کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو میں نے ہمدانی صاحب کو فون کر کے وہ تبدیلی کرائی۔ آخر کار یہ مسودات پوری کابینہ کو بھیجے گئے، تا کہ سب اُن پر غور کر سکیں۔ پھر صدر جنرل ضیاء الحق صاحب نے کابینہ کا اجلاس بلایا، اور اُس میں جسٹس افضل چیمہ صاحب، جسٹس ہمدانی کے علاوہ مجھے، مولانا ظفر احمد صاحب انصاری، مفتی محمد حسین نعیمی صاحب اور مفتی سیاح الدین صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کو بھی دعوت دی گئی۔ کابینہ کے اجلاس میں دو دن ان قوانین کی ایک ایک شق پر مفصل بحث ہوئی، اور آخر کار صدر صاحب نے ان کی منظوری دیدی، اور یہ تجویز کیا کہ ۱۲ ربیع الاول کو جو مشہور قول کے مطابق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت باسعادت تھا، حدود آرڈی ننس اور زکوۃ آرڈی ننس باقاعدہ نافذ کر دیے جائیں۔

ملک کی تاریخ میں قادیانیت کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی دستوری ترمیم کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب کچھ قوانین شریعت کی بنیاد پر نافذ کیے جا رہے تھے۔ اس لئے اس موقع پر ایک جشن کا سا سماں تھا۔ کئی ہفتوں سے مسلسل گھر سے دور اور دن رات کی انتھک محنت کے بعد مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک لمبے سفر کا مسافر ایک درمیانی منزل پر پہنچ کر دم لے رہا ہو۔ اُس دن سر سے ایک بڑا بوجھ اترا تھا، اس لئے میں اپنے آپ کو ہلکا محسوس کر رہا تھا۔ میرے بڑے بھائی حضرت مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم بھی کسی مناسبت سے اُس روز اسلام آباد تشریف لے آئے تھے، اور اس خوشی کے موقع پر شریک تھے۔ شام کے وقت ہم تفریح طبع کے لئے شکر پڑیاں کی پہاڑی پر چلے گئے۔ وہاں سے پورے اسلام آباد کا منظر سامنے تھا، سرکاری عمارتیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں، اور یوں لگ رہا تھا جیسے اسلام آباد کے اب واقعی اسلام آباد بننے کا آغاز ہو رہا ہے کہ اس میں شریعت کے کچھ اہم قوانین نافذ ہو رہے ہیں، اور آئندہ اس راستے پر مزید آگے بڑھنے کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ کیونکہ صدر جنرل ضیاء الحق شہید مرحوم جس طرح کونسل کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے تھے، اُس کے پیش نظر امید یہ تھی کہ ان قوانین کا نفاذ پہلا قدم ہے، اور اب ان شاء اللہ دوسرے قوانین کی ترتیب و تدوین بھی اسی طرح ہو سکے گی۔ اُس شام کی وہ خوشی مجھے ابتک ایک دلکش خواب کی طرح یاد ہے۔

جاری ہے.....

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــ جامعہ دار العلوم کراچی

یادیں

(تینتالیسویں قسط)

چنانچہ ۱۲ر ربیع الاول ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹۷۹ء کو ایوان صدر میں ان قوانین کے نفاذ کے لئے ایک پُروقار تقریب منعقد ہوئی جس کے شروع میں مولانا قاری سعید الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دلکش اور پُراثر آواز میں یہ آیات تلاوت فرمائیں:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۱۸) إِنَّهُمْ لَنْ يُغْنُوا عَنْكَ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَإِنَّ الظَّالِمِينَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِينَ (۱۹) (الجاثیۃ)

اس کے بعد صدر مرحوم نے اپنی تقریر میں اسلامی قوانین کی اہمیت اور اپنے آئندہ عزم کا اظہار فرمایا۔ ایوان صدر کی تقریبات میں یہ پہلا موقع تھا جب تمام چہروں پر حقیقی مسرت کی لہر نظر آتی تھی۔

حدود اور زکوۃ کے قوانین کے علاوہ کونسل کے ایک پینل نے غیر سودی بنکاری کے بارے میں بھی ایک مفصل رپورٹ تیار کی تھی، لیکن اُس پر ابھی کونسل کی طرف سے غور و فکر جاری تھا، اس لئے اس موقع پر اُس کا نفاذ نہیں ہوسکا، بلکہ اُس میں کچھ دیر لگی جس کا ذکر میں ان شاء اللہ آگے کروں گا۔

اسلامی قوانین کے دشمنوں کو یہ بات کہاں بھاسکتی تھی؟ ان کی طرف سے تو عرصۂ دراز سے یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ اسلام میں مختلف فرقوں کی موجودگی میں اسلام کا نفاذ ممکن نہیں ہے۔ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام نے اس پروپیگنڈے کا جواب ۱۹۵۲ء میں اُس وقت دیدیا تھا جب سب نے مل کر پاکستان کے آئین کے لئے بائیس متفقہ نکات پیش کردیئے تھے۔ ان نکات میں یہ بات طے ہوگئی تھی کہ تمام قوانین قرآن وسنت

کے مطابق بنائے جائیں گے، البتہ مختلف مکاتب فکر کے شخصی قوانین (نکاح، طلاق، وراثت وصیت جیسے معاملات) میں قرآن وسنت کی وہی تشریح معتبر ہوگی جسے وہ مکتب فکر درست سمجھتا ہو۔ یہی بات پاکستان کے دستور میں بھی اسی طرح درج ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ تھا کہ ملک کے عام قوانین تو تمام مکاتب فکر کے لئے ایک ہوں گے، البتہ نکاح وطلاق وغیرہ جن کو شخصی قوانین کہا جاتا ہے، اُن میں ہر مکتب فکر کے لئے اُسی کے مسلک کے مطابق قانون سازی ہوگی۔ حدود کے قوانین چونکہ شخصی قوانین میں داخل نہیں تھے، اس لئے ان میں اس طے شدہ اصول کے مطابق ہر مکتب فکر کے لئے الگ قانون سازی کا سوال نہیں تھا۔ چنانچہ اسلامی نظریاتی کونسل نے جب یہ قوانین بنائے، تو ان میں مختلف مکاتب فکر کے لئے الگ قانون بنانے کا کوئی ذکر نہیں آیا۔ یہاں تک کہ یہ بات بھی اصولی طور پر طے نہیں تھی کہ قوانین فقہ حنفی کے مطابق بنائے جائیں گے، یہ اور بات ہے کہ اکثریت اور عملیت کا لحاظ رکھتے ہوئے ان قوانین کے اکثر معاملات حنفی فقہ کے مطابق ہی بنے، البتہ بعض مسائل میں ضرورت اور مصلحت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسری فقہ سے بھی استفادہ کیا گیا۔ چنانچہ جب چوری کی سزا قرآن کریم کے مطابق ہاتھ کاٹنے کا قانون بنا، تو وہ جمہور کے قول کے مطابق ہاتھ کو پہنچے سے کاٹنا تجویز کیا گیا۔ اس موقع پر کونسل کے شیعہ رکن مفتی جعفر حسین مجتہد صاحب نے اپنا مسلک یہ بتایا کہ چور کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں گی۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد انہوں نے اپنا اختلافی نوٹ بھی لکھ کر دیدیا، لیکن مذکورہ بالا طے شدہ اصول کے مطابق جس پر ۳۳ علماء کے بائیس نکات میں ان کے بھی دستخط تھے، انہوں نے اس پر کوئی خاص اصرار نہیں کیا، اور قانون چور کا ہاتھ کاٹنے کا بن کر نافذ ہوگیا۔

جب قوانین حدود کے نفاذ کا اعلان ہوا، تو بی بی سی کا ایک نمائندہ مارک ٹیلی (جو دینی حلقوں کی مخالفت میں مشہور تھا)، مفتی جعفر حسین صاحب مجتہد کے پاس پہنچ گیا، اور اُن سے سوال کیا کہ ان قوانین میں آپ کے مسلک کی تو کوئی رعایت نہیں رکھی گئی، پھر آپ نے انہیں کیسے قبول کیا؟ اس کا واضح جواب تو یہ تھا کہ ملک کے عام قوانین الگ الگ نہیں بنائے جاسکتے، البتہ شخصی قوانین میں مختلف مسلکوں کی رعایت رکھی جائے گی۔ لیکن انہوں نے اس موقع پر یہ مطالبہ کردیا کہ شیعہ مسلک کے لوگوں کے لئے حدود کے قوانین میں ترمیم کی جائے۔ اسے بی بی سی کے نمائندے نے خوب اچھالا، یہاں تک کہ جذباتی لوگوں نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا، اور اس کی بنیاد پر "تحریک نفاذ فقہ جعفریہ" کے نام سے مفتی جعفر حسین صاحب کی سربراہی میں ایک

جماعت قائم ہوگئی جس نے مطالبات کے مروجہ طریقے استعمال کرنے شروع کردیئے۔ہم نے کونسل میں بھی اور باہر بھی مفتی صاحب سے گفتگو کی، اور یہ عرض کیا کہ یہ ایک اصولی معاملہ ہے، شخصی قوانین سے ہٹ کر مسلکوں کی بنیاد پر الگ الگ قانون سازی کا مطالبہ اگر تسلیم کرلیا جائے، تو اسلامی قانون ایک مذاق بنکر رہ جائے گا، اور اس کا نتیجہ آخر کار یہ ہوگا کہ جو سیکولر حلقے اسلامی قانون کے مخالف ہیں، ان کے ہاتھ میں ایک ہتھیار آجائے گا، اور اس سے اسلامی قوانین کا نفاذ ہی خطرے میں پڑ جائے گا، لہٰذا جو اصول بائیس نکات اور دستور میں طے ہوچکا ہے، اُسے نہ چھیڑیں۔لیکن افسوس ہے کہ مفتی صاحب راضی نہ ہوئے، اور ان کی تحریک چلتی رہی، یہاں تک کہ ایک مرحلے پر ان کی جماعت نے اسلام آباد میں سرکاری عمارتوں کا گھیراؤ کرکے دھرنا دیدیا۔

اس دھرنے کو ختم کرنے کے لئے حکومت کے بعض افراد نے ان کے مطالبے پر غور کرنے کی یقین دہانی کرائی، جس پر وہ دھرنا ختم ہوا۔اس کے نتیجے میں وزارت قانون کی طرف سے اسلامی نظریاتی کونسل کو ایک خط موصول ہوا جس میں کونسل سے کہا گیا تھا کہ وہ چور کی سزا کے قانون میں ایسی ترمیم تجویز کرے جس سے شیعہ لوگوں کے لئے الگ سزا مقرر ہوجائے۔

وزارت قانون کی طرف سے یہ تجویز سامنے آئی، تو ہمیں معاملے کی سنگینی کا احساس ہوا۔اُس وقت جناب غلام اسحاق صاحب مرحوم وزیر خزانہ تھے، لیکن صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے، کونسل کے ارکان کی ان کے ساتھ ایک میٹنگ ہوئی، اس میٹنگ میں میں نے عرض کیا کہ ہم لوگ اس تجویز کی جو مخالفت کررہے ہیں، اُسے کسی فرقہ وارانہ تعصب کی بنا پر نہیں، بلکہ اس اصولی بنیاد پر کررہے ہیں کہ اگر پبلک لاء میں ہر مکتب فکر کے لئے الگ قانون بنانے کی طرح ایک مرتبہ ڈال دی گئی، تو اس کی کوئی حد نہیں ہوگی، اور اسلامی قانون کی تدوین اور اُس کا نفاذ عملاً ناممکن ہوجائے گا۔اور یہ دستور پاکستان کے خلاف بھی ہوگا۔غلام اسحاق صاحب نے اصولاً اس بات کو تسلیم کیا، اور کہا کہ یہ سارے نتائج میرے سامنے ہیں، لیکن جو مسئلہ کھڑا کردیا گیا ہے، اس سے نمٹنے کی کوئی اور صورت سمجھ میں نہیں آرہی۔

اس ہنگامے کے باوجود اسلامی نظریاتی کونسل نے اپنا کام جاری رکھا، اور حدود کے بعد قصاص اور دیت کا قانون بھی ابتدائی طور پر میں نے مرتب کرکے کونسل میں پیش کیا۔

یہ مسودہ ابھی اپنی ابتدائی حالت میں تھا، اور اس پر بحث جاری تھی کہ میں وفاقی شرعی عدالت میں منتقل ہوگیا، پھر وہاں ایک اور حیثیت میں اس قانون کی خدمت کی توفیق ہوئی جس کی تفصیل میں ان شاء اللہ عدالتی کام کی تفصیل کے دوران آگے ذکر کروں گا۔

اس کے علاوہ عائلی قوانین میں ترمیم کا ایک مسودہ بھی مرتب کر کے میں نے پیش کیا جو کونسل نے منظور بھی کرلیا، لیکن ابھی اس کے نفاذ کا موقع نہیں آیا تھا کہ میں وفاقی شرعی عدالت چلا گیا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا کام صرف قوانین کے بارے میں سفارشات مرتب کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں میں دینی اصلاحات بھی اُس کا موضوع تھیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان میں تعلیمی اصلاحات سرفہرست تھیں۔ اس لئے ملک کے تعلیمی نظام میں تبدیلی کے لئے بھی میں نے ایک مفصل رپورٹ تیار کی، جو میری کتاب "ہمارا تعلیمی نظام" میں شائع ہوچکی ہے۔ اسی موقع پر وزارت تعلیم کے ساتھ بھی متعدد نشستیں ہوئیں، اور ان میں بہت سے مسائل زیر بحث آئے۔ اُس وقت میں نے ایک خط کونسل کے اُس وقت کے سیکریٹری جناب مظفر اشرف صاحب کو لکھا تھا۔ اس میں چونکہ متعدد اہم مسائل پر گفتگو ہے، اس لئے وہ بھی یہاں نقل کرتا ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترم ومکرم جناب ایس ایم اے اشرف صاحب

سیکرٹری اسلامی نظریاتی کونسل اسلام آباد

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

آپ کے گرامی نامے ۹(۱)/ 78 سی آئی آئی/ 1827 مورخہ 18 اکتوبر 1978ء کے جواب میں عرض ہے کہ اس خط کیساتھ آپ نے وزارت تعلیم کے جو دو فائل میرے پاس بھیجے تھے، میں نے اُن کا مطالعہ کیا، اس سے قبل میں وزارت تعلیم کی مقرر کردہ نصاب کمیٹی کی آخری میٹنگ میں اسلامی کونسل کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کر چکا تھا، اس سلسلہ میں میری معروضات مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مذکورہ فائلوں میں نویں اور دسویں جماعت کے لئے اسلامیات کا جو نصاب تجویز کیا گیا ہے وہ اس بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے کہ ان جماعتوں میں بھی سُنی شیعہ دونوں مکاتب فکر کا نصاب تعلیم کلی طور پر مشترک ہوگا،

لیکن قبل اس کے کہ میں اس مجوزہ نصاب کے بارے میں اپنی کوئی تفصیلی رائے ظاہر کروں مجھے اس بنیادی فکر کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

چند سال سے ہمارے ملک میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا ہے کہ اسلامیات کا نصاب تعلیم شیعہ سُنی دونوں قسم کے طلباء کے لئے مشترک ہو یا جداگانہ، ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ ملی وحدت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نصاب مشترک ہونا چاہئے، اور دوسرا نقطہ نظر جداگانہ نصاب کے حق میں ہے، اس مسئلہ میں طویل غور وفکر اور مختلف مکاتب فکر کے اہم اہل علم سے تبادلہ خیال کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شیعہ سُنی دونوں قسم کے طلباء کے لئے اسلامیات کا نظام تعلیم کلی طور پر مشترک نہ ہونا چاہئے، ایک حصہ میں نصاب مشترک ہو اور دوسرے میں جداگانہ اس تجویز کے دلائل مندرجہ ذیل میں ہے:

(الف) اگر شروع سے آخر تک اسلامیات کا نظام تعلیم مشترک رکھا جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی بھی مکتب فکر طلباء کو اسلامی معلومات کی اتنی مقدار فراہم نہیں کر سکے گا جو بحیثیت ایک تعلیم یافتہ مسلمان کے اس کے پاس ہونی ضروری ہے اور اس طرح عام اسلامیات کے مضمون میں معیار تعلیم کو اس سطح تک نہیں لے جا سکیں گے، جو ہمارے ملی تقاضوں کے پیش نظر ہونی چاہئے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں مکاتب فکر کے درمیان عقائد اور احکام کی تفصیلات میں اتنے شدید اختلافات موجود ہیں، اور عملی زندگی کے مسائل کا حل دونوں مکاتب فکر میں اتنا مختلف ہے کہ ان کے درمیان اشتراک پیدا کرنا مشکل ہے لہذا مشترکہ نصاب تعلیم میں اسلامی معلومات کی بہت کم مقدار طالب علم تک پہنچ سکے گی کیونکہ مختلف فیہ مسائل کو لازماً چھوڑنا پڑے گا۔

(ب) مشترکہ نصاب تعلیم کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ چند بنیادی عقائد، عبادات کے فضائل اور کچھ موٹی موٹی معاشرتی تعلیمات کے سوا کوئی چیز نصاب کا جز نہ بنے مثلاً: مشترکہ نصاب میں نماز کی فضیلت تو بیان ہوگی لیکن نماز کا طریقہ اور اس کے دوسرے احکام اس لئے بیان نہ کئے جا سکیں گے کہ ان میں دونوں مکاتب فکر کے درمیان اختلاف ہے۔

حالانکہ محض نماز روزے کی فضیلت اور جھوٹ، دھوکہ فریب وغیرہ کی برائی وہ چیزیں ہیں جو ایک مسلمان بچہ ماں کی آغوش میں جان لیتا ہے یا اسے جان لینا چاہئے اس کے لئے باقاعدہ نصابی کتب کی زیادہ ضرورت نہیں یہ امر واضح ہے کہ اسلام محض چند عبادات ورسوم یا محض اخلاقی تعلیمات کا نام نہیں بلکہ اس کے احکام اور

تعلیمات ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہیں اور مسلمان طلباء کو اسلام کی عظمت سے آشنا کرنے اور ان میں ملی خودداری پیدا کرنے کے لئے نیز انہیں سچا مسلمان بنانے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ انہیں ہر شعبہ زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کی اتنی تفصیل کا علم حاصل ہو جس کے ذریعے وہ وقت کے چیلنج کا جواب دے سکیں اور اگر یہ اصول طے کرلیا جائے کہ طلباء کے سامنے کوئی ایسی بات بیان نہ کی جائے گی جو شیعہ سنی مکاتب فکر کے درمیان اختلافی ہو تو پھر یہ مقصد حاصل کرنا ممکن نہیں ہوگا۔

(ج) وزارت تعلیم نے جو فائل بھیجے ہیں ان میں تجویز کردہ نصاب پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی مذکورہ بالا باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ اس میں بنیادی عقائد فضائل اور عام قسم کی اخلاقی ہدایات کے سوا کوئی ایسی بات شامل نہیں جسے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کی تفصیلات واضح کرتی ہو میں جب میٹنگ میں شریک ہوا اور میں نے دریافت کیا کہ اس نصاب میں نماز کے زیر عنوان کس قسم کی باتیں آئیں گی تو اس کا جواب یہ تھا کہ اس میں نماز کے فضائل اور اس کی خوبیاں بیان ہوں گی تو میں نے دریافت کیا کہ نماز کا طریقہ اور اس کے احکام کی تفصیلات طالب علم کب اور کہاں سیکھیں گے تو مجھے جواب ملا کہ مشترک نصاب کی موجودگی میں اس قسم کی باتیں وہ اپنے ماں باپ یا گھر والوں سے سیکھ لے گا حالانکہ میری رائے میں یہ معاملہ برعکس تو ہوسکتا ہے لیکن اگر اس نماز روزے اور زکوٰۃ کے تمام تفصیلی احکام گھر میں سیکھنے ہیں، تو پھر محض فضائل اور خوبیوں کا علم حاصل کرنے کے لئے نصاب اور مدرس کے تکلف کی کوئی ضرورت نہ ہونی چاہئے۔

میں جن میٹنگوں میں شریک ہوا، ان میں یہ مسئلہ خاص شدت کے ساتھ موضوع بحث بنا ہوا تھا کہ متذکرہ نصاب میں خلفاء راشدین کا تذکرہ بھی شامل ہونا چاہئے یا نہیں ؟ احقر نے بصراحت عرض کیا کہ جس اسلامیات میں خلفاء راشدین کے مثالی عہد کا تذکرہ جان بوجھ کو چھوڑا جائے، وہ میرے نزدیک اسلامیات کا نصاب کہلانے کا مستحق نہیں۔ چنانچہ اس رائے سے ان حضرات کو تقویت ملی جو خلفاء راشدین کا تذکرہ نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اور بالآخر سب کمیٹی نے اسکو اپنی تجاویز میں شامل کرلیا۔ اس واقعہ کو ذکر کرنے کا منشاء یہ بتلانا ہے کہ اختلافی باتوں کو نہ چھیڑنے کے نتائج کہاں تک پہنچتے ہیں۔

(د) اسلامی کونسل نے تعلیم سے متعلق اپنی جو مفصل سفارشات حکومت کو بھیجی ہیں ان میں نویں جماعت کے طلباء کے لئے اسلامیات کا جو معیار تعلیم تجویز کیا گیا ہے، اگر اس کا موازنہ زیر تبصرہ تجاویز سے کیا جائے تو

دونوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نصاب تعلیم کو کلی طور پر
مشترک رکھنے کے لئے ہر اختلافی بات سے پرہیز کی کوشش کی گئی ہے۔

لہذا ان تمام نقائص کا حل میری نظر میں اس کے سوا نہیں ہے کہ نصاب کا ایک حصہ جو صرف مشترک
عقائد وفضائل وغیرہ پر مشتمل ہے، دونوں کے لئے ایک رکھا جائے، اور دوسرا حصہ جس میں احکام اور عقائد اور
تاریخ کی تفصیلات ہوں دونوں مکاتب فکر کے لئے الگ بنایا جائے۔ امتحان کے پرچے اس دوسرے حصے میں
الگ الگ ہوں، اور جس درسگاہ میں دونوں میں سے کسی مکتب فکر کے طلباء کی تعداد اس درسگاہ کے مجموعی طلباء
کی تعداد سے بیس فیصد یا اس سے زائد ہو، وہاں اس مکتب فکر کے لئے الگ استاد کا تقرر کیا جائے، اور جس
مکتب فکر کی تعداد مجموعے کے مقابلے میں بیس فیصد سے کم ہو، ان کے لئے الگ استاد کے تقرر کی ضرورت
نہیں۔ وہاں اس مکتب فکر کے طلباء جداگانہ حصۂ نصاب کا امتحان ازخود مطالعے کی بنیاد پر دیں گے، یا پھر
اسلامیات کے دونوں حصوں کو ایک ہی استاد پڑھائے گا۔

احقر کا نقطہ نظر جسے مختلف مکاتب فکر
(۲) یہ تو تھا مشترک اور جداگانہ نصاب کے مسئلہ کے بارے میں
کے بہت سے علماء کی بھی تائید حاصل ہے۔ لیکن جہاں تک موجودہ نصاب کمیٹی کی سفارشات کا تعلق ہے میرا
مذکورہ بالا گزارشات سے ان کی تنقیص ہرگز مقصود نہیں، کیونکہ اس کو بامور ہی اس بات پر کیا گیا تھا کہ وہ
مشترک نصاب کی بنیاد پر تجاویز مرتب کرے، اور میں سمجھتا ہوں کہ اس محدود دائرے میں رہتے ہوئے اس
نے جو کوشش کی ہے بحیثیت مجموعی بری نہیں اور اگر اس کی تجاویز میں اسلامیات کی مطلوب مقدار شامل نہیں
ہوسکی تو اس میں کمیٹی بڑی حد تک معذور ہے کیونکہ اس کے دائرہ کار کو مشترک نصاب کی تعیین نے بڑی حد تک
محدود کر دیا تھا۔ البتہ اس بنیاد پر بھی کمیٹی کی مرتب کردہ نصاب میں چند ضروری مشورے اس نقطہ نظر سے پیش
خدمت ہیں کہ جب تک مشترک نصاب کے تصور کو بدلا نہیں جاتا اس وقت تک کم از کم اس میں مندرجہ ذیل
اضافے ضرور ہوجانے چاہئیں تا کہ مقدار نصاب کو ممکنہ حد تک معیاری بنایا جاسکے۔

اہمیت اور اس کے منجانب اللہ ہونے کے
(الف) حصہ اول باب اول میں قرآن مجید کی معجزانہ حیثیت،
دلائل نیز اس کی صحت کی حفاظت پر مفصل علمی مقالے شامل ہونے چاہئیں۔

وقت صرف وہ احادیث لی گئی ہیں جو
(ب) نصاب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ احادیث کا انتخاب کرتے

دونوں مکاتب فکر کی کتابوں میں موجود ہیں۔ چنانچہ فضائل قرآن کے بارے میں اس معیار پر صرف دو حدیثیں درج کردی گئی ہیں حالانکہ مشترکہ نصاب کی بنیاد پر بھی اصول یہ ہونا چاہئے کہ صحاح ستہ کی جن احادیث میں کوئی مختلف فیہ مسئلہ موجود نہ ہو، وہ لے لی جائیں، خواہ وہ احادیث دوسرے مکتب فکر کی کتابوں میں موجود نہ ہوں۔ اگر اس معیار پر احادیث کا انتخاب کیا جائے تو فضائل قرآن کے باب میں صرف مشکوٰۃ شریف میں سے بہت ضرورت اور مفید احادیث کا اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

(ج) حصہ اول باب دوم میں بنیادی عربی کے قواعد مذکور ہیں، لیکن ان کا معیار بہت کمتر ہے، نویں اور دسویں جماعت کے طلباء کو صرف اسم، فعل، حرف، واحد، جمع اور مذکر و مؤنث سمجھانے کے ساتھ مبتدا، خبر، مرکب اضافی اور مرکب توصیفی، فاعل اور مفعول بھی سکھا دینے کی ضرورت ہے۔

(د) باب سوم میں قرآن کریم سے اقتباسات دیئے گئے ہیں، جس میں پارہ عم کی ۶ سورتیں، اور مختلف آیات درج ہیں، حالانکہ پچھلے چند سالوں کو چھوڑ کر جو نصاب ہمیشہ سے رائج رہا ہے، اس میں پندرہ مکمل سورتیں پڑھائی جاتی تھیں جب کہ نصاب اس وقت بھی مشترکہ تھا، لہٰذا ان سورتوں میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

(ہ) حصہ سوم سیرت نبوی سے متعلق ہے، لیکن اس میں صرف معراج، ہجرت اور ختم نبوت پر زور دیا گیا ہے حالانکہ احقر کی رائے میں سیرت طیبہ کے ان پہلوؤں پر زیادہ زور دینا چاہئے جن کا تعلق عمل سے ہے، اور جن سے زندگی کے مختلف شعبوں میں رہنمائی ملتی ہے۔

(و) باب ہفتم میں حدیث کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس میں حجیت حدیث اور تدوین حدیث کے بارے میں مختصر اور آسان مقالے شامل ہونے چاہئیں۔

اس باب میں کل پندرہ احادیث پڑھنے کے لئے دی گئی ہیں، حالانکہ شروع میں جب کہ نصاب مشترک تھا، یہ معمول رہا ہے کہ ۴۰ر احادیث تک پڑھائی جاتی تھیں۔ لہٰذا ان احادیث کی تعداد میں بھی معقول اضافہ ہونا چاہئے۔

(ز) حصہ چہارم باب ہشتم بنیادی اعمال سے متعلق ہے جس میں ان بنیادی اعمال کی مشروعیت کی تاریخ بھی درج ہونی چاہئے اور ان کی حکمت اور فلسفہ بھی۔

(ح) باب نہم حقوق العباد سے متعلق ہے جس میں بہن بھائیوں، دوستوں اور اساتذہ کے حقوق کا بھی

ذکر شامل ہونا چاہئے، اس کے علاوہ اس میں بیع وشراء، تجارت، معیشت اور افسر و ماتحت کے حقوق بھی شامل ہونے چاہئیں۔

(ط) باب دہم کا عنوان امر بالمعروف رکھا گیا ہے حالانکہ اس کے تحت فریضۂ تبلیغ کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ دیانت، ایفائے عہد وغیرہ نیکیوں کا تذکرہ ہے۔ لہٰذا اس کا عنوان صرف اوامر رکھا جائے اور اس میں ایک مستقل عنوان فریضہ تبلیغ یا امر بالمعروف کے نام سے قائم کر کے اس میں تبلیغ سے متعلق آیات واحادیث کی تشریح کی جائے اس حصہ میں اسلام میں عورتوں کا مقام کے زیر عنوان جن آیات اور احادیث کا انتخاب کیا گیا ہے وہ تشنہ ہے اس میں اضافہ کی ضرورت ہے۔

(ی) اس طرح باب یازدہم کا عنوان نہی عن المنکر کے بجائے نواہی یا منکرات ہونا چاہئے اور اس میں رشوت، بغض وعناد، حسد، خودغرضی دنیا پرستی وغیرہ کو بھی شامل کرنا چاہئے۔

(ک) باب دوازدہم آداب معاشرت سے متعلق ہے اس میں استیذان کے آداب، کھانے پینے کے آداب، راہ چلنے کے آداب وغیرہ کی سخت کمی معلوم ہوتی ہے اس حصہ میں آداب سفر کے تحت صرف بسم اللہ مجرھا و مرسٰھا درج کیا گیا ہے حالانکہ اس موضوع پر بہت سی آیات واحادیث موجود ہیں۔

(۳) بحیثیت مجموعی نصاب کمیٹی کے کام کی کسی تنقیص کے بغیر میں یہ سمجھتا ہوں کہ مشترک نصاب کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی جتنی معلومات کی مقدار دی جاسکتی تھی، وہ اس میں نہیں دی گئی، اور نویں دسویں جماعت کے طلباء کے معیار کے لحاظ سے اس میں کافی اضافہ کی نہ صرف گنجائش بلکہ ضرورت ہے اور اس کے لئے جن عنوانات پر کام کیا گیا ہے نیز جن عنوانات کا ذکر احقر نے کیا ہے ان سے متعلق مزید قرآنی آیات کی فہرست مضامین قرآن سے اور مزید احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مشکوٰۃ شریف سے اور ان کی تشریح تفاسیر اور شروح حدیث کی کتابوں سے لے کر نصاب میں شامل کرنے کی ضرورت ہے۔

والسلام

محمد تقی عثمانی

اور غیر سودی بنکاری کی رپورٹ پر بھی کام جاری رہا۔ الحمد للہ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد حضرت مولانا شمس الحق افغانی رحمۃ اللہ علیہ کو کونسل کا رکن بنالیا گیا تھا۔ اس لئے اس کام کے دوران بفضلہ تعالیٰ ان کی صحبت اور ان کی آراء سے استفادے کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا۔

تحریک نفاذ فقہ جعفریہ کی طرف سے جس مطالبے کا میں نے ذکر کیا ہے، ان کے احتجاج کی بنا پر ایسا لگ رہا تھا کہ حکومت اس مطالبے کو ماننے کی تیاری کر رہی ہے، اور اس سلسلے میں کونسل کے پاس ایک تحریری نوٹ بھی آ گیا تھا۔ جب متعدد کوششوں کے باوجود کوئی اور راستہ نہ رہا، تو میں صدر محمد ضیاء الحق صاحب مرحوم کو ایک مفصل خط لکھکر کونسل سے مستعفی ہوگیا، اور اُس کے کچھ عرصے کے بعد کونسل کی مدت ختم ہونے پر کونسل ٹوٹ گئی۔ اُدھر جناب جسٹس محمد افضل چیمہ صاحب مرحوم جن کے ساتھ الحمد للہ بہت اچھا وقت گذرا تھا، اور نفاذ شریعت کے معاملے میں ہم نے انہیں ہمیشہ نہایت مخلص پایا، انہیں رابطۂ عالم اسلامی کی طرف سے یہ پیشکش ہوئی کہ وہ پاکستان میں رابطے کے دفتر کے سیکریٹری جنرل بن جائیں جسے انہوں نے قبول کرلیا، اور کونسل کے چیئرمین کی جگہ خالی ہوگئی، اور نئی تشکیل میں جناب جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کو کونسل کا چیئرمین بنادیا گیا۔

اگرچہ میں کونسل سے مستعفی ہو چکا تھا، لیکن یہ جناب صدر محمد ضیاء الحق صاحب شہید مرحوم کی بڑائی کی بات تھی کہ انہوں نے مجھ سے ذاتی حیثیت میں بھی تعلق قائم رکھا، اور بعض امور میں مشورے بھی لیتے رہے۔ میرے کونسل سے مستعفی ہونے کی وجہ، جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ بھی ختم ہو چکی تھی، اور صدر مرحوم نے مجھ سے کونسل کی نئی تشکیل میں رکنیت قبول کرنے کی فرمائش کی، لیکن مجھے دوبارہ کونسل میں جانے پر شرح صدر نہیں ہو رہا تھا۔

اسی دوران میرے پاس صدر مرحوم کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے فرمایا کہ میرے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے۔ میرا نکاح حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے پڑھایا تھا، اور میرے بھائی کا نکاح آپ کے والد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے۔ دونوں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے۔ میری خواہش ہے کہ میرے بیٹے کا نکاح بھی حضرتؒ کے کوئی خلیفہ پڑھائیں، حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب عارفی آپ کے شیخ ہیں۔ آپ میری طرف سے اُن سے درخواست کریں کہ اگر حضرتؒ

کو زحمت نہ ہو، تو میرے بیٹے کا نکاح پڑھادیں۔ میں خود اُن سے کہنا اس لئے نہیں چاہتا کہ کہیں اُن پر بوجھ نہ ہو، آپ اُن سے بے تکلف پوچھ لیں، اگر وہ راضی ہو جائیں، تو خوش قسمتی ہوگی، اور اگر زحمت کا اندیشہ ہو، تو کچھ فکر نہ فرمائیں۔ میں نے حضرتؒ سے ذکر کیا، تو حضرتؒ نے قبول فرمالیا۔ میں نے فون پر انہیں اطلاع دی، تو وہ بہت خوش ہوئے، اور کہنے لگے کہ حضرتؒ کو آپ خود ساتھ لیکر آئیں۔

چنانچہ میں اس نکاح کی تقریب میں حضرتؒ کے ساتھ گیا۔ صدر مرحوم نے راولپنڈی کے قدیم ایوان صدر میں حضرتؒ کو ٹھہرایا، اور اسی میں انتہائی سادگی کے ساتھ نکاح کی تقریب منعقد ہوئی، صدر مرحوم حضرتؒ کے سامنے نہایت ادب کے ساتھ دوزانو بیٹھے رہے۔ نکاح کے بعد انہوں نے حضرتؒ سے کہا کہ حضرت! مجھے آپ سے ایک درخواست یہ کرنی ہے کہ مولانا محمد تقی عثمانی نے اسلامی نظریاتی کونسل سے استعفاء دیدیا ہے۔ میں یہ درخواست کرتا ہوں کہ آپ ان سے فرمادیں کہ وہ دوبارہ اُس کی رکنیت قبول کرلیں۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں اُن سے یہ کیسے کہہ سکتا ہوں جبکہ انہیں یہ شکایت ہے کہ وہ شریعت کی روشنی میں جو تجاویز آپ کو دیتے ہیں، ان پر ٹھیک ٹھیک عمل نہیں ہوتا۔ صدر مرحوم نے کہا کہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم ان شاء اللہ کونسل کی تجاویز پر اہتمام کے ساتھ عمل کرنے کی پوری کوشش کریں گے، البتہ بعض اوقات کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں جن کی وجہ سے کچھ دیر بھی ہوجاتی ہے۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی عملی دشواری ہو، تو آپ دوبارہ کونسل سے رجوع کر کے انہیں اپنی مشکلات بتائیں، اور کونسل ان مشکلات پر اچھی طرح غور کر کے اس کا حل بتائے۔ لیکن قرآن وسنت کی روشنی میں علماء کرام جو فیصلہ کریں، اس کو نظر انداز کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس موضوع پر کافی دیر حضرتؒ اُن سے گفتگو فرماتے رہے، اور آخر کار حضرتؒ نے میری طرف اشارہ فرمایا کہ میں دوبارہ رکنیت قبول کرلوں۔

بہر کیف! اس گفتگو کے نتیجے میں حضرتؒ نے صدر صاحب سے وعدہ فرمالیا۔ دوسری طرف میں خط وکتابت کے ذریعے میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی رابطہ رکھتا تھا، اور ان سے کونسل کے کام میں مشورے لیتا رہتا تھا۔ اس موقع پر انہوں نے مجھے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا:

محب گرامی منزلت! زیدت مآثرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے مودت نامہ مورخہ ۱۷رجمادی الثانیہ ۱۴۰۰ھ نے مفتخر اور خوش وقت کیا۔ آپ نے ایک اہم مسئلہ میں مجھ پر اعتماد کر کے جس خصوصیت اور اعتماد کا اظہار فرمایا ہے اس سے مسرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ آپ کا مکتوب اور اس کا موضوع اتنا اہم ہے کہ اگر سفر کی سہولتیں ہوتیں اور وہ پابندیاں نہ ہوتیں جو اس سلسلہ میں حائل ہیں تو اس کا امکان تھا کہ میں اس مسئلہ پر آپ سے گفتگو کرنے کے لئے خود کراچی آتا اور مختلف مجلسوں اور قسطوں میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ مشترک طور پر لیا جاتا اور اس پر تبادلہ خیال کیا جاتا۔ مگر افسوس ہے کہ میں اس وقت اس حال میں نہیں ہوں کہ کوئی غیر ملکی سفر کرسکوں، مجھے رائے بریلی میں آپ کے قصد کی اطلاع ملی تھی، بڑی خوشی تھی کہ آپ وہاں آرہے ہیں لیکن بعد میں آپ کی مجبوریوں کا علم ہوا، اور خط سے مزید تفصیل کا علم ہوا، اگر مجھے وقت پر اس مجبوری کا علم ہوجاتا تو شاید میں خود لکھنو سے ملنے آپ سے آجاتا، لیکن مجھے آپ کی روانگی کے بعد سارا قصہ معلوم ہوا۔ آپ نے دارالعلوم کے بارے میں جو تاثرات لکھے وہ ہم لوگوں کے لئے موجب تقویب وطمانینت ہیں۔

مسئلہ معلوم پر تفصیل سے اظہار خیال نہیں کرسکتا۔ کوئی جانے والا ملا تو شاید تفصیل سے کچھ لکھ سکوں اس وقت اتنا ضرور لکھتا ہوں کہ آپ اپنی موجودہ ذمہ داری کو کسی طرح ترک نہ فرمائیں آپ کا شریک رہنا بڑے خیر وبرکت کا باعث ہوگا اور اس سے توازن واعتدال برقرار رہے گا اس دائرہ کار کے مرکزی نقطہ سے آپ جتنے قریب اور مشوروں میں شریک ہوں اس میں بالکل تامل نہ کریں، میں نے رباط سے لیکر رابطہ تک سب کو دیکھا ہے، مدار علیہ شخصیتوں میں سے کوئی بھی اندر سے ایسا مسلمان نظر نہیں آیا جیسے کہ صاحب موصوف (اپنی تمام کمزوریوں اور خامیوں کے ساتھ) میں چاہتا ہوں کہ علماء کا رول، خاص طور پر آپ کا، اس دائرہ کے اندر وہی ہو جو "رجاء بن حیوۃ" کا سلیمان بن عبدالملک کے دربار میں تھا، اور جس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی شکل میں خلیفہ راشد نصیب ہوا، یا کم سے کم وہ ہو جو حضرت خواجہ عبیداللہ احرار کا اپنے عہد وحکومت میں تھا اور جس کا حضرت مجدد الف ثانی اپنے مکتوبات میں بار بار حوالہ دیتے ہیں:

"من اگر شیخی کنم ہیچ شیخ دردنیا مریدے نیابد، لاکن مرا کارے دگر فرمودہ اند"

پھر اس کی حضرت مجددتشریح فرماتے ہیں کہ اس سے مراد اہل اقتدار سے مل کر اور تعلقات قائم کر کے احکام شرعیہ کا اجراء ونفاذ اور بدعات ومنکرات کا ازالہ تھا، باقی آپ تدوین وتالیف کا جو کام کرنا چاہتے ہیں وہ بے حد اہم ہے اور آپ اس کے لئے وقت نکالیں۔ میں پہلے دن سے اس نتیجہ پر پہنچ گیا تھا کہ اگر عصر حاضر کے مطابق اس علم کی تدوین نہیں ہوئی تو اس سے اس تجربہ کے ناکام ہوجانے کا اندیشہ ہے، آپ اس کے لئے دارالعلوم کے انتظامات اور البلاغ کی ذمہ داریوں سے زیادہ سے زیادہ وقت نکال لیں اور یہ کام دوسرے معتمد علیہ اشخاص کے سپرد کر دیں۔ معارف القرآن کا ترجمہ وغیرہ آپ اپنی ہمت سے دیکھتے رہیں، اللہ تعالیٰ وقت میں برکت دے گا۔ تدریس وافتاء کا کام بھی دوسروں کے سپرد کریں۔ میں کونسل کے بارے میں ضرور رائے دیتا کہ آپ اس سے سبکدوشی حاصل کرلیں لیکن اول تو آپ کا کوئی بدل نظر نہیں آتا دوسرے آپ کی اس رکنیت سے آپ کے دوسرے کاموں میں بھی مدد ملے گی اور اس ملک میں کام کرنے کے لئے اس طرح کی رکنیت مفید ہوگی۔

امید ہے کہ میرا یہ عریضہ کم سے کم آپ کو عجلت میں فیصلہ کرنے میں کسی درجہ مانع ہوگا۔ اگر اس نے اتنی ہی خدمت انجام دی تو یہ بھی بڑی خدمت ہے، اس کے ساتھ مسلسل ایک ہفتہ استخارہ بھی فرمائیں اور پھر دیکھیں کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ خدا کرے میرا یہ خط آپ کو مل جائے، اس کی رسید سے ضرور مطلع فرمائیں۔

والسلام

مخلص، (ابوالحسن علی، ۲۳ر مئی ۱۹۸۰ء)

بہر حال! ان وجوہ سے میں دوبارہ کونسل کا رکن بن گیا۔ جو کام چھوڑ کر گیا تھا، مثلاً قصاص ودیت کا قانون، اُسے مکمل کرنے کی کوشش کی، عائلی قوانین میں ترمیم کا مسودہ تیار کیا، اور غیر سودی بنکاری کی رپورٹ کو حتمی شکل دینے میں حصہ لیا۔

جاری ہے......

☆☆☆

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب، دامت برکاتہم
نائب رئیس ــــــــــ جامعہ دارالعلوم کراچی

یادیں

(چوالیسویں قسط)

امریکہ کا پہلا سفر

۱۴ر جولائی ۱۹۷۸ء مطابق شعبان ۱۳۹۸ھ کو میرے پاس اسلامی نظریاتی کونسل کے سیکریٹری مظفر اشرف صاحب کا فون آیا کہ امریکہ میں ایک مسلمان تنظیم کی طرف سے ۲۰ر جولائی کو ایک کنونشن منعقد ہو رہا ہے، اور اُس میں پاکستان کی نمائندگی کرنے کے لئے صدر ضیاء الحق صاحب نے ایک تین رکنی وفد تشکیل دیا ہے جس میں آپ کے علاوہ جناب خالد اسحاق ایڈوکیٹ اور جناب ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب شامل ہیں، اس لئے آپ امریکہ کے سفر کے لئے فوراً تیار ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے جلد سے جلد gratis (اعزازی) سرکاری پاسپورٹ بنوائے، اور چند ہی دن میں پی آئے کے طیارے سے سیٹ بک ہوگئی۔ مجھے یہ شوق تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے واپسی میں لندن، پھر قاہرہ اور آخر میں حجاز کا سفر بھی ساتھ ہو جائے، کیونکہ اس وقت کسی طویل پرواز پر راستے کے دو تین ملکوں میں ٹھہرنے کی اسی ٹکٹ میں کسی مزید ادائیگی کے بغیر گنجائش ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ ہم نے ٹکٹ اسی حساب سے بنوالیا۔ ہمارے خاندان، مدرسے اور ملنے جلنے والوں میں اب تک کسی نے مغربی دنیا کا سفر نہیں کیا تھا۔ اپنے ماحول میں پہلی بار اس طرف کا رُخ کرنے والا میں تھا، اس لئے مجھے یاد ہے کہ ۱۸ر جولائی کو جب ہم ایئر پورٹ پہنچے، تو ہمارے خاندان کے لوگوں کا ایک جم غفیر ایئر پورٹ پر مجھے رخصت کرنے کے لئے موجود تھا، تینوں بھائیوں کے علاوہ بھتیجے بھانجے، سسرالی رشتہ دار، دارالعلوم کے لوگ، سب جمع تھے۔ پی آئی اے کی فرسٹ کلاس میں میری اور ڈاکٹر تنزیل الرحمن صاحب کی سیٹیں ایک ساتھ تھیں، خالد اسحٰق صاحب کو علیحدہ سفر کرنا تھا۔ ہمارے جہاز کو پہلے دبئی، پھر قاہرہ، پھر فرینکفرٹ،

پھر پیرس رکنا تھا، اور وہاں سے بحر اوقیانوس (اٹلانٹک) کو عبور کر کے نیو یارک پہنچنا تھا۔ ہم رات گئے، تقریباً ایک بجے سوار ہوئے، اور دبئی سے پرواز کرنے کے بعد ہم سورج کے ساتھ ساتھ مغرب میں سفر کرتے رہے، اس لئے اُس روز ہمارا دن معمول سے بہت زیادہ لمبا ہوگیا۔ یورپ میں پہلی بار داخل ہوئے تو پہلی منزل فرینکفرٹ تھی، اُس وقت یہ شہر بادلوں کی لپیٹ میں تھا، اور جھین بادلوں سے جھلکتی ہوئی شہر کی خوبصورتی میرے لئے ایک نیا تجربہ تھی۔ ائیر پورٹ ہی اتنا وسیع وعریض اور جدید سہولیات سے آراستہ تھا کہ ایسا ائیر پورٹ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ وہاں سے اُڑے، تو پیرس کا اورلی ائیر پورٹ اپنے روایتی حسن کے ساتھ دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ عصر کی نماز ہم نے پیرس میں پڑھی، اُس کے بعد جہاز آٹھ گھنٹے مسلسل بحر اوقیانوس پر پرواز کرتا رہا، اور جب نیو یارک کے کینیڈی ائیر پورٹ پر اترا، تو عصر کا وقت اُس وقت بھی تھوڑا سا باقی تھا، اور جہاز سے اترتے اور امیگریشن وغیرہ کے مراحل طے کرتے کرتے مغرب ہوگئی جو ہم نے ائیر پورٹ پر ہی ادا کی۔ پاکستانی سفارت خانے کے نائب قونصل ہمارے استقبال کے لئے موجود تھے۔ کانفرنس ویسٹ ورجینیا کے دارالحکومت چارلسٹن میں ہونی تھی۔ ہم رات کے وقت نیو یارک پہنچے تھے، اور اُس وقت شاید چارلسٹن کے لئے کوئی پرواز نہیں تھی، اس لئے سفارت خانے کی طرف سے لگارڈیا ائیر پورٹ کے سامنے ایک ہوٹل میں ہمارے لئے رات گذارنے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ یہ امریکہ میں ہماری پہلی رات تھی، اور ہمارے ملک کے لحاظ سے دن کا وقت۔ اس لئے رات بھر کوشش کے باوجود نیند نہیں آئی۔ صبح اٹھے تو ہوٹل سے باہر چہل قدمی کے لئے نکلے۔ سامنے ایک ہائی وے تھی جس پر کاریں تیزی سے دوڑتی ہوئی جارہی تھیں۔ کچھ دیر کی چہل قدمی کے بعد ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ناشتے کے لئے بیٹھے تو ویٹر نے ایک بڑے سے مگ میں ہم سے پوچھے بغیر ہی کالی سی کافی انڈیل دی جو ایک طرف ٹھنڈی پٹ تھی، اور دوسری طرف دودھ کے بغیر اور اتنی کڑوی کہ اُسے منہ میں لے کر نگلنا بھی مشکل ہوگیا، اور اگلنا بھی۔ معلوم ہوا کہ امریکی گورے ناشتے کا آغاز ہی اس سیاہ فام کافی سے کرتے ہیں، اس لئے ویٹر پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔ ذائقے پر اس کافی کے بدذائقہ اثرات سے کسی طرح جان چھڑا کر توس اور انڈا لیا، چائے لی، تو وہ بھی ٹھنڈی، اور پھیکی۔ چینی کے پیکٹ تو بہت سے پڑے تھے، مگر ان میں مٹھاس بس واجبی ہی سی تھی۔

اُس وقت نیو یارک میں ہمارے جاننے والے بہت کم تھے۔ حضرت مولانا محمد متین خطیب صاحبؒ کے

صاحبزادے محمد امین صاحب جو میرے بچپن کے دوست تھے، ان کا فون نمبر میرے پاس تھا۔ انہیں فون کیا، تو وہ آکر اپنے گھر لے گئے۔ پھر اُسی دوپہر چارلسٹن کے لئے ہماری پرواز تھی۔ عصر کے قریب ہم چارلسٹن پہنچے۔ وہ زمانہ ایسا تھا کہ امریکہ میں پاکستانی حضرات بہت کم تھے۔ خاص طور پر چارلسٹن میں ان کی تعداد بہت کم تھی۔ ہم جب چارلسٹن ایئر پورٹ پر اترے، تو کانفرنس کے منتظمین سے زیادہ ایک پاکستانی جوڑا ہماری خاطر مدارات میں زیادہ مصروف نظر آیا۔ ہم انہیں نہیں جانتے تھے، لیکن وہ اس طرح ہماری خاطر مدارات میں لگا ہوا تھا جیسے اس سے پرانا تعلق ہو۔ پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ یہ دونوں میاں بیوی چارلسٹن کے کسی ہسپتال میں ڈاکٹر ہیں، (افسوس ہے کہ اب ان کا نام یاد نہیں آرہا) انہوں نے سُن لیا تھا کہ کانفرنس میں شرکت کے لئے پاکستان سے دو آدمی آرہے ہیں، اور پاکستان سے محبت انہیں ایئر پورٹ کھینچ لائی۔ دراصل اُس وقت تک وہاں پاکستانی باشندے بہت کم تھے، اور جو تھے، انہیں پاکستانیوں کو دیکھنے اور ان سے ملاقات کا بڑا شوق ہوتا تھا۔ یہی شوق تھا جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ انجانے پاکستانیوں سے ملنے کے لئے ایئر پورٹ پر ان کا استقبال کریں۔ ان کے اس جذبے کی بڑی قدر ہوئی، اور پھر انہوں نے چارلسٹن میں ہمارے قیام کے دوران ہمارا اس طرح خیال رکھا جیسے ہم ان کے گھر کے ایک فرد ہوں۔

ہمارا قیام ہالی ڈے ان ہوٹل میں تھا۔ ہم وہاں پہنچے، تو سہ پہر کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ ڈاکٹر صاحب دو بڑے سے تھیلے خشک میووں اور نمکیات سے بھرے ہوئے لاکر ہمارے پاس رکھ گئے کہ پاکستان سے آنے والوں کے دن اور رات کا نظام یہاں تبدیل ہوجاتا ہے، اس لئے ہوسکتا ہے کہ آپ کو بے وقت کھانے کی ضرورت ہو۔ ایسے موقع پر یہ چیزیں کام آئیں گی۔ ہم تھکے ہوئے تھے، اس لئے کچھ دیر آرام کی غرض سے سوگئے۔ دن اور رات کا نظام واقعی تبدیل ہوچکا تھا، اور اب جو آنکھ کھلی تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ مغرب قضا ہوگئی تھی، جلدی سے اٹھکر مغرب اور عشاء پڑھی۔ اس کے بعد ریسٹورنٹ میں کھانے کے لئے پہنچے، تو وہ بند ہوچکا تھا۔ ایک ویٹر نے بتایا کہ ہوٹل کی اوپر کی بالکل آخری منزل پر ایک ریسٹورنٹ کھلا ہوگا، آپ وہاں جاسکتے ہیں۔ ہم وہاں پہنچے تو ریسٹورنٹ میں اندھیرا تھا، البتہ میزوں کے اوپر چھوٹی چھوٹی شمعیں جل رہی تھیں۔ ہم ایک میز پر پہنچے، اور ویٹریس کو مچھلی لانے کے لئے کہا، کیونکہ کوئی اور حلال غذا ملنے کی توقع نہیں تھی۔ ویٹریس نے آرڈر تو لے لیا، لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے آکر کہا کہ اگر آپ برا نہ مانیں، تو میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ یہ

جگہ شاید آپ کے لئے موزوں نہیں ہے، آپ روم سروس کو آرڈر دیکر جو کھانا چاہیں، منگوالیں۔ اس کے کہنے سے اندازہ ہوا کہ یہ جگہ تھوڑی دیر میں ایک نائٹ کلب میں تبدیل ہونے والی ہے۔ اور ہمارے چہرے کی داڑھیوں اور لباس سے ویٹریس نے اندازہ لگایا کہ ہم مسلمان ہیں، اور تھوڑی دیر میں جب نائٹ کلب کی کارروائی شروع ہوگی، تو پھر ہم یہاں بیٹھنا نہیں چاہیں گے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس مشکل سے بہ آسانی نکال دیا۔ اور اسی موقع پر پہلی بار اپنی داڑھی اور پاکستانی لباس کی قدر معلوم ہوئی کہ اس کی وجہ سے ایک غیر مسلم خاتون کو بھی یہ احساس ہوگیا کہ جو مشغلہ تھوڑی دیر میں یہاں شروع ہونے والا ہے، وہ اس کے مناسب نہیں، اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ایک فتنے سے بچالیا۔ اس کے بعد کھانے کو دل ہی نہ چاہا، اور ڈاکٹر صاحب جو خشک میووں کے تھیلے دے گئے تھے، ان کی قدر ہوئی، اور ہم نے انہی پر اکتفا کیا۔

صبح کو فجر کے بعد میں چہل قدمی کے لئے ہوٹل سے باہر نکلا۔ ہوٹل جس سڑک پر واقع تھا، اس کی دوسری طرف ایک دریا بہہ رہا تھا، اور اس کے دونوں جانب کا علاقہ بڑا سرسبز تھا، لیکن چہل قدمی کے دوران پوری فضا میں تیل کی بُو بسی ہوئی تھی جس نے سیر کا سارا لطف ختم کردیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک صنعتی شہر ہے، اور کارخانوں کی کثرت کی بنا پر یہاں فضا اس بو سے مکدر ہے۔ حیرت بھی ہوئی کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں ماحول کی اس آلودگی کو کیسے برداشت کیا جارہا ہے۔

اس وقت امریکہ میں مسلمانوں کی کئی تنظیمیں بنی ہوئی تھیں، جو زیادہ تر عرب مسلمانوں نے بنائی تھیں، ان تنظیموں کا ایک وفاق "فیڈریشن آف اسلامک ایسوسی ایشن" کے نام سے بنا ہوا تھا جس کے سیکریٹری اسد صاحب ایک لبنانی مسلمان تھے۔ اور انہوں نے ہی صدر ضیاء الحق صاحب مرحوم سے یہ فرمائش کی تھی کہ ان کا سالانہ کنونشن جولائی میں ہورہا ہے، اس کے لئے پاکستان سے کچھ نمائندے بھیجے جائیں۔ صدر صاحب مرحوم نے اس کے لئے ہم تینوں کو بھیجا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ ایک تربیتی قسم کا اجتماع ہوگا جس میں مسلمانوں اور ان کے بچوں کو دین کے بارے میں کچھ سکھایا جائے گا، اور ہمیں بھی اس میں کچھ حصہ لگانے کا موقع ملے گا، لیکن یہاں آکر دیکھا تو یہ سوشل قسم کا کنونشن تھا، جس میں ایک مجلس "امریکہ میں اسلام" کے عنوان سے رکھی گئی تھی، اسی میں مجھے بھی تقریر کرنی تھی، اور انگریزی میں تقریر کرنے کا میرے لئے پہلا موقع تھا، اس لئے میں نے تقریر لکھ لی تھی، اور لکھی ہوئی تقریر ہی پڑھی، جس کا خلاصہ ترجمہ "جہان دیدہ" میں شائع ہوگیا ہے۔ تنزیل

الرحمٰن صاحب اور خالد اسحاق صاحب نے فی البدیہہ تقریر کی۔ لیکن شام کو جب ڈنر میں پہنچے، تو وہاں یہ افسوسناک منظر نظر آیا کہ بہت سی مسلمان خواتین مغربی انداز کے نیم برہنہ لباس میں مردوں کے ساتھ مخلوط ہو کر بیٹھی تھیں، اور یہ اعلان ہو رہا تھا کہ:" جو لوگ حلال کھانا چاہیں، وہ مچھلی پر اکتفا کریں" جس کا مطلب یہ تھا کہ گوشت حلال نہیں تھا۔ ماحول سراسر مغربی عریانی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایک عرب نوجوان نے لاؤڈ اسپیکر پر آ کر خواتین کے اس لباس پر اعتراض کیا، تو ہال سے آوازیں بلند ہوئیں: "Backwardness, Backwardness" (دقیانوسیت، دقیانوسیت) ہم تھوڑی دیر ایک کونے میں دبک کر بیٹھے، پھر جلد ہی وہاں سے سدھارنے میں عافیت سمجھی۔

اگلے دن قریبی دریا میں جہاز کے ذریعے سیر کا پروگرام تھا، اُس میں بھی دور دور اسلامیت کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم فیڈریشن کے صدر اسد صاحب سے ملے، اور ان سے عرض کیا کہ ہمیں اس قسم کا ماحول دیکھ کر بڑی سخت اذیت ہوئی ہے۔ اگر آپ ان لوگوں کو اس کنونشن میں اسلامی طرز زندگی سکھا نہیں سکتے، تو پھر اس کنونشن کا فائدہ کیا ہے؟ یہ سُن کر ان کی آنکھ پُرنم ہوگئی، اور انہوں نے کہا کہ جناب! ہم خود اس صورت حال سے پریشان ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ بیشتر اُن عرب خاندانوں کی اولاد ہیں جو سالہا سال پہلے معاش کی خاطر امریکہ میں آباد ہوئے، اور یہیں کا طرز زندگی اپنا لیا۔ انہیں بچوں کی دینی تربیت کی بھی کوئی فکر نہیں تھی، اس لئے یہ سب امریکی ماحول میں بری طرح رنگے ہوئے ہیں، اور اب ہم فی الحال اسی بات کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے اور سمجھتے رہیں، اس لئے ہم اس قسم کے اجتماعات میں ان پر سختی اس لئے نہیں کرتے کہ یہ کہیں مرتد نہ ہو جائیں۔ یہ سُن کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ پھر ہم نے انہیں کچھ تجاویز بھی پیش کیں، اور دل سے دعائیں نکلیں کہ اللہ تعالیٰ یہاں کے مسلمانوں کے ایمان کی حفاظت فرمائیں۔ میں نے امریکہ کے بعد کے بہت سے سفروں میں یہ عبرت انگیز واقعہ سُنا کر اپنے بھائی بہنوں کو متنبہ کیا کہ آنے والی نسلوں کے ایمان کی حفاظت ان کا سب سے بڑا فریضہ ہے، اور اگر انہوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی، تو اللہ تعالیٰ محفوظ رکھیں، انجام یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ الحمد للہ، جوں جوں وہاں مسلمانوں کی تعداد بڑھی ہے، حالات خاصے تبدیل ہوئے ہیں، لیکن سچی بات ہے کہ اگر وہاں رہنے والے مسلمانوں کی اکثریت کو دیکھا جائے، تو اولاد کا مسئلہ اب بھی تشویش ناک ہے۔

چارلسٹن سے فارغ ہوکر ہم واشنگٹن گئے، جہاں سائنسی میوزیم خاص طور پر دلچسپی کا باعث بنا۔ وائٹ ہاؤس کی بھی سیر کی، اور اس کے بعد خالد اسحاق صاحب مرحوم واپس چلے گئے، اور میں نے ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب کے ساتھ نیویارک میں اپنے ایک عزیز جناب ناظم صاحب کے گھر چند دن قیام کیا۔ نیویارک پہلی بار آنا ہوا تھا، اس لئے وہاں کے خاص خاص مقامات، مثلاً ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ اسی وقت دیکھی تھی۔ اُس وقت نیویارک میں مسجدیں بہت کم تھیں، اور حلال غذا حاصل کرنا کارے دارد تھا۔ چنانچہ صرف سبزیوں کا بنا ہوا پیزا پہلی بار وہیں کھانے کی نوبت آئی تھی۔

اس زمانے میں اگر ایک طویل سفر کے راستے میں مختلف ائیر لائنز کے ذریعے کئی جگہ قیام کیا جاتا، تو کرایہ تقریباً یکساں رہتا تھا۔ چنانچہ نیویارک سے ہم نے پہلے لندن کا سفر کیا۔ وہاں بھی میرے ایک عزیز جناب انصاراللہ صاحب کے یہاں قیام ہوا۔ لندن کا بھی پہلا سفر تھا، اس لئے وہاں کے خاص خاص مقامات دیکھے، اور ریجنٹ پارک کی مسجد میں میرا خطاب بھی ہوا۔ وہاں بھی اُس وقت مساجد کی تعداد بہت کم تھی، بالہم کی مسجد بھی چھوٹی سی تھی۔

مجھے بچپن سے اسلامی ملکوں، بالخصوص مصر دیکھنے کا شوق تھا، چنانچہ ہم نے لندن سے ایتھوپیا ائیر لائنز کے ذریعے قاہرہ کا سفر کیا۔ قاہرہ میں اُس وقت کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ چنانچہ ائیر پورٹ پر اتر کر وہیں سے ایک درمیانے قسم کے ہوٹل میں بکنگ کرائی، جو قاہرہ کے علاقے دُقّی میں واقع تھا، جو دریائے نیل کے اُس پار جیزہ میں ہے۔ ہمیں جامعۃ الازہر دیکھنے کا بھی شوق تھا، اور شیخ الازہر سے ملاقات کا بھی، فون پر ان سے ملاقات کا وقت لیا تو انہوں نے اگلے دن صبح کا وقت دیا۔

شام خالی تھی، اور مجھے شہر کی سیر کے علاوہ وہاں سے احرام کی چادریں بھی خریدنی تھیں۔ میں نے تنزیل الرحمٰن صاحب سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلیں، لیکن وہ تھکے ہوئے تھے، اور آرام کے موڈ میں تھے۔ چنانچہ میں نے ہوٹل سے کچھ رہنمائی لیکر ایک ٹیکسی لی، اور ڈرائیور سے کسی ایسے بازار چلنے کے لئے کہا جہاں سے احرام خریدا جا سکے۔ چنانچہ اُس نے دریائے نیل کے پار ایک بازار میں لاکر اتار دیا۔ عربی تو میں اُس وقت بھی بول لیتا تھا، مگر مصر کی عامی زبان بالکل پلے نہیں پڑتی تھی۔ نہ جانے کس طرح ڈھونڈ ڈھونڈ کر احرام کی چادریں دریافت ہوئیں۔ اب واپسی کے لئے ٹیکسی لوں، تو ڈرائیور کو پتہ سمجھانا بہت مشکل تھا۔ بہر حال! کسی طرح یہ

مشکل حل ہوئی، اور واپسی میں ہوٹل کا راستہ میں خود بھول گیا۔ کسی دوسرے ملک میں کسی رہنما کے بغیر کیا مشکلات ہوتی ہیں، ان کا اندازہ اسی سفر میں ہوا۔ آخر دعائیں کر کر کے رات کو نہ جانے کس طرح ہوٹل پہنچا۔

اگلے دن ہم جامعۃ الازہر گئے۔ اس وقت شیخ جادالحق رحمۃ اللہ علیہ شیخ الازہر تھے، وہ بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے۔ میں نے علماء دیوبند کی حدیث کی خدمات کا ذکر کیا، اور فتح الملہم پر اپنے کام کا تذکرہ آیا، تو انہوں نے فرمایا کہ ازہر کے ناظم شیخ حسینی مسند احمدؒ پر کام کر رہے ہیں، آپ اُن سے ضرور ملیں۔ پھر انہوں نے ہی ان سے ملاقات کروائی۔ شیخ حسینیؒ بھی بڑی محبت سے پیش آئے، اور انہوں نے بتایا کہ وہ حدیث کے بارے میں ایک کانفرنس کرنا چاہتے ہیں۔ علماء دیوبند کی خدمات کے پیش نظر انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ جب وہ کانفرنس ہوگی، تو میں آپ کو دعوت دوں گا، آپ اُس میں علمائے ہند کی حدیثی خدمات پر مقالہ لکھیں۔ (چنانچہ بعد میں انہوں نے یہ دعوت مجھے بھیجی، اور میں نے مقالہ بھی لکھا، جو مقالات العثمانی میں شامل ہے، البتہ کانفرنس کسی وجہ سے ملتوی ہوگئی)۔

ازہر سے راہ و رسم کے نتیجے میں قاہرہ کے مختلف مقامات دیکھنے کے لئے کچھ رہنمائی بھی میسر آ گئی۔ جامع الازہر اور جامع سیدنا حسینؓ کے علاوہ فراعنہ کی لاشوں کے میوزیم اور دریائے نیل کے کنارے اسّی منزلہ برج القاہرہ نیا نیا بنا تھا، اُس کی بھی سیر کی۔ اُسی شام کو شعبان کی ۲۹ر تاریخ تھی۔ معلوم ہوا کہ علماء کی مجلس نے رمضان کا چاند نظر آنے کا اعلان کر دیا ہے۔ اُسی وقت یہ بھی معلوم ہوا کہ مصر کے بارے میں جو افواہ تھی کہ وہاں رؤیت ہلال کے بجائے حساب پر فیصلہ کیا جاتا ہے، وہ بالکل غلط تھی۔ رات کے وقت ہماری سیٹ جدہ کے لئے بک تھی۔ اسی رات ہم روانہ ہوگئے، اور رات گئے مکہ مکرمہ پہنچ کر پہلا روزہ وہیں رکھا۔ مدرسہ صولتیہ میں قیام ہوا۔ اس وقت تک حرم مکی میں مطاف اور ترکی عمارت کے درمیان سنگریزوں والا صحن موجود تھا، اور تراویح مطاف کے اندر اندر ہی ہو جاتی تھی۔ الحمدللہ! رمضان کے چند دن مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ میں نصیب ہوئے۔ مدینہ طیبہ میں اُس وقت حرم کی دوسری سعودی توسیع نہیں ہوئی تھی، اور باب عمرؓ کے مشرقی جانب ایک متصل گلی میں حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زیر انتظام رباط بنگال قائم تھی۔ اسی میں قیام ہوا۔ اور پھر وہاں سے دوبارہ حرم مکی میں حاضری دیکر جدہ سے کراچی واپسی ہوئی۔ اس سفر کا بہت مختصر تذکرہ میں نے البلاغ میں لکھا تھا، اور "جہان دیدہ" میں "یورپ اور امریکہ میں چند روز" کے عنوان سے شامل ہے۔

جامعۃ الامام محمد بن سعود سے تدریس کی پیشکش

شعبان ۱۳۹۹ھ (جولائی ۱۹۷۹ء) میں مجھے اچانک ریاض کی جامعۃ الامام محمد بن سعود کے مدیر کی طرف سے ایک تار موصول ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ جامعہ کی طرف سے آپ کو استاذ مقرر کر دیا گیا ہے، آپ اپنی منظوری سے مطلع کریں۔ میں حیران تھا کہ میری کسی تحریک کے بغیر کس بنا پر یہ تقرر کیا گیا ہے۔ اب تو سعودی عرب کے علماء میں میرے جاننے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، لیکن اُس وقت میں کم از کم اُس ملک میں گمنام تھا۔ پھر خیال آیا کہ حضرت شیخ عبدالفتاح ابوغدہ (رحمۃ اللہ علیہ) اسی جامعہ کے کلیۃ اُصول الدین میں استاذ ہیں، اور ایک دو ماہ قبل وہ یہاں تشریف لائے تھے۔ شاید ان کی تحریک پر مجھے یہ دعوت دی گئی ہوگی۔ چنانچہ چند ہی دن میں حضرت موصوفؒ کے دو گرامی نامے میرے نام آئے جن سے اس خیال کی تصدیق ہوگئی۔ ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

''أكتب لكم هذه الكلمة العجلى تحية وصلة .قدّمتُ اسمكم الكريم للجامعة، وسيأتي إن شاء الله الطّلب إليكم، وأرجو أن نسعد بكم في الرّياض لتكون رياضا نفاحة بهجة''.

''میں یہ کلمات عجلت میں سلام ودعا پہنچانے کے لئے لکھ رہا ہوں۔ میں نے آپ کا نام جامعہ میں پیش کردیا ہے، اور ان شاء اللہ عنقریب آپ کے پاس ان کی طرف سے طلب آئے گی، اور مجھے امید ہے کہ ہمیں آپ سے ریاض میں سعادت حاصل ہوگی، تاکہ ریاض خوشبو اور خوشیوں سے مہک اُٹھے۔''

اس سلسلے میں حضرتؒ کا جو دوسرا قدرے تفصیلی مکتوب مجھے ملا، وہ اُن کی غایت شفقت کا عظیم مظہر ہے، وہ پورا نقل کرتا ہوں:

'' بسم الله الرحمن الرحيم

إلى الأخ الحبيب المحب الحب ابن الحب فضيلة الشيخ العلامة المحدث الفقيه مولانا محمد تقي كان الله له وبلّغه أمله، وأكرمني بصالح دعواته آمين.

من أخيه راجي دعواته عبد الفتاح أبو غدة

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته.

وبعد: فأحمد الله تعالى إليكم، وأرجو أن تكونوا وكلّ من معكم ويعزّ عليكم بخير من الله ونعمة.

لعل البرقيّة الّتى أرسلت من قبل مدير الجامعة بدعوتكم وصلت إليكم فى حينها، فإنّى منذ عدت إلى الرياض، قدّمت التقرير عن اختيار فضيلتكم لتكونوا فى أسرة التّدريس المختارة الممتازة فى الجامعة، ورحّب المدير بذلك والحمد لله، ثم أرسل برقية بهذا كما وعدنى، واليوم قبل إرسال هذه التّحيّة إليكم ذهبت إلى مدير الجامعة، وسألته عن إرسال البرقية للسفير عندكم لإعطاء التأشيرة ...فأجاب أن قد أُرسلت من أيام، فأرجو أن يكون تم ذلك بعون الله تعالى.

والدّراسة عندنا تبدأ من ١/ ذى القعدة فى هذا العام إن شاء الله ومعنى بدايتها منه أنّ المدرّسين يعودون إلى الجامعة فى هذا اليوم أو الّذى يليه ٢/١١ / ١٣٩٩ھ ويكون الاختبار الثانى للطلاب، ولعل الدراسة الفعلية تبدأ حقيقة فى ١٥/ أو ٢٠/ منه، أذكر لكم هذا لتنظموا عملكم وسفركم من الآن، وحبّذا لو أخبرتمونى برسالة قريبة عن عزمكم للحضور بعون الله تعالى جزماً، لعلنا نوفّق باختيار مسكن لكم مناسب إذا علمت به، فإن اختيار المسكن مهم، وإذا كانت الجامعة تقدمه لكم فأولى، ويعطون ١٠/ آلاف لتأثيث المسكن للقادم، هذه منحة غير داخلة فى الراتب الشهرى وتعويض المسكن، فإن تعويض المسكن ١٧ / ألفاً لغير الأستاذ، ولمرتبة الأستاذ ٢٠/ ألفاً، ولكن الأجرة الفعلية قد تزيد وقد تنقص بحسب المسكن سعة وضيقاً، فكم غرفة ترغبون وكم عدد الأسرة العزيزة بارك الله فيها؟

وعلى كلّ حال لعلّى آخذ علم ذلك منكم مع الأخ الوارد إلينا بعد نحو عشرة أيام كما أخبرنى بذلك الأخ إلياس، وختاماً تحياتى لكم وللأخ الأعزّ فضيلة الشيخ محمد رفيع وإلى باقى الأحباب والأصحاب، وأستودعكم الله، إلى لقاء قريب حبيب بإذن الله، والسلام عليكم ورحمة الله.

الرياض ٢٣/٨ / ١٣٩٩ھ أخوكم عبد الفتاح أبو غدة

ملاحظة: يوجد في الرياض مدرسة للأولاد الباكستانيين خاصة بهم مأذون بها من الدولة هنا، فقد تحتاجون إلى معرفة هذا .والله ولي التوفيق .

خط کا ملخص ترجمہ یہ ہے:

"سلام ودعا کے بعد

ریاض سے جامعہ کے مدیر کی طرف سے جو تار آپ کو بھیجا گیا ہے، شاید وہ بروقت پہنچ گیا ہوگا۔ میں نے ریاض واپس آنے کے بعد آپ کے بارے میں ایک مفصل تجویز جامعہ کے مدیر کو بھیجی تھی کہ آپ کو جامعہ کے منتخب اور ممتاز اساتذہ میں شامل کیا جائے۔ جامعہ کے مدیر نے الحمدللہ اس تجویز کا خیر مقدم کیا، اور اس کی بنا پر آپ کو تار روانہ کیا۔ آج ہی میں نے ان سے مل کر پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ تار بھی بھیج دیا گیا ہے، اور اُس کے ساتھ پاکستان کے سفیر کو آپ کے ویزا کا انتظام کرنے کے لئے بھی کہہ دیا ہے، اور امید ہے کہ یہ کام بھی ہو چکا ہوگا۔

اس سال ہمارے یہاں تعلیم یکم ذیقعدہ سے شروع ہوئی ہے، یعنی اساتذہ اس تاریخ کو یا اس کے ایک دن بعد پہنچیں گے، اس کے بعد طلبہ کا امتحان ہوگا، اور عملی طور پر تعلیم بظاہر ۱۵ یا ۲۰ ذیقعدہ سے شروع ہو سکے گی۔ یہ میں اس لئے بتا رہا ہوں، تاکہ آپ اپنے سفر کا انتظام اس کے حساب سے کرلیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ مجھے اپنے آنے کے حتمی ارادے سے مطلع کر دیں، تاکہ میں آپ کے لئے مناسب مکان تلاش کر کے رکھوں، کیونکہ مکان کا معاملہ بڑا اہم ہے۔ اگر جامعہ نے خود مکان کا انتظام کر دیا، تو بہتر ہے، اُس صورت میں وہ گھر کے فرنیچر اور دیگر سامان کے لئے دس ہزار ریال دیں گے۔ یہ رقم ماہانہ تنخواہ اور گھر کے الاؤنس کے علاوہ ہوتی ہے۔ گھر کا الاؤنس استاذ کے علاوہ لوگوں کے لئے ۱۷ ہزار ریال اور استاذ کے لئے ۲۰ ہزار ریال ہوتا ہے۔ لیکن مکان کا کرایہ گھر کی نوعیت کے لحاظ سے کم یا زیادہ ہوسکتا ہے۔ آپ کتنے کمروں کا مکان لینا چاہیں گے؟ اور آپ کے عزیز خاندان کے افراد کتنے ہوں گے؟

یہ ساری معلومات میں ان شاء اللہ ایک ساتھی کے ذریعے حاصل کرلوں گا جو عنقریب آپ کے پاس آنے والے ہیں، جیسا کہ مولانا محمد الیاس نے مجھے بتایا ہے۔ حضرت مولانا محمد رفیع صاحب کو سلام۔

"ایک ضروری بات یہ ہے کہ یہاں پاکستانی بچوں کی تعلیم کے لئے ایک الگ اسکول موجود ہے، جسے

مملکت کی طرف سے اجازت بھی حاصل ہے۔ یہ اس لئے ذکر کر دیا کہ شاید آپ کو اس کی ضرورت ہو۔"

حضرت شیخ ؒ کا یہ خط ان کی جس غیر معمولی شفقت کا مظہر ہے، اُس کے احساس سے میں نہال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، اپنے ایک ناکارہ شاگرد کا اتنا خیال رکھنا اور اُس کی ایسی عزت افزائی اُنہی کا حصہ تھا۔ لیکن اس گرامی نامے نے مجھے ایک عجیب کشمکش میں ڈال دیا۔ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت اور فیض صحبت کا یہ اثر تھا کہ ریاض کی جامعہ میں بحیثیت استاذ تقرر کے جو مادی فوائد تھے، الحمد للہ ان کی وجہ سے تو کوئی قابل ذکر کشش پیدا نہیں ہوئی، دوسری طرف دارالعلوم کی خدمت کو مستقل طور پر چھوڑنے کے لئے بھی دل آمادہ نہیں تھا، والدہ ماجدہ رحمہا اللہ تعالیٰ مسلسل بیمار چل رہی تھیں، اور اس حالت میں انہیں چھوڑ کر جانا بھی دل پر شاق تھا۔ نیز پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا جو آغاز ہو رہا تھا، اُس میں کسی بھی حیثیت سے شریک رہنا ضروری معلوم ہوتا تھا۔ البتہ میرے لئے کشش کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت سے استفادہ کا یہ بہترین موقع تھا۔ اس کے علاوہ عرب ماحول میں رہکر عربیت میں ترقی کی بھی امید تھی۔ اس وجہ سے میں نے اس پہلو سے سوچنا شروع کیا کہ مستقل طور پر جانے کے بجائے فی الحال ایک سال کے لئے اس پیشکش کو قبول کرلوں، اس دوران الحمد للہ! حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم دارالعلوم اور والدہ صاحبہ مدظلہا کی دیکھ بھال کے لئے تیار تھے، نیز ریاض میں رہتے ہوئے بھی اسلامی قوانین کی تدوین کے کام میں کسی نہ کسی طرح شامل رہ سکنے کی امید تھی۔ چنانچہ اس پہلو سے میں نے استخارہ بھی شروع کیا، اور مشورہ بھی۔ میرے بڑے بھائیوں کی رائے یہ تھی کہ اس پیشکش پر عمل کرلیا جائے، لیکن جوں جوں استخارہ کرتا، طبیعت کی آمادگی میں کمی آجاتی۔ آخر میں نے اپنے شیخ حضرت عارفی قدس سرہ سے مشورہ کیا، اور اپنے سارے حالات بتائے۔ حضرت ؒ نے تمام حالات سننے کے بعد مشورہ یہی دیا کہ معذرت کرلی جائے۔ حضرت شیخ عبدالفتاح ابو غدہ رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی شفقتوں کی بنا پر میرے لئے معذرت کرنا بھی آسان نہیں تھا، اور سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان سے معذرت کس منہ سے کس طرح کروں؟ لیکن اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ انہوں نے رمضان کے آخر میں مجھے خط لکھا کہ وہ عید کے متصل بعد کراچی تشریف لارہے ہیں۔ اپنی تشریف آوری کے اسباب بتانے کے بعد انہوں نے لکھا تھا:

" ولعلي بهذه المناسبة أدرك آخر العيد عندكم، فأجمع فيه بين عيدين لقائكم وعيد الفطر

السعید، ولقاء الأحباب الأنجاب لدیکم، ولعلکم تهیئتم للسفر إلینا علی أوائل ذی القعدة، لتکونوا فی أول العام الدراسی فی مقر عملکم المنتظر لکم، أعانکم الله ویسّر علیکم کل عسیر".

الریاض   الأربعاء ۲۱ / من رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ

أخوکم عبد الفتاح أبو غدة

"شاید اس موقع پر عید کے آخری دن میں آپ کے پاس ہوں، اور اس طرح میرے لئے دوعیدیں جمع ہوجائیں۔ ایک آپ اور دوسرے بھائیوں سے ملاقات کی عید، اور دوسری عید الفطر۔ شاید آپ اب تک اس بات کی تیاری کر چکے ہوں گے کہ ذیقعدہ کے اوائل میں سفر کر کے ہمارے پاس آجائیں، تاکہ تعلیمی سال کے شروع ہی میں آپ اپنے اُس مستقر میں پہنچ سکیں جو آپ کا منتظر ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو آپ کے لئے آسان فرمادیں، اور ہر مشکل کو دور فرمادیں۔

چنانچہ حضرتؒ عید کے موقع پر دارالعلوم تشریف لائے، اور ہمارے یہاں کافی دن قیام فرمایا۔ اس موقع پر حضرتؒ سے اپنے ریاض منتقل ہونے کے بارے میں بات کرنے کا موقع ملا۔ حضرتؒ کی عنایتوں پر شکریہ ادا کرنے کے بعد جس کے لئے میرے پاس موزوں الفاظ بھی نہیں تھے، میں نے اپنے اعذار ذکر کئے، حضرتؒ نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اُنہیں سُنا، اور خاص طور پر والدہ صاحبہ (رحمہا اللہ تعالیٰ کی علالت کا عذر سُنکر پورے انشراح کے ساتھ اُسے قبول فرمالیا، اور ساتھ ہی مجھے مشورہ دیا کہ میں مدیر جامعہ کو اپنا یہی عذر لکھ کر بھیج دوں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، اور اُس کے بعد مدیر جامعہ کی طرف سے مجھے ایک تار ملا جس میں انہوں نے میرے عذر کو قبول کرتے ہوئے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ آپ کے لئے جامعہ کی طرف سے کھلی دعوت ہے کہ جب والدہ صاحبہ کو صحت ہو، اور آپ کے لئے آنا ممکن ہو، تو جامعہ آپ کا خیر مقدم کرے گی۔

جاری ہے......

☆☆☆